مولانا

شیخ زاید اسلامک سنٹر
جامعہ پنجاب، لاہور

Marfat.com

Marfat.com

GIFT BOOK

مقالاتِ گیلانیؒ

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

شیخ زاید اسلامک سنٹر
جامعہ پنجاب، لاہور

Marfat.com

GIFT BOOK
ACC. G
Date
P.U. LIBRARY LHR.
66991

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

کتاب : مقالاتِ گیلانی

مصنف : مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

ناشر : ڈاکٹر جمیلہ شوکت
ڈائریکٹر شیخ زاید اسلامک سینٹر جامعہ پنجاب لاہور

کمپوزر : عتیق الرحمٰن شاہد
شیخ زاید اسلامک سینٹر جامعہ پنجاب لاہور

تعداد : ۵۰۰

سالِ اشاعت : ۲۰۰۴ء

قیمت : -/۶۰۰ روپے

ISBN : 969-8604-05-5

Marfat.com

فہرست مضامین

☆ حرف آغاز

☆ مولانا سید مناظر احسن گیلانی (احوال و آثار پر ایک طائرانہ نظر) ۱

۱۔ قرآن کے صابئین ۱۴

۲۔ اسلام اور ہندو مذہب کی بعض مشترک تعلیمات ۴۷

۳۔ مسئلہ سود مسلم و حربی میں ۷۶

۴۔ جدید علم کلام قدیم زبان میں ۱۶۴

۵۔ میرا مجوزہ تعلیمی خاکہ ۱۹۷

۶۔ انسانی تاریخ کی ایک مثالی حکومت ۲۱۳

۷۔ اسلامی حکمرانوں سے مسلمانوں کی ایک بے جا شکایت ۲۲۶

۸۔ مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم اقوام ۳۴۸

۹۔ مسلمانوں کا اندلس خود ان کی نگاہوں میں ۴۲۶

۱۰۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا نظریہ علم ۴۸۲

۱۱۔ علامہ سید مرتضیٰ زبیدیؒ ۵۱۳

۱۲۔ ہندوستان کا ایک مظلوم مولوی ۵۴۷

۱۳۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی ۶۰۸

۱۴۔ حضرت حکیم سید مولانا برکات احمد صاحب ٹونکیؒ ۶۲۸

☆ مصادر و مراجع ۶۸۲

Marfat.com

Marfat.com

حرفِ آغاز

مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ، کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے فرزندوں میں جو ہستیاں نمایاں ترین حیثیت رکھتی ہیں ان میں مولانا مناظر احسن گیلانی کا نام بڑے اہم مقام کا حامل ہے۔ مولانا کی شخصیت میں غیر معمولی وسعت اور عمق ہے۔ علم و عمل دونوں میں آپ کی ذات دوسروں کے لیے نمونہ تھی۔ تدریس، تحریر اور تقریر سب میدانوں میں زبردست ملکہ رکھتے تھے۔ آپ کی تصنیف "النبی الخاتم" سے تو سب آگاہ ہیں لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ذہنوں سے آپ کے نتائجِ قلم کا تنوع اور پھیلاؤ محو ہوتا جا رہا ہے۔ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسلامیانِ برصغیر کے اس عظیم الشان ذہن کی روشنی کو پھر سے مجتمع اور منعکس کیا جائے۔

اس تحریک کے تحت شیخ زاید اسلامک سینٹر، جامعہ پنجاب، لاہور نے یہ منصوبہ بنایا کہ مولانا کے منتشر مضامین کو کتابی شکل میں یکجا شائع کیا جائے۔ مولانا کی تحریریں اتنی زیادہ تعداد میں ہیں کہ سب کا احاطہ کرنا دشوار تھا چنانچہ پہلے مرحلے میں صرف معارف، اعظم گڑھ میں شائع ہونے والے مضامین پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ اب معارف کی تمام فائلوں میں کوئی ایسا مضمون نہیں رہا جو اس مجموعے میں نہ آ گیا ہو تاہم ہماری بھرپور کوشش رہی ہے کہ تمام اہم تحریریں یکجا ہو جائیں۔ اس کے لیے جس قدر محنت اٹھانا پڑی اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں وطنِ عزیز میں کسی علمی منصوبے کی اشاعت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا تجربہ ہے۔
بہرحال اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج یہ وقیع علمی مرقع آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

Marfat.com

قارئین دیکھیں گے کہ اس مجموعے کے مضامین نہایت اہم اور متنوع موضوعات پر عالمانہ و محققانہ دستاویزوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مضامین کی اس قوس قزح میں تقابل ادیان، فقہ، تصوف، تاریخ اور سوانح سب اپنے اپنے رنگ میں جلوہ گر ہیں اور بہت سا وقت گزر جانے کے باوجود ان کا مواد زر خالص کی طرح تازہ و تابناک ہے۔

ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر رفیق محترم حافظ عبدالباسط خان صاحب کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جن کی محنت سے ان تحریروں کی بہم آوری سے لے کر، ترتیب اور پروف خوانی تک کے مراحل طے ہوئے۔ حافظ صاحب نے اصل مضامین کے حواشی کو جدید ضروریات کے مطابق از سر نو مرتب کیا اور کہیں کہیں بقدر ضرورت اضافہ بھی فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اور مرکز کے اس منصوبے کو خود قبول فرما کر قبول عام سے بھی سرفراز کرے۔ آمین

ہم مجلہ ''معارف'' کے مدیر و انتظامیہ کے بھی شکر گذار ہیں جن کے تعاون سے یہ علمی مرقع آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم چوہدری ڈین کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے کہ جن کے تعاون کے باعث اس کتاب کی اشاعت ممکن ہو سکی۔

آخر میں لیفٹیننٹ جنرل (ر) ارشد محمود صاحب، وائس چانسلر جامعہ پنجاب و چیئر مین بورڈ آف گورنرز شیخ زاید اسلامک سینٹر کا بھی تہہ دل سے شکریہ لازم ہے جن کی سرپرستی اور علم دوستی کی بدولت یہ علمی منصوبہ تکمیل کو پہنچا۔

پروفیسر ڈاکٹر جمیلہ شوکت

Marfat.com

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

احوال و آثار پر ایک طائرانہ نظر

وسعتِ نظر، وسعتِ مطالعہ، رسوخ فی العلم اور ذکاوت میں ان کی نظیر اس وقت ممالک اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے، والغیب عند اللہ، تصنیف و تالیف کے لحاظ سے وہ عصر حاضر کے عظیم مصنفین میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کر دیا ہے وہ بیسیوں آدمیوں کو مصنف اور محقق بنا سکتا ہے۔ اس ایک آدمی نے تن تنہا وہ کام کیا ہے جو یورپ میں پورے پورے ادارے اور منظم جماعتیں کرتی ہیں۔ ان جیسا آدمی برسوں میں پیدا ہوا تھا، اور اب ان جیسا آدمی شاید برسوں میں بھی پیدا نہ ہو۔

یہ اقتباس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (م ۱۹۹۹ء) کے ایک تعزیتی مضمون سے لیا گیا ہے جو انہوں نے مصنف مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی رحلت پر لکھا تھا۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی نسباً واسطی زیدی سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق ان کے اجداد میں سے ایک بزرگ سید احمد جاجنیری (بغداد کے محلّہ جاجنیر کی طرف منسوب) سلطان محمد غوری کے ہمراہ برصغیر وارد ہوئے تھے۔ پہلے وہ کانپور کے قریب آباد ہوئے، اور بعد میں اپنے اہل و عیال سمیت بہار (ہندوستان) کے اس علاقے میں چلے آئے جو آج ضلع مونگیر کا حصہ ہے۔ سید احمد جاجنیری کے اخلاف اپنے دیہات کے مجموعی نام سے ''سادات بارہ گاواں'' کہلاتے ہیں۔ اس خانوادے کی ایک شاخ ضلع پٹنہ میں موضع بہار شریف سے بارہ میل جانب مشرق ''محی الدین پور گیلانی'' نام کی ایک بستی میں آباد چلی آ رہی ہے۔ ''محی الدین پور گیلانی'' کا نام عام آدمی کی زبان پر محض ''گیلانی'' رہ گیا ہے، اس بستی کے حوالے سے مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی پہچان ہے۔ آج اس بستی کی آبادی محض چھ سات سو افراد پر مشتمل ہے۔

Marfat.com

خاندان

مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا خاندان اپنی زمینداری اور اثر ورسوخ کے اعتبار سے علاقے میں معروف رہا ہے۔ ان کے پردادا داروغہ میر شجاعت علی سرکار برطانیہ کے ایک صاحب وجاہت عہدے دار تھے۔ داروغہ میر شجاعت علی کے صاحب زادے سید محمد احسن اپنے وقت کے ایک بڑے عالم اور زبردست معقولی مدرس تھے۔

سید محمد احسن ۱۲۱۲ھ/ ۹۸۔۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ ناز ونعم میں پلے اور تعلیم پر کوئی توجہ نہ دی، حتی کہ شادی ہوگئی اور ایک بچے کے باپ بن گئے تو کسی نے انہیں ان پڑھ ہونے کا طعنہ دیا۔ خاندانی وجاہت اور مالی آسودگی یہ طعنہ برداشت نہ کرسکی۔ تہیہ کرلیا کہ آئندہ کسی کے لیے یہ طعنہ دینے کا موقع نہ رہے گا۔ چنانچہ گھر بار چھوڑ کر طلب علم میں نکل کھڑے ہوئے۔ چودہ برس شمالی ہند کے علمی مراکز میں مقیم رہ کر واپس آئے تو مروجہ دینی علوم میں مجتہدانہ نظر کے حامل تھے۔ اس عرصے میں انہوں نے مظفر پور کے مولانا نعمت اللہ سے متوسط درجے تک کی کتابیں پڑھیں۔ معقولات میں مفتی واجد علی بنارسی اور مولانا فضل حق خیر آبادی سے استفادہ کیا۔ ہیئت و ہندسہ مفتی نعمت اللہ لکھنوی سے پڑھا۔ علم فقہ کی تحصیل مولانا اکبر علی رامپوری اور مولانا عالم علی نگینوی سے کی۔

فارغ التحصیل ہوکر پہلے ''گیا'' کے سرکاری مدرسے میں ملازمت کی اور وظیفہ یاب ہونے کے بعد گیلانی میں علوم دینیہ کی تدریس میں مصروف رہے۔ ان سے استفادہ کے لیے نہ صرف بہار، بلکہ برصغیر کے دور دراز کے علاقوں، حتی کہ سرحد و کابل تک کے طلبہ کی ایک خاصی تعداد ''گیلانی'' کا سفر کرتی تھی۔ بہار کے بعض جلیل القدر علماء مثلاً مولانا رفیع الدین شکرانوی، مولانا عبدالغفور رمضان پوری، مولانا حکیم عبدالسلام بھاگلپوری، مولانا حکیم دائم علی ٹونکی اور مولانا محمد اسماعیل رمضان پوری وغیرہ اسی درسگاہ کے خوشہ چین تھے۔ مولانا سید محمد احسن گیلانی ۱۳۰۱ھ/ ۸۴۔۱۸۸۳ء میں فوت ہوئے اور اپنے مولد ہی

Marfat.com

میں مدفون ہوئے۔

مولانا سید محمد احسن گیلانی کے تین صاحبزادے تھے۔ سب سے بڑے صاحبزادے ابوظفر محمد سلیمان کا اپنے والد کی زندگی ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔ باقی دو صاحبزادے سید ابونصر اور حافظ ابوالخیر تھے۔ سید ابونصر نے رامپور اور لکھنؤ میں تعلیم پائی تھی اور اپنے علم وفضل اور شعروشاعری کے ذوق کی وجہ سے اپنے ہم چشموں میں بڑی عزت کے مالک تھے۔ دوسرے صاحبزادے حافظ ابوالخیر والد کی رحلت کے وقت چودہ سال کے تھے۔ انہوں نے درسیات کی جانب زیادہ توجہ نہ دی، حفظ قرآن اور ابتدائی فارسی خوانی کے بعد کھیتی باڑی کے کاموں میں لگ گئے اور زندگی بھر ہل سہاگے کے بندوبست میں لگے رہے، تاہم بڑے مخیر اور فیاض تھے۔ ۱۹۲۹ء میں فوت ہوئے۔ یہی حافظ ابوالخیر مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے والد ماجد تھے۔

ابتدائی زندگی اور تعلیم

سید مناظر احسن گیلانی ۹ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ/ یکم اکتوبر ۱۸۹۲ء کو اپنی ننھیال ''استھانواں'' میں پیدا ہوئے۔ مناظر احسن تاریخی نام ہے۔ ان کی تعلیم وتربیت میں ان کے والد ماجد حافظ ابوالخیر سے زیادہ چچا سید ابونصر کا حصہ ہے۔ انہی نے سید مناظر احسن کے لیے دینی تعلیم کا میدان منتخب کیا۔ خود تعلیم دی، اور اردو فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھانے کے بعد ٹونک بھیجا، جہاں مولانا سید برکات احمد ٹونکی کے درس کی شہرت تھی۔ اس وقت مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی عمر تیرہ چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی ''مدرسہ خلیلیہ'' (ٹونک) اور علامہ ٹونکی کے ذہین طلبہ میں شمار ہوتے تھے۔ ٹونک کے سات آٹھ سالہ قیام (۱۳۲۴ھ۔۱۳۳۱ھ/ ۱۹۰۶ء۔۱۹۱۳ء) میں انہوں نے ''درسِ نظامی خیرآبادی'' اور خصوصیت سے منطق وفلسفہ کی کتابیں پڑھیں۔ مدرسہ خلیلیہ کے ایک دوسرے مدرس مولانا محمد اشرف سے جو ملتان کے رہنے والے تھے،

Marfat.com

انہوں نے ادب میں مقامات حریری، دیوان متنبی، حماسہ اور سبعہ معلقہ جیسی کتابوں کا درس لیا۔ ان ہی سے ریاضی، ہیئت اور ہندسہ کی تحصیل کی۔

ٹونک سے فارغ التحصیل ہو کر کچھ عرصے کے لیے مولانا گیلانی اجمیر چلے گئے تھے۔ وہاں مولانا معین الدین اجمیری (م ۱۹۴۰ء) کے ہاں مقیم رہے۔ جو مولانا برکات احمد ٹونکی کے شاگرد تھے۔ مولانا گیلانی ؒ کو ان سے رسمی تلمذ تو حاصل نہیں رہا البتہ مذاکرہ اور تبادلہ خیال کرتے رہے۔ شوال ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء میں جب ان کی عمر بیس برس کے قریب تھی، دورۂ حدیث کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔

آپ ؒ نے الجامع الصحیح للبخاری وسنن الترمذی شیخ الہند مولانا محمود حسن ؒ سے، الجامع الصحیح للمسلم مولانا انور شاہ کشمیری ؒ سے، سنن ابی داؤد مولانا شبیر احمد عثمانی اور میاں سید اصغر حسین سے، موطا امام مالک وموطا امام محمد مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی سے، سنن ابن ماجہ مولانا غلام رسول سے اور سنن نسائی مولانا حسین احمد مدنی سے پڑھی۔

اولیں ملازمت

مولانا گیلانی نے دارالعلوم دیوبند سے شعبان ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء میں امتیازی حیثیت سے سند فضیلت حاصل کی۔ اب معاش کا مسئلہ درپیش تھا، پہلے اپنی ابتدائی مادر علمی ''مدرسہ خلیلیہ'' میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔

حیدر آباد دکن کا سفر

ٹونک میں چند ماہ قیام کے بعد قسمت آزمائی کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ حیدر آباد دکن گئے اور مولانا انوار اللہ خان (معین المہام امورِ مذہبی) کے مدرسہ نظامیہ میں مقیم رہے۔ مولانا انوار اللہ خان کے ہاں ابن عربی کی فتوحات مکیہ کا درس ہوتا تھا۔ مولانا گیلانی بھی اس حلقے کے حاضر باش تھے۔ موطا امام محمد اور موطا امام مالک مولانا مفتی عزیز الرحمٰن سے پڑھیں۔

Marfat.com

ایک روز انہوں نے مثنوی مولانا روم کے مباحث پر تقریر کی تو اہل حیدر آباد "نووارد مہمان" کی صلاحیتوں سے واقف ہوئے۔ ملا مراد کابلی تاجر کتب، جو مثنوی مولانا روم کے شناسا تھے، کی وساطت سے مہاراجہ کشن پرشاد سے ملاقات ہوئی۔ مہاراجہ ہندو تھے، مگر مولانا انوار اللہ خان کی طرح اہل علم کے قدر شناس تھے۔ انہوں نے مولانا گیلانی کو مستقلاً حیدر آباد میں قیام کرنے کا مشورہ دیا۔ حیدر آباد کے دو بااثر اور بااختیار حضرات سے تعلق قائم ہو جانے کے باوجود مولانا گیلانی نے حیدر آباد چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ شیخ الہند اور حضرت انور شاہ کے حلقہ ہائے درس میں رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں کو سننے اور پڑھنے کا آخری انجام میرے لیے کیا یہی تھا کہ ایک غیر مسلم امیر کی مصاحبت اور ندیمی میں اپنی زندگی گزاروں گا۔ یہ خیال میرے سامنے آتا، معلوم ہوتا کہ دنیا مجھ پر تاریک ہوگئی۔

دارالعلوم دیوبند سے تعلقِ ملازمت

دارالعلوم دیوبند آنے پر اساتذہ نے ان کا خیر مقدم کیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن (مہتمم دارالعلوم) نے ابتدا میں "الرشید" اور "القاسم" کی ادارت ان کے سپرد کی۔ بعد میں "معین مدرسانِ عربی" کے زمرے میں انہیں شامل کرلیا گیا۔ پہلے ماہ تو محض دس روپے اعزازیہ ملا، شعبہ تدریس میں آنے کے بعد نیز اپنے مشفق اساتذہ کے طفیل تیس روپے ماہوار ہوگئی، تاہم یہ تنخواہ ان کی ضروریات کے لیے بہت کم تھی۔ اس بات کا اظہار انہوں نے مہتمم دارالعلوم سے کیا، مگر تنخواہ میں اضافے کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔ اس زمانے کے ایک خط میں انہوں نے لکھا ہے:

> "ان شاء اللہ تعالیٰ اس سال دیوبند ہی رہوں گا تیس روپے سے زیادہ تنخواہ ملنی ناممکن ہے۔ کھانا بھی اب نہیں ہوسکتا..... ملانوں کے مدرسوں میں غایت سے غایت پچاس سے آگے نہیں مل سکتا اور میں اتنی تنخواہ کے لیے اپنے آرام کو قربان

Marfat.com

نہیں کر سکتا ...... دیوبند میں تو میرا جی نہیں لگتا''۔

درمیان میں چھٹی پر اپنے وطن گیلانی چلےگئے اور وہاں کوشش کی کہ معاش کی بہتر سبیل نکل آئے، تاہم بات نہ بن سکی اور دارالعلوم دیوبند سے وابستہ رہے۔

جامعہ عثمانیہ ___ حیدرآباد

دارالعلوم دیوبند کی ملازمت سے عدم اطمینان جاری تھا کہ ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء میں حیدرآباد دکن میں کلیہ جامعہ عثمانیہ قائم ہوا۔ مولانا حمیدالدین فراہی (م ۱۹۳۰ء) کے توسط سے کلیہ جامعہ عثمانیہ میں ''استاذ حدیث'' کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوگیا۔ دارالعلوم دیوبند کے بزرگوں نے ان کے حیدرآباد چلے جانے کی تائید کی اور اس طرح ایک ''دیوبندی عالم'' کو جدید طرز کی درسگاہ میں اپنی صلاحیتیں اجاگر کرنے کا موقع ملا۔ مشاہرہ بھی معقول (۲۵۰ روپے ماہانہ) تھا۔ کچھ عرصے بعد مولانا گیلانی ''دینیات لازمی'' کے استاد ہوگئے۔

مولانا گیلانی نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ جامعہ عثمانیہ میں گزارا۔ آخری زمانے میں صدر شعبہ کے فرائض انجام دیتے رہے تھے۔ آخر ۳۱ مارچ ۱۹۴۹ء/ ۱۱ جمادی الثانی ۱۳۶۹ھ کو پنشن پاتے ہوئے الگ ہوگئے۔ مولانا جامعہ عثمانیہ کے ہردلعزیز اور کامیاب اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ اپنے مضمون پر ان کے عبور، وسعتِ مطالعہ اور دل نشین اندازِ بیان کے ساتھ طلبہ کیساتھ نہایت شفیق اور ہمدرد سرپرست کی حیثیت رکھتے تھے۔

حیدرآباد کی زندگی

جامعہ عثمانیہ سے تیس سالہ وابستگی اور قیام حیدرآباد میں ان کے حلقہ احباب میں شہر کے سب ہی اصحابِ علم وفضل شامل تھے۔ مولانا حمیدالدین فراہی سے انہیں استفادے کا موقع ملا تھا اور ان کی ہم نشینی نے مولانا گیلانی کے مطالعہ قرآن کے ذوق میں اضافہ کیا تھا۔ نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن شروانی کے ساتھ کتاب دوستی اور وعظ گوئی کا اشتراک تھا اور شہر کی محافل میلاد کی رونق ان دونوں کے دم سے تھی۔ اپنی رہائش گاہ کی قریبی

Marfat.com

مسجد میں مولانا گیلانی درسِ قرآن کا ہمیشہ اہتمام کرتے تھے، اور جمعہ وعیدین کے موقع پر خطبہ بھی دیتے تھے۔

حیدرآباد میں تصوف کا ذوق رکھنے والوں کا اپنا ایک حلقہ تھا اور مولانا اس سے خاصے قریب تھے۔ انہوں نے زمانہ طالب علمی میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، مگر بوجوہ حصولِ تربیت کے انہیں زیادہ مواقع نہ مل سکے تھے۔ حیدرآباد میں مولانا محمد حسین ایک صاحب حال وقال بزرگ تھے، مولانا گیلانی کو ان سے ارادت تھی، انہوں نے مولانا گیلانی کو اپنا خلیفہ نامزد کر دیا تھا۔ حیدرآباد کے ایک دوسرے بزرگ حبیب العیدروس تھے، ان سے بھی بیعت کی، اور خلافت سے سرفراز ہوئے، لیکن اس دوہری خلافت کے باوجود خود کسی کو بیعت نہیں کیا۔

گیلانی کا زمانہ قیام

جامعہ عثمانیہ کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہوئے تو متعدد اداروں نے انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی، مگر انہوں نے اپنے وطن مالوف کے قیام کو ہر پیش کش پر ترجیح دی۔ بڑے شہروں کی پرشور اور ہنگامہ خیز زندگی سے دور ایک گاؤں میں، انہوں نے مطالعہ وتحریر کا سامان فراہم کرلیا تھا، اور علمی اعتبار سے "تنہائی" کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس دور کے مکتوبات میں قیام گیلانی کو اکثر "کہفی دور" لکھا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے جلسۂ ماتم (دارالعلوم ندوۃ العلماء ___ لکھنؤ) میں شریک ہوکر جب واپس گیلانی آئے تو دوسرے یا تیسرے روز ان کے مکان پر چوروں نے رات کو حملہ کیا اور گھر سے جو کچھ اسباب لے جاسکتے تھے، لے گئے، خاصا نقصان ہوا اور بقول مولانا گیلانی "صبح کو جب آنکھ کھلی تو آنکھیں کھل گئیں"۔

۱۹۵۳ء کے آخر میں انہیں دل کا دورہ پڑا، مگر فوری علاج معالجے سے افاقہ ہوگیا تھا۔ چند ماہ بعد دوسرا دورہ پڑا جو اس قدر شدید تھا کہ ڈاکٹروں نے ان کے لکھنے پڑھنے پر

کامل پابندی لگادی تھی۔

۴ جون ۱۹۵۶ء کو انہوں نے نہایت پُرمسرت دن گزارا، الماریوں کی تمام کتابیں خود سجائیں، بچوں کو قصہ کہانی سنتے رہے، اور اپنے بھانجے سے فانی بدایونی کی غزل سننے کی فرمائش کی۔ جب یہ شعر پڑھا گیا:

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ، میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

تو ان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ بہت روئے اور موت کے موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ دوسرے روز صبح چار بجے دل کا دورہ پڑا۔ کچھ افاقہ ہوا، نماز ادا کی، اور لیٹ گئے۔ عالم خواب میں روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی، اسی روز ۵ جون ۱۹۵۶ء/ ۲۵ شوال ۱۳۷۵ھ کو بعد نماز ظہر نماز ہ جنازہ ہوئی اور گیلانی میں دفنائے گئے۔

اولاد

مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی اولاد میں ایک صاحبزادے سید محی الدین اور ایک صاحبزادی تھیں۔ سید محی الدین جدید پڑھے لکھے آدمی تھے۔ اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان آگئے تھے۔ صاحبزادی کی شادی مولانا مرحوم کے بھائی مکارم احسن کے صاحبزادے سے گیلانی میں ہوئی تھی، ان کی اولاد وہیں مقیم ہے۔

تصنیفی زندگی

مولانا گیلانیؒ نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز رسالہ ''القاسم'' (دیوبند) کے ایک مضمون سے کیا تھا جو انہوں نے اپنے استاذ گرامی حضرت شیخ الہند کے توجہ دلانے پر ''خیر الامم کا طغرائے امتیاز'' کے زیر عنوان لکھا تھا۔ اس کے بعد مسلسل لکھتے رہے اور بلا مبالغہ ہزاروں صفحات ان کے قلم سے نکلے۔ جن دنوں ''القاسم'' اور ''الرشید'' کی ادارت و ترتیب کی ذمہ داریاں ان کے ذمے تھیں، بعض اوقات پورا پرچہ ان ہی کی تحریروں کا مجموعہ

Marfat.com

ہوتا تھا۔

مولانا گیلانی سے متعدد کتابیں یادگار رہیں، مگر ان میں سے ایک دو کے علاوہ کوئی کتاب انہوں نے باضابطہ منصوبہ بندی کے تحت نہیں لکھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

''یہ آپ نے خوب لکھا ہے کہ میں مینہ برسا رہا ہوں۔ سچ عرض کرتا ہوں، لکھنے کے لیے فقیر نے، اب تک خود کچھ نہیں لکھا ہے، جو کچھ بھی ہو جاتا ہے کوئی سر پر سوار ہو کر لکھوا لیتا ہے یا اسی قسم کی کچھ مجبوریاں پیش آ جاتی ہیں''

مولانا کو کسی گوشے سے تحریک ہوئی، یا ان کے الفاظ میں کوئی مجبوری پیش آ گئی تو لکھنے بیٹھے اور صفحات پر صفحات لکھتے چلے گئے، اور لکھنے کی رفتار کا اندازہ اس بات سے کیا جاتا ہے کہ بڑے سائز کے تقریباً چار سو صفحات کی کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت (حصہ اول)'' بیس روز میں لکھ دی تھی۔ اس تیز نویسی میں وہ خود اپنے لکھے ہوئے پر نظر ثانی نہیں کرتے تھے اور یہ فریضہ ان کے شاگرد یا مخلص احباب انجام دیتے تھے، یا ناشر اپنے طور پر تبویب و تدوین کرا لیتے تھے۔ اپنے انداز تحریر کے بارے میں ایک جگہ مولانا گیلانی نے لکھا ہے:

''ایک دفعہ جھونک میں لکھنے بیٹھا تو لکھتا چلا گا۔ اب پھر اس پر نظر ثانی، حک و اصلاح میرے لیے مشکل ہے''

اسی انداز تحریر کا نتیجہ ہے کہ اکثر لکھتے لکھتے اصل موضوع سے ہٹ جاتے ہیں اور درجنوں صفحات ضمنی بحثوں میں کھپا دیتے ہیں۔ ایک بات سے دوسری بات نکال لیتے ہیں اور اس پر خامہ فرسائی کرتے کرتے بہت دور نکل جاتے ہیں اور جب کئی صفحات کے بعد دوبارہ اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں، تو اس وقت تک قاری عموماً سلسلہ مضمون بھول چکا ہوتا ہے۔ اسی طرح جملوں کی نشست و برخاست اور تراش خراش کے زیادہ قائل نہیں۔

Marfat.com

بعض اوقات قواعد کو بھی خاطر میں نہیں لاتے، جو لفظ قلم سے ایک بار نکل گیا، اسے کاٹ کر دوسرا نہیں لکھا۔ بعض اوقات عبارت کے درمیان جملہ معترضہ شروع ہوا، اور وہ اتنا طویل ہوگیا کہ پہلے جملے کا باقی حصہ کہیں درمیان میں ہی دم توڑ گیا۔

مولانا کی تصنیفی زندگی کا ایک بڑا روشن پہلو یہ ہے کہ انہوں نے دوسروں کی امداد وتعاون کا حوالہ دینے میں کبھی کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ بڑی فراخ دلی اور فیاضی سے ملنے والی علمی امداد کا ذکر کرتے ہیں۔

ذیل میں موضوع اور ان کی تصنیفی کاوشوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔

قرآنیات

۱۔ تدوین قرآن ۲۔ تذکیر بسورۃ الکہف

حدیث

۱۔ امالی صحیح مسلم (از افادات مولانا انور شاہ کاشمیری)

۲۔ تدوین حدیث

سیرت وسوانح

۱۔ النبی الخاتم ۲۔ ظہور نور (نیا میلاد نامہ)

۳۔ ابوذر غفاریؓ ۴۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی

۵۔ تذکرہ شاہ ولی اللہ ۶۔ سوانح قاسمی (تین جلدیں)

معاشیات

۱۔ اسلامی معاشیات ۲۔ اسلام اور نظام جاگیرداری وزمینداری

Marfat.com

فقہ

۱۔ مقدمہ تدوین فقہ

فلسفہ، تصوف اور کلام

۱۔ کائناتِ روحانی ۲۔ اسفار اربعہ (ترجمہ)

۳۔ الدین القیم ۴۔ مقالاتِ احسانی

۵۔ عبقات (ترجمہ)

تعلیم و تاریخ

۱۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، (جلد اول، جلد دوم)

۲۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ

۳۔ ہزار سال پہلے

متفرق مقالات و مکاتیب

دین کے دو بھائی، دربارِ نبوت کی حاضری، احاطہ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن، بہشتی پیداواروں کی ایک جھلک، سیرت بانی دار العلوم، ''مکاتیب گیلانی'' مولانا گیلانی کے مضامین متحدہ ہندوستان اور بعد ازاں پاک و ہند کے متعدد رسالوں میں چھپتے رہے زیر نظر کتاب بھی مولانا کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں چھپتے رہے ہیں۔

علمی اداروں سے وابستگی

شوال ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹ء میں وہ دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن نامزد کیے گئے اور ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ دار المصنفین (اعظم گڑھ) کے مشیروں میں سے تھے، اسی طرح ندوۃ المصنفین ــ دہلی کے رکن تھے۔ ایک سال ماہنامہ

Marfat.com

''الفرقان'' (لکھنؤ) کے اعزازی مدیر کی حیثیت سے بھی انہوں نے کام کیا تھا۔ پاکستان میں اسلامی دستور سازی کے حوالے سے منعقدہ مجلس شوریٰ میں شرکت کی جو مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے طور پر منعقد کروائی تھی۔

شاعری

مولانا گیلانی نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، وہ شعر وسخن کے چرچوں سے خالی نہ تھا۔ ان کے عم محترم اور استاد سید ابو نصر شعر وسخن سے دلچسپی رکھتے تھے۔ مولانا گیلانی جن دنوں ٹونک میں زیرِ تعلیم تھے، معقولات کے ساتھ اردو ادب کا ذوق اس قدامت پسندانہ ماحول میں ان پر غالب تو نہ تھا لیکن ایک گونہ اس سے تعلق ضرور تھا۔

مولانا کی آواز میں غضب کا سوز وگداز تھا، اپنے اشعار ترنم سے پڑھتے تھے۔ اور بقول کسے اپنی نعتوں سے اہل مجلس کو کیف وسرور کا وہ بادۂ دوشینہ پلاتے کہ مدینہ طیبہ کی فضا میں آنکھوں میں لہرا جاتی تھیں۔

خطابت

مولانا مناظر احسن گیلانی کی شخصیت میں ان کی خطابت کا بھی ایک پہلو ہے۔ ان کی لسانی اور خطابت کی روانی مشہور ہے۔ وہ کئی کئی گھنٹے مسلسل تقریر کرتے اور سامعین ہمہ تن گوش ہو کر سنتے تھے۔ ان کی تقریروں میں واعظانہ نوعیت کی باتوں کے ساتھ علمی مسائل بھی ہوتے تھے جنہیں اس سادگی اور شستگی سے وہ بیان کرتے تھے کہ عامی بھی برابر کا لطف لیتا تھا۔

اخلاق وعادات

مولانا گیلانی نے فارغ البالی کی زندگی بسر کی۔ جامعہ عثمانیہ سے معقول تنخواہ پاتے تھے، موٹر نشین تھے، اور بنگلے میں رہتے تھے۔ شہر حیدر آباد میں ان کا اکرام اور احترام

Marfat.com

تھا، بلکہ لوگ آنکھیں بچھاتے تھے۔ دینی و دنیوی وجاہت کے باوجود مزاج میں انکسار اور تواضع کا رنگ تھا۔ علمی مرتبے اور وجاہت کے ساتھ دوستوں سے ہنسی مذاق کر لیتے تھے، گفتگو اور نجی تحریروں میں مخاطب کی کبھی اس طرح چٹکی لے لیتے کہ دوسرے ہی نہیں بلکہ خود جس کی چٹکی لی جاتی، مسکرائے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ مولانا گیلانیؒ کے ہاں سادگی، ضمیر کی سچائی، اخلاص و محبت اور محض اللہ کے لیے دوستی و دشمنی نظر آتی ہے۔

مولانا گیلانی کی تحریروں سے ان کی وسعت مطالعہ عیاں ہے۔ نادر اور مفید کتابوں کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ کتابیں خریدتے تھے اور کتابوں کے بارے میں احباب سے استفسار کرتے تھے۔ سید ابوالحسن علی ندوی نے ''نزہۃ الخواطر'' کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ اس میں مولانا گیلانیؒ کی مساعی جمیلہ کا بہت بڑا حصہ تھا۔

☆ یہ مضمون مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب ''تدوینِ حدیث'' مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ کے آغاز میں موجود مقالہ سے لیا گیا ہے۔ ہم اس مقالہ کے مؤلف پروفیسر ڈاکٹر سفیر اختر راہی کے شکر گذار ہیں۔

Marfat.com

قرآن کے صابئین

کیا

بدھ مذہب کے ماننے والے تھے؟

یہ ایک سوال ہے جسے اہل علم کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ دنیا کے جانے پہچانے عام مذاہب وادیان یہودیت، عیسائیت بلکہ مجوسیت یعنی روشنی کے ماننے والوں کے ساتھ ساتھ قرآن میں ایک سے زائد مقامات پر ''الصابئین'' کا بھی تذکرہ پایا جاتا ہے۔

سوال یہی ہے کہ ''الصابئین'' کے اس لفظ سے قرآن نے کن لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے، اتنی بات تو کھلی ہوئی ہے کہ مذہبی اقوام اور دینی امتوں ہی کا ذکر جب کیا جارہا ہے تو ''الصابئین'' بھی چاہیے تو یہی کہ کسی ''دینی امت'' ہی کی تعبیر ہو۔

عرب کے باشندے جنہیں قرآن نے اپنا پہلا مخاطب بنا کر دنیا کی قوموں کی طرف ان ہی کو مبعوث کیا تھا (الف) اور جو کام ان عربوں کے سپرد کیا گیا تھا، عزم اور ارادے کی پوری قوت، ممکنہ وفاداری اور راستبازی کے ساتھ اس فرض کو انہوں نے انجام دیا اور ایک صدی بھی نہیں گذری تھی کہ مغرب میں مراکش کی پہاڑیوں اور مشرق میں دیوار چین تک قرآنی دعوت کو اس قوم نے پہنچا دیا، پھیلا دیا۔

....

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں فروری و مارچ ۱۹۵۳ء کو دو اقساط میں شائع ہوا۔

Marfat.com

گویا اترنے اور نازل ہونے کے چند ہی سال بعد وہی قرآن جو عرب میں اترا تھا، معمورہ عالم کے آباد اور شائستہ علاقوں کا قرآن بن چکا تھا۔ اس کتاب کو اپنی آسمانی کتاب سامی، آریائی، تورانی، الغرض بنی آدم کی عام نسلوں اور قوموں میں ماننے والے پیدا ہو چکے تھے۔ ان ہی ماننے والوں میں نبوات و کتاب سے بے تعلق ہو کر خود تراشیدہ اوہام میں مبتلا بت پرستوں کے ساتھ جیسے عیسائی تھے، یہودی تھے، مجوسی تھے، اسی طرح جاننے والے جانتے ہیں کہ ان میں کافی اور معقول تعداد بودھ مت کے ماننے والوں کی بھی تھی۔ وسط ایشیا، بخارا، سمرقند، بلخ، سندھ، سرحد، چینی، ترکستان میں بھی قرآن پڑھنے والے آج جو پائے جاتے ہیں، سمجھا جاتا ہے کہ ان کی اکثریت کا تعلق زیادہ تر بودھوں ہی سے تھا۔

سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ یہودیوں، عیسائیوں مجوسیوں کے تذکرہ کے ساتھ قرآن پر ایمان لانے والے ان بودھسٹوں کی طرف بھی اس کتاب میں کیا کوئی اشارہ کیا گیا تھا؟ مذاہب و ادیان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص مذہب کے ماننے والوں کو مختلف ممالک اور قوموں میں مختلف ناموں سے لوگ موسوم کرتے رہے ہیں۔ دور کیوں جائیے، خود مسلمانوں کو سارآسین، مور، ترک، ہوئی اور خدا جانے کن کن ناموں سے کن کن ملکوں میں نہیں پکارا گیا اور آج تک نہیں پکارا جارہا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ گو خود بدھ مت کے بانی گوتم بدھ کی جدوجہد کا دائرہ بقول ونسنٹ اے سمتھ:

> ''نہایت چھوٹے علاقے تک محدود تھا، جس میں تقریباً چار درجے عرض بلد اور اتنے ہی طول بلد شامل تھے۔ یہ علاقہ گیا، الہ آباد، اور کوہستان ہمالیہ کے درمیان کا ملک تھا، انہی حدود کے اندر گوتم بدھ پیدا ہوا، زندہ رہا اور بالآخر فوت

Marfat.com

ہو گیا''۔(۱)

لیکن مہاراجہ اشوک کی سرپرستی کے بعد جیسا کہ رائے بہادر مہامہو پادھیائے گوری شنکر ہیرا چند نے لکھا ہے:

''اشوک کی کوشش سے بودھ دھرم کی اشاعت محض ہندوستان تک محدود نہ رہی، بلکہ ہندوستان کے باہر لنکا، اور شمال مغرب کے ملکوں میں اس کا زور اور بڑھ گیا۔ بعد ازاں بودھ سادھوؤں کے مذہبی جوش کی بدولت رفتہ رفتہ، تبت، چین، منچوریا، منگولیا، جاپان، کوریا، سیام، برما اور سائبریا کے کرغیز اور کلموک تک پھیل گیا''۔(۲)

اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اے سمتھ کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ:

''اس کی (اشوک) اسی دستگیری نے بودھ مذہب کی قسمت کو پھیرا، اور اس قابل کر دیا کہ اس زمانے میں بھی وہ اسلام اور عیسائیت کا بلحاظ تعداد مقابلہ کرنے، بلکہ ان سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا ہے''۔(۳)

ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ ''شمال مغرب'' اور ''لنکا'' جہاں بودھ مت کے پھیل جانے کی اطلاع دی گئی ہے، لکھنے والوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

''ایران و مصر تک بودھ مذہب کا اثر پھیل چکا تھا''۔(۴)

یہی نہیں، بلکہ شام اور فلسطین میں بھی بودھ مذہب کے جن آثار کا لوگوں نے پتہ چلایا ہے ان کی بنیاد پر بقول اے سمتھ:

''بہت سے مصنفین ایسے بھی ہیں، جن کا خیال ہے کہ عیسوی مذہب کی بھی بہت سی باتوں میں بدھ تعلیمات کا اثر ملتا ہے'' (۵)

بجائے خود اس دعویٰ کی نوعیت خواہ کچھ ہی ہو، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فلسطین و شام تک بودھ مت کا اثر کسی نہ کسی شکل میں ضرور پہنچا ہے، جہاں

عرب کے باشندوں کی آمدرفت جاری تھی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تجارتی اغراض سے لنکا اور جزائر شرق الہند، جاوا، ساٹرا اور چین تک عرب کی واقفیت کسی وجہ سے محل تعجب نہیں ہوسکتی۔

ان اجمالی معلومات کے بعد جن کی تفصیلات سے ارباب تاریخ واقف ہیں، اب آیئے اور جو سوال اٹھایا گیا ہے اس پر غور کیجیے۔

اس سے تو خواص ہی نہیں، شاید عوام بھی واقف ہوں گے کہ ''الصابئین'' کا لفظ جو صابی کی جمع ہے، عرب اور مکہ والے صرف اس سے مانوس ہی نہ تھے، بلکہ عام طور پر یہ لفظ ان میں مستعمل تھا، انتہا یہ ہے کہ جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں، امام رازی نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے:

''كانت العرب يسمون النبی عليه السلام صابئاً''(۶)

''عرب کے لوگوں نے رسول اللہ کا نام صابی رکھ دیا تھا''

بلکہ ''صابی'' کے اسی لفظ سے صیغے بھی بنائے گئے ہیں، دین اسلام کے قبول کر لینے والوں کو عموماً صبؤت (تم صابی ہو گئے) کہا کرتے تھے۔ لیکن باوجود اس کے جب قرآن کے لفظ ''الصابئین'' کی تفسیر کا مرحلہ پیش آیا، تو مفسرین کی رائیں مختلف ہوگئیں۔ تفسیر کی موجودہ کتابوں میں جتنے اقوال پائے جاتے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ حضرت نوح علیہ السلام کے دین کے ماننے والوں کی صائبین یادگار ہیں۔(۷)

۲۔ اہل کتاب ہی کا ایک گروہ ہے السدی کا یہ قول ہے۔

۳۔ ایک قوم ہے جو فرشتوں کو پوجتی ہے، اور زبور کی تلاوت کرتی ہے۔

۴۔ کسدانیوں (قدیم بابل ونینوا) والوں کی ایک یادگار امت ہے، حضرت

Marfat.com

ابراہیم علیہ السلام اسی امت کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔

۵۔ وہب بن منبہ جو غیر قوموں کے حالات سے زیادہ واقف تھے، کہا کرتے تھے کہ صابی ان لوگوں کو کہتے ہیں جو اللہ کی توحید کے قائل ہیں لیکن ان کے پاس کوئی خاص شریعت نہیں ہے جس پر عمل کیا جائے۔

۶۔ ابوالزناد کا قول ہے کہ عراق کے نواح میں کوثی نامی مقام کی رہنے والی یہ ایک قوم ہے جو سارے انبیاء علیہ السلام کو مانتی ہے۔(۸)

۷۔ مجاہد کہتے تھے کہ صابی نہ تو یہودی ہیں نہ نصاریٰ بلکہ مشرکوں کی ایک قوم ہے جن کے پاس کوئی کتاب نہیں ہے۔

۸۔ سعید بن جبیر کی طرف ایک لطیفہ یہ بھی منسوب کیا گیا ہے کہ کچھ لوگ تھے جو یہودیوں سے ملے اور پوچھا کہ تمہارے دین کی نوعیت کیا ہے۔ جواب دیا گیا کہ ہمارے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام ہیں، جن کی کتاب توراۃ ہے، اس کتاب میں فلاں فلاں باتوں کا حکم دیا گیا ہے اور فلاں فلاں چیزوں سے منع کیا گیا ہے، جو ہمارا ساتھ دے گا وہی جنت میں داخل ہوگا۔ پھر وہ عیسائیوں کے پاس آئے اور پوچھا، جس کا جواب دیا گیا کہ ہمارے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور ان کی کتاب انجیل ہے جو ہماری پیروی کرے گا وہی جنت میں ہوگا۔ صابیوں نے دونوں قوموں کی ان باتوں کو سن کر کہا کہ ان جھگڑوں میں کون پڑے ہم کسی مذہب کو نہیں مانتے۔(۹)

الغرض یہی یا اسی کے قریب قریب مختلف اقوال لوگوں کی طرف تفسیر کی کتابوں میں منسوب کیے گئے ہیں۔ حاصل جن کا یہی ہوسکتا ہے کہ حضرت نوح جو گویا اوّل الانبیاء تھے، ان کی طرف منسوب کر کے دنیا کی امتوں میں قدیم ترین امت صابیوں کے ٹھہرانے والے جہاں ملتے ہیں، وہیں ان ہی مفسرین میں ایسے حضرات بھی ہیں جو یہودیوں اور عیسائیوں کے بعد نئی تازہ امت ان کو قرار دیتے ہیں۔

Marfat.com

اس میں شک نہیں جیسا کہ تاریخ کی کتابوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نام کی ایک قوم عراق کے نواح میں پائی جاتی تھی۔ ابوالزناد نے کوثی نامی آبادی میں ان کا جو پتہ دیا ہے اس سے وہی مراد ہیں۔ مسعودی نے بھی مروج الذہب میں لکھا ہے کہ ایک گروہ اسی صابئین کے نام کا عراق کے نواح میں پایا جاتا ہے اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:

''و دیارھم فی بلاد واسط والبصرۃ من ارض العراق نحو البطائع والآجام''(۱۰)

''ان لوگوں کی بستیاں واسط اور بصرہ میں عراق کے اس حصہ میں پائی جاتی ہیں جن میں بطائح (دل دل) اور جنگل ہیں''

لیکن اسی کے ساتھ المسعودی نے یہ اطلاع بھی دی ہے اور اس کی یہی خبر مستحق توجہ ہے یعنی عراق کے صائبیوں کا ذکر کر کے اس نے لکھا ہے:

''و ھذا النوع من الصابئۃ مبائنون للحرانیین فی نحلتھم''(۱۱)

''عراق والے صابی اپنے نحلہ و دین دھرم میں حرانی صابیوں سے الگ ہیں''۔

المسعودی کے ان الفاظ کا صحیح مطلب کیا ہے؟ اس پر تو آگے بحث کی جائے گی، سردست ان سے اجمالی نتیجہ جو پیدا ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ المسعودی کے علم کے مطابق صابیوں کی ایک قوم تو وہ ہے جو عراق کے نواح میں پائی جاتی تھی اور یہ کہ ان عراقی صابیوں کا نحلہ (یعنی کیش یا زندگی کے جس طریقہ کا اپنا دھن انہوں نے بنالیا تھا) ان کا نحلہ دوسرے صابیوں سے بالکل جدا تھا۔

بظاہر خیال یہی ہوتا ہے کہ ان ہی عراقی صابیوں کے متعلق سنی سنائی باتیں، ہمارے مفسرین تک پہنچی ہیں جن کو جو کچھ بھی اس سلسلہ میں معلوم ہوا اسی کو انہوں نے اپنی کتابوں میں درج کر دیا۔

Marfat.com

لیکن جیسا کہ المسعودی نے لکھا ہے عراق کے صابی بھی گو صابی ہی کہلاتے تھے مگر دوسرے صابیوں اور ان میں نام ہی کا صرف اشتراک تھا، ایسا کیوں ہوا! کوئی معین قابل اعتماد جواب تو اس کا مشکل ہے لیکن عراق کے جن حصوں میں وہ آباد تھے۔ یعنی ''بطائح اور آجام'' جس کی حقیقت گویا وہی ہے جو ہمارے وطن میں بڑے بڑے دریا کے متصل علاقوں کی ہوتی ہے جن میں عموماً دلدل اور جھاڑیاں پیدا ہو جاتی ہیں، مرطوب اور نمناک ہونے کی وجہ سے ملیرس مقامات بن جاتے ہیں۔

ملیریا بخار کا ترجمہ اسی لیے جدید عربی طب میں ''آجامی بخار'' یا ''حمی آجامیہ'' کیا گیا ہے۔ ایرانی امراء جو عراق پر قابض تھے انہوں نے معلوم ہوتا ہے غریب صابیوں کو ان ہی علاقوں کی طرف ہنکا دیا تھا اور وہیں بسنے پر ان کو مجبور کیا تھا۔ انتہائی غربت وافلاس کی زندگی ان ہی بطائح اور آجام میں بسر کرتے تھے۔(ب)

ایسی حالت میں ان پر جو بھی گذری، گذرنا ہی چاہیے تھا، اپنے موروثی دین، آبائی تہذیب سے ان کا تعلق ایسی صورت میں اگر باقی نہ رہا تو خود سوچیے کہ جو افتاد ان پر پڑی تھی، اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

خدا ہی جانتا ہے کہ ان غریب صابیوں کی کتنی پشتیں دجلہ وفرات کے ان ملیرس علاقوں میں گذری تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ عراق جب ایرانی امراء کے پنجۂ استبداد سے آزاد ہوا، تو دوسروں کے ساتھ ان صابیوں کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ سانس لینے کا کچھ موقع ملا۔ خصوصاً بغداد کو عباسیوں نے جب اپنا پایۂ تخت بنایا تو ایک سے زیادہ امراء عباسی دربار کے ایسے نظر آتے ہیں، جن کے نام کے ساتھ صابی کا لفظ لکھا جاتا ہے جن میں ثابت بن قرہ اور اس کے خاندان کے لوگ خاص طور پر مشہور ہوئے لیکن عباسیوں کے عہد کے صابی امراء کے خاندان کا بانی بھی ثابت جیسا کہ کتابوں میں

Marfat.com

لکھا ہے کہ ابتدا میں ایک معمولی صراف تھا، محمد بن موسیٰ منجم اور فلسفی نے اس کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا اور علاوہ عام فلسفہ وحکمت کی کتابوں کے طب کی تعلیم بھی ثابت نے حاصل کی۔ معتضد باللہ عباسی خلیفہ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور اسی نے آگے بڑھنے کے مواقع دیئے، جس کی تفصیل کتابوں میں پڑھنی چاہیے۔

لیکن علم وفضل کے بعد بھی ان صابیوں کو اپنے آبائی دین کے متعلق بس اسی قدر معلوم تھا، جتنا دجلہ وفرات کے آجام و بطائح میں رہنے والے جانتے تھے، یا جان سکتے تھے۔ البتہ ثابت کا جونسب نامہ ہمارے ہاں کتابوں میں نقل کیا جاتا ہے اس میں لکھتے ہیں کہ ادریس پیغمبر علیہ السلام کے ایک صاحبزادے جن کا نام طاط تھا، وہی ''صاب'' کے لقب سے ملقب تھے ابن ابی اصیبعہ میں ہے:

''الصابئیون نسبتهم الی صاب و هو طاط ابن النبی ادریس علیه السلام''(۱۲)

''صابی لوگوں کی نسبت صاب کی طرف ہے جو ادریس علیہ السلام کے صاحبزادے طاط کا نام تھا''

خدا جانے اس کی اصلیت کیا ہے، ممکن ہے کہ عباسی دربار میں امتیاز حاصل ہونے کے بعد یہ بات بنائی گئی ہو۔ لیکن اگر کچھ بھی اس دعویٰ کا واقعہ سے تعلق ہے تو پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ عراق کے صابی مذہباً نہیں بلکہ نسلاً صابی تھے۔ اور اسی لیے ان صابئیوں سے وہ الگ تھے، جو دین صابئہ کے ماننے والے تھے، لیکن عراقی صابئیوں کا جو حال بیان کیا جاتا ہے اس سے اس احتمال کی تائید مشکل ہی سے ہوسکتی ہے۔ عام طور پر بیان کرنے والے جس طریقہ سے عراقی صابیوں کا تذکرہ کرتے ہیں اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسلی نہیں بلکہ ایک دینی جتھے کی تعبیر ہے۔

بہرحال مذہب اور مذہبی امتوں کی بوقلمونیوں کے جو قصے کتابوں میں نقل

Marfat.com

کیے گئے ہیں بلکہ آج بھی اس سلسلہ میں عینی مشاہدات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس پر بالکل تعجب نہیں ہوتا کہ عراق کے صابیوں کی دینی زندگی دوسرے صابیوں سے اس حد تک مختلف ہو چکی تھی کہ نام کے سوا ان دونوں میں کوئی چیز مشترک باقی نہ رہی تھی، آخر آج آپ سے کوئی کہے کہ:

''ہندوستان میں ایک فرقہ ایسا بھی پایا جاتا تھا جس کی دینی زندگی اور مذہبی کاروبار کے نمایاں عناصر یہ تھے کہ جو مر چکے ہیں ان ہی کے ہاتھ تعلقات کو تازہ رکھنا اپنا سب سے بڑا مذہبی فرض خیال کرتے تھے۔ ان کی ہر آبادی میں ایک مرکزی قبر پائی جاتی تھی، زندگی کے مشکلات اور عام حاجتوں میں آبادی کی اسی قبر یادگار کی طرف رجوع ہونا، خوشی اور غم ہر موقعہ پر درگاہ کی حاضری، شادی کے موقعہ پر دولہا اور دلہن کی سواریوں کو درگاہ پر لیجانا، سال بھر میں اسی دن جس دن صاحب قبر کی وفات ہوئی، خوشی منانا، ڈھول، باجوں کے ساتھ جلوس نکالنا، قبر کو غسل دینے کے لیے خاص اہتمام کے ساتھ ممتاز ہستیوں کا سروں پر پانی لانا، صندل مالی کے بعد پانی کو قبر پر بہا کر اپنے ہاتھوں بلکہ اپنی پیٹھوں سے قبر کو دھونا، غسل کے بعد ہر سال اسی مرکزی قبر پر قیمتی سے قیمتی چادروں کا چڑھانا، عطر اور طرح طرح کی خوشبو میں ان چادروں کا بسانا اور قبر کے سامنے دھونی دینا آبادی کے افراد کا قبر پر اپنی اپنی حیثیت سے نذریں چڑھانا، یہ اور اسی قسم کے قبری کاروبار ہی ان لوگوں کا دین اور دھرم تھا''۔

قبری کاروبار کے اسی سلسلہ میں ہر سال ایک غیر معمولی تقریب شہروں اور قصبوں ہی میں نہیں بلکہ ان کے ہر ہر گاؤں میں اسی طرح بھی منائی جاتی تھی کہ بجائے قبر کے دو بزرگوں کی قبروں کا نمونہ کاغذ اور بانس کی ٹھٹھریوں سے بنایا جاتا تھا

66991
GIFT BOOK

Marfat.com

اور قبر کے اس نمونہ کو بہترین لباس پہنائے جاتے تھے۔ سہرا بھی قبر کے اس نمونہ کے سر پر باندھا جاتا تھا، پھر آبادی کے مقررہ مقام سے مٹی لاکر دو قبریں ایسی بنائی جاتی تھیں، گویا لاشوں کے وہ نمونے ہیں، قبر کے نمونوں میں لاشوں کے ان خاکی نمونوں کو دفن کر کے پھر ساری آبادی میں گھوڑوں، ہاتھیوں، اونٹوں وغیرہ کے جلو میں سواری نکالی جاتی تھی۔ نقارے، شہنائیاں، بگل، قرنار، بوق، الغرض دنیا بھر کے باجوں کے ساتھ گشت کراتے ہوئے اسی مقام پر لوگ پہنچتے تھے، جہاں کی مٹی سے لاشوں کے نمونے بنائے گئے تھے اور اسی مقام میں ان خاکی لاشوں کو دفن کر دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں ہر آبادی کے قبری نمونہ کے مقابلہ میں دوسری آبادی کے قبری نمونہ سے ہوتا تھا۔ دونوں طرف سے مقابلہ میں کافی جوش وخروش کا اظہار کیا جاتا تھا۔ بعض دفعہ خونریزی کی نوبت بھی قبری نمونوں کے مقابلہ میں کافی آ جاتی تھی۔ ہر بستی کے باشندے اپنی ضرورتیں کاغذ اور بانس کی ٹھٹھریوں کے ان ہی قبری نمونوں پر پیش کر کے یقین کر لیتے تھے کہ جو کچھ ہمیں مانگنا تھا، مانگ لیا اور ہماری ساری مرادیں سال بھر تک پوری ہوتی رہیں گی۔ جو اولاد سے محروم ہوتے سمجھتے تھے کہ ان کو اولاد عطا ہوگئی اور جو روزی مانگتے تھے، خیال کر لیتے تھے کہ رزق کی ضمانت ان کو مل گئی۔ ان قبری نمونوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے کے بعد جو بچے پیدا ہوتے تھے، ان کو ہر سال خاص قسم کا لباس پہنایا جاتا تھا۔ کمر میں ان کی زنجیر باندھی جاتی تھی، مور کے پر بھی سروں پر لگائے جاتے تھے اور ایک گاؤں کے قبری نمونے کے گرد طواف کر کے دوسرے گاؤں، دوسرے سے تیسرے گاؤں تک طواف کرنے کے لیے وہی دوڑے پھرتے تھے۔ شربت کی مشکیں بھی ان بچوں پر لادی جاتی تھیں اور تقریب میں شریک ہونے والوں کو وہ شربت پلاتے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں خاص قسم کے کھانے گھروں میں پکتے تھے۔ کپڑوں کو بھی خاص قسم کے رنگ میں

Marfat.com

رنگتے تھے۔

اپنی حکومت کے زوال وانحطاط کے زمانہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت کی دینی زندگی پر جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں یہی رنگ جو غالب تھا اس کو دیکھ کر دیکھنے والا مذکورۂ بالا الفاظ میں مسلمانوں کی خصوصیتوں کو اگر بیان کرے تو بتایا جائے کہ غلط بیانی یا جہل کے الزام کو اس کی طرف عائد کرنا کسی حیثیت سے بھی صحیح ہوسکتا ہے۔

پھر جن لوگوں کے سامنے صابیوں کے وہی نمونے پیش ہوئے جو ایرانیوں کی غلامی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے عراق کے بطائح و آجام میں جہل و وحشت کی زندگی گذار رہے تھے جن غریبوں کی اخلاقی زبوں حالیاں اس حد تک پہنچی ہوئی تھیں کہ عباسیوں کے عہد میں ان کو صرف لکھنے پڑھنے ہی کے مواقع میسر نہ تھے، بلکہ کتابوں میں پڑھیے ان میں بڑے بڑے مصنفین، فلاسفہ، مہندسین، اطباء، مسلسل پیدا ہو رہے تھے، ان ہی صابیوں میں بعضوں کا اقتدار اس درجہ تک پہنچ گیا تھا کہ عباسی خلیفہ معتضد باللہ کے متعلق لکھا ہے کہ:

''کان یجلس بحضرته فی کل وقت ویحادثه طویلا و یضاحکه ویقبل علیه دون وزرائه و خاصته'' (۱۳)

''اس کی مجلس میں وہی صابی شریک رہتا تھا جو خلیفہ سے باتیں کرتا، ہنستا، بولتا اور وزراء کے مقابلہ میں خلیفہ اسی کی طرف متوجہ ہوتا''۔

مگر باوجود ان تمام باتوں کے خود ایک عراقی صابی کا بیان ہے کہ جس کو میں بجنسہ اس کے الفاظ کے ساتھ القفطی کی تاریخ سے نقل کر دیتا ہوں:

''و لهولاء الصابئة من سوء الاخلاق و معاداة الاهل بعضهم بعضا ما لا یکون علیه احد غیرهم حتی لا یری منهم اثنان متفقین و لا

مجتمعین بل یسعیٰ بعضهم فی بعض و یقبح کل واحد علی الآخر بکل ما یجد الیه السبیل "(۱۴)

"اخلاقی خرابیوں اور باہمی بغض وعداوت میں ان صابیوں کا یہ حال ہے کہ ان کے سوا یہ حال کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا، ان میں دو آدمی بھی کبھی متفق اور میل ملاپ کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ بلکہ ہر ایک دوسرے کے مقابلہ میں مخالفانہ کوششوں میں سرگرم رہتا ہے اور جہاں تک ممکن ہے ایک دوسرے کی برائی اور عیب چینی کے درپے رہتے ہے کوئی دقیقہ اس راہ میں اٹھا نہیں رکھتا"۔

یہ بیان اس شخص کا ہے جو صابیوں کے اسی خاندان کا ایک رکن تھا جسے عباسی عہد میں غیر معمولی عروج و اقبال حاصل ہوا تھا، اس کا نام ابوالفضل تھا۔ مثلاً اس نے اپنے حقیقی بھائی ابوالحسن الصابی کے طرز عمل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں ایک مہلک مرض میں مبتلا ہوا، بھائی سے میری صفائی نہ تھی، نہ وہ مجھ سے ملتے تھے اور نہ میں ان سے لیکن اپنے مرض کی تکلیف سے مجبور ہو کر ان کو خط لکھا اور لجاجت کے ساتھ عرض کیا کہ مجھے آکر دیکھ جایئے۔ اور میرا علاج کیجیے۔ میرے اس خط کو پاکر وہ آتو گئے اور علاج بھی کیا لیکن جب میری حالت کچھ سنبھلی تو وہ چلے گئے، تندرست ہونے کے بعد میں لاٹھی ٹیکتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ایک دن ان کے گھر پہنچا۔ ایک دریچے سے ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی، پکار کر بولے کہ:

"ابوالفضل تم الٹے پاؤں واپس ہو جاؤ، میرا دل تم سے صاف نہیں ہوا ہے اور جیسے تعلقات تم سے منقطع تھے، آئندہ بھی منقطع ہی رہیں گے"۔ (۱۵)

یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد ابوالفضل لکھتا ہے کہ اس بے رحم آدمی کے اس برتاؤ کو دیکھ کر میرا دل ٹوٹ گیا اور میں ملے بغیر واپس چلا آیا۔

Marfat.com

''و ما دخل الی ولا دخلت الیه مدة حیاته'' (۱۶)

''پھر نہ زندگی بھر میں ہی ان کے یہاں اور نہ وہی میرے یہاں آئے''

علم و فضل کے بعد جن کی یہ اخلاقی حالت تھی تو اندازہ کرنا چاہیے کہ جہل و وحشت کے زمانہ میں وہ کیا ہوں گے۔

یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے مفسرین بے چارے ان صابیوں کے متعلق کسی خاص نتیجہ تک نہ پہنچ سکے۔ بظاہر خیال گذرتا ہے کہ عراق کے قدیم باشندے کلدانیوں، یا کسدانیوں کی صحبت میں ستارہ پرستی، اور آفتاب و ماہتاب کی مورتیوں کی پوجا کا رواج ان میں ہو چکا تھا۔ پھر جب یہودیوں اور عیسائی مذہب کے راہبوں کی آمد و رفت اسلام سے پہلے عراق میں شروع ہوئی تو عیسوی دین کی بھی کچھ چیزیں ان کی دینی زندگی میں شریک ہوگئیں۔ مثلاً وہ داؤد علیہ السلام کے زبور کی تلاوت کیا کرتے تھے جو بظاہر عیسائیوں یا یہودیوں کے میل جول کا نتیجہ تھا اور اہلِ کتاب ہی کی صحبت میں غالباً وہ حضرت نوحؑ، حضرت ادریسؑ اور دوسرے انبیاء کے ناموں سے واقف ہوئے۔ جب ان سے کوئی پوچھتا تو کبھی اپنے آپ کو حضرت نوحؑ کی اور کبھی حضرت ادریسؑ کی یادگار قرار دیتے۔ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے بعضوں نے باضابطہ عیسائی یا اہلِ کتاب کا دین قبول کرلیا تھا، آئندہ بھی اس کا ذکر آئے گا۔

بہرحال میرا خیال ہے کہ اربابِ تفسیر تک ان کے متعلق اسی قسم کی روایتیں مختلف ذرائع سے پہنچتی ہیں اور ان ہی کو وہ کتابوں میں درج کرتے چلے گئے۔

مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ عراق کے یہ صابی جن کی حیثیت ایک مقامی فرقے سے زیادہ نہ تھی، ان کی تعداد جیسا کہ بعضوں نے لکھا ہے کہ ترکوں کے زمانہ تک چند لاکھ سے آگے نہ بڑھ سکی تھی (ج)۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں

Marfat.com

نے عراق میں جس زمانہ میں ان کو پایا ہوگا، شاید چند ہزار سے زیادہ نہ رہے ہوں گے۔ اور قرآن جس وقت نازل ہو رہا تھا اس وقت ان کی تعداد اور بھی کم اور نا قابلِ لحاظ ہی رہی ہوگی۔ ایسی حالت میں کسی صورت میں بھی دنیا کی عالمگیر دینی امتوں یا غیر معمولی شہرت رکھنے والی مذہبی قوموں یعنی یہود و نصاریٰ اور مجوس کے ساتھ ایسے حقیر فرقے یعنی صابیوں کے قرآن میں تذکرہ کی جو عراق کے سیتانوں میں غربت و افلاس، وحشت و بربریت کی زندگی گذار رہا تھا، آخر کیا وجہ ہو سکتی تھی اور اگر قرآن بڑے چھوٹے ہر قسم کے دینی فرقوں ہی کا ذکر کرنا چاہتا تھا تو دنیا کے ہر حصہ میں بیشمار دینی فرقے اور مذہبی جتھے پائے جاتے تھے۔

ان سب سے قطع نظر کر کے صرف عراق کے اس مجہول اور غیر معروف فرقہ کے انتخاب کی کوئی وجہ تو ہو سکتی تھی، اس قسم کی مقامی مذہبی ٹولیوں سے تو دنیا بھری ہوئی تھی اس لیے اگر ان عراقی صابیوں کو قرآن کے صابئین کا مصداق نہ قرار دیا جائے تو وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر قرآن کے ان ''الصابئین'' کو ہم کہاں ڈھونڈیں۔

آیئے، جو مواد اور معلومات اس سلسلہ میں اب تک فراہم ہوئے ہیں اسے پیش کیے دیتا ہوں ممکن ہے اس سے کسی نتیجہ تک پہنچنے میں کچھ مدد ملے۔

اس سلسلہ میں پہلی اطلاع اسی المسعودی کی ہے جس نے لکھا ہے کہ عراق کے صابیوں کا نحلہ (دین، دھرم) دوسرے صابیوں سے مختلف ہے۔ اپنی کتاب مروج الذہب میں ایک مقام پر اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''ہندوستان اور چین کے اکثر باشندوں کا خیال تھا کہ خالق کائنات خود بھی ایک جسمانی وجود ہے، اور فرشتے (ملائکہ) بھی جسمانی ہیکل رکھنے والی ہستیاں ہیں۔ خدا اور اس کے فرشتے پر ان کا اعتقاد تھا کہ آسمانوں میں چھپے

Marfat.com

ہوئے ہیں، اسی اعتقاد اور خیال نے ان کو اس پر آمادہ کیا کہ خدا خالق کائنات اور اس کے فرشتوں کی مورتیاں تراشیں، انہوں نے خدا کی بھی مورت ڈھالی، اور فرشتوں کی بھی۔ ان کی مورتیاں، مختلف شکل وصورت اور قد کی بنائی گئی تھیں، جن میں بعضوں کی صورت تو انسانوں کی اور بعضوں کی شکلیں غیر انسانی تھیں۔ ان مورتیوں کے لیے قربانیوں کے مختلف طریقے اختیار کیے گئے اور خاص خاص قسم کی نذریں ان کے لیے مقرر کی گئیں'' (۱۷)

اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ ان مورتوں کے بعد آفتاب و ماہتاب، ستاروں اور سیاروں کی پرستش کا رواج بھی ان میں ہوا اور ان کی بھی مورتیاں بنائی گئیں اور ہر مورتی کے لیے خاص خاص قسم کے ہیکل یعنی مندر اور دیول تعمیر کیے گئے جن کا نام ان ہی ستاروں کے نام پر رکھا گیا۔ یہ اور اسی قسم کی تفصیلات کے بعد المسعودی نے بیان کیا ہے، اس کا پیش کرنا مقصود ہے:

''فلم یزالوا علی ذلک حتی ظهر بوذاسف بارض الهند، و کان هندیا'' (۱۸)

''ہندوستان وچین کے باشندے ان ہی حالات میں تھے کہ سرزمین ہند میں ایک شخص بوذاسف نامی ظاہر ہوا جو خود ہندوستانی تھا''۔

اس کے بعد یہ لکھ کر کہ ہندوستان کے سوا بوذاسف کا اثر سندھ، کلیسان، زابلستان، کرمان وغیرہ وغیرہ تک کیسے پہنچا، یہ بھی اطلاع دیتا ہے کہ:

''و زعم انه رسول الله و انه واسطة بین الله و بین خلقه'' (۱۹)

''بوذاسف نے دعویٰ کیا کہ وہ اللہ کا رسول ہے، خدا اور اس کے بندوں کے درمیان وہ واسطہ ہے''

پھر اس قسم کی باتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ

Marfat.com

ہندوستان کا یہ بوذاسف ایرانی بادشاہ طہمورث کے زمانہ میں پیدا ہوا، اور بعض کہتے ہیں کہ جمشید کے عہد میں ظاہر ہوا۔ آخر میں اس واقعہ کا انکشاف کرتا ہے کہ:

"و هو اول من اظهر مذهب الصابئة" (۲۰)

"بوذاسف ہی پہلا آدمی ہے جس نے پہلی دفعہ صابئہ کے دین کو ظاہر کیا"

بوذاسف کے دین کی اصل روح المسعودی نے ان الفاظ میں درج کی ہے:

"كان بوذاسف امر الناس بالزهد في هذا العالم و الاشتغال بما علا من العوالم اذ كان من هنالک بدء النفوس و اليها يقع الصدر من هذا العالم" (۲۱)

"بوذاسف لوگوں کو زہد یعنی (دنیا سے بقدر ضرورت استفادہ) کا حکم دیتا تھا اور یہ کہ اپنی توجہ کو لوگ برتر و بالا جہانوں کی طرف مرکوز رکھیں، کیونکہ عالمِ بالا ہی سے جانوں کا آغاز ہوا اور پھر پلٹ کر اسی عالمِ بالا کی طرف لوگ جائیں گے"۔

وہ لوگ جو اس سے واقف ہیں کہ بوذاسف بودھا کے لفظ کا عربی تلفظ ہے، عربی کتابوں میں بودھا کا ذکر بوذاسف کی شکل میں کیا جاتا ہے۔ وہ المسعودی کی اس اطلاع کا مطلب بھی سمجھ سکتے ہیں اور یہی ان کو سمجھنا چاہیے کہ بودھا نے جس دین اور دھرم کی دعوت دی تھی اسی دین کے ماننے والوں کو صابئہ کہتے ہیں۔

چونکہ المسعودی نے براہِ راست ہندوستان کی سیر کی ہے اپنی اسی کتاب مروج الذہب میں متعدد مقامات پر اس نے اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مثلاً ایک موقعہ پر اس نے لکھا ہے کہ:

"ولقد حضرت بلاد صيمور من بلاد الهند و ذلک في سنة اربع و ثلثمائة" (۲۲)

"میں ہندوستان کے علاقہ صیمور میں ۳۰۴ھ کو حاضر ہوا"

اس کو اس ملک کے عوام و خواص بلکہ حکمرانوں سے بھی ملنے جلنے کے کافی مواقع حاصل ہوئے ہیں اس لیے بودھا کی صحیح تعلیم کو درج کر کے اس نے انقلابات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن کا بودھ مذہب بعد کو شکار ہوتا رہا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ بوذاسف یعنی مہاتما بدھ کے بعد بدھ متی کے ماننے والوں کے متعلق کتابوں میں اس قسم کی خبریں جو دی گئی ہیں کہ:

''مہاتما بدھ کو معبود مان کر ان کی عبادت کی تعلیم دی جانے لگی اور مورتیاں بننے لگیں پھر ۲۴ ماضی، ۲۴ حال اور ۲۴ مستقبل کے بعد بدھوں کی تخلیق کی گئی' اتنا ہی نہیں، بودھی ستووں اور بے شمار دیویوں کو بھی وجود میں لایا گیا اور سیاہی کی مورتیں بننے لگیں''۔ (۲۳)

بدھ متی کے ان انقلابی اور تحریفی پہلوؤں سے بھی المسعودی واقف نہیں ہے اس نے لکھا ہے:

''مورتیوں کی پوجا کا طریقہ بھی ان میں جاری ہوا اس سلسلہ میں مختلف حیلوں اور مخفی تدبیروں سے کام لیا گیا'' (د)۔ (۲۴)

بدھ متی پر بعد کو جو گذری وہ میری بحث کا موضوع نہیں ہے۔ بلکہ کہنا یہ ہے کہ بودھا یا بوذاسف کے ماننے والوں کو صابئہ کہتے تھے اس کا ذکر المسعودی نے علاوہ مذکورۂ بالا مقام کے اسی کتاب میں دوسری جگہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''ابو ذاسف احدث مذاهب الصابئة'' (۲۵)

''صابئہ کے مذاہب یعنی دینی خیالات کو ابوذاسف ہی نے پیدا کیا''

اور المسعودی تو خیر ہندوستان کا صرف سیاح ہے۔ یہاں کی علمی زبانوں، یعنی سنسکرت یا پالی وغیرہ سے بھی آشنا تھا، مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ لیکن ابوریحان بیرونی کو کون نہیں جانتا کہ ہندی زبانوں اور ہندی علوم و معارف کا اپنے وقت ہی

میں نہیں بلکہ شاید آج تک مستند ترین ماہر مانا جاتا ہے۔ اپنی مشہور کتاب الآثار الباقیہ میں اس نے جو کچھ لکھا ہے، میں بجنسہٖ اس کے الفاظ نقل کر دیتا ہوں:

''بوذاسف قد ظهر عند مضى سنة من ملك طهمورث بارض الهند و اتى بالكتابة الفارسية و دعا الى ملة الصابئين فاتبعه خلق كثير و بقايا هم الآن بالهند و الصين التغرغر ويسميهم اهل خراسان بشمنان و آثارهم و بهارات اصنامهم و فرخاراتهم ظاهرة فى الثغور خراسان المتصلة بالهند'' (۲۶)

''بوذاسف (یعنی بودھا) شاہ طہمورث (ایرانی) کے ایک سال بعد سرزمینِ ہند میں ظاہر ہوا اور فارسی حروف کو اس نے رواج دیا اسی نے الصابئین کی ملت کی طرف لوگوں کو دعوت دی، بہت بڑی خلقت اس کی پیرو ہوگئی، جن کا بقایا (نام لیوا) آج تک ہندوستان اور چین، تغزغر، (ترکی قبائل) میں پائے جاتے ہیں اور خراسان کے لوگ ان کو ''شمنان'' کہتے ہیں۔ ابوذاسف کے ان ماننے والوں کے آثار اور ان کی مورتیوں اور فرخارات (یعنی پیکروں) کے بھارات خراسان کے ان حصوں میں جو ہندوستان سے متصل ہیں، عام طور پر پائے جاتے ہیں''۔

البیرونی نے جس تفصیل سے کام لیا ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم قطعی طور پر اسی نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ الصابئین کی ملت کا داعی البیرونی کے نزدیک بھی بوذاسف یعنی بدھا تھا، بھارت کا لفظ بہار کے لفظ کی جمع ہے اور یہ معلوم ہے کہ بودھ مذہب کے دینی مراکز کی تعبیر بہار سے کی جاتی تھی۔ بہار کے صوبہ میں بودھ مذہب کے دینی مرکزوں کی کثرت تھی۔ اس لیے اس صوبہ کا نام ہی بہار ہوگیا۔ بلکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ وسط ایشیا کا شہر بخارا اور دراصل بہار ہی کے لفظ کی ایک شکل

Marfat.com

ہے ایک زمانہ میں خراسان کا یہی شہر بودھوں کا مرکز تھا، بلخ کا نوبہار تو مسلمانوں کی آمد تک موجود تھا۔ عباسی دربار کے برمکی وزراء کا نسبی تعلق بلخ ہی کے اسی نوبہار کے پرکھوں سے تھا، پرکھ کا لفظ عربی میں برمک بن گیا۔

اصنام کے ساتھ فرخارات کا لفظ ظاہر ہے کہ فارسی کے لفظ پیکر کی عربی شکل ہے۔ باقی البیرونی کی یہ اطلاع کہ بوذاسف نے فارسی کتابت کے طریقہ کو اختیار کیا۔ چونکہ قدیم ایرانی حروف سے بھی میں ناواقف ہوں اور پالی زبان کے حروف سے بھی ناآشنا ہوں اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ البیرونی کا صحیح مطلب کیا ہے۔ (ہ)

عام طور پر ہماری کلامی کتابوں میں ''سمینہ'' کا لفظ مستعمل ہے، جس کی متعلق یہ سمجھا دیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستانی مفکرین کے کسی خاص گروہ کی تعبیر ہے لیکن البیرونی کے اس بیان سے کہ خراسان میں بوڈھسٹوں کو یعنی بوذاسف کے پیروؤں کو ''شمنان'' کہتے تھے۔ اب یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ''سمینہ'' اسی ''شمنان'' کی نسبت سے بنالیا گیا تھا۔ جس سے مراد بدھ متی کے لوگ تھے اور بھی بہت سے جدید انکشافات بیرونی کی اس اطلاع سے حاصل ہوتے ہیں جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ میری غرض صرف یہ ہے کہ ''الصابئین'' بودھا کے ماننے والوں کا نام ہے۔ المسعودی کے سوا ابوریحان بیرونی جیسے ماہر ہندیات کی علمی شہادت بھی یہی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مورخین کی یہ تاریخی تحقیق کہ ''الصابئہ'' جن کا قرآن میں یہود و نصاریٰ جیسی عالمگیر امتوں کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، یہ مہاتما بدھ کے ماننے والے بدھسٹوں کی تعبیر ہے جو دینی علوم کی خدمت کرنے والے علماء اور مفسرین تک شاید نہ پہنچ سکی اور عراق کے آجام اور بطائح میں جو صابئہ پائے جاتے تھے، انہی کے متعلق جو تھوڑے بہت معلومات ان تک مختلف ذرائع سے پہنچتے رہے ان ہی پر ہمارے بزرگوں نے قناعت کر لی۔ لیکن دینی علماء کے سواء ہمارے یہاں

تعلیم یافتہ مفکرین کا جو طبقہ تھا وہ اسلامی مورخین کی مذکورۂ بالا تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ واقف تھا اور مسلمانوں میں فلسفہ کی جو شاخ اشراقی فلسفہ کے نام سے موسوم ہے اسی فلسفہ کی کتاب شرح حکمۃ الاشراق میں بوذاسف یعنی بودھا کے متعلق لکھا ہے کہ:

''ھو الذی شرع دین الصابئۃ'' (۲۷)

''بوذاسف وہی ہے جس نے صابئہ کے دین کو جاری کیا''

اگرچہ اسی کے ساتھ ایک ایسا قول بھی اسی کتاب میں درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عراقی صابئوں کو دیکھ کر بعض لوگ بوذاسف یعنی بودھا کے متعلق اس مغالطہ میں مبتلا ہو گئے کہ وہ ہندوستان کا نہیں بلکہ کالڈیا کا رہنے والا تھا اور کالڈیا والے جو کسدانیوں کے نام سے موسوم تھے ان کی ستارہ پرستی وغیرہ کے طریقہ کا موجد وہی تھا، اسی نے تاریخ کے سنین متعین کیے اور دنیا کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا۔

غرض جس طرح عراقی صابیوں کی وجہ سے ہمارے مفسرین ''الصابئین'' سے بوذاسف کے رشتہ کا پتہ نہ چلا سکے۔ اسی طرح عراق کے ان ہی صابیوں کو دیکھ کر اور یہ معلوم کر کے کہ ''الصابئین'' بوذاسف کے پیروؤں کا نام ہے۔ ہمارے اربابِ فکر ونظر کا ایک گروہ اس مغالطہ کا شکار ہو گیا کہ بودھا ہندوستان میں نہیں بلکہ عراق ہی میں پیدا ہوا تھا اور وہیں اپنے دین کو اس نے جاری کیا اور اسی قسم کے دوسرے مسائل بھی عراقی صابیوں (و) کے خاص حالات نے پیدا کر دیئے تھے، جن کی تفصیل کی اس مختصر مقالہ میں گنجائش نہیں ہے۔ ہاں آخر میں قابل ذکر اور لائق توجہ یہ سوال رہ جاتا ہے کہ الصائبین اگر مہاتما بدھ کے ماننے والوں کی تعبیر ہے تو یہ سوال ہوسکتا ہے کہ بودھ کے ماننے والوں کے ''الصابئین'' کے نام سے موسوم ہونے کی وجہ کیا تھی اور عرب واطرافِ عرب میں اس نام سے وہ کیوں مشہور ہوئے اور یہ کہ اہلِ مکہ ''اسلامی دین'' کے قبول کرنے والوں بلکہ خود داعی اسلام علیہ السلام پر

یہودی عیسائی یا مجوسی ہو جانے کے صابی ہو جانے کا الزام کیوں لگاتے تھے۔

برسوں سے اس مسئلہ پر غور و فکر کرنے کے باوجود میں کسی اطمینان بخش نتیجے تک نہیں پہنچ سکا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ جن سے عرب اچھی طرح واقف تھے اور جن کی کافی تعداد عرب میں پائی جاتی تھی۔ اسلام جو اس کا مدعی ہے کہ سارے مذاہب و ادیان جو خدا کی طرف سے بنی آدم کو عطا ہوئے، قرآن ان خدائی قانونوں اور قدرتی آئین کی آخری شکل ہے، ان ساری آسمانی کتابوں کا آخری ایڈیشن ہے۔ اسی لیے مطالبہ کیا گیا ہے کہ جس کسی کے پاس بھی دین یا مذہب جس شکل میں بھی اپنے باپ دادوں سے پہنچتا ہو۔ اس کا فرض ہے کہ آسمانی کتاب کے اسی آخری ایڈیشن سے اس کی تصحیح کر لے۔

ان مذاہب و ادیان کے جن عناصر و اجزاء پر قرآن نے توثیقی و تصدیقی مہر ثبت کر دی ہے۔ سمجھنا چاہیے کہ بنی آدم کے قدرتی آئین کے وہی صحیح اجزاء ہیں ان کے سوا جو کچھ بھی جس دین میں ملے اسے قلم زد کر دینا چاہیے۔

اس لحاظ سے سب سے زیادہ تصدیقی تعلق قرآن کا اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ ہی کے دین سے تھا۔ اس لیے سوال یہ ہوتا ہے کہ اپنے انکار و کفر کی توجیہ اور عذر تراشی کے لیے عربوں کے لیے یہ زیادہ آسان تھا کہ وہ قرآنی تعلیمات پر یہ الزام لگا دیتے کہ وہ اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے دین سے ماخوذ ہیں جیسا کہ آج تک یہ جھوٹا الزام یورپ کے منکروں کی بڑی تعداد کی پناہ گاہ بنا ہوا ہے۔

لیکن اس کی بجائے اسلامی دین کے قبول کرنے والوں بلکہ خود داعی اسلام علیہ السلام پر صابی ہو جانے کا الزام قریشِ مکہ کیوں لگاتے تھے۔ جیسا کہ یورپ کے بعض مستشرقین مثلاً ڈوزی نے لکھا ہے کہ:

''ہندوستان سے بدھ مت کے مبلغوں کی ایک جماعت جہاں سیلون، برما،

چین گئی ، اسی طرح ایران ، اور مشرق قریب میں بھی اس مذہب کے منادی تبلیغی جدوجہد میں اسلام سے پہلے مشغول تھے''۔(۲۸)

اگر اس کو مان لیا جائے تو ظہورِ اسلام سے پہلے مشرق قریب میں جس میں عرب بھی شریک رہے ، بدھ مت کے مبلغوں کی تبلیغی جدوجہد کا دعویٰ ڈوزی صاحب کی کوئی دماغی اختراع ہے ، یا واقعی تاریخی وثائق کی روشنی میں وہ اس نتیجہ تک پہنچے ہیں۔

کچھ بھی ہو اگر ہم ان کے اس تاریخی اکتشاف کو تسلیم بھی کر لیں اور جیسا کہ عام طور پر اس زمانہ میں کہا جاتا ہے کہ بودھ مذہب کے لٹریچر کی تلاش و تحقیق سے لوگ اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ مہاتما بدھ کا دعویٰ تھا کہ جس دھرم کو وہ پیش کر رہے ہیں:

''یہ وسطی (درمیانی) راستہ ہے یعنی نہ تو عیش و عشرت میں محو رہنا چاہیے اور نہ فاقہ کشی ، شب بیداری اور دشوار عملیات سے روح کو ایذا پہنچانا چاہیے ، (ج) بلکہ ان دونوں کے بیچ میں رہنا لازم ہے''(۲۹)

اسی طرح پتہ چلایا گیا کہ بدھ کی تلقین یہ تھی کہ:

''دنیا اور اس کی سب ہی چیزیں فانی اور غم انگیز ہیں''(۳۰)

پس ایسی زندگی کو جو فانی نہیں ، بلکہ باقی ہو ، اور غم واندوہ کی آلائشوں سے پاک ہو کر صرف سکھ ہی سکھ بن جائے جو حاصل کرنا چاہتا ہے اس کو ''نروان'' کے شرائط کی تکمیل کرنا چاہیے ۔ کرنل اسکاٹ نے تھیاسوفیکل سوسائٹی میں جو لیکچر ''بدھ دھرم'' پر ۱۸۷۷ء میں دیا تھا اس میں اس کا اقرار کیا تھا کہ:

''بودھ دھرم مردہ ہو چکا تھا'' (۳۱)

مگر اسی مردہ دھرم کی دفن شدہ ہڈیوں کو الٹنے پلٹنے کے بعد ان پر ثابت ہوا تھا کہ منجملہ دوسری باتوں کے ''نروان'' کے لیے مہاتما بدھ کی طرف سے یہ مطالبہ

Marfat.com

پیش ہوا تھا کہ:

''قتل مت کرو، چوری مت کرو، ممنوعہ لذات سے پرہیز کرو، جھوٹ مت بولو، نشہ یا مست کرنے والے عرق یا اشیاء کا استعمال مت کرو (ط)''۔ (۳۲)

اگر فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ احتمال آفرینیوں کے انبار کے نیچے سے ڈھونڈھنے والوں کو بدھ دھرم میں درحقیقت یہ چیزیں ملی ہیں تو اسلام کی تصدیق وتوثیقی فہرست میں بدھ مذہب کے بھی بعض اجزاء شریک ہوجاتے ہیں اور دونوں میں مشابہت ومناسبت کا مسئلہ چنداں بعید از قیاس باقی نہیں رہتا۔

بلکہ ہمارے بعض علماء کے اس دعویٰ کا کہ'' تناسخ '' کا عقیدہ جن مختلف مذاہب میں پایا جاتا ہے ان میں ایک بوذاسف الہندی کا دین بھی ہے واقعی مطلب یہ تھا کہ:

''عرضهم هو اثبات المعاد الجسمانی فی النشآءة الاخرة علی وجه مفصل'' (۳۳)

''آخرت کی دوسری زندگی میں جسمانی طور پر واپسی ہوگی، اسی عقیدے کی تفصیل کا نام تناسخ ہے''

اس سے ان لوگوں کا مطلب یہ ہے کہ مذاہب وادیان کی باتوں میں فلسفہ کا رنگ بھر کر روحانی حشر ونشر کا جو عقیدہ پھیلا دیا گیا تھا اور جس کا کوئی صحیح مطلب ان لوگوں کو سمجھ میں نہیں آسکتا جو جسم اور بدن کے بغیر سکھ یا دکھ کے احساس کا تخیل بھی نہیں کرسکتے تھے اسی ''روحانی معاد'' کا مجہول نظریہ عموماً انکار آخرت کے ہم معنی بن جاتا تھا۔ اس خیال کی تردید اور اسی مغالطہ کے ازالہ کے لیے یہ سمجھایا گیا تھا کہ آئندہ زندگی میں جسمانی قالب ہی کے ساتھ لوگ اٹھیں گے۔ نیک کرداروں کو حسین وجمیل جسمانی قالب عطا ہوگی اور بدکرداروں کو ان کے برے اعمال کے

Marfat.com

مطابق بری صورتوں اور مسخ شدہ قالب میں زندہ کیا جائے گا۔

بہر حال ''تناسخ'' کے جس عقیدہ کو مہاتما بدھ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ دوسری زندگی بھی جسمانی قالب میں نمایاں ہوگی اور'' پنر جنم'' یا آواگون کا دھرم چکر بدھ مذہب کے فلسفی مزاج طبائع کی اپج ہے۔ جس کا اضافہ بعد کو اس مذہب کے عقائد میں ہوا۔ واقعہ کی نوعیت اگر یہی ہے تو آخرت کے اس عقیدے اور اسلام کے اخروی زندگی کے عقیدہ میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے اور جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے کہ جنت میں لوگ جرد مرد ''یعنی صاف ستھرے چہروں کے ساتھ داخل ہوں گے اور جہنم میں ایک ابوجہل ہی ایسے طویل وعریض بدن کے ساتھ داخل ہوگا کہ اس کا ایک ایک دانت احد پہاڑ کے برابر ہوگا''، ان کا مطلب یہی تو ہے کہ اچھے قالب میں اچھے لوگ اور برے قالب میں برے لوگ آئندہ زندگی میں اٹھیں گے۔

کچھ بھی ہو فلسفیانہ نکتہ نوازیوں اور خرافاتی توجیہوں، تحریفی تاویلوں کے نیچے دفن شدہ بودھ دھرم میں کریدنے والوں کو آج جو کچھ بھی مل رہا ہو۔ ہم جب یہ جانتے ہیں کہ بدھ کے مرنے کے چند صدیوں بعد ہی بودھ کی صحیح تعلیم مختلف فرقوں کی من مانی تشریحات کی شکار ہوکر نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اسی مضمون میں گذر چکا ہے کہ بدھ متی میں مورتی پوجا کا رواج ہو گیا تھا اور کیسا رواج ؟ کہ ہندوستان کا چپہ چپہ مورتیوں سے گویا پٹا ہوا تھا اور تو اور خود غریب بدھ ہی کی مورتی بنا بنا کر لوگ پوجنے لگے تھے کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ فارسی کے لفظ ''بت'' کی اصل بدھ ہی تھی۔ دال۔ ت سے بدل گئی چینی سیاح اتسنگ نے لکھا ہے کہ جب وہ ہندوستان آیا تھا اس زمانے تک:

''بودھ دھرم میں اٹھارہ فرقے ہو چکے تھے'' (۳۴)

ان میں دو فرقوں میں ہنایان ''مہایان'' کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ مشرق قریب میں بدھ مت کے اشاعت کا ڈوزی کا دعوی صحیح تاریخی شہادتوں پر مبنی ہے تو ہوسکتا ہے کہ بدھ مت مذہب کے داعی بت متی کے نام سے جس دین کو پیش کر رہے تھے وہ مہاتما بدھ کی تعلیمات کے صحیح اجزاء کا ترجمان رہا ہو اور اسی کو دیکھ کر مکہ والوں نے مسلمانوں کو صابی کہنا شروع کیا تھا۔ مگر بظاہر جو واقعات ہم تک پہنچے ہیں ان سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ ہمارے یہاں کی روایتوں میں صرف ایک روایت جو مشہور تابعی قتادہ کی طرف منسوب کی گئی ہے اور جس کی رو سے ''صابئین'' کی دوسری خصوصیتوں میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ:

''یصلون الی الشمس کل یوم خمس صلوٰت'' (۳۵)

''وہ آفتاب کی طرف رخ کر کے دن بھر میں پانچ دفعہ نمازیں ادا کرتے ہیں''

اس سلسلہ میں بس یہی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں جیسے پانچ وقتوں میں نمازیں پڑھی جاتی ہیں، اسی طرح صابیوں کے یہاں بھی پانچ ہی اوقات عبادت کے تھے۔ لیکن اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ صابی آفتاب کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ ایسی صورت میں محض عبادت کے پانچ اوقات کا اشتراک اہلِ مکہ کے مسلمانوں کو صابی کہنے کے لیے کافی نہیں ہوسکتا۔ سچ تو ہے کہ بدھ بے چارے کی طرف اس زمانہ میں یہ عقیدہ تک منسوب کیا جارہا ہے کہ وہ سرے سے خدا ہی کا قائل نہ تھا۔ یا قائل بھی تھا تو اس کے نزدیک خدا اور انسانی روح بلکہ کیڑوں مکوڑوں کی جان میں کسی قسم کا فرق نہ تھا، ونسنٹ صاحب اپنی تاریخ ''قدیم ہند'' میں لکھتے ہیں کہ بدھ کا عقیدہ تھا کہ:

''وہ ہستی جو اس وقت آسمان میں دیوتا کی حیثیت رکھتی ہے ممکن ہے مرور ایام کے دوران میں بالآخر ایک کیڑے مکوڑے کی شکل میں دنیا میں نمودار ہو اور بجنسہٖ اسی طرح ایک کیڑے کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ بتدریج دیوتا کا

درجہ حاصل کرلے" (۳۶)

جہاں دین کو فلسفہ کی ان بھول بھلیوں میں داخل کر کے معاد جسمانی یا تناسخ کے چکر میں اتنی وسعت پیدا کر دی گئی ہو کہ آسمانوں والا دیوتا، یا خدا بھی اس چکر سے (العیاذ باللہ) آزاد نہیں ہے۔ تو ایسا دین دین ہی کب باقی رہتا ہے اور اسلام جیسے سیدھے سادے دین کے ساتھ اس کی مشابہت و مناسبت کی صورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ مسلمانوں کو مکہ والوں کے یہودی، یا عیسائی کہنے کے بجائے صابی کہنے کی کوئی صحیح توجیہ اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی ہے۔

اسی طرح اس کا جواب بھی مشکل ہے کہ عرب اور اس کے علاقوں میں بدھ مذہب کے پیروؤں کو لوگ "صابئین" یا "صابیہ" کیوں کہنے لگے تھے۔ ممکن ہے اس علاقے میں بدھ متی جن لوگوں کے ذریعہ پہنچا ہو ان میں سے کسی شخص یا فرقہ کے نام کی طرف منسوب ہو کر یہ لفظ بنا ہو۔

لیکن بقول ونسنٹ صاحب جب حال یہ ہے کہ:

"بدقسمتی سے بدھ مذہب کی ان تبلیغی مشنوں کا حال محفوظ نہیں جو ایشیا، افریقہ اور یورپ کی یونانی سلطنتوں میں بھیجے گئے اور نہ ان مبلغوں کے نام ہی ہم کو معلوم ہیں" (۳۷)

تو اس احتمال کو بھی پیدا کر کے ہم کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ صحیح ہے جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ خود ہم مسلمانوں کو مختلف ملکوں علاقوں میں مختلف ناموں سے لوگ موسوم کرتے رہے ہیں۔ یورپ والے ہمیں سآراسین یا مور کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ اسی قسم کی صورت بدھ مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ بھی پیش آئی ہو۔ ابوریحان بیرونی کا بیان آپ پڑھ چکے کہ خراسان میں لوگ ان کو "شمنان" کہتے تھے۔ مگر ان الفاظ کی تو کچھ نہ کچھ توجیہ (ی) ہم کر سکتے ہیں۔

مگر صابی ''صابئین'' یا ''صابئہ'' کے نام سے بدھ کے ماننے والوں کوموسوم کرنے کی ایسی توجیہ جو دلنشین ہو اب تک سمجھ میں نہیں آئی۔ یوں کہنے کے لیے تو مختلف احتمالات پیش کیے جا سکتے ہیں مثلاً خود مہاتما بدھ کا اصلی نام کہا جاتا ہے کہ سدھارتھ تھا۔ بدھ مذہب کے فقیروں کو سادھو کہتے تھے۔ بدھ متی والوں میں بعد میں جن مورتیوں کی پوجا کا رواج ہوا ان کو بھی ''بودھی ستودن'' کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ سادھی بدھ مذہب والوں کے مذہبی استغراق کی تعبیر تھی۔ سوبھدرا مہاتما بدھ کے چیلوں میں ایک مشہور شخصیت کا نام تھا۔ ان سارے الفاظ کے شروع میں 'س' کا حرف پایا جاتا ہے جو آسانی عربی کے ص کا تلفظ اختیار کرسکتا ہے اور ایک زبان کے الفاظ کے دوسری زبان میں منتقل ہونے میں اس قسم کی تبدیلی کوئی عجیب نہیں ہے اور برابر ہوتی رہتی ہے۔

آخر بودھا کا لفظ جب ''بوذاسف'' بن سکتا ہے تو کیوں نہ سمجھا جائے کہ صابی کا لفظ بھی کچھ اس قسم کے الٹ پھیر رد و بدل کے قصوں سے متاثر ہوا، طبقات الاطباء میں عراقی صابیوں کی اصل بتاتے ہوئے ابن ابی اصیبعہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، یعنی جن کو لوگ صاب کہتے تھے، وہ حضرت ادریسؑ کے صاحبزادے طاط کی نسل میں ہیں۔ (۳۸)

اگر یہ مان لیا جائے کہ طاط کو ادریس علیہ السلام کا صاحبزادہ قرار دینا کسی غلط فہمی یا اسمی اشتباہ پر مبنی ہے (ک) تو دھیان کچھ ادھر جاتا ہے کہ مشرق قریب یا عرب اور اس کے نواح میں شاید صاب صابی مذہب کے داعی کی تعبیر تھی۔ یعنی پہلا آدمی اس علاقہ میں جو پہنچا ممکن ہے اس کا اصلی نام طاط یا ٹاٹ ہو۔ اور صاب اس کا دینی لقب (ل) ہو اور اسی کی طرف منسوب ہو کر اس کے ماننے والے ''صابئین'' کے نام سے موسوم ہوئے ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب

Marfat.com

حواشی

الف۔ دوسرے علماء سے بھی خاکسار نے سنا ہے اور مرشد تھانوی حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں بھی ہے کہ عرب کے لوگ کہتے ہیں قرآن عرب میں نازل ہوا، مصر میں پڑھا گیا، ترکی میں لکھا گیا اور ہندوستان میں سمجھا گیا، یہ واقعہ بھی ہے کہ مصریوں سے بہتر قاری کہیں نہیں پائے جاتے۔ خط نسخ اور قرآنی کتابت میں ترکوں کا کام بے نظیر ہے۔ باقی ہندوستان میں سمجھا گیا، ہندوستانی ہو کر اس دعویٰ کی تشریح کیسے کروں۔

ب۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب ازالۃ الخفاء میں لکھا ہے کہ ایران و روم کے امراء زمین کے مالکوں پر مسلط تھے، حالانکہ زمین کے نہ یہ امراء مالک تھے، نہ اس کو آباد کرتے تھے، اور نہ اپنے باپ دادوں سے وراثت میں ان کو زمین ملی تھی۔ مسلمانوں نے درحقیقت ان پر زبردستی قبضہ جمانے والے جاگیرداروں سے جنگ کی اور ان کو مار بھگایا اور واقعی جو زمین کے مالک تھے اور اس کو آباد کرتے تھے ان کے حوالہ کر کے خراج کے معاملہ میں صلح کر لی گئی تھی۔ (ازالۃ الخفاء، ۳/۴۸۵، شاہ ولی اللہ، احمد بن عبدالرحیم، مترجم مولانا محمد اشتیاق، کراچی، قدیمی کتب خانہ، س ن)

ج۔ ایک عراقی فاضل نے ''الصابئہ'' کے نام سے ایک مقالہ لکھا تھا جو کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے، اپنی ذاتی معلومات کی روشنی میں عراقی صابیوں پر انہوں نے بحث کی ہے۔ افسوس ہے کہ اس وقت یہ کتاب میرے پاس موجود نہیں ہے، اسی کتاب میں یاد آتا ہے کہ ترکوں کے زمانہ میں عراقی صابیوں کی تعداد چند لاکھ سے زیادہ نہیں بتائی گئی تھی، بہر حال ہزار بارہ سو سال بعد عراق کے ایک غیر مشہور فرقہ کی شکل میں ان کا رہ جانا یہ خود دلیل ہے کہ اتنے طویل عرصہ میں بھی ان کو پڑھنے پھلنے پھولنے کا موقع نہ مل سکا، اس مقالہ میں بھی قرآن کے الصابئین ان ہی عراقی صابیوں کو قرار دیا گیا ہے۔

د۔ اس وقت المسعودی کا جو مطبوعہ نسخہ میرے پیش نظر ہے وہ فاحش اغلاط سے معمور ہے، عموماً قرینہ اور قیاس ہی سے صحیح الفاظ سمجھ میں آتے ہیں، اس موقع پر بھی عبارت کچھ اس طرح چھپ گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاتما بدھ جس نے توحید کی تعلیم دی تھی، خود اسی نے

Marfat.com

مورتی پوجا کے طریقہ کو بھی جاری کیا، علاوہ تناقض کے واقعہ کی یہ صحیح تعبیر بھی نہیں ہے، مطبوعہ نسخہ میں ہے کہ "حدد بوداسف عند الناس عبادۃ الاصنام" (مروج الذہب برا لکامل، ۵/۴، مسعودی علی بن حسین، مطبع احمد الحلبی ۱۳۰۳ھ) بظاہر جدد کی جگہ بعد کا لفظ چاہیے تو یہی کہ اصل کتاب میں ہو، یعنی بوذاسف کے بعد بدھ مت کے ماننے والوں کو عبادۃ الاصنام (مورتی پوجا) کی طرف مائل کیا گیا۔

مروج الذہب کے پیرس کے مطبوعہ نسخہ میں جس کی تصحیح پروفیسر بینارڈ اور پرفیسر کورتل نے کی ہے، بعینہ یہی عبارت ہے۔ اس لیے اس کو طباعت کی غلطی پر محمول نہیں کیا جا سکتا، مسعودی کا خیال یہی رہا ہوگا اور اس بارے میں اس کو یہی معلومات پہنچی ہوں گی۔ (نوٹ از مدیر "معارف") نیز مروج الذہب کے جدید نسخہ میں بھی حدد ہی موجود ہے۔

وحدد بوداسف عند الناس عبادة الأصنام، و السجود لها، لشبه ذكرها، و قرب لعقولهم عبادتها بضروب من الحيل والخدع۔ (مروج الذہب، ۲/۲۵۳، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، الطبعۃ الاولی)

ھ۔ مولانا عنایت رسول چڑیا کوٹی مرحوم کا حال ان کی کتاب (بشریٰ نامی) کے شروع میں جو درج ہے، اس میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ فارسی کا قدیم رسم خط بائیں طرف سے لکھا جاتا ہے۔ "جس زبان میں ژند اور اوستا (زرتشتی دین کی کتابیں) ص ۲۶ پر بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت کے رسم خط کی جگہ مہاتما بدھ نے غالباً سہولت کی وجہ سے انہی قدیم ایرانی حروف کے رسم خط کو اختیار کر لیا تھا، وہی پالی کے نام سے مشہور ہوا۔ ہندوستان میں "پالی" جاننے والے علماء پیدا ہو چکے ہیں، وہی بتا سکتے ہیں کہ اصل واقعہ کیا ہے۔

مولانا مناظر نے "بشریٰ" نامی کتاب کی جس عبارت سے یہ معنیٰ مفہوم کیا ہے وہ درج ذیل ہے۔

فارسی کی قدیم زبان جس میں ژند اور اوستا کی قدیم کی کتابیں ہیں (بشریٰ، ص ۱۹، چڑیاکوٹی، عنایت رسول، علی گڑھ، شروانی پرنٹنگ پریس ۱۹۳۶ء، از محقق)

و۔ دیکھیے شرح حکمۃ الاشراق ص ۷۹ مطبوعہ ایران، (تلاش بسیار کے بعد بھی یہ کتاب میسر نہیں آئی، از محقق) دلچسپ بات اسی سلسلہ کی یہ ہے کہ نوح علیہ السلام اور ان کے مشہور طوفان

Marfat.com

سے پہلے تسلیم کر لیا گیا تھا کہ بودھا قدیم بابل میں پیدا ہو چکا تھا اور یہ کہ اپنے نجومی حساب سے اس نے اس طوفان کی پیشین گوئی بھی کی تھا، اپنے ماننے والوں کو پہلے ہی سے ہوشیار کر دیا تھا۔

ز۔ مثلاً معلوم ہوتا ہے کہ ان عراقی صابیوں یا شام کے صحرائی علاقوں حران وغیرہ میں جو صابی پائے جاتے تھے ان میں بعضوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا، مگر باوجود اس کے یہ صابی بھی کہلاتے تھے، امام ابوحنیفہؒ کی طرف یہ فتویٰ منسوب کیا گیا ہے کہ اہل کتاب کا دین جن صابیوں نے اختیار کر لیا ہے ان کے ساتھ اہل کتاب کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ یعنی ان کی عورتوں سے ازدواجی رشتہ بھی مسلمان قائم کر سکتے ہیں اور ان کا ذبیحہ بھی کھا سکتے ہیں۔

(صابئین کے بارے میں امام صاحب کے اس فتویٰ کی تفصیل اور مسئلہ کی اصل تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو، احکام القرآن، ۳/۲۹ ـ ۳۲۸، جصاص، احمد بن علی، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۲ھ، از محقق)

ح۔ واقعہ یہ ہے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ ساکیہ منی مہاتما بدھ کے زمانہ میں اور اس سے پہلے ہمارے ملک ہندوستان میں مقاصد و اغراض کو حاصل کرنے کے لیے ''دردان'' کا طریقہ عام طور پر مقبول تھا۔ یعنی دیوتا اور معبود کے سامنے اپنے آپ کو دکھ پہنچایا جائے، جیسے وہ فقیر جو کوڑے مار کر اور اپنے بدن سے خون نکال نکال کر بھیک دینے پر لوگوں کو مجبور کرتے ہیں، اس راہ میں لوگ اپنے بدن کا گوشت تک کاٹ کر ہون کرتے تھے۔ راون کا قصہ مشہور ہے کہ دس سروں میں سے اپنے نو سر کاٹ کاٹ کر آگ میں جھونکتا رہا، جس کے بعد ''دردان'' اس کو ملا اور دردان کی قوت سے بالآخر وہ فرعون بن گیا، عام طور پر ہندی قصص ''دردان'' کے ذکر سے معمور ہیں، آج کل عوام اسی کو ''بردان'' کہتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ لوگ پہاڑوں سے اپنے آپ کو گراتے تھے، آہنی میخوں پر گر کر سارے بدن کو لہولہان کرتے تھے، ہندوستان کے جنگل ''دردان'' طالبوں سے کسی زمانہ میں بھرے رہتے تھے، جس دکھ اور مصیبت کی زندگی وہ گذارتے تھے، آج ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، کہتے ہیں کہ ساکیہ منی مہاتما بدھ بھی کچھ دن تک اسی ''دردان'' کے چکر میں گھومتے پھرے اور بالآخر ان پر بجائے ''دردان'' کے ''نروان'' کا اصول واضح ہوا، جس میں نجات کے لیے خواہ مخواہ کی غیر فطری مصیبتوں کی برداشت کرنے کا انکار کیا گیا اور مذہبی مطالبات کے مطابق پاکیزہ اخلاقی زندگی کو نروان یعنی نجات کے لیے کافی قرار دیا گیا۔

ط۔ کرنل اسکاٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ بدھ مت کے تمام فرقوں کا ان باتوں پر اتفاق تھا اور برہما چین، جاپان اور چٹا گانگ میں کرنل صاحب کے زمانہ میں بدھ مت کے جو مستند علماء تھے، ان کے دستخط بھی ان اتفاقی امور پر حاصل کیے گئے تھے۔

ی۔ یورپ والے کہتے ہیں کہ ساراسین کی اصل صحرا نشین یا سارقین (چور) ہے، لیکن درحقیقت یہ لفظ ''سارا قین'' تھا، عرب والے اسماعیل ابن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد شمار ہوتے تھے۔ یہود کا دعویٰ تھا کہ اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ہاجرہ، ابراہیم علیہ السلام کی دوسری بیوی سارہ کی لونڈی تھیں، اس لیے سارے عرب کو وہ سارا قین (سارہ کے غلام) کہتے تھے، حالانکہ حضرت ہاجرہ شاہ مصر کی صاحب زادی تھیں، مسلمانوں کو ہندوستان میں ترک اس وجہ سے کہنے لگے کہ زیادہ تر اسلام اس ملک میں ترکی فاتحین کے ساتھ ہی پہنچا تھا۔ مور کا لفظ ممکن ہے مراکش وغیرہ کی طرف منسوب ہو ''ہوئی ہوئی'' کی توجیہ بھی کسی نے کی تھی، جواب یاد نہ رہی، باقی بدھسٹوں کو شمنان کہنے کی بظاہر وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ سومنات کی طرف خراسان والے ان کو منسوب کرتے تھے۔

ک۔ اسی سے اندازہ کیجیے کہ ملتان جب تک مسلمان پہنچے تو وہاں کی سب سے بڑی مورتی کے متعلق ان میں یہ خیال پھیل گیا کہ ''ان صنمه هو ايوب النبي عليه السلام'' یہ مورتی ایوب علیہ السلام پیغمبر کی ہے۔ (الکامل، ۲۰۹/۵، ابن اثیر، مبارک بن محمد، مصر مطبع احمد الحلبی، ۱۳۰۳ھ) بظاہر یہ خیال گذرتا ہے کہ ملتان میں پرہلاد کا مشہور مندر تھا اور جو افسانہ اس سلسلہ میں اب تک بیان کیا جاتا ہے، اس میں پرہلاد کے باپ کا نام کش یپو بتایا گیا ہے۔ کش یپو ہی کا لفظ ممکن ہے، عربوں کے کان میں یا ان کی زبان پر ''ایوب'' بن گیا ہو، ورنہ ملتان سے حضرت ایوب علیہ السلام کا بھلا کیا تعلق، تاریخ میں اس قسم کے عجائبات کی کمی نہیں ہے۔

ل۔ راہ صواب پر چلنے والا یا راہ صواب بتانے والا، اس مفہوم کی گنجائش ''صاب'' کے لقب میں پیدا ہوتی ہے ممکن ہے کہ واقعہ کی کچھ صورت یہی ہو۔

حوالہ جات

۱۔ Early History of India: P-197, Vincent A. Smith, England, Oxford Press, 1924

۲۔ قرونِ وسطی میں ہندوستانی تہذیب، ص۲، ہیرا چند، گوری شنکر، الہ آباد، ہندوستان اکیڈمی، ۱۹۳۱ء

۳۔ Early History of India: P-198

۴۔ ہندوؤں کے دس اوتار، ص۲۲ (کتاب تلاش بسیار کے بعد بھی نہیں مل سکی، از محقق)

۵۔ Early History of India: P-197

۶۔ التفسیر الکبیر، ۱۱۳/۲، رازی، محمد بن ضیاء الدین عمر، مکۃ المکرمہ، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۴۱۴ھ

۷۔ تفسیر ابی السعود، ۱۴۱/۱، ابوالسعود، محمد بن محمد، مکۃ المکرمۃ، مکتبہ عباس احمد الباز، ۱۴۱۹ھ

۸۔ الدر المنثور، ۱۴۶/۱، سیوطی، جلال الدین، عبدالرحمن بن ابی بکر، بیروت، دارالکتب العلمیۃ، ۱۴۱۱ھ

۹۔ محولہ بالا

۱۰۔ مروج الذھب برمع الکامل لابن اثیر، ۲/۴۷، مسعودی، علی بن حسین، مصر، مطبع احمد الحلبی، ۱۳۰۳ھ

۱۱۔ محولہ بالا

۱۲۔ طبقات الاطباء، ۲۱۵/۱، ابن ابی اصیبعہ، احمد بن القاسم، مصر، مطبع الوھبیہ، ۱۲۹۹ھ

۱۳۔ اخبار الحکماء، ص۸۱، قفطی، ابوالحسن، جمال الدین یوسف، مصر، مطبع السعادہ، ۱۳۲۶ھ

۱۴۔ ایضاً، ص۲۶۰

۱۵۔ اخبار الحکماء، ص۲۶۰

۱۶۔ محولہ بالا

۱۷۔ مروج الذھب، ۴/۵

۱۸۔ محولہ بالا

۱۹۔ محولہ بالا

۲۰۔ محولہ بالا

۲۱۔ محولہ بالا

۲۲۔ مروج الذھب، ۵۶/۳

۲۳۔ قرونِ وسطی میں ہندوستانی تہذیب، ص۵

۲۴۔ ایضاً، ص۴

۲۵۔ مروج الذھب، ۴/۲

۲۶۔ الآثار الباقیہ، ص۲۰۶، البیرونی، ابوریحان احمد بن محمد، لیدن، جرمنی، ۱۸۹۷ء

Marfat.com

۲۷۔ شرح حکمۃ الاشراق، ص ۴۷۹ (تلاش بسیار کے بعد بھی کتاب میسر نہیں آئی، از محقق)

۲۸۔ ذوزی کے مقالات کا عربی ترجمہ (تلاش بسیار کے بعد بھی کتاب میسر نہیں آئی از محقق)

۲۹۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب، ص ۲

۳۰۔ ایضا، ص ۴ ۳۱۔ ایضا، ص ۲۵

۳۲۔ ایضا، ص ۳۸

۳۳۔ تعلیقات شرح حکمۃ الاشراق، ص ۴۷۹

۳۴۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب، ص ۴

۳۵۔ تفسیر رازی، ۱۱۳/۳۰

۳۶۔ Early History of India, P-197

۳۷۔ Ibid

۳۸۔ طبقات الاطباء، ۲۰۵/۲

اسلام اور ہندو مذہب کی بعض مشترک تعلیمات

''تناسخ اور اس کے ذریعہ نجات کے عقیدے کی تعلیم آپ نے (یعنی پیغمبرؐ) نے نہیں دی، بہشت و دوزخ وغیرہ باتیں عیسائیوں اور یہودیوں کے مذہب جیسے رہنے دیں''۔ (۱)

یہ ہے وہ علم جو اس وقت تک ملک کے آزاد ہونے کے بعد بھی ہمارے بچوں کو سکھایا جا رہا ہے مذکورہ کتاب (ابھینو مڈل اتہاس) بہار کے اسکولوں کے نصاب میں شریک ہے، مصنف کا نام بھولا داس بی اے ال ال بی ممبر بہار ریسرچ سوسائٹی ہے، کتاب ابھینو گرنتھا گار کی شائع کی ہوئی ہے۔

جو فقرے اس کتاب کے آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں ان کو پڑھ کر پہنچنے والے یقیناً ان ہی نتیجوں تک پہنچ سکتے ہیں، کہ

۱۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں جو لوگ آباد تھے اور ویدک دھرم کے قائل تھے، ان کے اس دھرم میں صرف تناسخ کا عقیدہ پایا جاتا ہے اور بہشت و دوزخ وغیرہ عقائد سے اس دھرم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

۲۔ عیسائیوں اور یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد نیکی اور بدی کے نتیجے ان کے سامنے بہشت و دوزخ کی شکل میں آئیں گے۔

دوسری بات یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کے ذہن میں مرنے کے بعد بہشت و دوزخ کا عقیدہ پایا جاتا ہے اور اسلام میں بھی یہی مانا جاتا ہے۔ کیا یہی

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں اپریل ۱۹۵۲ء کو شائع ہوا۔

Marfat.com

واقعہ ہے؟ یہودیوں کا حال تو یہ ہے کہ ان کے دین کی بنیادی کتاب تورات، مرنے کے بعد جی اٹھنے کے عقیدہ سے خاموش ہے۔ نیکی اور بدی کے صلہ میں فلسطین کی سرزمین کا وعدہ اس کتاب میں پایا جاتا ہے، جس میں بار بار دہرایا گیا ہے کہ اسی ارض موعود میں شہد اور دودھ کی نہریں بہتی ہیں۔ خدا کے حکموں کو مانو گے تو اس سرزمین پر تمہارا قبضہ قائم رہے گا۔ باقی عیسائی مذہب سو اس میں مرنے کے بعد کی زندگی کا ذکر ضرور کیا گیا ہے لیکن عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ نیک آدمی مرنے کے بعد فرشتہ بن جاتا ہے اور بدکار شیطان اور بھوت بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کی حیثیت پر عیسائی اس لیے چیں بہ چیں ہوئے ہیں کہ فرشتہ کی زندگی کو جنات وانہار وحور وقصور سے کیا تعلق۔

باقی پہلی بات یعنی ہندوستان کے باشندے اسلام کے پیش کیے ہوئے عقیدے جنت ودوزخ سے قطعاً ناآشنا اور ناواقف تھے۔ ان کے دین میں نجات کا ذریعہ صرف تناسخ کو مانا جاتا تھا۔ یہ اور اس کے سوا بھی اسلامی تعلیمات کے دوسرے اجزاء کے متعلق دیکھیے کہ ویدک دھرم کی تصریحات اس باب میں کیا ہیں۔

افسوس ہوتا ہے کہ اسلام اور ہندوؤں کے ویدک دھرم کا مقابلہ صحیح علمی روشنی میں نہیں کیا گیا۔ ایک ہندو دان (عالم) کے تاثرات تو آپ دیکھ چکے۔ خود مسلمانوں کا بھی حال اس معاملہ میں یہ ہے کہ براہِ راست ہندوؤں کی کتابوں کے پڑھنے کا موقع جن لوگوں کو نہیں ملا ہے، سنی سنائی باتوں کو واقعات قرار دے کر اس قسم کی چیزیں ان کی کتابوں میں بھی درج ہوگئی ہیں۔ اور تو اور محمد بن عبدالکریم شہرستانی جنہوں نے مذاہب وادیان ہی پر اپنی مشہور کتاب ملل ونحل لکھی ہے اس میں بعض مسلمانوں کے اس خیال کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ برہمن کا لفظ برہما نامی جس شخص کی طرف منسوب ہے، یہ دراصل حضرت ابراہیم کے نام کا ایک ہندی تلفظ ہے

Marfat.com

اس پر تنقید کرتے ہوئے شہرستانی نے لکھا ہے کہ یہ عجیب بات ہے۔ اس لیے کہ برہمنوں کا طبقہ جو ہندوستان میں پایا جاتا ہے وہ تو:

"المخصومون بنفی النبوات اصلا و راساً". (۲)

''نبوات کے سلسلہ کا سرے سے منکر ہے''

خدا ہی جانتا ہے کہ شہرستانی نے 'براہمہ' یعنی 'برہمن' ہندوستان کے کن لوگوں کو سمجھ لیا، اور ان کی طرف یہ عجیب وغریب عقیدہ منسوب کردیا کہ وہ نبوات ورسالات ہی کے سلسلہ کے سرے سے منکر تھے۔

حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ برہمنوں کے دین کی بنیادی کتاب وید کے متعلق عام عقیدہ اس کتاب کے ماننے والوں کا یہی ہے کہ خالق کائنات کی نازل کی ہوئی کتاب ہے، دور کیوں جایئے مہابھارت جو عام طور پر ہر ہندو گھر میں آج اب بھی پڑھی جاتی ہے، اسی میں بہ کثرت اس قسم کی باتیں آپ کو مل سکتی ہیں، مثلاً:

''پریشر (خدا) کی سانس سے وید اپجن (پیدا) ہوئے''۔ (۳)

یا اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ یہ ہیں کہ:

''پتشری (عبادت گذار) لوگ بید بچن (وید کے الفاظ) کو بھگوان کا واک (کلام) جان کر اس پر ڈرہ بدھی (استقامت اختیار کرتے) رہے ہیں'' (۴)

بہرحال وید کا برہما کے منہ سے نکلنا، ہندوؤں کے سناتن دھرم کا عام عقیدہ ہے اور خواہ شہرستانی کو اس کا علم نہ ہو۔ لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کے سربرآوردہ علماء اور صوفیا بھی اپنی کتابوں میں اس قسم کی باتیں لکھتے رہے ہیں۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کا مشہور فقرہ مقامات مظہری میں پایا جاتا ہے کہ خالقِ کائنات نے اپنے رحم وفضل سے:

''کتابے مسمّی بہ بید کہ چہار دفتر وارد و مشتمل بر احکام نہی وامر واخبار ماضی و

Marfat.com

مستقبل است بہ توسط ملکے برہمانام کہ آلہ جارجہ ایجاد عالم ست فرستاد‘‘ (۵)

مرزا صاحب نے برہما کو بجائے ابراہیم کے ’’ملک‘‘ یعنی فرشتہ قرار دیا ہے لیکن بہر حال اس کی تو تصریح فرمائی ہے کہ وید خدا کی نازل کی ہوئی کتاب ہے۔ یہی ہندوؤں کا عقیدہ ہے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ناواقفیت کی وجہ سے شہرستانی نے ہندوؤں کو سرے سے نبوات و رسالات کا منکر ہی ٹھہرادیا۔ اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ ’’اسلام اور ویدک دھرم‘‘ کی تعلیمات میں کیا تعلق ہے؟ سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ پر نہ ہندوؤں میں صحیح طور پر کام کرنے والوں نے اب تک کوئی قابل ذکر کام کیا اور جیسا کہ چاہیے مسلمانوں میں بھی اس مسئلہ کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کا وہ قرار واقعی طور پر مستحق ہے۔ بطور ابتدائی اور تمہیدی مضمون کے ایک مختصر سا مقالہ آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ کام کی راہ ممکن ہے ان لوگوں کے سامنے آجائے جو ہندو مذہب کے مطالعہ کا ذوق رکھتے ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ ہندوستان کے قدیم مذاہب و ادیان کے وثائق اور یادداشتوں کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے نہیں کیا گیا ہے ورنہ ان ہی کتابوں میں نہیں، جن کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کا عام رواج اس ملک میں باقی نہیں رہا ہے اور اسی وجہ سے ان کے مطالب اور معانی کی صحیح یافت دشوار ہوگئی ہے۔ (الف) بلکہ مہابھارت جیسی عام کتاب جس کا اب بھی تقریباً ویدک دھرم کے ماننے والوں کے گھر گھر میں پاٹ ہوتا ہے اور ہر کہہ ومہہ، چھوٹے بڑے کی رسائی خود اس کتاب تک اور اس کے مضامین تک آسان ہے۔ اسی میں ایسی حیرت انگیز چیزیں مل جاتی ہیں کہ آدمی مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ قرآن کے ذریعہ سے جو کچھ دیا گیا ہے، اس کا بڑا حصہ اب بھی ہندوستان کے باشندوں کے اگلے بزرگوں کی کتابوں میں موجود ہے۔ قرآنی تعلیمات کا بنیادی مسئلہ اور جوہری روح جیسا کہ

Marfat.com

سب جانتے ہیں توحید ہے۔ یعنی بجائے مخلوقات کے عالم کے پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جل مجدہ ہی کی عبادت پر اصرار یہی قرآن کا محوری پیغام ہے۔ اسی محور پر اس کے سارے مطالبات گردش کرتے ہیں۔ لیکن یہ تو قرآن میں ہے اب مہابھارت کے بن پرب کا اکھتر واں ادھیائے کا ترجمہ پڑھیے۔ بھیم سین جو مہابھارت کی جنگ کے گویا رستم تھے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہ ایک دفعہ ہنومان جی نے بھیم سین کو اپنے درشن دیئے تو اس وقت قدیم ہند کے سناتن دھرم کی خصوصیت بتاتے ہوئے ہنومان جی نے جیسا کہ اسی کتاب میں ہے یہ کہا کہ:

''کرت جگ جس کو ست جگ کہتے ہیں اس میں سناتن دھرم جاری تھا'' (۶)

سناتن دھرم جب اس ملک میں جاری تھا تو اس کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت ہنومان جی کے بیان کے مطابق کیا تھی، سنیئے ہنومان جی کی طرف یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ:

''اس جگ میں دھرم کا ناش نہیں ہوتا تھا، دیوتا دانو، گندھرب، کنتر جلش، بنش (ب) ایک پرشوتم بھگوان کی پوجا کرتے تھے'' (۷)

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ ملک کے آبادکاروں کے آباء اولین (اگلے آباء اجداد) کے دین کا جوہری عنصر توحید ہی تھا۔ اور خالق عالم جل مجدہٗ کی ذات پاک اس ملک کا واحد معبود ہنومان جی کے زمانہ میں تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک پر رام چندر جی حکومت کرتے تھے لیکن یہ سلسلہ کب تک جاری رہا؟ بھشیم پتامہ جن کا ذکر علم و عرفان، حسن و کردار و عمل کے مثالی وجود کی حیثیت سے اس رزمیہ داستان مہابھارت میں کیا گیا ہے، جب زخمی ہو کر یہی بھشیم پتامہ تیروں کے بیچ پر لٹا دیئے گئے تھے اور ان کی مزاج پرسی کے لیے آخر میں خود شری کرشن جی بھی ان کے بالیں پر پہنچے تو لکھا ہے کہ:

Marfat.com

''بھشیم جی کو انن بھگت جان کرتو لوکی درشن'' (۸)

سے سری کرشن جی نے سرفراز کیا، یعنی تینوں عالم (لوک) کا مشاہدہ ان کو کرادیا، مذکورہ بالا فقرے میں انن بھگت کا جو لفظ ہے، اس کا مطلب اسی کتاب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ:

''جو کیوں (صرف) نارائن (خالق عالم) کی اوسپانا (عبادت) کرتا ہو''۔ (۹)

جس سے معلوم ہوا کہ مہا بھارت کی جنگ اس ملک میں جب لڑی گئی تھی اس وقت تک دینی زندگی کی روح یہی ''انن بھگت'' ہونا سمجھی جاتی تھی۔ اور یہ تو خیر پھر بھی ایک اجمالی بات ہوئی۔ مہا بھارت کی جنگ میں فاتح اعظم ہونے کی حیثیت راجہ جدھشٹر کو حاصل ہوئی تھی، ان ہی کو ان الفاظ کے ساتھ خطاب کرتے ہوئے یعنی:

''ہے مہا بھاگ (بڑے خوش قسمت) راجہ جدھشٹر''۔ (۱۰)

منجملہ اور باتوں کے یہ اپدیش بھی ان کو دیا گیا تھا، جس میں خالق عالم کو ان الفاظ میں روشناس کراتے ہوئے کہ:

''وہی نارائن سرشٹی (عالم) کو اتپن (پیدا) کرتا ہے اور پھر اپنے میں لے لیتا ہے''۔ (۱۱)

''یعنی ہر چیز اسی کی طرف واپس ہو جاتی ہے (کل الیہ راجعون) وہی سب دیوتاؤں، رشیوں دانووں، گندھریوں، منشوں کا پالن پوش کرنے والا ہے''۔ (۱۲)

آخر میں راجہ جدھشٹر کو حکم دیا گیا تھا کہ:

''اسی نرگن دیوتا کا پوجن کرو'' (۱۳)

گویا: ﴿ذالکم اللہ ربکم فاعبدوہ﴾ (۱۴)

''یہی اللہ ہے تمہارا پروردگار، پس اسی کو پوجتے رہنا''

Marfat.com

کی قرآنی آیت کا جو حاصل ہے اسی کی تعلیم راجہ جدھشٹر کو دی گئی تھی اور مہابھارت کا یہ نرگن دیوتا جس کی پوجا کا مطالبہ راجہ جدھشٹر سے کیا گیا ہے جانتے ہیں، ہندوستان کے آباد کاروں کے آباء اولین کی معرفت اس کے متعلق کن گہرائیوں تک پہنچ چکی تھی۔

اسی کتاب کا وہ حصہ جسے ''او یوگ'' کہتے ہیں، اس کے گیارہویں ادھیاے میں ایک رشی جن کا نام سجات جی بتایا گیا ہے، ان ہی کی طرف یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ:

''سجات جی بولے کہ برہم کا روپ کیا برنن (بیان) کروں نہ پرتھی (زمین) میں ویسا ہے، نہ آکاش (آسمان) میں، نہ اس کا جسم ہے، نہ وہ سمندر میں ہے، نہ ستاروں میں، نہ بجلی میں، نہ بادل میں، نہ چندرمان آذکشتروں میں دکھائی دیتا ہے، نہ سورج میں، نہ اور کسی میں، کتنو اس کا روپ، اپارینہ ہے''۔ (۱۵)

اپارینہ کا ترجمہ مترجم صاحب (ج) نے ''بے مثل و بے حد'' کیا ہے۔ نیز اسی اذیوگ کے بارہویں ادھیاے میں صراحۃً ان الفاظ کو ہم پاتے ہیں۔

اس برہم کی صورت کسی نظیر اور مثال سے نہیں بتائی جا سکتی اور نہ کوئی اس کے مشابہ ہے۔

الغرض ''لیس کمثلہ شی'' کے تعبیری لباس میں قرآن نے معرفت کی جس تنزیہی شان کو بیان کیا ہے، کیا مہابھارت کے اس فقرے میں اس کے سوا اور بھی کچھ ہے۔

میرے سامنے اس وقت تفصیل نہیں ہے، صرف چند سرسری مثالوں کو پیش کر رہا ہوں۔ ورنہ اس قسم کی باتیں مثلاً:

Marfat.com

''جس کے اوپر نارا ین کرپا (مہربانی) کریں اس کا کوئی بگاڑ نہیں سکتا اور جس پر پریشر کوپ کریں اس کو کوئی بچا نہیں سکتا'' (۱۶)

﴿ما یفتح اللہ للناس من رحمۃ فلا ممسک لھا و ما یمسک فلا مرسل لہ من بعدہ﴾ (۱۷)

''اللہ آدمی کے لیے جس رحمت کو کھولے، اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جسے روک دے اسے کوئی کھول نہیں سکتا''

اسی مضمون کی بے شمار آیتوں کے مفہوم ہی کے اعادہ کی شکل ہے، آپ بکثرت اسی مہابھارت میں پا سکتے ہیں۔ اور قدم قدم پر اسی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کی اگلی نسلوں کو جو کچھ دیا گیا تھا، جیسے دوسروں تک ان کے آبائی سرمائے کو قرآن نے واپس کیا ہے، اسی طرح اس ملک کے صحیح موروثی دین کو ان کے وارثوں تک وہ پہنچانا چاہتا ہے۔ لوگوں کو معلوم نہیں ہے اور نہ توحید ہی نہیں۔ مذہب کی عملی زندگی، بِرّ واثم یعنی پاپ پن یا نیکی اور بدی کے قانون کا تابع ہے، اس عام اسلامی نظریہ اور جو کچھ اس کے تفصیلات ہیں، ایک ایک جز اس کا بھی آپ کو مہابھارت ہی میں مل سکتا ہے۔ اسی قانون کا ذکر ایک جگہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے، یعنی:

''پاپ پن، دونوں پھل، والک (نتیجہ خیز بارآور) ہیں، ایک سے سرگ (الجنت) اور دوسرے سے نرک (النار) ملتا ہے''۔ (۱۸)

اور یہ کہ ''آدمی تپ اس لوک (دار دنیا) میں کرتا ہے اور پھل اس کا دوسرے لوک (عالم آخرۃ) میں پاتا ہے''۔ (۱۹)

نیز: ''پن سے پاپ کا ناش ہوتا ہے''۔ (۲۰)

Marfat.com

اسی کے ساتھ یہ بھی کہ:

'جو کوئی منش (آدمی) پاپ کرم (گناہ کا کام) کر کے پشچا تاپ کرتا ہے (یعنی پچھتاتا اور نادم ہوتا ہے) وہ پچھلے کیے ہوئے پاپ سے چھوٹ جاتا ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ پھر ایسا پاپ کرم نہیں کروں گا وہ اس کیے ہوئے پاپ کا پھل نہیں پاتا'' (۲۱)

''بر و اثم'' یا نیکی اور بدی کے ان ہی کلیات پر تصدیق کی مہر ثبت کر کے موجودہ زندگی کے لیے قرآن نے جب بے نقاب کیا ہے تو پھر میں یہ کیسے مان لوں کہ ہمارے وطن کے باشندوں کی طرف بھی اس کے خطاب کا رخ نہ تھا، جن کی کتابوں میں نیکی اور بدی کے قانون کے ان تمام پہلوؤں کو ہم پاتے ہیں، جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے، آخر آپ ہی بتایئے قرآنی آیات مثلاً:

﴿لها ما کسبت و علیها ما اکتسبت﴾ (۲۲)

''یعنی ہر شخص کو اپنے بھلے کاموں کا نفع بھی ملتا ہے اور برے کا وبال بھی اسی پر عائد ہوتا ہے''۔ یا:

﴿ان الحسنات یذهبن السیئات﴾ (۲۳)

''بھلائیاں (پن) (برائیاں) (پاپ) کو زائل کر دیتی ہیں'' اور یہ کہ:

﴿والذین اذا فعلوا فاحشة او ظلموا انفسهم ذکروا الله فاستغفروا لذنوبهم ولم یصروا علی ما فعلوا وهم یعلمون. اولئک جزاء هم مغفرة من ربهم﴾ (۲۴)

''جن لوگوں نے بے حیائی کا کام کیا، یا اپنے اوپر ظلم توڑا، یاد آیا ان کو اللہ پھر معافی چاہی اپنے گناہوں کی، اور جو کچھ کر گذرے اس پر اصرار نہ کیا بحالیکہ وہ جان رہے ہیں ان کا صلہ ہے اپنے مالک کی طرف سے آمرزش''

میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ غیر مروج غیر متداول کتابوں ہی میں نہیں،

بلکہ اسی مہابھارت میں جب یہ موجود ہے کہ نیکی آدمی اس لوک (دنیا) میں کرتا ہے اور پھل اس کا دوسرے لوک (عالم آخرۃ) میں پاتا ہے اور اس کے بعد سرگ، نرگ کا ذکر کر کے بار بار ہر تھوڑے وقفہ سے اس قسم کی باتیں ملتی ہیں، مثلاً سرگ (الجنۃ) کا تذکرہ کرتے ہوئے:

''سرگ اس لوگ (عالم) ہے جہاں سب پدارتھ (سازو سامان) موجود ہیں وہاں رہنے والوں کو بھوک پیاس سردی گرمی کچھ نہیں لگتی''۔ (۲۵)

بہشتی نعمتوں کی ایک طویل فہرست جس میں ملبوسات، مطعومات، مشمومات، مسموعات، ملموسات (د)، الغرض سارے حسی لذائذ کی تفصیل کے بعد آخر میں ہے:

''اس دیہ (جسم) سے جو دب دیہہ (نورانی جسم) کہلاتی ہے، جس میں نہ بڑھاپا ہے، نہ جوانی ہے، ہمیشہ ایک چیتن روپ رہتی ہے، سرگ باس ملتا ہے، وہاں سوائے ہرکھ (سرور) شوک پٹیرا (دکھ کی تکلیف) نہیں ہے''۔ (۲۶)

اور اسی کے مقابلے میں نرک کے متعلق:

''گھور نرک جہاں اندھیرا ہے، اچھس (یا ملائکہ غلاظ شداد) پٹیرا (تکلیف) دیتے ہیں''۔ (۲۷)

شاید ہی کوئی حصہ مہابھارت کا ہوگا، جو انسانیت کے اس آخری انجام یعنی الجنۃ والنار کے ذکر سے خالی ہو، پھر کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ تھوڑا یا موجودہ یہودیت جس کی آسمانی کتاب کو جنت اور دوزخ ہی نہیں، بلکہ اس لوک اور عالم کے بعد دوسرے لوک یا عالم کی زندگی کے ذکر سے ہم قطعی طور پر خاموش پاتے ہیں۔ اس دین کو تو محض یورپ والوں کی اس قسم کی مصنوعی تقسیموں یعنی سامی و آریائی، دتوں وغیرہ حصوں میں مذہبی قوموں کو بانٹ بانٹ کر یہ فیصلہ جو کر دیا گیا ہے کہ اسلام اور

Marfat.com

یہودیت ونصرانیت تو دین کی سامی قسم میں شریک ہیں اور ہندوستان وغیرہ میں جو دین اور دھرم پھیلا ہوا تھا وہ اس کی آریائی شکل ہے، حالانکہ میرا تو خیال یہ ہے کہ یہودیت اور نصرانیت کے متعلق چاہے کہنے والے کچھ کہیں، لیکن اسلامی دین جسے قرآن نے اس دعویٰ کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اصولاً دین کی یہ کوئی شکل وصورت نہیں ہے، بلکہ ساری انسانی نسلوں کا جو حقیقی موروثی اور آبائی دین اور دھرم تھا، اس کو ہر قسم کی خارجی آمیزشوں سے صاف و پاک کر کے قوموں کے حوالہ کر دینا یہی اس کا واحد نصب العین ہے۔ مرحوم ڈاکٹر اقبال کے الفاظ میں:

از قباے لالہ ہاے ایں چمن
پاک شست آلود گیہاے کہن

قرآن کے پیش کرنیوالے پیغمبر ﷺ کی سب بڑی خصوصیت جب یہی ہے تو ایسی صورت میں کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ ہندوستان جیسے عظیم ملک کے باشندوں کو قرآنی دائرے کے مذکورۂ بالا احاطہ سے خواہ مخواہ باہر سمجھا جائے۔ بلکہ تحقیق و تلاش سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی کا آبائی اور موروثی دھرم قرآن کے پیش کیے ہوئے دین سے جتنا زیادہ قریب اور نزدیک ہے، شاید یہ نزدیکی ان دینوں اور مذہبوں کی موجودہ شکلوں کو بھی بہ مشکل میسر آسکتی ہے۔ جن کو یورپ والوں کی مذکورۂ بالا فرضی تقسیم کے رو سے سامی ادیان کی فہرست میں ہم شریک پاتے ہیں۔ حالانکہ محض چند سرسری باتیں اور وہ بھی صرف ایک کتاب مہا بھارت کے مختلف مقامات سے اخذ کر کے آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں لیکن قرآن کے پڑھنے والوں سے میں حق کی گواہی کی درخواست دیتا ہوں، توحید فی الخلق، توحید فی العبادة، توحید فی الافعال یا قانون ''بِـرّ و اِثم'' (نیکی و بدی) اس قانون کے نتائج الجنة والنار توبہ و استغفار۔ الغرض ان سارے اصولی حقائق جن پر قرآنی تعلیم

کی بنیاد قائم ہے، کیا وہی ساری باتیں مہابھارت میں بھی نہیں مل رہی ہیں؟ سچ تو یہ ہے کہ بعض بعض فقرے مہابھارت کے مذکورۂ بالا حوالوں میں ایسے بھی ہیں کہ قرآن کی عربی عبارت کے سامنے بطور ترجمہ کے ہم ان کو بآسانی درج کر سکتے ہیں۔

اور یہ قصہ صرف مبدء و معاد نیکی و بدی ہی کے تفصیلات تک محدود نہیں ہے، بلکہ اخلاقی فضائل و رذائل کی جو فہرست اسلام میں پائی جاتی ہے، بجنسہ یہی فہرست ویدک دھرم کی بھی ہے۔ بلکہ ایسی چیزیں جو عموماً اسلام کے ساتھ مختص سمجھی جاتی ہیں، مثلاً جوا، شراب خوری، ان کی حرمت کا بھی بار بار ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے، قمار (جوا) کی اہمیت تو اسی سے ظاہر کہ مہابھارت کا موضوع ہی ایک حیثیت سے اگر سمجھا جائے تو قمار یعنی جوا ہی کے نتائج اور انجام کو بیان کرنا ہے۔ یہی بتایا گیا ہے کہ یہ ساری خونریزیاں جو مہابھارت کی جنگ میں ہوئیں اور جیسا کہ اسی کتاب میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ کروڑ ہا کروڑ (ھ) انسان جو اس جنگ میں مارے گئے، سب کا خون پانڈو اور کورو خاندان کے شہزادوں کے جذبہ قمار بازی کے سر عائد ہوتا ہے۔ گویا جوا بازی کے نتیجے کو دکھلانے کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب مرتب کی گئی، مگر حیرت ہوتی ہے کہ بہت سی باتیں جو ہندوستان میں عموماً مروج ہیں بلکہ عام طور پر دین اور دھرم کے نام لینے والے جن اعمال کو اپنی خصوصیت قرار دیئے ہوئے ہیں ان کے متعلق بھی اس مہابھارت میں وہی نقطہ نظر اختیار کیا گیا ہے جو اسلام کا ہے۔ مثلاً او یوگ کے دسویں ادھیاے میں بدرجی کا ایک طویل اپدیش کو نقل کرتے ہوئے ان فقروں کو بھی ان ہی کی طرف ہم منسوب پاتے ہیں کہ:

''تلوار کا زخم بھر جاتا ہے مگر کٹھور بچن کا زخم کبھی نہیں بھرتا، جب تک انسان کی نیک نامی دنیا میں رہتی ہے، تب تک وہ زندہ سمجھا جاتا ہے، قسم کھانے والے کی بات کا اعتبار نہیں رہتا''۔ (۲۸)

Marfat.com

اور اسی سلسلہ میں یہ بھی ہے کہ:

''شاہدریک یعنی ہاتھ کا ریکھا دیکھنے والا، شگون بتانے والا، جوتشی''(۲۹)

ان سب کو: ''بے شرم بھڑوا، گریہہ کرانے والا اپنی استری (عورت) کا خرچی کھانے والا، برہمن ہو کر شراب پینے والا''۔(۳۰)

کی فہرست میں شریک کیا گیا ہے، حالانکہ آج ہاتھ کا ریکھا دیکھنے والے اور شگون بتانے کا پیشہ کرنے والے ہی اس ملک میں دین کے پیشوا سمجھے جاتے ہیں، یہی نہیں عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ بھکشا لینا، اور بھیک مانگنا یہی برہمن کا مذہبی فریضہ ہے۔ لیکن اسی مہابھارت میں ہم بھکاری اور گداگر برہمن کے متعلق یہ الفاظ پاتے ہیں:

''جو برہمن سوال کرنے والا ہوتا ہے، اس کی عزت نہیں ہوتی، مان اس کا دور ہو جاتا ہے، سوال کرنے والے برہمن کا خوف چور کا سا ہوتا ہے''۔(۳۱)

اور آخر میں ہے:

''بھیک مانگنے والا مرتا ہے دان کرتا کبھی نہیں مرتا(و)''(۳۲)

اسی طرح آج ''بیاج'' یعنی ربا یا سود خوری اس ملک میں جس قوم کا خصوصی پیشہ سمجھا جاتا ہے اسی کی دینی کتاب میں ہم یہ بھی پاتے ہیں کہ:

''بیاج (سود) کھانے والے کا ان (کھانا) بشٹاہ (گوہ) سمان (مانند) کہا ہے''۔(۳۳)

میرے سامنے اس وقت تفصیل نہیں ہے۔ ان شاء اللہ کسی مستقل مقالہ میں اپنی معلومات کو جمع کر کے پیش کروں گا، سردست صرف سرسری باتوں کا ذکر کر رہا ہوں۔

خیال تو کیجیے، پانی سے تطہیر یا پاکی تو خیر عام بات ہے۔ لیکن ہماری فقہ کا

Marfat.com

ایک جزئیہ ہے کہ آفتاب سے یہی چیزیں پاک ہوتی ہیں۔ ٹھیک اسی جزئیہ کو ان الفاظ میں آپ مہابھارت میں بھی پاویں گے:

''سورج کی کرن سے سب بستو (چیزیں) پوتر (پاک) ہوئی ہیں'' (۳۴)

حد یہ ہے کہ غسل کے ساتھ قریب قریب وضو کے مسئلہ کو بھی آپ چاہیں تو پا سکتے ہیں، عبادت کرنے سے پہلے کیا کرنا چاہیے اسی کا جواب دیتے ہوئے حکم دیا گیا ہے:

''ممکن ہو تو اشنان (غسل) کرلے، نہیں تو ہاتھ پاؤں دھو کر اچمن (کلی) کر کے شدھ (پاک) آسن (جگہ) بیٹھ کر نارائن (خالق عالم) کا سمرن (ذکر) دھیان جپ وغیرہ کرے''۔ (۳۵)

اسی طرح صدقہ خیرات تو خیر مذاہب وادیان کی عام بات ہے لیکن مہابھارت میں اطلاع دی گئی ہے کہ سب سے پہلے منوجی نامی راجہ کو راج ملا اور ان سے پرجا نے وعدہ کیا کہ آپ:

''ہمارا پالن کریں، ہم پشوؤں کا اور سونے کا پچاسواں بھاگ (حصہ) اور ناج کا دسواں حصہ خزانہ کی ترقی کے لیے..... تمہارے خزانے میں داخل کریں گے''۔ (۳۶)

زکوۃ کے قانون کی تشکیل کرتے ہوئے پشوؤں (السوائم یعنی بھیڑ بکری گائے اونٹ وغیرہ) اور زر ونقرہ سے اسلام نے جس قدر زکوۃ نکالنے کا حکم دیا ہے اور عشر یعنی دسواں حصہ زمین سے پیدا ہونے والے اناج کا صدقہ جو طلب کیا ہے، اس کو اپنے سامنے رکھیے اور مہابھارت کی مذکورہ اطلاع کو پیش نظر رکھیے اور غور کیجیے ان قرآنی آیات پر جن میں فرمایا گیا ہے کہ تمہارے اگلے باپ دادوں کے پاس جو کچھ آیا تھا، کیا اس کے سوا قرآن تمہیں کچھ اور دے رہا ہے، یا ارشاد ہوا ہے:

Marfat.com

﴿ليهديكم سنن الذين من قبلكم﴾ (۳۷)

''تاکہ جو تم سے پہلے گذرے ہیں، ان کے طور اور طریقوں کی طرف تمہاری راہ نمائی کی جائے''

قرآن کے ان دعووں کی تصدیق کے لیے میں نہیں سمجھتا کہ اور کیا چاہا جاتا ہے، ذرا ملاحظہ کیجیے کہ جرائم کے سلسلہ میں چوری کے جرم کی سزا قرآن میں جیسا کہ مشہور ہے کہ یہ مقرر کی گئی ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، ظاہر ہے کہ اصل مقصود تو چوری کا انسداد ہے، جرم کے انسداد کے لیے یہ سزا مقرر کی گئی ہے۔ خود قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اور تو اور حضرت یعقوب علیہ السلام جن کا دوسرا نام اسرائیل تھا اور ان ہی کی طرف منسوب ہو کر یہود بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئے، ان ہی یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں کی زبانی قرآن میں چوری کی سزا ان کے پاس مروج تھی، یہ بتایا گیا ہے کہ چوری کا مال جس کے پاس نکلے، خود اسی چور پر مال کا مالک قبضہ کر لے، سورہ یوسف میں یہ مشہور اعتراف حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں کا منقول ہے:

﴿قالو جزائه لمن وجد في رحله فهو جزائه كذلك نجزي الظلمين﴾ (۳۸)

''یعقوب علیہ السلام کے لڑکوں نے کہا کہ بدلہ اس کا یہ ہے کہ جس کے سامان میں چوری کا مال ملے وہی اس کا بدلہ ہے ہم ظلم کرنے والوں کو یونہی سزا دیتے ہیں''

جس سے معلوم ہوا کہ چوری کے انسداد کے لیے اپنے خاص حالات کے لحاظ سے بنی اسرائیل کے لیے قطع ید (ہاتھ کاٹنا) کافی نہ تھا، کٹے ہوئے ہاتھوں کے باوجود بے شرمی کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چور چوری سے باز نہیں آتے

Marfat.com

تھے، اس لیے اس سے زیادہ سخت سزا ان کے یہاں غالباً مروج ہوگئی تھی۔ لیکن آیئے اور دیکھیے، ویدک دھرم جسے شمار کرنے والے سامی مذاہب کے مقابلہ میں آریائی دین کی فہرست میں شمار کرتے ہیں، اس میں اسی چوری کے جرم کی سزا کے متعلق جو آگاہی مہا بھارت ہی سے حاصل ہوئی ہے، اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ ایک شخص چوری کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے اور وقت کے راجہ سودمن کے سامنے اس کا مقدمہ پیش ہوتا ہے، خود چور درخواست کرتا ہے کہ:

''جو ڈنڈ (سزا) چور کو ہوتا ہے وہی ڈنڈ مجھے دو''۔ (۳۹)

راجہ نے چوری کی سزا دیتے ہوئے چور کے متعلق حکم دیا:

''کہ دونوں ہاتھ کاٹ ڈالو'' (۴۰)

بتایئے کہ اصولاً و فروعاً کس لحاظ سے ہم یورپ والوں کے اس مشاغبہ (پروپیگنڈے) سے متاثر ہو سکتے ہیں کہ ہندوستان کے آریائی دھرم کا قرآن کے سامی دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حالانکہ میں نے اجمال اور بہت زیادہ اجمال کے ساتھ کام لیا ہے۔ لیکن اس وقت تک جن معلومات کو پیش کر چکا ہوں اس وہمی اور فرضی بلکہ درحقیقت خود غرضانہ سیاسی دعوی کی تردید کے لیے کیا وہی کافی نہیں ہیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مہا بھارت میں بعض موقعوں پر لوگوں کے جو مکالمے نقل کیے گئے ہیں، ان کو پڑھ کر تو آدمی یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ کتاب کیا اسی زمانہ میں لکھی گئی ہے، جس سے ہم اس وقت گذر رہے ہیں؟ ایک جگہ یدھشٹر فاتح اور بھشیم پتاماکی باہمی گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے جدھشٹر کی طرف یہ سوال منسوب کیا گیا ہے کہ:

''جدھشٹر نے پوچھا مہاراج منش (آدمی) کا شریر (بدن) کو اسی جگہ جلا دیتے ہیں یا پرتھی میں گاڑ دیتے ہیں''۔ (۴۱)

یہ سوچنے کی بات ہے کہ آج تو ہندوستان میں ہندو اپنے مردوں کو جلاتے

Marfat.com

ہیں اور مسلمان گاڑ دیتے ہیں لیکن جدھشتر کے مذکورہ بالا سوال سے کیا یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جلانے کے ساتھ ساتھ تدفین کا عمل بھی ملک میں مہابھارت کے زمانہ میں بھی جاری تھا۔ حالانکہ یہ رسم و رواج کی بات ہے۔ لیکن اس لحاظ سے بھی دیکھیے تو آج جو کچھ یہاں دیکھا جارہا ہے کل بھی یہی دیکھا جارہا تھا۔

اور میں اس سلسلہ میں کہاں تک لکھوں، حد سے زیادہ اختصار کے ارادے کے باوجود خواہ مخواہ بات میں بات یاد آتی چلی گئی اور میں لکھتا گیا۔ ورنہ کہنا تو صرف یہ تھا کہ ادیان و مذاہب کو آریائی اور سامی وغیرہ فرضی خود تراشیدہ تقسیموں کے گورکھ دھندوں میں پھنسا کر یورپ والے سیاسی اغراض کی تکمیل میں جو کام لیتے ہیں، چاہیے کہ لوگ ان کے شاطرانہ طریقہ عمل سے چوکنا رہیں اور نظر ہمیشہ حقیقت پر رکھنی چاہیے۔ حالانکہ بہت کم کہا گیا ہے کہ لیکن بقدر ضرورت اصول وفروع رسم و رواج کے لحاظ سے جن جن باتوں کا ذکر سردست میں نے کیا ہے فیصلہ تک پہنچنے کے لیے ان شاء اللہ ان سے بھی کافی مدد مل سکتی ہے۔

میں یہ مانتا ہوں کہ جیسے مسلمانوں میں مختلف اسباب و مؤثرات کے زیر اثر بعد کو مختلف خیالات اور نت نئے دینی نظریات پیدا ہوئے۔ اسی حادثہ کا شکار ہندوستان کا آبائی اور موروثی دین بھی ہوا ہے۔ ہندو دھرم کی یہ تاریخ کتابوں میں محفوظ بھی ہے اور اسی کا نتیجہ یہ ضرور ہوا ہے کہ مختلف زمانہ میں مختلف عقائد وخیالات کے زیر اثر اس ملک کے باشندے ہوتے رہے ہیں خود اسی کتاب مہابھارت ہی کے پڑھنے سے ان مختلف نظریات وخیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلکہ مہابھارت ہی کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ عقائد وخیالات کی گونا گونی، رنگارنگی سے لوگ پریشان تھے۔ شانتی پرب کے ادھیائے ۹ میں گالورشی کی طرف یہ فقرہ منسوب کیا گیا ہے کہ ناروجی کو خطاب کر کے گالورشی نے کہا:

Marfat.com

''بہت سے شاستروں کے ہونے سے کلیان (اطمینان) بہت گپت (غائب) ہو رہا ہے''۔(۴۲)

گالورشی نے یہ بھی کہا کہ:

''ہے نارو جی شاستر ایک ہی ہوتو سنشے (شک وشبہ) نہیں ہوسکے''۔(۴۳)

آخر میں بولے:

''اسی لیے (یعنی ساشتروں کی کثرت کی وجہ سے) مجھے بہت سندیہہ (شک وشبہ) ہیں آپ ان کو دور کیجیے''۔(۴۴)

بہر حال مہابھارت ہی کے زمانہ میں جب یہ حال تھا تو اس کے بعد کیوں تعجب کیا جائے۔ اگر آج ویدک دھرم کے ماننے والوں میں مذکورہ بالا بہت سی چیزیں نہیں پائی جاتی ،خصوصاً خالق عالم ہی کی عبادت اور اسی کی پوجا موکش (نجات) کا واحد ذریعہ ہے۔ اس کا یقین اس ملک کی عمومیت میں باقی نہیں رہا ہے۔ حالانکہ اسی شانتی پرب کے ادھیایے ۵۸ میں اتم مارگ ''صراط مستقیم'' و''طریقہ وسطی'' یا سب سے بہتر راہ کے متعلق ایک مکالمہ شیو جی اور برہما جی کے درمیان نقل کرتے ہوئے ایک فقرہ برہما جی کی طرف یہ بھی منسوب کیا گیا ہے:

''ہے راجن اسی نارائن پرب برہم کو پوجنا جوگ (واجب) ہے جو سب کا اپت استھان (مصدر و سرچشمہ) ہے''۔(۴۵) آخر میں ہے:

''اسی کو پوجنے سے موکش (نجات) پراپت (میسر) ہوتا ہے''۔(۴۶)

ویدک دھرم کے قدیم مذہبی وثائق (ویدایا اپنشداوغیرہ) میں نہیں ، بلکہ مہابھارت جیسی عام کتاب جو شاید اب بھی ہندو گھرانوں میں روزانہ پڑھی جاتی ہے۔ جب اس میں بھی یہ موجود ہے کہ نجات اور مکتی کا جو طالب ہے اس کے لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ خالق عالم ہی کی عبادت کرے اور اسی کو پوجے اسی

Marfat.com

سے لوگائے مگر باوجود اس کے اس عقیدہ کا دبو ملک سے عام آبادکاروں پر سے کیوں اٹھ گیا اور یہی نہیں بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اسی مہابھارت میں جہاں ندوہ بالا توحیدی عقائد ونظریات ملتے ہیں، وہیں اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس عقیدے کی مخالفانہ شہادتوں کو بھی کتاب میں پاتے ہیں اور بکثرت پاتے ہیں۔

اور ایک یہی کیا دین اور دھرم کی دوسری بنیادی حقیقت اور جوہری عنصر یعنی پاپ پن، نیکی اور بدی ''برواثم'' کے نتائج کے سلسلے میں یہ سوال جو پیدا ہوتا ہے کہ سرگ اور نرک یا جنت و دوزخ انسانی علم وعمل، گیان اور کرم کا آخری انجام ہے، جو قیام قیامت اور فیصلہ کے بعد سامنے آئے گا(ز)۔

لیکن موت کے بعد اور قیامت سے پہلے درمیانی وقفہ میں مرنے والوں پر کیا گذرتی ہے۔ اسلام میں بھی اس سوال کا جواب یہی ملتا ہے کہ کثیف جسم کو چھوڑ دینے کے بعد انسان کی وہی تخلیقی قوت جو رویا اور خواب میں عمل کرتی ہے اور دیکھنے والے جن حالات میں ہوتے ہیں ان ہی حالات کو خاص خاص شکلوں میں خواب کے اندر دیکھتے ہیں، زکام میں جو مبتلا ہے، خواب میں پایا ہے کہ پانی میں تیر رہا ہے، صفراء کا غلبہ جن پر ہوتا ہے وہ دیکھتے ہیں کہ آگ لگی ہوئی ہے۔ حالانکہ خواب میں کثیف جسم سے رشتہ منقطع نہیں ہو جاتا لیکن سو جانے کی وجہ سے اس کثیف جسم کے آثار سے گونہ آزادی میسر آتی ہے۔ پھر موت کے بعد جب خاکی کالبد کا دبو بالکلیہ اٹھ جائے گا تو علمائے اسلام امام غزالی شاہ ولی اللہ وغیرہ محققین کا خیال یہی ہے کہ اخلاق و عادات، جذبات وعواطف اور ان ہی کے مطابق اعمال مرنے والوں کے سامنے مختلف صورتوں میں آتے ہیں۔ صحیح حدیث میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کی باتیں روایت کی گئی ہیں کہ اژدہوں اور سانپوں کو مرنے والے مرنے کے بعد دیکھتے ہیں۔ الغرض سانپ بچھو چوہے، سور وغیرہ وغیرہ جیسے جانوروں اور

Marfat.com

حشرات الارض جیسی چیزوں کا ذکر کتابوں میں کیا گیا ہے۔ بلکہ بعض روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ میدان قیامت میں آنے والوں کو بندروں، سوروں کی شکلوں میں بھی دیکھا جائے گا۔ (ح) بہر حال باوجود ان تصریحات کے جیسا کہ گذر چکا ہے کہ:

''آدمی تپ اس لوک (عالم) میں کرتا ہے اور پھل دوسرے لوگ (عالم آخرت) میں پاتا ہے'' (۴۷)

بکثرت مہا بھارت میں اس مضمون کو دہرایا گیا ہے، استری پرب کے تیسرے ادھیا میں یہ کہتے ہوئے کہ:

''کوئی بالک پنے (بچپن) کوئی ترن اوستھا (جوانی) کوئی بڑھاپے میں شریر (بدن) چھوڑتے ہیں''۔ (۴۸) آخر میں ہے:

''اس اسار (ناپائدار) سنسار میں رہنا کسی کو نہیں ہے''۔ (۴۹)

خود مہا بھارت کی تالیف جس کی طرف منسوب ہے۔ یعنی ویاس جی نے جدھشٹر کو یہ سمجھاتے ہوئے کہ جنگ میں جو مارے گئے ان کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے، کہا تھا کہ:

''اس بھاری سنگرام (جنگ) میں جو مارے گئے وہ کسی پرکار سے پھر نہیں آسکتے''۔ (۵۰)

''کسی پرکار'' کا لفظ قابل غور ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ مرنے والے پھر اس دنیا میں خواہ کسی شکل میں ہو، واپس نہیں ہو سکتے ،لیکن باوجود ان تمام باتوں کے یہ واقعہ ہے کہ عام طور پر ہندوستان میں یہی خیال پھیل گیا کہ اسی سنسار اور دنیا میں جو چلتے پھرتے جانور چرند پرند اور درندے نظر آتے ہیں کچھ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ مرے ہوئے آدمیوں کو پھر اس دنیا میں ان جانوروں کے جون اور قالب میں چلنے پھرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ گویا یہ یاد رکھا جاتا کہ ''اواگمن'' کا نظریہ جس کا

Marfat.com

عام تلفظ آواگون ہے، اس کا مطلب یہی ہے۔

فلسفہ کی عربی کتابوں میں ''تناسخ'' کے جس مسئلہ کا ذکر پایا جاتا ہے سمجھا جاتا کہ اسی کے قائل ویدک دھرم کے ماننے والے بھی ہیں۔ حتیٰ کہ اسی بنیاد پر بہت سے لوگ جنھوں نے ویدک دھرم کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا ہے وہ خیال کرتے ہیں کہ جنت و دوزخ کا عقیدہ سامی مذاہب کی خصوصیت ہے اور آریائی ویانات میں بجائے جنت و دوزخ کے عقیدہ کے تناسخ کا عقیدہ مانا جاتا ہے۔ خود مسلمانوں میں اچھے پڑھے لکھے لوگوں سے یہ سن کر مجھے تعجب ہوا۔ حالانکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ سرگ اور نرک کے الفاظ سے ویدک دھرم میں وہ سب کچھ مانا جاتا ہے جسے مسلمان الجنۃ والنار کی تعبیروں میں ادا کرتے ہیں۔ گفتگو صرف درمیانی وقفہ کے متعلق ہے، جس سے قیامت سے پہلے ہر مرنے والے کو موت کے بعد سابقہ ہوتا ہے۔ عام طور پر مسلمانوں میں برزخ کے لفظ سے اس وقفہ کو موسوم کرتے ہیں اگر ''اواگمن'' کے نظریہ کا تعلق بجائے موجودہ دنیا کے برزخ ہی کی طرف منتقل کر دیا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ سامی اور آریائی تقسیم کا کھیل یورپ کے سیاسی بازیگروں کا کھیلا ہوا صرف عقلی ملاعب بن کر رہ جاتا ہے اور بے شمار منطقی تضاد اور تناقص سے بھی وہ عقیدہ پاک ہو جاتا ہے جسے ویدک دھرم والوں کی طرف منسوب کرنے والوں نے منسوب کر دیا ہے (ط)۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ جیسے مسلمانوں کے مختلف فرقوں نے اسلامی عقائد و مسلمات کی تشریح مختلف شکلوں میں کر کر کے اپنا ایک خاص مسلک بنا لیا ہے اور کوئی کسی کو اپنی تشریح کے ماننے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ تو پھر ویدک دھرم کے مختلف مکاتیب خیال اور اسکولوں میں اس مذہب کے مسلمات کی جو تشریحیں آج مانی جا رہی ہیں، ہم بزور ان تشریحوں کے ماننے سے ان کو کیسے باز رکھ سکتے ہیں۔

بلکہ مسلمانوں کی حد تک تو گونہ گنجائش بھی ہے کہ ان کی آسمانی کتاب (قرآن عزیز) تاریخی طور پر ہر قسم کی بیرونی آمیزشوں سے اس وقت تک پاک ہے، اس کو وہ بھی ماننے پر مجبور ہیں، جنہوں نے ابھی قرآن کو خدا کی کتاب نہیں تسلیم کیا ہے۔ اسی لیے مسلمانوں پر تو یہ اصرار شاید بے جا اصرار نہ ہوگا کہ کم از کم قرآن کے حدود سے تو باہر نہ ہوں لیکن مہابھارت جیسی ضخیم کتاب جس میں سب ہی طرح کی باتیں ملی جلی پائی جاتی ہیں، ہر خیال والے اپنی تائیدی شہادت اسی کتاب سے حاصل کرتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ بقول ملا عبدالقادر بدایونی ہشیر دہ ہزار عالم اس کتاب میں پوشیدہ ہے۔ اس لیے اس کتاب کے ماننے والوں کا مسئلہ کافی دشوار ہوگیا ہے۔ کانٹوں سے پھول عقل کے زور سے چننا آسان نہیں ہے۔ غریب عقل نے بسا اوقات کانٹوں کو پھول اور پھولوں کو کانٹا باور کرلیا۔ انسانی عقل کی تاریخ اسکی شاہد ہے کہ مسلمانوں کی طرح قرآن کو فیصلہ کی حیثیت سے استعمال کرنے کا حق بھی ان کو اس سے حاصل نہیں ہوا ہے کہ قرآن ساری آسمانی کتابوں کا آخری مکمل ترین اڈیشن ہے۔ یہی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔

بہر حال اس وقت میرے سامنے یہ مسئلہ ہی نہیں، ویدک دھرم کے صحیح عقائد و اعمال کیا تھے اور تاریخی انقلابات و مؤثرات سے گذرتے ہوئے اب ان کی شکل و صورت کیا ہوگئی۔ اولاً یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے اور کوئی کرنا بھی چاہے تو بجائے دوسروں کے خود اس دھرم کے ماننے والے اس تحقیق کے زیادہ مستحق ہیں۔ انہی کی تحقیق دھرم کے ماننے والوں کے لیے قابل قبول ہوسکتی ہے میں تو صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ قرآن نے جو یہ پوچھا تھا کہ:

''ان کے پاس کیا کوئی ایسی باتیں آئی ہیں جو ان کے اگلے باپ دادوں کے پاس نہ آئی تھیں''۔ (۵۱)

Marfat.com

اس سوال کا رخ جیسے دنیا کی دوسری قوموں اور امتوں کی طرف ہے اسی طرح واقعات کی روشنی میں دکھانا پڑتا تھا کہ ویدک دھرم والوں کے یہاں بھی ہمیں وہی چیزیں ملتی ہیں جنہیں قرآن کے ذریعہ آخری دفعہ قدرت نے بنی آدم کے سپرد کرنا چاہا ہے۔ خواہ ان چیزوں کو ان کے حقیقی خد و خال کے ساتھ ماننے والے مان رہے ہوں یا نہ مان رہے ہوں لیکن ملنے کی حد تک آپ نے دیکھ لیا کہ جیسے دوسروں کے یہاں ہمیں قرآنی تعلیمات کی پرچھائیاں ملتی ہیں اسی طرح ویدک دھرم کے آئینے میں بھی ان ہی تعلیمات کی تصویروں کا ہم نظارہ کر سکتے ہیں، بلکہ کہا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے دینی آئینہ میں یہ تصویریں جتنی زیادہ نمایاں ہیں، شاید دنیا کے دوسرے ادیان و مذاہب کی موجود شکلوں میں ہم ان کو نہیں پا سکتے۔

اگرچہ یہ ضمنی بات ہے لیکن پچھلے چند دنوں سے یورپ ہی کے بے بنیاد مغالطوں کے زیر اثر بعض لوگوں نے ہندی مسلمانوں پر یہ الزام جو تھوپنا چاہا کہ اس ملک کے کلچر سے ان کا کلچر مختلف ہے۔ اور باہر سے درآمد ہوا ہے۔ قدرتاً اس وقت اس کا خیال آ گیا، جب کبھی اس کلچری اعتراض کی خبر میرے کانوں تک پہنچی۔ پہلے تو یہی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک ہی ملک کے باشندوں میں بعضوں کے کلچر کو ہندی کلچر اور ان ہی باشندوں میں سے بعض دوسرے طبقات کے کلچر کو غیر ہندی قرار دینے کی بنیاد آخر کس منطق پر قائم ہے۔ ہندی کلچر ہندوستان کے رہنے والوں کا کلچر ہے۔ خواہ وہ دروازڑ کلچر ہو، بدھسٹ کلچر ہو یا اسی ملک کے ان باشندوں کا کلچر ہو، جن کا مذہب اسلام ہے۔ وطن ہونے کی حیثیت سے ہندوستان سب کا وطن ہے، بلکہ جو ناستک یا ادھرم بے دین اور ملحد لوگ ہیں، ان کو آپ اور جو کچھ جی میں آئے کہیے، لیکن یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان ان کا وطن نہیں ہے، اور وہ اس ملک کے وطنی حقوق سے محروم ہیں (ط)، اور یہ تو خیر عام بات ہے اس موقع پر ذیلاً جس چیز کا خیال مجھے آیا

Marfat.com

وہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر یہ اعتراض کہ ان کا کلچر ہندی کلچر نہیں ہے اگر کلچر کے اس لفظ میں دینی احساسات وعقائد وخیالات بھی شریک ہیں، اور غالباً مسلمانوں کا امتیازی ذکر ان کے دین اور مذہب ہی کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ تو آپ دیکھ چکے کہ اصولی اور بنیادی عقائد ہی نہیں بلکہ جزئیات اور فروع تک مسلمانوں کے دین کی کسی اور کتاب میں نہیں۔ مہا بھارت تک میں بھی جب پائے جارہے ہیں تو دین اور مذہب کی وجہ سے مسلمانوں کے کلچر کو غیر ہندی کلچر قرار دینے کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہی تو ہوا کہ مہا بھارت بھی ہندی کلچر سے خارج ہے۔ اب میں کیا عرض کروں، عموماً اس قسم کی باتیں وہی کرتے ہیں، جنہوں نے نہ مسلمانوں ہی کے دین کا مطالعہ کیا ہے اور نہ ویدک دھرم کی کتابوں کو انہوں نے صحیح معنوں میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ قرآن جس نے مسلمانوں کو ساری دنیا کے سچے ادیان اور صادق مذاہب کی صحیح تعلیمات کا جائز وارث بنادیا ہے اسی وجہ سے

در دل حق سر مکنونیم ما
وارث موسیٰ وہارونیم ما

کا بقول ڈاکٹر اقبال مرحومؒ مسلمان بجا دعوی کر سکتے ہیں، ایسی صورت میں مسلمانوں کا کلچر قدرۃً دنیا کا عالمگیر کلچر بن گیا ہے۔ ان کے لیے نہ کسی ملک کا کلچر اجنبی ہے اور نہ وہ کسی کلچر کے لیے اجنبی۔ اور میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ واقعات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے کلچر سے مسلمانوں کا کلچر جتنا زیادہ قریب ہے، اس قرب، اس مناسبت کا موجودہ حالات میں شاید ہی کسی دوسرے ملک کے مذہب اور دین کے ماننے والوں کے کلچر کے متعلق یہ دعویٰ صحیح ہوسکتا ہے، اور اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اشوکا کے عہد میں یہ مانتے ہوئے کہ گو ہندوستان میں مختلف ادیان و مذاہب کے لوگ پائے جاتے تھے لیکن ان مذاہب کے اختلافات کی نوعیت وہ

نہیں ہے:

''جیسا کہ پران کے ہندومت اور اسلام میں ہے''۔ (۵۲)

قدیم ہند کے مورخ ونسٹنٹ ۔ اے اسمتھ کے مذکورہ فقرے یا اسی دوسری شاطرانہ دسیسہ کاریوں کی تہ میں حریفوں نے کس زہر کو ملانا چاہا ہے۔

حواشی

الف۔ میرا اشارہ وید اور اپنشد وغیرہ ہندوستان کے قدیم دینی سرمایوں کی طرف ہے۔ وید کے متعلق پنڈت سندر لال جی نے اپنی کتاب ''قرآن اور گیتا'' میں جو حال میں شائع ہوئی ہے لکھا ہے کہ ویدک زبان اتنی پرانی ہو چکی ہے کہ صحیح مطلب کا سمجھنا اس کا دشوار ہے۔ (قرآن اور گیتا، ص ۸۵، سندر لال، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، س ن)

ب۔ ملائکہ، جن، ارواح طیبہ، و خبیثہ کے متعلق ہندو ادبیات میں یہی الفاظ مستعمل ہیں، جلکش، منش، اجن، و الاکس کے ہم معنی الفاظ ہیں۔

ج۔ مترجم صاحب سے میری مراد منشی شری رام صاحب ماتھر دہلوی ہیں، جنہوں نے چار ضخیم جلدوں میں کافی تحقیق و تدقیق کے ساتھ مہابھارت کا اردو میں کامیاب ترجمہ کیا ہے۔ مطبع نولکشور میں متعدد بار یہ ترجمہ چھپا ہے۔ میرے پیش نظر ۱۹۱۴ء کا مطبوعہ نسخہ ہے۔ سارے حوالے مہابھارت کے اسی ترجمہ سے ماخوذ ہیں۔

د۔ مطلب یہ ہے کہ ہر ہر انسانی حاسہ کے ساتھ جن جن لذتوں کا تعلق ہے۔ سب ہی کا ذکر ویدک دھرم کے سرگ میں کیا گیا ہے۔ حتی کہ اپسراؤں (حوروں) کے ساتھ بھوگ بلاس کے پراپت ہونے یعنی حاصل ہونے کا ذکر بکثرت اس کتاب میں ملتا ہے۔

ھ۔ استری پرب دسواں ادھیائے میں جدھشٹر کی زبانی مقتولوں کی تعداد ایک ارب چھیاسٹھ کروڑ بیس ہزار بتائی گئی ہے۔

و۔ اسی ادھیائے میں ایک فقرہ جس میں اچھے برہمن کی خصوصیتوں کو بتاتے ہوئے ایک خاص علامت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ جو برہمن

''داڑھی مونچھ رکھنے والے ہیں ان کو نیوتہ دے کر اچھے پدارتھ بھوجن کراؤ''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مونچھ داڑھی ہمارے وطن میں پرہیزگار انسانوں کی علامت ہمیشہ مانی جاتی تھی۔

ز۔ قیامت کبریٰ کے عقیدے کا ذکر بکثرت ویدک دھرم کی کتابوں میں ''مہا پرلے'' کے نام سے کیا گیا ہے۔ مہابھارت میں بھی ہے کہ

Marfat.com

''مہاپرلے (قیامت کبریٰ) میں دیوتا اور رشی وغیرہ سب ناش ہو جاتے ہیں۔ ایک پر (خالق عالم) الجھت (قدوس) اناشی (لافانی) باقی رہتا ہے''۔

(... پرب ادھیائے ۔ ۹۲)

جو'' کل من علیها فان و یبقی وجه ربک ذوالجلال والاکرام '' قرآنی آیت ہی کا حاصل اور خلاصہ ہے۔

ح۔ بعض بزرگوں کے حال میں لکھا ہے کہ مجمعوں میں نقاب ڈال کر آنکھوں پر جاتے پوچھا گیا تو بولے عموماً لوگ مجھے بندروں، سوروں، کتوں وغیرہ کی شکلوں میں نظر آتے ہیں۔ حضرت معاذ بن جبل صحابیؓ سے ایک حدیث بھی مروی ہے کہ ان سے رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا کہ قیامت کے دن بعض اٹھنے والے ان شکلوں میں آئیں گے یعنی'' **بعضهم علی صورة القردة وبعضهم علی صورة الخنازیر** ''

''بعض بندروں کی شکل میں بعض سوروں کی شکل میں''

(الدرالمنثور، ۶/ ۵۰۱، سیوطی، جلال الدین، عبدالرحمن بن ابی بکر، بیروت، دارالکتب العلمیہ، ۱۴۱۱ھ)

اور یہ بھی فرمایا گیا کہ قتات (چغل خور) بندروں کی شکل میں اور حرام خور سوروں کی شکل میں ہوں گے (درمنثور بحوالہ ابن المنذر وعبد بن حمید وغیرہ) بہرحال اس روایت کا حاصل بھی یہی ہے کہ قیامت سے پہلے اور موت کے بعد درمیانی وقفہ میں عادات و اخلاق، اعمال و افعال کی تابع صورتیں ہو جاتی ہیں اور ان ہی صورتوں کے ساتھ میدان قیامت میں وہ آئیں گے۔ قرآنی آیت فتاتون افواجا کی تفسیر کتابوں میں پڑھیے۔

(پوری روایت میں لوگوں کی ایسی دس انواع کا ذکر ہے جو اپنی دنیوی عادات کے موافق مختلف شکلوں میں متشکل ہوں گے۔ الدرالمنثور، ۶/ ۵۰۱، از محقق)

ط۔ مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں بہت سے جانوروں کو غیر معمولی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جن میں گائے، لنگور اور سانپ وغیرہ کو بہت معمولی اہمیت حاصل ہے۔

ل ۔ اب اگر یہ مانا جائے کہ مذکورہ بالا حیوانات سزا یافتہ انسانوں کی شکلیں ہیں، تو کسی گنہگار پاپی وجود کے محترم ہونے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں۔ ماسوا اس کے مہابھارت ہی کے

ادھرپ ادھیاے ۱۹، میں آفرینش عالم کی داستان کواس قصہ سے شروع کر کے کہ ابتداء میں
صرف برہم پرماتما یعنی خدا تھااور پانی میں زمین غائب تھی ۔آگے بیان کیا ہے کہ کشپ جی کی
گیارہ جوڑوں سے ہاتھی گھوڑی، خچر، اونٹ بھیڑ بکری، شیر ہرن، گائے بیل بھینسے وغیرہ چار
پائے اور باز کبوتر، بٹیر، طوطے، مینا، گررچی وغیرہ پرندے اور سانپ مگرمچھ اور مچھلیاں آبی جانور
اور کیڑے مکوڑے وغیرہ پیدا ہوئے۔ایسی صورت میں یہ خیال کہ سارے جانوروں اور انسانوں
کی بزائی قالب ہیں کہاں تک درست ہوسکتا ہے۔

ی ۔ مگر وہ کے راجہ اشوک اعظم کے سنگی فرامین میں ساتویں فرمان میں یہ فقرہ بھی ہے کہ
میرے قلم میں اگر کوئی بود باش رکھتا ہوتو اس کو اذیت نہ دی جائے ۔(اشوک چرتر،ص ۷۰)(یہ کتاب
تلاش بسیار کے بعد بھی میسر نہیں آئی ،البتہ راجہ اشوک کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو۔

۱۔ اشوک، پرکاش دیو، لاہور، جارج اسٹیم پریس، ۱۹۱۷ء

۲۔ اشوک اعظم، محمد حفیظ، دہلی، انجمن ترقی اردو، س ن،

(از محقق)

حوالہ جات

۱۔ ابھینو ندل اتھاس، ص ۸۸، بھولا داس، مطبوعہ ابھینو گرنتھا گار، س ن

۲۔ الملل والنحل، ۲، ۱۳۵، الشہرستانی، عبدالکریم، مصر، مطبع مصطفیٰ البابی، ۱۲۱۵ھ

۳۔ مہابھارت، اویوگ پرب ادھیائے ۱۱، مترجم ماتھر دہلوی، منشی شری رام، دہلی
نولکشور، ۱۹۱۴ء

۴۔ مہابھارت شانتی پرب حصہ سوم ادھیاے، ۱۷۹

۵۔ مقامات مظہری (مترجم)، ص ۹۸۔۴۹۷، مجددی، دہلوی، غلام علی شاہ، مترجم محمد
اقبال مجددی، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۳ء

۶۔ مہابھارت بن پرب ادھیاے، ۱۷ ۷۔ محولہ بالا

۸۔ مہابھارت شانتی پرب ادھیاے، ۲۳ ۹۔ محولہ بالا

Marfat.com

۱۰۔ محولہ بالا

۱۱۔ محولہ بالا

۱۲۔ محولہ بالا

۱۳۔ محولہ بالا

۱۴۔ یونس/۳

۱۵۔ مہابھارت ادیوگ ادھیاے ۱۱

۱۶۔ سبھا پرب ادھیاے ۱۴

۱۷۔ فاطر/۲

۱۸۔ مہابھارت ادیوگ ادھیاے ۱۱

۱۹۔ مہابھارت بن پرب ادھیاے ۹

۲۰۔ محولہ بالا

۲۱۔ محولہ بالا

۲۲۔ البقرہ/۱۴۱

۲۳۔ ھود/۱۱۴

۲۴۔ آل عمران/۱۳۶۔۱۳۵

۲۵۔ مہابھارت بن پرب ادھیاے ۹

۲۶۔ محولہ بالا

۲۷۔ محولہ بالا

۲۸۔ مہابھارت انوساس پرب ادھیاے ۱۴

۲۹۔ محولہ بالا

۳۰۔ محولہ بالا

۳۱۔ محولہ بالا

۳۲۔ محولہ بالا

۳۳۔ مہابھارت شانتی پرب ادھیاے ۱۲

۳۴۔ ایضاً، ۱۴

۳۵۔ مہابھارت شانتی پرب ادھیاے ۱۴

۳۶۔ ایضاً، ۴۹

۳۷۔ النساء/۲۶

۳۸۔ یوسف/۷۵

۳۹۔ مہابھارت شانتی پرب ادھیاے ۸

۴۰۔ محولہ بالا

۴۱۔ مہابھارت انوساسن پرب ادھیاے ۲۰

۴۲۔ مہابھارت شانتی پرب ادھیاے ۹

۴۳۔ محولہ بالا

۴۴۔ محولہ بالا

۴۵۔ مہا بھارت شانتی پرب ادھیاے

۵۸۔ محولہ بالا

۴۶۔ محولہ بالا

۴۷۔ مہابھارت بن پرب ادھیاے ۹

۴۸۔ مہابھارت استری پرب ادھیاے ۳

۴۹۔ محولہ بالا

۵۰۔ مہابھارت شانتی پرب ادھیاے ۱۷،

۵۱۔ محولہ بالا

۵۲۔ Early History of India, p-198, Vincent A. Smith, England, Oxford Press; 1924

Marfat.com

مسئلہ سود مسلم و حربی میں (الف)

معارف ماہ مئی ۴۵ء میں مخدوم و محترم والا مرتبت حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کا جو مقالہ مندرجہ عنوان مسئلہ کے متعلق خاکسار کے بعض خیالات اور دعاوی کی تنقید و تردید میں شائع ہوا ہے، اسی کے متعلق حسب ذیل سطروں میں باادب مولانا کی خدمت میں خصوصاً اور ناظرین معارف کی خدمت میں جن حضرات کو مسئلہ سے دلچسپی ہے، عموماً اپنی ناچیز معلومات کے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ بلکہ سچ پوچھیے تو مولانا سے زیادہ میرا روئے سخن ناظرین ہی کی طرف ہے، کیونکہ مولانائے موصوف کے لیے تو شاید چند اشاروں کی طرف توجہ دلانا ہی غالباً کافی ہوتا، میں مولانا سے معافی چاہتا ہوں کہ بعض غیر ضروری تمہیدی امور کا محض ان حضرات کی خاطر سے اندراج ضروری خیال کر رہا ہوں، جو فقہ اسلامی میں عالمانہ بصیرت نہیں رکھتے۔ مولانا کی تحریر سے اس کا اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے امام اور مجتہد کے متعلق بعض غلط فہمیاں نہ پیدا ہو جائیں اور ایک غرض اس مضمون کی اشاعت سے یہ بھی ہے۔ اگرچہ مولانا کے مضمون کے اس پہلو سے مجھے مسرت بھی ہوئی کہ ہم اربابِ تقلید پر اپنے اپنے ائمہ اجتہاد کے متعلق بے جا طرف داری کا جو الزام لگایا جاتا ہے اس کی تردید کے لیے منجملہ دوسری شہادتوں کے ایک تر و تازہ شہادت مولانا کا یہ مضمون بھی ہے۔ یعنی باوجود حنفی اور غالی حنفی ہونے کے مولانا ظفر احمد صاحب نے اپنے

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں نومبر، ۱۹۴۵ء۔ دسمبر ۱۹۴٦ء کو چار اقساط میں شائع ہوا۔

Marfat.com

امام کی یہی نہیں کہ خود بے جا طرفداری نہیں فرمائی بلکہ دوسرے کو (یعنی فقیہ کو) بھی اس سے روکا ہے اور آپ کے نزدیک انصاف کی جو بات تھی اس کو پیش نظر رکھ کر اپنے ایک نیازمند کو ٹوکا ہے۔ فجزاہ اللہ عنا وعن الاحناف خیر الجزاء

۱۔

اب اس مضمون کے متعلق چند تمہیدی مقدمات کو پہلے پیش کرتا ہوں اس کے بعد جو کچھ عرض کرنا ہے، عرض کروں گا۔

عام مذاہب و ادیان میں جیسے انسانی جان و مال کے احترام پر زور دیا گیا ہے، اسلام نے بھی اس باب میں اگرچہ اپنا کافی حصہ ادا کیا ہے لیکن علاوہ ایک مذہبی دعوت ہونے کے اسلام چونکہ ایک مستقل آئین اور باضابطہ دستور بھی ہے، اسی حیثیت سے زمین کے بہت بڑے حصہ پر صدیوں بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ ہزار سال اور ہزار سال سے بھی زیادہ مدت تک حکومتوں نے اس کا استعمال بھی کیا ہے۔ اس لیے احترام نفوس و اموال کے باب میں اس کو قانونی اور آئینی نقطہ نظر کو اپنے سامنے رکھنا پڑا ہے۔

۲۔

فقہائے اسلام نے اس قسم کی قرآنی آیتیں مثلاً

﴿ان اللہ بری من المشرکین و رسولہ﴾ (۱)

''قطعاً اللہ بری ہے مشرکوں سے اور رسول بھی (ان مشرکوں سے بری ہیں)''۔

یا اس قسم کی مشہور و معروف حدیثیں جیسے صحاح ستہ کی یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ فمن قال ذلک

Marfat.com

عصم منی مالہ و نفسہ "(۲) ۔

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے میں اس وقت تک جنگ کیے چلا جاؤں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کریں۔ پس جس نے اس (کلمہ) کا اقرار کر لیا محفوظ اور معصوم ہو گیا، اس کا مال اور اس کی جان مجھ سے"۔

الغرض یہ اور اس قسم کے نصوص و آثار کو سامنے رکھ کر نفوس و اموال کو اسلامی قانون کی رو سے دو قسموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یعنی نفوس و اموال کی ایک قسم تو وہ ہے جس کی حفاظت و احترام کی ذمہ داری اسلام میں لی گئی ہے اور دوسری قسم وہ ہے جس کے متعلق اس قسم کی ذمہ داری اسلام نے نہیں لی ہے۔ پہلی قسم کی اصطلاحاً معصومہ نفوس و اموال سے اور دوسری کی غیر معصومہ اموال ونفوس سے تعبیر کی جاتی ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے متعلق خدا اور خدا کے رسول کی طرف سے قرآن میں برات کا اعلان کیا گیا ہو تو اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کی جان و مال کا ذمہ دار اللہ اور اس کا رسول نہیں ہے۔ یعنی ان کے اموال ونفوس میں تصرف کرنے والوں سے کوئی باز پرس نہ ہوگی اور یہی معنی غیر معصوم ہونے کے ہیں۔ ان مواقع پر فقہاء "مباح" کا لفظ جو بولتے اور لکھتے ہیں اس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے، گویا قرآن وحدیث سے جو کچھ سمجھا جاتا ہے اس کی تعبیر اس لفظ سے کرتے ہیں۔

۳۔

لیکن اسی کے ساتھ اسلام ہی کا ایک عام قانون ہے جس کا نام قانون معاہدہ ہے، یعنی عہد کرنے کے بعد جن باتوں کا عہد کیا جاتا ہے ان کی تکمیل اور ان کا ایفاء بھی مسلمانوں کے اہم دینی فرائض میں شامل ہو جاتا ہے،

Marfat.com

خواہ یہ وعدہ مسلمانوں سے کیا گیا ہو یا غیر مسلمانوں سے۔ قرآنی آیات:

﴿اوفوا بالعقود﴾ (۳)

''معاہدہ کو پورا کرو''۔

﴿ان العهد كان مسئولا﴾ (۴)

''قطعاً عہد و پیمان سے سوال کیا جائے گا''۔

﴿اتموا اليهم عهدهم﴾ (۵)

''پورا کرو ان کے ساتھ عہد کو''۔

وغیرہ میں بکثرت مسلمانوں کو اس فرض کی تعمیل پر سختی سے متوجہ کیا گیا ہے اور حدیثوں میں تو ایفاء وعہد کے متعلق جو ذخیرہ پایا جاتا ہے اور جن جن شکلوں میں اس کی اہمیت جتلائی گئی ہے اگر سب کو یہاں درج کیا جائے تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان ہی قرآنی نصوص اور پیغمبر اسلام ﷺ کی حدیثوں سے، آپ کے طرز عمل سے یہ قانون پیدا کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت سے یہ وعدہ لے کر کہ ان کی جان و مال وعزت کی حفاظت کی ذمہ داری لی جائے گی جو غیر مسلم قومیں ان کے علاقہ میں بود و باش اور دوامی سکونت اختیار کریں یا وقتی طور پر کچھ دن کے لیے ان کے قلمرو میں اس معاہدہ کے ساتھ داخل ہوں کہ نہ تو وہ امن و امان کے قانون کی خلاف ورزی کریں گے اور نہ مسلمان ان کی جان و مال وعزت کے ساتھ کوئی غیر قانونی برتاؤ کریں گے۔ معاہدے کی پہلی شکل کا نام ''عہد ذمہ'' اور دوسری شکل کا نام ''عہد استیمان'' ہے۔ بہر حال یہ ہو یا نہ ہو ہر حال میں اس معاہدہ کے بعد اس کا ایفاء مسلمانوں کا ایک اہم ترین دینی فرض اور مذہبی ذمہ داری ہے۔ اس معاہدہ کی خلاف ورزی کا اصطلاحی نام غدر اور عہد شکنی ہے، جس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ نفوس و اموال کے معصوم

محفوظ ہونے کی جیسے ایک قانونی شکل وہ تھی جس کا پہلے حصہ میں ذکر کیا گیا ہے، اسی طرح ایفائے عہد کا یہ فرض اور غدر و قانون شکنی کی حرمت و ممانعت دوسری شکل ہے۔ جو مذکورہ بالا معاہدہ کرنے والوں کی جان و مال کو معصوم و محفوظ اسلامی آئین و دستور کے رو سے کر دیتا ہے۔

اسی لیے یہ سمجھا جاتا ہے کہ احترام نفوس کے متعلق اس قسم کی قرآنی آیتیں مثلاً

﴿لا تقتلوا انفسکم﴾ (۲)

''نہ قتل کرو باہم اپنے آپ کو''۔

یا اموال کے احترام کے متعلقہ نصوص مثلاً:

﴿لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم﴾ (۷)

''اور باطل (یعنی غیر آئینی طور پر) باہم ایک دوسرے کا مال نہ کھایا کرو، الا یہ کہ باہمی رضامندی سے تجارت (کا طریقہ لین دین میں اختیار کیا جائے)''۔

وغیرہا میں جن جانوں اور جن اموال کے احترام کا مطالبہ کیا گیا ہے ان سے مراد وہی نفوس اور اموال ہیں جو اسلامی آئین کی رو سے عصمت و حفاظت کے دائرے میں داخل ہو چکے ہیں، یعنی نفوس معصومہ اور اموال معصومہ ہی سے ان کا تعلق ہے اور وہی ان احکام کے مورد خاص ہیں۔

اسی لیے اس قسم کا استدلال کہ جہاد میں مسلمان کو چونکہ قتل نفس کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے اور قتل نفس نص قطعی کے رو سے حرام ہے، اس لیے جہاد بھی

Marfat.com

حرام ہے۔ ایک مضحکہ خیز استدلال ہے، زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ کیونکہ جہاد میں جن نفوس کے قتل کا ارتکاب ناگزیر ہے وہ ان آیتوں کے دائرہ خطاب میں داخل ہی نہیں ہیں جن کا احترام اور جن کی حفاظت مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے۔

اور جو حال نفوس کا ہے وہی حال اموال کا ہے۔ یعنی یہ قرار دیتے ہوئے کہ اموال کے لین دین میں قرآن نے چونکہ باہمی رضامندی کو مشروط کر دیا ہے اس لیے غنیمت اور فئی کے نام سے دوسروں کا مال لینا ناجائز ہے۔ اگر کوئی اس قسم کی بات کرے تو اس سے بھی یہی کہا جائے گا کہ اموال کے احترام کا جن نصوص میں مطالبہ کیا گیا ہے آپ نے سمجھا ہی نہیں کہ ان کا تعلق معصومہ اموال سے ہے ورنہ غیر معصومہ اموال کے متعلق تو قرآن ہی میں:

﴿فکلوہ مما غنمتم حلالاً طیباً﴾ (۸)

''پس کھاؤ (اس مال کو جو بہ غنیمت حاصل ہوا) حلال اور پاک و طیب (سمجھ کر)''۔

کا فتوئی موجود ہے۔ یہ فتوی ان ہی اموال کے متعلق دیا گیا ہے جنہیں مسلمان نہ خرید و فروخت کی راہ سے حاصل کرتے ہیں اور نہ ہبہ و وراثت و صدقہ و خیرات کی راہ سے یعنی مال والوں کی رضامندی کے بغیر بزور و قوت جو مال چھین لیا جاتا ہے اس کے متعلق حکم دیا گیا ہے کہ کھاؤ اس کو حلال اور صاف ستھرا طیب و پاک سمجھ کر۔ اس سے معلوم ہوا کہ باہمی رضامندی کی شرط جن اموال میں لگائی جاتی ہے ان کے دائرے ہی سے اموال کی یہ دوسری قسم خارج ہے جن کے متعلق مال والوں کی رضامندی کے حاصل کرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔

۵۔

اب یہاں فقہائے اسلام کی اس اصطلاح کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جن

Marfat.com

کے نفوس و اموال مسلمان ہونے کی وجہ سے یا مسلمانوں کی حکومت سے عہد ذمہ یا عہد امان کی تعمیل کرنے کی وجہ سے معصوم و محفوظ ہو جاتے ہیں، یہ مالی داد وستد، لین دین کے تعلقات کے لحاظ سے ان کا تو ایک طبقہ ہوا جس کا یہی مطلب ہے کہ باہم خود مسلمانوں کے ساتھ مسلمانوں کو لین دین کے جن قوانین کا پابند بنایا گیا ہے بجنسہ مسلمانوں کو وہی پابندیاں ذمیوں اور ان لوگوں کے ساتھ اختیار کرنی پڑیں گی جو امن کا معاہدہ کر کے مسلمانوں کی حکومت میں داخل ہوتے ہوں، شرح سیر کبیر میں ہے:

"و المستأمنون و اهل الذمة فی ذلک سواء"(۹)

''امن کا معاہدہ حاصل کر کے مسلمانوں کی حکومت کے حدود میں داخل ہونے والے غیر مسلم اور ذمی لوگ (یعنی اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا) دونوں اس معاملہ میں برابر ہیں''۔

ذلک کا اشارہ لین دین کے معاملات کی طرف ہے جس کا ذکر اس سے پہلے آیا ہے۔

بہر حال ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہوا جن کے نفوس و اموال کی عصمت وحفاظت کی ذمہ داری اسلامی دستور میں لی گئی ہے اور اسی کے مقابلہ میں دوسرا طبقہ وہ ہے جس نے عصمت وحفاظت کے ان اسلامی ذرائع کو اختیار کر کے اپنے نفوس و اموال کے محفوظ و معصوم کر لینے کا سامان نہ کیا، اصطلاحاً اسی طبقہ کی قانونی تعبیر الحربی کے لفظ سے فقہاء کرتے ہیں۔ یعنی نہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ اور لڑائی کرنے سے روکنے والی کوئی چیز ان کے پاس موجود ہے اور نہ مسلمانوں کو ان پر حملہ کرنے اور ان سے جنگ کرنے میں کوئی چیز مانع ہے۔ چونکہ عصمت وحفاظت کے ان آئینی ذرائع سے یہ طبقہ محروم ہے، جو اسلام نے

Marfat.com

مقرر کیے ہیں۔ اسی لیے قبضہ کرنے کے بعد مسلمان ان کے اموال کے مالک ہو جاتے ہیں، خواہ یہ قبضہ ان کی رضامندی سے کیا گیا ہو، یا بغیر رضامندی کے اس پر تو سارے ائمہ اسلام کا اتفاق ہے۔ البتہ اس کی برعکس صورت میں مسلمانوں کے اموال پر اگر اس الحربی طبقہ کو قبضہ حاصل ہو جائے تو کیا وہ بھی اسلامی قانون کی رو سے مسلمانوں کے اموال کے جائز مالک اسی طرح ہو جاتے ہیں جیسے مسلمانوں کو قبضہ کے بعد ان کے اموال کا جائز مالک قرار دیا جاتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کی طرف سے اس کا جواب بھی اثبات میں دیا گیا ہے۔ یعنی وہ بھی مسلمانوں کے مال پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد مالک ہو جاتے ہیں۔ حنفی فقہ کے متون کا مسئلہ ہے، ہدایہ میں ہے:

"ولو غلبوا علی اموالنا (العیاذ باللہ) ملکوھا "(۱۰)

''اگر حربیوں کا گروہ ہمارے اموال پر (خدانخواستہ) قبضہ حاصل کر لے، تو وہ بھی ان کا مالک ہو جاتا ہے''۔

مالک قرار دینے کی یہاں بھی وہی وجہ قرار دی گئی ہے کہ:

"لان الاستیلاء ورد علی مال مباح فلینعقد سبباً للملک کاستیلائنا علی اموالھم "(۱۱)

''اس لیے کہ حربیوں کا تسلط اور قبضہ ایسے مال پر ہوا ہے (جو ان کے لیے) مباح ہے پس ملک کا سبب ان کا یہی قبضہ بن جائے گا جیسے ہمارا قبضہ ان کے اموال پر ہمارے ملک کا سبب بن جاتا ہے''۔

جس کا مطلب وہی ہوا کہ عصمت وحفاظت کے ذرائع سے محروم ہونے کی وجہ سے جیسے ان کا مال مسلمانوں کے حق میں غیر معصوم اور مباح ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے اموال بھی ان کے لیے مباح ہیں۔ میں اپنی اصطلاح میں فقہ کے

اس قانون کو بین الاقوامی اباحت کے قانون کے الفاظ سے موسوم کرتا ہوں۔

۶۔

غیر معصوم مباح اموال کے متعلق یہ جو کہا گیا، کہ قبضہ کرنے کے بعد قبضہ کرنے والے ان کے مالک ہو جاتے ہیں، یہ ذرا مبہم سا جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قبضہ کو دیکھا جائے گا اگر حکومت کی پشت پناہی اور فوجی قوت کے زر سے یہ قبضہ حاصل ہوا ہے، تو ظاہر ہے کہ تقسیم سے پہلے حکومت اور اس کی ساری فوج جس کی امداد اور قوت سے یہ قبضہ حاصل ہوا ہے سب کا یہ مقبوضہ مال ایک مشترکہ سرمایہ ہے اس لیے جائز نہ ہوگا کہ قبل از تقسیم کوئی خاص آدمی خواہ اسی فوج کا سپاہی ہی کیوں نہ ہو، اس مال میں کسی قسم کا تصرف کرے، ہاں تقسیم کے بعد جس سپاہی کے قبضہ میں اس مال کا جتنا حصہ آئے گا وہ اپنے اس خاص حصہ پر چونکہ قابض ہوگا اس لیے اب اس کا وہ بلا شرکت غیرے جائز شخصی مالک ہے اور اب جائز ہے کہ جس قسم کا تصرف اس مال میں وہ چاہے کرے۔

غیر معصومہ اموال کی اسی قسم کا یعنی حکومت اور حکومت کی فوجی قوت کی پشت پناہی کے بغیر کسی مسلمان کے ہاتھ اگر لگ جائے تو ظاہر ہے کہ اس وقت حکومت اور فوج کو اس مال سے کیا تعلق؟ اسی لیے حکم اس کا یہ ہے جیسا کہ امام محمد نے سیر کبیر میں نقل کیا ہے۔ یعنی:

"هذا ليس بغنيمة بل هو احراز المباح" (۱۲)

"یہ غنیمت نہیں ہے، بلکہ ایک مباح مال کا سمیٹنا (اور اس پر قبضہ کرنا ہے)"۔

اسی لیے اس مال کا قبضہ کرنے والا ہی مالک ہو جاتا ہے۔ امام محمد ہی نے اسی کے بعد لکھا ہے:

"فيكون بمنزلة الاصطياد و الاحتشاش" (۱۳)

Marfat.com

''اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے شکار کرنے والا شکار کا مالک قبضہ کرنے کے بعد ہو جاتا ہے یا گھاس گڑھنے والا ہو جاتا ہے''۔

ابن ہمام نے بھی الغنیمۃ کی یہ تعریف کرتے ہوئے یعنی:

"الغنیمة ما اخذ قهراً و غلبة "(۱۴)

''غنیمت اس مال کا نام ہے جسے بزور غلبہ حاصل کیا گیا ہو''۔

ان غیر معصومہ مال کے متعلق جن پر قہراً و غلبۃً قبضہ نہ کیا گیا ہو لکھا ہے کہ:

"انما یا خذ بحیلة فکان هذا اکتسابا مباحا من المباحات کاحتطاب والاصطیاد "(۱۵)

''ان کو تو لینے والا اپنی خاص تدبیر سے حاصل کرتا ہے تو اس کے متعلق یہی سمجھا جائے گا کہ مباح اور جائز اموال میں سے کسی مباح مال کا یہ کما لینا ہے جیسے جنگل کی لکڑی کو لکڑ ہارے حاصل کرتے ہیں، یا شکاری شکار پر قبضہ کرتے ہیں''۔

اور چونکہ یہ قبضہ شخصی جدو جہد کا نتیجہ ہوتا ہے، اسی لیے سیر کبیر میں یہ کلیہ درج کر کے:

"فی کل موضع یکون للمصاب حکم الغنیمة فالآخذ و غیره فیه سواء وفی کل موضع لا یکون للمصاب حکم الغنیمة "(۱۶)

''ایسا مال جو مسلمانوں کو غنیمت کی مد میں ہاتھ لگے تو اس کا قاعدہ یہ ہے کہ مال کا حاصل کرنے والا اور اس کے سوا دوسرے لوگ (یعنی فوج کے دوسرے افراد) اس مال میں مساوی حق رکھتے ہیں لیکن (اسی قسم کے مباح اموال جو غنیمت کی نوعیت نہیں رکھتے)''۔

Marfat.com

تو پھر اس کا وہی حکم ہے کہ:

"فان الأخذ يختص به"(۱۷)

"تو (ان کا کلی قاعدہ یہ ہے) کہ قبضہ کرنے والے کی وہ مخصوص ملکیت ہوگی"۔

اور اسی قسم کے مملوکات شخصیہ کے متعلق امام محمد کی اسی کتاب میں دوسری جگہ ہے:

"فالما خوذ لمن اخذه ولا خمس فيه"(۱۸)

"پس جو مال اس راہ سے حاصل کیا جائے گا وہ اسی کا ہوگا جس نے اسے حاصل کیا ہو اور اس مال میں (خمس) یعنی پانچواں حصہ (حکومت) کا نہ ہوگا"۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ خمس تو حکومت کا حصہ ہوتا ہے جب حکومت کی امداد ہی اس قبضہ میں شریک نہیں ہے تو اس کا حصہ اس میں کیوں ہونے لگا۔

بہر حال مجھے کہنا یہ ہے کہ اموالِ غیر معصومہ کے مالک ہونے کی یہ دونوں صورتیں درحقیقت مبنی تو اسی پر ہیں کہ یہ مباح اموال ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری ان کی طرف سے اٹھا لی گئی ہے۔ البتہ داخل نہیں ہے، اس کا اثر بھی اجتماعی نہیں ہے۔

یہ خیال کہ غنیمت کا مال چونکہ لڑائی بھڑائی اور جنگ و جدال میں حاصل ہوتا ہے اس لیے اس کو حلال کیا گیا ہے اگرچہ ایک عامیانہ خیال ہے لیکن عوام ہی کے لیے میں کہتا ہوں کہ جنگ کو اگر اموالِ غنیمت کے حلال ہونے میں دخل ہوتا، یعنی غیر معصوم ہونے کی جو وجہ ہمارے فقہاء نے قرار دی ہے اگر ان اموال کی حلت کی وجہ یہ نہ ہوتی بلکہ لڑائی اور جنگ میں حاصل ہونا یہی بات ان کے حلال ہونے کی وجہ ہوتی، تو چاہیے تھا کہ حکومت سے باغی مسلمانوں کا جو مال جنگ میں

ہاتھ آتا ہے وہ بھی مال غنیمت بن کر قبضہ کرنے والوں پر حلال ہو جاتا لیکن فقہ کا یہ عام مسئلہ ہے۔ سیر کبیر میں بیسیوں جگہ یہ مسئلہ مذکور ہے:

"مال المسلم لا یکون غنیمة للمسمین بحال کاموال اهل البغی"(۱۹)

"مسلمانوں کا مال مسلمانوں کے لیے کسی حال میں غنیمت نہیں بن سکتا، مثلاً حکومت کے باغیوں سے (لڑائی) میں جو مال حاصل ہو، وہ غنیمت نہیں بن سکتا"۔

ابن ہمام نے فتح القدیر میں لکھا ہے:

"لا یقسمها حتی یتوبوا فیردها علیهم و علی ورثتهم"(۲۰)

"چاہیے کہ باغیوں کے اس مال کو مسلمان آپس میں غنیمت بنا کر تقسیم نہ کریں بلکہ انتظار کیا جائے کہ (باغی افراد) توبہ کر لیں (توبہ کر لینے کے بعد) ان کا مال ان ہی کو واپس کر دیا جائے گا (اور اگر وہ خود موجود نہ ہوں) تو ان کے وارثوں کو یہ مال واپس کرنا پڑے گا"۔

اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان کا مال بہر حال معصوم ہے اور معصوم مال کے مالک ہونے کی صورت وہی ہے جسے اسلام نے لین دین کے جائز قانونی ذرائع قرار دیئے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ حرب یا لڑائی کو غنیت کے اموال کی حلت میں دخل نہیں ہے بلکہ ان کا غیر معصوم ہونا یہی اصلی وجہ ہے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، قبضہ چونکہ اموال غنیمت پر اجتماعی قوت سے حاصل کیا جاتا ہے اس لیے شخصی تصرف کی اجازت قبضہ کرنے والوں کو تقسیم سے پہلے کی فہرست بھی مختصر نہیں ہے، فتح القدیر میں ہے:

"کاللحم المطبوخ والخبز والزبیب والعسل والسکر الفاکهة

الیابسة والرطبة والبصل والشعیر والتین والادھان الماکولة کالزیت والسمن فلھم الاکل والادھان بتلک الادھان "(۲۱)

''پکا ہوا گوشت، روئی، کشمش، شہد، شکر، پھل، خواہ خشک ہوں یا تر، پیاز، جو، انجیر اور تیل جو کھانے میں مستعمل ہوں اور گھی تو ان چیزوں کو (تقسیم سے پہلے بھی) فوج کے سپاہی (انفرادی طور پر) کھا سکتے ہیں اور تیل کی مالش کر سکتے ہیں''۔

ان چیزوں میں شخصی تصرفات کی اجازت نہ صرف تقسیم سے پہلے دی گئی ہے بلکہ استعمال کے لیے اسلامی حکومت کے حدود میں بھی ان کو لانے کی ضرورت نہیں، بخلاف غنیمت کے دیگر اموال کے کہ عسکری قوت سے چونکہ یہ چھینے جاتے ہیں، اور جن سے فوج چھینتی ہے وہ بھی فوج ہی ہوتی ہے اس لیے سمجھا یہ جاتا ہے کہ اسلامی حدود میں داخل ہونے سے پہلے مسلمانوں کا قبضہ ان پر مستحکم نہیں ہوا ہے اور نہ واقع میں ہوتا ہے بلکہ زوال کے شدید خطرے میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک دشمن ہی کے ملک میں مال ہے اور جب قبضہ ہی مکمل نہیں ہوا تو ملکیت کی تکمیل بھی سمجھی جائے گی، کہ جیسی چاہیے نہیں ہوئی لیکن فوری ضرورت کی چیزیں مثلاً غذا، ایندھن وغیرہ کے متعلق اجازت دے دی گئی ہے۔ وجہ وہی ہے کہ حلال ہونے کی اصلی وجہ تو بہر حال اس میں پائی ہی جا رہی ہے، یعنی ان اموال کا غیر معصوم اور مباح ہونا۔

۷۔

ایک مختصر سی بات پہلے ہی سے طے کر لینے کی یہ بھی ہے کہ اگرچہ بدیہی اور واضح امر ہے لیکن سمجھ لینا اس کو چاہیے پہلے ہی، اور وہ یہ کہ شراب بیچنے والے کسی مسلمان پر اگر اسلامی حکومت یہ الزام قائم کرے کہ اس معاملہ کے کرنے پر

تم نے رضامندی کیوں ظاہر کی، تو اس کا یہ جواب کیا صحیح ہوگا کہ بوجہ مسلمان ہونے کے میرا کیا ہوا، یہ معاملہ صحیح کب ہوا اور چونکہ معاملہ صحیح نہیں ہوا اس لیے میری رضامندی بھی اس معاملہ کے کرنے پر ثابت نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس کی یہ بات کتنی مہمل اور غلط ہوگی، معاملہ کا صحیح ہونا نہ ہونا یہ اور بات ہے اور اس معاملہ کو کرنے پر یعنی شراب کے بیچنے پر راضی ہو جانا یہ دوسری بات ہے، یہ تو ایک واقعہ ہے کہ شراب کے بیچنے پر وہ راضی ہوا تھا اب مسلمان کے لیے اس قسم کے محرمات کی تجارت چونکہ ناجائز وحرام ہے اس لیے شرعاً اس کا یہ کیا ہوا معاملہ صحیح نہ ہوا بہر حال کسی معاملہ کا صحیح ہونا نہ ہونا یہ الگ چیز ہے اور اس معاملہ کے کرنے پر راضی ہو جانا دوسرا مسئلہ ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا بات بالکل معمولی ہے۔ لیکن ہم آئندہ جو کچھ کہنے والے ہیں اس کے لیے اس نکتہ کا ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ خیر یہ سب تو تمہیدی مقدمات تھے اصل مسئلہ آپ کے سامنے اب آتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اسی ''بین الاقوامی اباحت'' کے کلی ضابطہ کی ظاہر ہے کہ سینکڑوں جزئیاتی صورتیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ فقہائے اسلام جیسا کہ ان کا دستور ہے ممکنہ حد تک ان جزئیات کو پیدا کر کے ان کے خاص حالات کے لحاظ سے جو حکم ان کا ہوسکتا تھا، اسے بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ مثلاً ابھی آپ نے دیکھا کہ حکومت اور فوج کی قوت سے جب قبضہ حاصل ہو تو اس کا حکم اور ہے اور یہی قبضہ بغیر حکومت و فوج کے جب میسر آئے تو اس کا حکم دوسرا ہے پھر فوجی مقبوضات کی بعض چیزیں مستثنیٰ بھی کی گئی ہیں۔ الغرض جیسے حالات ہوئے ہیں ان ہی کو پیش نظر رکھ کر جو حکم ان کا کتاب وسنت کی روشنی میں نظر آیا ہے لوگوں نے اس کو بیان کیا ہے۔

ان جزئیات میں سے ایک خاص صورت مسئلہ کی یہ ہے کہ کسی غیر اسلامی قلمرو میں ایک مسلمان امن و امان کا معاہدہ کر کے مقیم ہے، جس کا ظاہر مطلب یہی ہے کہ امن و امان کو قائم کرنے کے لیے جو قوانین اس غیر اسلامی حکومت نے نافذ کیے ہیں، ان کی پابندی کر کے وہ عہد کرتا ہے کہ اس ملک میں زندگی گزارے گا۔ مثلاً چوری، ڈاکہ، فریب، دھوکہ وغیرہ جیسے امور اس حکومت کے آئین میں اگر ناجائز ٹھہرائے گئے ہیں تو یقیناً اس مسلمان پر واجب ہوگا اور اپنے اس معاہدہ کی رو سے وہ پابند ہے کہ اس حکومت کے باشندوں کی کسی چیز کو ان غیر قانونی ذرائع سے لینے کی نہ کوشش کرے گا اور نہ لے گا۔ اس کی خلاف ورزی غدر کے جرم کا مجرم خود اسلامی قانون اس کو قرار دے گا۔ یہی ہمارے فقہاء کا مذہب بھی ہے بلکہ انہوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ لین دین کا کوئی ذریعہ اسلامی شریعت میں اگر جائز بھی ہو لیکن اس غیر اسلامی حکومت کے آئین میں مثلاً ناجائز ہو تو اس وقت اپنے معاہدہ کے رو سے اس فعل سے بھی اس کو باز رہنا پڑے گا۔ خلاف ورزی کرے گا تو عہد شکنی کے جرم میں مجرم ہوگا۔ امام محمد نے مثلاً لکھا ہے کہ اسلامی قانون کی رو سے فرض کرو کہ کوئی بات کسی سودے میں عیب نہ ہو لیکن اس غیر اسلامی حکومت کے قانون میں اگر وہ عیب ہے تو اس عیب پر مطلع کیے بغیر کسی خریدار کو اس سودے کا دینا یہ بھی فریب و خیانت اور غدر سمجھا جائے گا۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

''لیس له ان یدلس لهم العیب فیما یبیعه منهم مما یجوز مثله فی دار الاسلام ولا یجوز''(۲۲)

''(امن لے کر کسی اسلامی علاقہ میں داخل ہونے والے مسلمان) کے لیے جائز نہ ہوگا کہ خرید و فروخت کی چیزوں میں وہ تدلیس سے کام لے، (یعنی

عیب پوشی کر کے مال بیچے) خواہ اس عیب کے ساتھ اسلامی قانون کے رو سے اس مال کا بیچنا جائز ہو یا نا جائز ہو''۔

جس کا حاصل یہی ہوا کہ امان کے اس معاہدے کے پابند ہو جانے کے بعد جب تک اس غیر اسلامی قلمرو میں اس مسلمان کا قیام رہے گا اس کو لین دین کے سارے معاملات میں اسی غیر اسلامی حکومت کے قوانین کی پابندی خود اسلام کی رو سے ضروری ہوگی اس پر لازم ہوگا کہ عہد شکنی اور غدر کی تمام صورتوں سے احتراز کرے۔ ایک مشہور حدیث جس میں ان ہی مواقع پر عہد شکنی اور غدر سے رسول اللہ ﷺ نے بشدت ممانعت فرمائی ہے۔ سیر کبیر سے نقل کرنے کے بعد علامہ شمس الائمہ سرخسی نے بطور فتویٰ کے یہ نتیجہ نقل کیا ہے کہ:

"و فی ھذا دلیل علی وجوب التحرز عما یشبه الغدر صورة و معنی "(۲۳)

''یہ دلیل ہے اس بات کی کہ غدر سے مشابہ جو باتیں بھی ہوں گی ان سے پرہیز (اس مستامن) مسلمان کے لیے ضروری ہے خواہ واقعہ میں وہ غدر اور عہد شکنی ہو یا اس کی صورت غدر و عہد شکنی کے مشابہ ہو''۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ''بین الاقوامی اباحت'' کے قانون کو بنیاد بنا کر جو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اسلام نے ہر حال میں اس بات کی اجازت دے رکھی ہے کہ جس طرح چاہیں اور جب چاہیں، جہاں چاہیں، غیر مسلم اقوام کا مال لوٹ لیں، چھین لیں، چوری کر لیں۔ یہ کتنا بڑا اسلام اور مسلمانوں پر بہتان ہے۔

کسی غیر اسلامی حکومت اور اس کے باشندوں کے ساتھ امن و امان کی صحیح قانونی اور آئینی زندگی بسر کرنے کی شکل اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ

Marfat.com

مسلمانوں کو لین دین کے ان معاملات میں اسی غیر اسلامی حکومت کے قوانین کی پابندی پر مذہباً مجبور کیا جا رہا ہے اور ان قوانین کی خلاف ورزی دینی حیثیت سے ان کے لیے اس حد تک ناجائز قرار دی گئی ہے کہ صورۃً ہی نہیں بلکہ معناً خلاف ورزی بھی ان کے لیے ممنوع ہے۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ صورۃً اگر جواز کی شکل پیدا بھی ہو رہی ہو جب بھی قانون کی اس ظاہری شکل سے ناجائز نفع اٹھانے تک کا موقع اسلام نے مسلمانوں کے لیے باقی نہیں رکھا ہے چہ جائیکہ ان حالات میں غیر اقوام کے اموال کو چوری یا سینہ زوری سے لینا العیاذ باللہ جائز ہو۔

اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ معاہدہ قالاً کیا جائے یا حالاً کیا جائے ہر حال میں وہ معاہدہ ہی سمجھا جائے گا۔ مسلمانوں کے ملک میں غیر اقوام کے لوگ اگر داخل ہوں اور تحریراً اور تقریراً معاہدہ نہ بھی کریں لیکن جس حال کے ساتھ ان کا داخلہ ملک میں ہو وہ دلالت کر رہا ہو کہ وہ امن و امان کے ساتھ رہنے اور کاروبار کرنے کے لیے آئے ہیں تو ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جو تحریری یا تقریری معاہدہ کرنے والوں کے ساتھ کرنا چاہیے۔ امام محمد نے اسی مسئلہ کو جہاں بیان کیا ہے، اس کی شرح کرتے ہوئے شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں:

"ان تجارهم هكذا يكون الحال بينهم و بين المسلمين يدخلون دار الاسلام من غير ان ينادوا لطلب الامان "(۲۴)

"غیر اقوام کے تاجروں کا بھی یہی حال مسلمانوں کے ساتھ ہے، یعنی وہ اسلامی علاقوں میں داخل ہوتے ہیں اور اس طور پر داخل ہوتے ہیں کہ امان کا مطالبہ اعلانیہ زبان سے نہیں کرتے"۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ امان کے اس معاہدہ کے لیے زبان سے کہنے یا قلم سے لکھنے کی ضرورت نہیں، حال بھی اس کے لیے کافی ہے، یعنی اپنا حال جو

Marfat.com

دلالت کرتا ہو کہ اس غیر اسلامی حکومت میں یہ مسلمان آئینی زندگی بسر کرنے کے ارادے سے داخل ہوا ہے۔ بس یہی چیز اس کو لین دین کے ان سارے قوانین کا مذہباً پابند بنا دے گی، جو اس ملک میں اس کی حکومت کی جانب سے نافذ ہوں، خواہ خود اپنے مذہب کی رو سے ان قوانین کی پابندی اس مسلمان کے لیے ضروری ہو یا ضروری نہ ہو۔

اور اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ مذہب کی صحیح پابندی اور سچی اسلامی زندگی مسلمانوں کو غیر اقوام کے مقابلہ میں کس درجہ امن پسند اور شریف ترین شہری بنا دینے میں ممد و معاون ہوسکتی ہے لیکن افسوس کہ مسلمانوں کے صحیح مذہب سے ناواقف لوگوں نے مسلمانوں پر قابو پانے کے بعد سب سے زیادہ جس چیز کی حوصلہ شکنی کی وہ ان کی مذہبی زندگی ہی کی۔ ان کے مذہب کا مہیب فرضی تصور قائم کیا گیا اور پابند مذہب مسلمانوں کو ایک خوفناک ڈراؤنا آدمی مان کر جس طرح بھی ممکن ہوا ان کی مذہبی تعلیم اور مذہبی زندگی کے پیدا کرنے کے طریقوں کو برباد کرنے کی کوشش کی گئی۔

میں کہتا ہوں کہ آج بھی پاکیزہ ترین امن پسند شہریوں کے پیدا کرنے کا ارادہ اگر حکومت کرنا چاہتی ہے تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی علوم، مذہبی تعلیم اور مذہبی زندگی کو پختہ کرنے کے جن ذرائع کو اس نے برباد کیا ہے، قصداً وعمداً برباد کیا ہے ان کو پھر زندہ کرے اور تجربہ کرے کہ مسلمان کا مذہب ان کو فسادی، شورش پسند، فتنہ انگیز قوم بناتا ہے یا ان کے شہروں اور دیہاتوں کو بہترین امن پسند شہریون اور آبادکاروں سے بھر دیتا ہے۔ یہی چند مسئلے جن کا ابھی ذکر ہوا ہے، دنیا کا کوئی مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں کو غیر اقوام کے ساتھ اتنے بچے تلے، صحیح تعلقات کے قائم کرنے کی تلقین

کرتا ہو۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، مسلمانوں پر مسلمانوں کے دین پر، ان کی دینی تعلیم پر ظلم کیا گیا ہے اور صرف غلط اوہام خود آفریدہ مفروضات کے زیر اثر ظلم کیا گیا ہے۔ ان کی مذہبی زندگی کے نظام کو تہس نہس کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ ان حالات کو دل دیکھتا ہے اور بے قابو ہو جاتا ہے۔ کاش! ہوتا کوئی جو مظلوموں کی آواز ظالموں تک پہنچاتا اور دنیا کی ایک بہترین امت صالحہ کی بربادی کا جو تہیہ کیا گیا ہے ظلم کرنے والوں کو ان کے اس ظالمانہ ارادہ سے باز رکھتا،

ع لکن لیس فی الدار دیار، و حسبی اللہ نعم الوکیل۔

ہاں! تو گفتگو اس میں ہو رہی تھی کہ غیر اسلامی قلمرو میں امن کے معاہدے کے ساتھ داخل ہونے والے اس مسلمان پر اسلام ہی کے قانون ایفائے عہد کی وجہ سے یہ پابندی عائد ہو جاتی ہے کہ جس چیز کا اس نے عہد کیا ہے اسے وہ پورا کرے، یعنی ملک کے قوانین نافذہ کی پابندی اس وقت تک کرتا رہے اور اس پابندی کو اپنا مذہبی اور دینی فرض سمجھے جب تک اس غیر اسلامی ملک میں اس کا قیام ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس معاہدے کی وجہ سے کیا وہ اس کا بھی پابند ہو جاتا ہے کہ جن اموال کو اسلام نے غیر معصوم قرار دیا ہے، ان کو بجائے غیر معصوم ہونے کے معصوم یقین کرے۔ شمس الائمہ سرخسی شرح سیر کبیر میں لکھتے ہیں:

"ان اموالھم لا تصیر معصومۃ بدخولہ الیھم بامان "(۲۵)

"امن کا معاہدہ کر کے غیر اسلامی قلمرو میں جو مسلمان داخل ہوتا ہے تو امن کے اس معاہدے کی وجہ سے (غیر مسلم اقوام کے اموال کے غیر معصوم ہونے کا جو قانون ہے وہ بدل نہیں جاتا، یعنی معصوم نہیں بن

Marfat.com

جاتا ہے)''۔

اور یہ ہے بھی کھلی ہوئی بات کہ پابندی تو اس پر لازم ہوگی ان ہی باتوں کی جن کا اس نے معاہدہ کیا ہے یعنی وہی بات کہ لین دین میں اس ملک کے نافذہ قوانین و آئین کی پابندی کرنے کا جو طریقہ اس ملک کے دستور میں غیر آئینی قرار دیا گیا ہو اس سے احتراز اپنے اس معاہدہ کی بنیاد پر اس پر مذہباً واجب ہے لیکن یہ بات کہ جن اموال کو خدا نے غیر معصوم قرار دیا ہے۔ قرآن میں جن ذمہ داریوں سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے برأت کا اعلان کیا گیا ہے ان ہی کے متعلق خواہ مخواہ آخر وہ یہ کیوں باور کرلے کہ وہ معصوم ہوگئے اس بات کا جب اس نے معاہدہ ہی نہیں کیا ہے تو اس کی پابندی بھی اس پر کیوں لازم ہوگی۔

بہرحال کچھ بھی ہو آپ دیکھ رہے ہیں کہ فقہائے اسلام کے نزدیک امن کا یہ معاہدہ اس مسلمان کے لیے ضروری نہیں ٹھہراتا کہ غیر معصوم اموال کو وہ بلاوجہ معصوم یقین کرنے لگے۔

اب ان امور کے طے ہونے کے بعد یہ سوال ہوتا ہے کہ اس غیر اسلامی حکومت کے قوانین نافذہ کی پابندی جیسے اس پر لازم ہے خواہ اسلام ان قوانین کا اسے پابند بناتا ہو اسی طرح اگر کوئی ایسی صورت میں آجائے جو اس کے برعکس ہو یعنی لین دین کا مثلاً ایک طریقہ اسلام میں ناجائز ہے مگر اس غیر اسلامی حکومت کے قوانین کی رو سے لین دین کا وہی طریقہ جائز قرار دیا گیا ہو اس ملک کے باشندے باہم رضامندی کے ساتھ اموال کا تبادلہ اس ذریعہ سے کرتے ہوں اور حکومت بھی ان ذرائع سے اپنے ملک کے آبادکاروں کو دیتی دلاتی ہو۔

اب لین دین کے انہی طریقوں سے جو اس ملک کے قانون کی رو سے

تو جائز طریقے ہیں لیکن اسلامی لین دین کی رو سے ناجائز ہیں ۔ ان ہی میں سے کسی ایک طریقہ سے غیر معصوم مال اس مسلمان کے ہاتھ لگتا ہے ۔ مثلاً شراب کے معاوضہ میں اسی ملک کے کسی غیر مسلم باشندے کے دس روپے اس مسلمان کے قبضہ میں آجاتے ہیں ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی آئین کے رو سے اس روپے کے متعلق کیا فتویٰ دیا جائے ؟ یہ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ شراب فروشی کا جو اس مسلمان نے کیا چونکہ اسلامی قانون کی رو سے ایک ناجائز معاملہ ہے یعنی کسی مسلمان کے لیے اس معاملہ کا کرنا جائز نہیں ہے اور اگر کوئی کرے گا تو معاملہ فاسد اور غلط قرار دیا جائے گا ۔ اس لیے بذاتِ خود تو یہ معاملہ یقیناً فاسد اور غلط ہوگیا کیونکہ اس کا کرنے والا مسلمان ، اور مسلمان خواہ کہیں ہو کسی ملک میں ہو، اپنے مذہب کے احکام کی پابندی ہر حال میں اس کے لیے ضروری ہے ۔ سیر کبیر میں امام محمد اپنے اور اپنے استاد امام ابو حنیفہ کا مذہب ہر جگہ یہی نقل کرتے چلے گئے ہیں کہ :

''المعاملة فی دار الحرب و دار الاسلام سواء فی حق المسلم ''(۲۶)

''مسلمانوں کے لیے معاملہ کی نوعیت دار الاسلام اور دار الحرب (یعنی اسلامی و غیر اسلامی قلمرو دونوں) میں برابر ہے''۔

اور شمس الائمہ سرخسی اسی کے بعد بطور تشریح کے لکھتے ہیں کہ

''لانہ مستلزم حکم الاسلام حیث ما یکون ''(۲۷)

''کیونکہ اسلامی احکام و قوانین کی پابندی کا ذمہ دار مسلمان ہر جگہ ہے، جہاں کہیں بھی وہ ہو''۔

پس کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں کا کیا ہوا یہ معاملہ بذات خود تو ختم ہوگیا لیکن سوال اس روپے کے متعلق ہے جو اس مسلمان کے ہاتھ میں پہنچ گیا ہے ظاہر

ہے کہ معاملہ اگر چہ بذاتِ خود ختم ہوگیا لیکن یہ بات کہ شراب لے کر دینے والے نے اس کو جو روپیہ دیا ہے وہ اپنی رضامندی سے دیا ہے کیا یہ بھی ایک واقعہ نہیں ہے؟ یقیناً اس کی مثال وہی ہے جس کا ذکر تمہیدی مقدمات میں میں نے کیا تھا کہ شراب بیچنے والے مسلمان کے معاملہ کو حکومت باطل بھی قرار دے لیکن اسی مسلمان پر یہ الزام اگر قائم کیا جائے کہ شراب بیچنے پر وہ راضی ہوگیا تھا تو اس واقعہ کا انکار اس وجہ سے وہ قطعاً نہیں کر سکتا کہ اس کے معاملہ کو تو حکومت نے فسخ کر دیا کیونکہ معاملہ لاکھ فسخ ہوا ہو مگر معاملہ تو اس نے اپنی رضامندی سے کیا تھا۔ اسی طرح جب غیر اسلامی ملک میں شراب لے کر روپیہ کا لین دین ایک عام قانونی فعل تھا تو دینے والے نے اس مسلمان کو یہ روپیہ یقیناً اپنی رضامندی سے دیا ہے اپنی حکومت کی رضامندی سے دیا ہے اور اس مسلمان نے روپیہ لینے کی حد تک قطعاً نہ اس غیر مسلم کو دھوکہ دیا ہے نہ اس نے فریب کیا ہے اور نہ اس غیر اسلامی حکومت کے کسی قانون کو توڑ کر عہد شکنی اور غدر کا مجرم ہوا ہے۔ ایک بات تو یہ ہوئی اور دوسری طرف وہ روپیہ ایک غیر معصوم مال ہے تو واقعہ کی صورت یہ ہوئی کہ حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کیے بغیر دینے والے کی رضامندی سے ایک غیر معصوم مال اس مسلمان کے قبضہ میں آیا ہے اور اب یہی سوال کی حقیقی صورت ہے۔ بتایا جائے کہ اس مال کے مالک ہونے اور اس میں تصرف کرنے سے اب اس مسلمان کو کون سی چیز روک سکتی ہے؟ دو ہی چیزیں روکنے والی ہو سکتی ہیں، مال کا معصوم ہونا، سو وہ بھی نہیں ہے۔ معاہدہ کی خلاف ورزی یعنی غدر کے جرم کا ارتکاب، آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں اس کا بھی کوئی شائبہ نہیں ہے۔ پس یہی امام ابو حنیفہ کا فتویٰ ہے کہ ایسی صورت میں اس مسلمان کے نہ مالک قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی ہے بلکہ ایک مباح مال پر بغیر کسی فریب

Marfat.com

اور غدر کے چونکہ اس کا قبضہ ہوگیا ہے اور اس قسم کا قبضہ مسلمان کو مال مباح کا چونکہ مالک بنا دیتا ہے اس لیے وہ اس کا مالک ہوگیا اور جیسا کہ ابن ہمام نے لکھا تھا:

"فکان ھذا اکتساباً مباحاً من المباحات کالاحتطاب و الاصطیاد"(۲۸)

''پس مباح اور جائز مال کا یہ کمانا اور حاصل کرنا ہوگا تو اس کی مثال ایسی ہوگی کہ لکڑ ہارے نے جنگل کی لکڑی کاٹی اور اس کا مالک ہوگیا یا شکار کا مالک شکاری شکار کرنے کے وجہ سے ہوجاتا ہے''۔

اس لیے وہی بات صادق آئی جو اموالِ غیر معصومہ کے قبضہ کے متعلق امام محمد کے حوالہ سے گذر چکی ہے کہ:

"فالماخوذ لمن اخذہ ولا خمس فیہ"(۲۹)

''پس جو مال اس راہ سے حاصل کیا گیا اور اسی کا ہوگا جس نے اسے حاصل کیا اور اس میں (حکومت کا) خمس (پانچواں حصہ) نہ ہوگا''۔

اور جس طرح شراب کے اس قصہ کا یہ حال ہے۔ یہی کیفیت لین دین کے ان تمام طریقوں کی ہوگی جو اسلامی قانون کے رو سے تو ناجائز ہیں لیکن جس حکومت سے امن کا معاہدہ کر کے وہ مسلمان اس کے قلمرو میں مقیم ہیں اس کے آئین میں ان معاملات کو لین دین کا جائز ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

شمس الائمہ سرخسی سیر کبیر میں ارقام فرمانے کے بعد:

"باعھم میتۃ او اخذ مالھم بطریق القمار فذلک کلہ طیب لہ"(۳۰)

''ان غیر مسلم لوگوں کے ہاتھ (اسی غیر اسلامی علاقہ میں اگر وہ مستامن مسلمان) مردار کو فروخت کرے یا جوئے کے ذریعہ سے ان کا مال لے

Marfat.com

تو یہ سب اس کے لیے طیب اور پاک ہے''۔

لکھتے ہیں کہ:

''ھذا کلہ قول ابی حنیفۃ و محمد رضی اللہ تعالیٰ عنھما ''(۳۱)

''یہ سارے فتوے امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے ہیں''۔

اور یہ تو خیر پھر بھی جزئیات ہیں۔ کلیہ اصلی یہ ہے کہ:

"اذا دخل المسلم دار الحرب بامان فلا باس بان یاخذ منھم اموالھم بطیب انفسھم بای وجہ کان ''(۳۲)

''امن کا معاہدہ کر کے غیر اسلامی قلمرو میں مسلمان جب داخل ہوا تو اس میں کچھ ہرج نہیں ہے کہ (اس غیر اسلامی علاقے کے غیر مسلم باشندوں) کے اموال کو ان کی رضامندی سے لے، خواہ یہ لینا کسی طریقہ سے ہو''۔

اور اسی بات کو جسے میں تفصیل سے بیان کر آیا ہوں وہ ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں کہ:

"لان اموالھم لا تصیر معصومۃ بدخولہ الیھم با مان و لکنہ ضمن بعقد الامان ان لا یخو نھم فعلیہ التحرز من الخیانۃ ''(۳۳)

''کیونکہ اس غیر اسلامی علاقے میں امن کا معاہدہ کر کے مسلمان کا ہونا اس کی وجہ سے (ان غیر مسلم اقوام) کا مال معصوم نہیں ہو جاتا البتہ امن کے معاہدہ نے اس مسلمان کو اس بات کا پابند بنا دیا ہے ان لوگوں کے ساتھ خیانت اور بد دیانتی نہ کرے اس لیے ضروری ہے کہ وہ خیانت اور بد دیانتی سے پرہیز کرے''۔

بہرحال یہاں سمجھ لینے کی کل اتنی سی بات ہے کہ اس مسلمان کو مالک جو اس غیر معصوم مال کا قبضہ کے بعد قرار دیا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ

اس معاہدہ کو العیاذ باللہ اس کے مالک ہونے میں کسی حیثیت سے بھی کچھ بھی دخل ہے۔ گذر چکا کہ اس راہ سے تو ایک پیسہ بھی لینا مسلمان کے لیے حرام ہے، خواہ وہ کسی علاقہ میں ہو۔ اسلامی میں ہو یا غیر اسلامی میں، بلکہ اسی لیے کہ اس معاملہ کے کرنے میں چونکہ مسلمان بھی شریک ہے اسی وقت وہ معاملہ فاسد اور غلط ہو کر رہ جائے گا لیکن باوجود غلط اور فاسد ہو جانے کے اس واقعہ کی دلیل ہونے سے اس معاملہ کے متعلق کیسے انکار کیا جاسکتا ہے کہ دینے والے نے مسلمان کو اپنا مال بغیر فریب اور دھوکہ کے قطعاً اپنی رضامندی سے دیا ہے۔ ایسے ذریعہ سے دیا ہے کہ بجائے مسلمان کے کوئی غیر مسلم اگر ہوتا تو یقیناً اس سے اس مال کو واپس لینے کا کوئی حق اس کو اس لیے نہیں ہوسکتا تھا کہ اپنی رضامندی سے اس نے دیا ہے اور واپس لینا بھی چاہے تو حکومت بزور اس واپسی سے اس کو روکے گی۔ پس رضامندی کے واقعہ کے ثبوت کے سوا بذاتِ خود یہ معاملہ کالعدم ہو جاتا ہے اور مسلمان اس مال کا مالک اس معاملہ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس بنیاد پر اس کو قرار دیا جاتا ہے کہ غیر معصوم مال کے قبضہ نے اس مالک کا مسلمان کو مالک بنا دیا ہے۔ امام محمد فرماتے ہیں:

"حین اخذ المال فانما اخذ المباح علی وجہ منعه من الغدر فیکون ذلک طیباً له "(۳۴)

''مسلمان نے اس مال کو جس وقت لیا تو اس طور پر لیا کہ ایک مباح اور جائز مال کو وہ اس طرح لے رہا ہے کہ عہد شکنی کے وہ منافی نہیں ہے۔ پس ایسا مال اس مسلمان کے لیے طیب اور پاک ہوگیا''۔

اسی مفہوم کو مبسوط میں شمس الائمہ نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

"یتملک المال بالاخذ لا بهذه الاسباب"(۳۵)

''مال کا مالک قبضہ کی وجہ سے ہو نہ کہ ان معاملات کی وجہ سے''

علامہ کاسانی نے اور مختصر فقرہ اسی کی تعبیر میں یہ لکھا ہے کہ:

"یثبت الملک بالاخذ لا بالعقد "(۳۶)

''ملک قبضہ کی وجہ سے ثابت ہوئی، نہ کہ معاملہ کی وجہ سے''۔

اب فرض کیجیے کہ کوئی غیر اسلامی حکومت ایسی ہے جس کے قانون میں بذریعہ ربوا یعنی سود رعایا کا مالی لین دین ناجائز ہے اور اسی ملک میں امن کا معاہدہ کر کے مسلمان داخل ہوا تو ظاہر ہے کہ ربوا کے ذریعہ سے کسی غیر معصوم مال پر قبضہ کرنے کا موقع اس کو اگر مل جائے تو اس کا وہ قطعاً مالک نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ یہ اس معاہدہ کی خلاف ورزی ہے جو اس غیر اسلامی حکومت سے اس نے کیا ہے لیکن یہ صورت اگر نہ ہو بلکہ جیسے شراب فروشی وغیرہ کے معاملات اس غیر اسلامی حکومت میں لین دین کے جائز ذرائع تھے اسی طرح سود (ربوا) بھی اس ملک کے قانون میں اگر لین دین کا جائز ذریعہ ہو اس ذریعہ سے جو روپیہ لوگوں کے ذمہ واجب ہوتا ہو دعویٰ کرنے پر حکومت اس کے دلانے کی ذمہ دار ہو تو سوال ہے کہ کسی غیر معصوم مال پر اس مسلمان کا قبضہ شراب والی نہیں، اسی ربوا والی صورت کے ساتھ ہو جائے تو ظاہر ہے جو جواب معاملات کی ان صورتوں میں دیا گیا تھا جن میں معاملہ بجائے خود غلط اور فاسد ہو کر ختم ہو جاتا تھا لیکن دینے والے کی رضامندی کی دلیل بن کر ختم ہوتا تھا۔ کیا ربوا میں بھی بجنسہ یہی ساری باتیں نہیں پائی جاتی ہیں چونکہ ربوا کے اس معاملہ کا کرنے والا ایک طرف مسلمان ہے اور مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، اس فعل کے کرنے کا مذہباً مجاز نہیں ہے۔ اس لیے اسلامی آئین کے رو سے یہ معاملہ یقیناً کالعدم ہو کر ختم ہو گیا لیکن اس کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ دینے والے نے بجائے دس کے مثلاً

اس مسلمان کو چوبیس روپے جو دیئے ہیں یقیناً اپنی رضامندی اپنی حکومت کی رضامندی سے دیئے ہیں۔ پھر جن بنیادوں پر مذکورہ بالا صورتوں میں کوئی چارہ اس کے سوا اسلامی اصول و قواعد کی بنا پر نہ تھا کہ ان غیر معصومہ اموال کا اس مسلمان کو مالک قبضہ کر لینے کے وجہ سے قرار دیا جائے تو بتایا جائے کہ ربوا والی اس شکل میں آپ مال کے ایک جائز آئینی مالک کے مالک ہونے سے کیسے انکار کر سکتے ہیں کس بنیاد پر کر سکتے ہیں۔

بلا شبہ اسلام میں سود حرام ہے لیکن سود کی تعریف جیسا کہ ملک العلماء کاسانی نے لکھا ہے:

"الربا اسم لفضل یستفاد بالعقد"(۳۷)

"ربوا (سود) اس زیادتی کا نام ہے جسے عقد اور معاملہ کے ذریعہ سے حاصل کیا جائے"۔

اور یہاں معاملہ جب سرے سے باطل ہو کر ختم ہی ہو گیا تو کسی مال کے بنانے کا ذریعہ بھلا وہ کیا ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ باطل ہونے والا معاملہ اس واقعہ کی قطعاً دلیل ہے کہ دس کے معاوضہ میں بیس روپیہ دینے والے نے اس مسلمان کو جو دیئے ہیں وہ اپنی اور اپنی حکومت کے قانون کی رضامندی سے دیئے ہیں۔ پھر کیا کسی واقعہ کو واقعہ ہی یقین کرنا یا جو چیز اس واقعہ پر دلالت کر رہی ہو اس کے متعلق یہ خیال کرنا کہ اس واقعہ پر وہ دلالت کر رہی ہے، یہ کوئی ناجائز بات ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس مقبوضہ کا مالک اس مسلمان کو نہ قرار دیا جائے، اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اور جو چیز ایک مسلمان کی ملک ہو چکی ہے، بتایا جائے کہ آخر کس دلیل سے اس بیچارے مسلمان کو اپنی جائز مملوکہ شئے کی ملک سے محروم کیا جائے۔ جو لوگ محروم کرنا چاہتے ہیں ان کو چاہیے کہ اس کو محروم قرار دینے پر

دلیل پیش کریں اور یہی تفصیل ہے حضرت امام ابو حنیفہؒ کے اس فتویٰ کی جو سیر کبیر اور اس کی شرح میں بایں الفاظ یا اسی کے قریب قریب دوسرے الفاظ میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً کبھی کہا جاتا ہے کہ:

"ان الربا لا یجری بین المسلم و الحربی فی دار الحرب "(۳۸)

''قطعاً ربوا (سود) مسلمان اور حربی کے درمیان جاری نہیں ہوتا غیر اسلامی حکومت کے قلمرو میں (یعنی دار الحرب میں)''۔

اسی کی تعبیر دوسرے الفاظ میں یوں کی گئی ہے۔ اسی سیر کبیر کی شرح میں ہے:

"لو باعهم در هما بد رهمین او باعهم میتة بدرا هم او اخذ مالاً منهم بطریق القمار فذلک کله طیب له "(۳۹)

''اگر وہی مستامن مسلمان ان لوگوں کے ساتھ (یعنی غیر اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ) یہ معاملہ کرے کہ ایک درہم کو دو درہم کے بدلے بیچے (یعنی سود لے) یا مردار فروخت کر کے درہم لے یا ان سے مال جوئے کی راہ سے لے تو یہ سارے اموال اس کے لیے طیب اور پاک ہیں''۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس مال کا مالک ان صورتوں میں اس مسلمان کو قرار دیا جا رہا ہے اور اس مملوکہ مال کے استعمال کو اس کے لیے طیب و پاک ٹھہرایا جا رہا ہے کہ مثلاً وہ سود اور سود کی آمدنی تھی اور باوجود سود اور سود کی آمدنی ہونے کے پھر بھی اس کو اس مسلمان کے لیے حلال ہونے کا فتویٰ العیاذ باللہ دیا جا رہا ہے بلکہ بات وہی ہے کہ مسلم و حربی کے درمیان ایسی صورت میں معاملہ ہوا ہی نہیں اور جس مال کا قبضہ کرنے کے بعد وہ مالک ہوا ہے سرے سے سود ہی نہیں، عام فقہاء کے الفاظ:

"لا ربوا بین المسلم و الحربی فی دارالحرب "(۴۰)

''مسلم اور حربی کے درمیان ربوا نہیں ہوتا دارالحرب میں''۔

جس کے متعلق یہ بھی دعویٰ کیا جاتا کہ مکحول کی حدیث کے یہ الفاظ ہیں وہ حدیث ہے یا نہیں اس کی بحث تو آگے آئے گی، سردست مجھے یہ کہنا ہے کہ اس کا مطلب بھی وہی ہے کہ سرے سے وہ ربوا ہی نہیں ہے جیسے اسی سے پہلے متون میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں:

"لا ربوا بین العبد والمولی "(۴۱)

''نہیں ربوا ہے آقا اور غلام کے درمیان''۔

یعنی عبد و غلام کا مال چونکہ غلام کا نہیں بلکہ مولیٰ (آقا) ہی کا مال ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ خود اپنا مال مالک کے لیے سود کیسے ہوسکتا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ چند مدوں میں تقسیم کر کے جو اپنی آمدنی جمع کرتا ہے ضرورت کے وقت ایک مد سے دس روپیہ لے کر خرچ کرے اور دوسری مد سے بجائے دس کے اس میں بیس روپیہ جمع کر دے تو کیا یہ سود ہوگا؟

بہر حال یہ ہے اس مسئلہ کی تفصیل جسے لوگوں نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کی طرف بایں الفاظ منسوب کر دیا ہے کہ وہ دارالحرب میں حربی سے سود لینے کو جائز سمجھتے ہیں۔ پھر اصل حقیقت سے جو ناواقف ہیں وہ اپنے قلوب میں امام صاحب کی طرف سے طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا کرتے ہیں ان کو غلط فہمی ہوگئی ہے کہ باوجود ربوا ماننے کے امام ابوحنیفہؒ ربوا کی اس خاص صورت کو حرمت کے حکم سے مستثنیٰ کرتے ہیں لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ امام پر یہ کتنا بڑا بہتان ہے۔ واقعہ کی جو صورت خود حنفی مذہب کی مستند کتابوں کے حوالہ سے آپ کی خدمت میں پیش کی گئی۔ کیا اس کے پڑھ لینے کے بعد جو خاکسار نے دعویٰ کیا تھا کہ امام

Marfat.com

صاحب جس چیز کے حلال و طیب ہونے کا فتویٰ دے رہے ہیں، اس کے حلال و طیب ہونے کے دلائل کے پیش کرنے سے پہلے میرا تو ان ہی لوگوں سے سوال ہے کہ اس کی حرمت اور عدم جواز کی اگر کوئی دلیل رکھتے ہیں تو اسے سامنے لائیں کیا بیجا دعویٰ تھا؟ اور اب بھی میں اپنے اس دعویٰ پر قائم ہوں کہ امام جس چیز کو حلال قرار دے رہے ہیں اس کے حرام تو حرام مکروہ بلکہ خلاف اولیٰ یا مقتضا ے احتیاط کے خلاف ہونے کی بھی کوئی دلیل کسی حیثیت سے بھی پیش نہیں کر سکتا اسی لیے آپ دیکھ رہے ہیں کہ حلال ہی نہیں۔ امامؒ اس کو طیب کہنے سے بھی نہیں جھجک رہے ہیں اور جھجکنے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں ہے۔ جو کچھ اب تک کہا جا چکا ہے اگر اسی پر قناعت کر لی جائے اور مزید تائید میں کوئی دوسری چیز نہ پیش کی جائے۔ جیسا کہ ابن ہمام نے مکحول والی روایت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"و فی التحقیق انه لو لم یرد خبر مکحول اجازه النظر المذکور اعنی کونه ما لا مباحاً الا لعارض لزوم الغدر" (۴۲)

"تحقیقی بات یہ ہے کہ اگر سرے سے مکحول والی روایت نہ بھی نقل ہوتی جب بھی مذکورہ بالا بحث کا اقتضا بھی یہی ہے (یعنی اس ... ہاں سود نہیں ہے، مذکورۂ بالا بحث سے میری مراد وہی ہے (یعنی اس مال کا مباح ہونا جو کسی عارضی وجہ سے یعنی عہد شکنی و غدر کی وجہ سے مباح باقی نہیں رہتا"۔

جس کا مطلب وہی ہے کہ غیر معصوم اور مباح ہونے کی وجہ سے اس قسم کا مال مسلمانوں کے لیے بجائے خود حلال ہے۔ ہاں معاہدے کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہوسکتی ہے، لیکن جہاں معاہدے کی خلاف ورزی بھی لازم نہیں آ رہی ہو تو اب اس کے نہ حلال ہونے کی وجہ ہی کیا ہوسکتی ہے۔ بلکہ جہاں تک میں غور کرتا ہوں اگر ادب مانع نہ آتا تو کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ سے

Marfat.com

اختلاف کرنے والوں کے پاس شاید اختلاف کے سوا اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے ان کے اختلافی خیال کی تائید ہو سکتی ہے۔ میں قطعاً یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جس مال کا مالک اس مسلمان کو حضرت ابو حنیفہؒ قرار دے رہے ہیں اسی مال کے ناجائز یا اس مسلمان پر اس کے حرام ہونے کی دلیل آخر اختلاف کرنے والے حضرات کیا پیش کر سکتے ہیں۔ میرے نزدیک تو ان کی تائید نہ کسی قرآنی آیت سے ہوتی ہے، نہ کسی حدیث سے، نہ کسی صحابی کے اثر سے، حتی کہ کوئی قیاسی بات بھی تو ایسی نظر نہیں آتی جس کی بنیاد پر اس مسلمان کو اپنی ایک مملوکہ چیز سے محروم کرنے کا فتویٰ دیا جا سکتا ہو۔

اختلافی دوائر میں پیش کرنے والے جس چیز کو بار بار پیش کرتے ہیں وہ صرف ربوا والی آیتیں یعنی لا تاکلو الربوا یا واکلھم الربوا وقد نھوا عنہ وغیرہ ہیں۔ حالانکہ اب میں کیا عرض کروں، مجھے تو یہ ایسی بات نظر آتی ہے کہ ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ پانی حلال ہے، اس سے اختلاف کرنے والے اپنی تائید میں انما الخمر الآیۃ یعنی ان آیتوں کی تلاوت شروع کر دیں جن میں شراب کی حرمت کا اعلان کیا گیا ہے۔ آخر جب بار بار کہا جا رہا ہے کہ جس چیز کا مالک اس مسلمان کو گردانا جا رہا ہے وہ نہ ربوا ہے اور نہ اس کے ربوا ہونے کی کوئی وجہ ہے بلکہ ایک غیر معصوم مباح مال ہے جس پر خیانت اور غدر کے بغیر دینے والے کی رضامندی سے اس مسلمان کو قبضہ حاصل ہوا ہے، مگر لوگ ہیں کہ مسلسل اسی ربوا والی قرآنی آیتوں کو دہراتے چلے جاتے ہیں، اولاً اس مسئلہ کا ربوا والی صورت سے کوئی خصوصی تعلق بھی نہیں ہے۔

بیسیوں شکلیں مثلاً قمار یا شراب یا میتہ وغیرہ وغیرہ جیسے عقود فاسدہ میں سے ایک ذیلی جزئی در جزئی شکل ربوا کی بھی ہے، لیکن اس باب میں تمام دوسری

Marfat.com

چیزوں سے قطع نظر کر کے اچانک لوگوں کا یہ پھیلا دینا کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک (العیاذ باللہ) ربوا کی ایک خاص شکل حلال بھی ہے، گویا اس مسئلہ کا اوّل بھی یہی ہے اور آخر بھی یہی ہے، اور جب پوچھا جاتا ہے کہ اس قسم کے فتوی کی جرأت قرآن کے مقابلہ میں ان کو کیوں ہوئی، تو یہ جانتے ہوئے کہ نص قرآنی میں کسی قسم کے اضافہ کو امام ابو حنیفہؒ ان حدیثوں کی بنیاد پر بھی جائز قرار نہیں دیتے جنہیں خبر احاد کہتے ہیں، خواہ وہ صحت کے کسی درجہ پر ہوں، لیکن اطمینان سے مکحول والی روایت پیش کرنے والے پیش کر دیتے ہیں۔ ایسی روایت جس کے متعلق دوسروں ہی کی کتابوں میں نہیں، خود حنفی مذہب تک کی کتابوں میں اس قسم کے الفاظ پائے جاتے ہیں:

"قال ابن العز قال فی المغنی هذا خبر جمهول لم یرو فی صحیح ولا مسند ولا کتاب مرثوق به و هو مع ذلک رسل، محتمل"(۴۳)

''ابن عز نے کہا ہے کہ المغنی میں لکھا ہے کہ مکحول والی یہ روایت مجہول روایت ہے، نہ کسی صحیح حدیث کی کتاب میں اس کا پتہ ہے اور نہ کسی مسند میں، نہ کسی ایسی کتاب میں جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہو، باوجود اس کے بجائے خود یہ روایت مرسل ہے (یعنی تابعی نے صحابی کو چھوڑ کر براہ راست رسول اللہ ﷺ کی طرف اسے منسوب کر دیا ہے)''

یہ بھی کہا جاتا ہے اور کہا بھی کیا جاتا ہے، دیکھا جا رہا ہے، جس کا جی چاہے دیکھ سکتا ہے کہ اس قسم کے رسائل میں حضرت امام ابو حنیفہؒ عموماً اسی پہلو کو اختیار کرتے ہیں جس میں زیادہ احتیاط ہو، العمل بالاحوط تقریباً ان کے اجتہاد کا ایک محوری اصول ہے لیکن جس مسئلہ میں اب کیا کہیے وہ زیادت علی الکتاب اور

العمل بالاحوط اپنے دونوں مسلمہ اصول سے ہٹ گئے، وہ قرآن کا وہی جرم تھا جس سے زیادہ دھمکیاں کسی دوسرے جرم میں اس کتاب میں نہیں دی گئی ہیں۔

لوگ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اس زمانہ کے مولوی اگر امام صاحب ہوتے، تو شاید کہا بھی جا سکتا تھا، کہ سودخوار اقوام کے ربائی شکنجوں میں اپنی قوم کو دیکھ کر ہو سکتا ہے کہ ان کا دماغ بے قابو ہو گیا اور مسلمانوں کی معاشی پریشانیوں نے اس عجیب و غریب اجتہاد پر ان کو شاید ابھار دیا تھا لیکن بحمد اللہ امام والا مقام کا عہد تو مسلمانوں کا زریں عہد تھا، عالمی معاشیات کی کلید تو اس وقت انہی مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی جنہوں نے صرف وعظ و تقریر ہی سے نہیں بلکہ حکومت اور فوج کی قوت سے سودخواری کی خونخوار رسم کو کم از کم ان تمام ممالک میں مٹا دیا تھا جو ان کے زیر اثر تھے، پھر خواہ مخواہ باوجود سود اور ربوا ہونے کے اس کے جواز کا فتویٰ دینے کی امام کو ضرورت ہی کیا تھی؟ پس واقعہ وہی ہے کہ امام نے جس چیز کی حلت و جواز کا فتویٰ دیا ہے وہ سرے سے ربوا ہی نہیں ہے اسی طرح ربوا نہیں ہے جیسے مولانا ظفر احمد صاحب بھی تسلیم فرماتے ہیں کہ:

''لا ربوا بین العبدو المولی ربوا نہیں ہے''(ب)

ربوا کی متعلقہ قرآنی آیات جن سے مطلق ربوا کی حرمت ثابت ہوتی ہے ابن ہمام نے ان ہی کی طرف اور ان کی اطلاقی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بالکل صحیح بات لکھی ہے، کہ:

''المطلقات مراد بمحلها المحظور بحق لمالكه''(۴۴)

''مطلق ربوا کی ممانعت والی آیتوں کا تعلق صرف ان ہی اموال تک محدود ہے جن پر تصرف اس طرح ممنوع ہے کہ ان کے مالکوں کا حق

اس سے مانع ہے''

یعنی امام کے مذکورہ بالا فتویٰ کی وجہ سے حرمتِ ربوا کی مطلق آیتوں کی اطلاقیت قطعاً متاثر نہیں ہوتی ۔ کیونکہ ان کا تعلق ان ہی اموال سے ہے جن پر ان کے مالکوں کے کسی حق کی وجہ سے نہ قبضہ کرنا درست ہے اور نہ ان میں تصرف کرنا اور یہاں جس مالک کے متعلق یہ فتویٰ دیا گیا ہے وہ غیر معصوم مال ہے، البتہ معاہدے کی وجہ سے ایک عارضی خطرہ اور ممانعت کی کیفیت اس میں بھی پیدا ہوگئی ہے، سو رضامندی کی وجہ سے ان کا بھی ازالہ ہوگیا ہے ۔ خلاصہ یہ ہے کہ الربوا سے اس کو خارج کرنے کی ضرورت تو اس وقت ہوتی ہے جب اس میں وہ داخل بھی ہوتا ہے بجنسہ وہی حال یہاں بھی ہے، جیسے غنیمت وفئی وغیرہ کے اموال:

"لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل" (۴۵)

''مت کھاؤ باہم اپنے اموال باطل (ذرائع سے)''۔

کے نیچے داخل ہی نہیں ہیں، اسی لیے ایک کا کھانا حرام ہے اور دوسرے کے متعلق قرآن ہی نے:

"فکلوہ مما غنمتم حلالاً طیباً"(۴۶)

''پس کھاؤ اس کو حلال اور طیب سمجھتے ہوئے''۔

کا فتویٰ دیا ہے، رہا لفظ تو صرف لفظ سے متاثر ہو کر کسی حلال چیز کو حرام سمجھ لینا، اب میں کیا کہوں اس میں اور یہود کے اس معاملہ میں کیا فرق ہے جس کے متعلق حدیثوں میں آیا ہے یعنی آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"قاتل اللہ الیہود ان اللہ حرم علیھم شحومھا فاجمدوہ ثم باعو ثمنہ فاکلوہ"(۴۷)

''تباہ کرے خدا یہود کو اللہ نے مردار چیزوں کی چربی ان پر حرام کی

Marfat.com

تھی تو اس چربی کو جما کر یہی یہودی اسے بیچنے لگے، اور اس کا دام کھانے لگے''۔

کہ صرف نام بدل کر حرام کو حلال کر لیتے تھے، میرے نزدیک تو اس میں اور کسی حلال چیز کو نام کی وجہ سے حرام قرار دینے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ امام مالک نے اسی غلط اسمی تاثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریا کے اس جانور کے متعلق جسے لوگ بحری خنزیر کہتے تھے فرمایا تھا:

''انتم تسمونها خنزیرا''(۴۸)

''تم لوگوں نے اس کا نام خنزیر (سور) رکھ دیا ہے''۔

واقعہ تو یہ ہے کہ اب تک جو کچھ اس مسئلہ میں عرض کیا جا چکا ہے، حضرت امام مالک کے مسلک قدیم کی وضاحت وتفہیم کے لیے وہی کافی ہے، لیکن ان قرآنی بیّنات مثلاً:

﴿ان اللہ بری من المشرکین و رسولہ﴾(۴۹)

''مشرکین سے بری ہے اللہ بھی اور اللہ کا رسول بھی''۔

اور وہ ساری آیتیں جن سے اغتنام اور غیر معصومہ اموال کے احکام پیدا ہوتے ہیں یا اس قسم کی حدیث یعنی:

''عصم منی مالھم دمائھم''(۵۰)

''معصوم ہو جاتا ہے مجھ سے (ان غیر مسلم اقوام) کا مال اور ان کی جان''۔

اور اسی کے مفاد کو ادا کرنے والی دوسری صحیح حدیثیں جن پر امام ابو حنیفہؒ کے اس فتویٰ کی بنیاد قائم ہے بجائے خود ان کا کافی ذخیرہ کتاب وسنت سے اکٹھا کیا جا سکتا ہے، لیکن اس مسئلہ میں علاوہ ان کلی نصوص و آثار کے تفصیلی شواہد و مؤیدات

Marfat.com

بھی کچھ کم نہیں ہیں، مولانا ظفر احمد صاحب جیسے صاحب بصیرت وخبرت کے قلم سے ان الفاظ کا نکلنا حیرت انگیز ہے، یعنی آپ فرماتے ہیں:

''امام ابو حنیفہ کے پاس بجز ایک ضعیف حدیث یا ضعیف قیاس کے کوئی بھی قوی دلیل نہیں''۔ (۵۱)

اصل بحث سے فارغ ہونے کے بعد میں چاہتا ہوں کہ ان شواہد کو بھی پیش کردوں۔

سب سے پہلی چیز اس سلسلہ میں خود قرآن ہی کا اشارہ ہے، مطلب یہ ہے کہ تحریم ربوا کے ساتھ ایک طرف تو:

﴿ذروا ما بقی من الربوا﴾ (۵۲)

''چھوڑ دو جو کچھ باقی رہ گیا ہے سود ہے''۔

کا حکم دیا گیا، لیکن اسی کے ساتھ قرآن ہی میں:

﴿فله ما سلف﴾ (۵۳)

''پس سود لینے والے کے لیے رہ گیا''۔

اس سود کا وہ حصہ جو پہلے لیا جا چکا ہے۔

کا فتویٰ بھی موجود ہے، جس کا مطلب یہی ہوا ہے کہ سود کی جتنی رقم لوگ وصول کر چکے تھے، ان کا مالک لوگوں کو اس آیت نے بنا دیا، سوال یہ ہے کہ خرچ کرنے والوں نے جو کچھ خرچ کر دیا، اس کو تو جانے دیجیے لیکن جن لوگوں کے پاس وصول شدہ رقوم سود کی ابھی موجود نہیں، کیا اس کی واپسی کا حکم نہیں دیا جا سکتا، اور اگر دیا جاتا تو اس حکم کی تعمیل میں کیا دشواری تھی۔ ٹھیک شراب کا جو حال ہوا کہ آئندہ سے تو خیر لوگ تائب ہو گئے لیکن جن کے گھروں میں شراب کے ذخیرے موجود تھے، ان کا پینا بھی لوگوں پر چونکہ حرام کر دیا گیا تھا اس لیے

Marfat.com

کہتے ہیں کہ ہر گھر سے مدینہ میں اتنی شراب بہائی گئی، کہ گلیوں میں بہی پھرتی تھی لیکن سود کے معاملہ میں یہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا، بلکہ جن کے پاس وصول شدہ رقوم سود کی موجود تھیں بجائے انہی کے ان رقوم کا ان کو مالک ٹھہرایا گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں ٹھہرایا گیا۔ امام ابو حنیفہ کے اصول پر اس کا جواب آسان ہے کہ تحریم ربوا سے پہلے جن رقوم پر لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا وہ ایسی رقمیں تھیں جن پر اس وقت قبضہ کرنا حرام نہ تھا اور قبضہ کی وجہ سے وہ اس کے مالک ہو چکے تھے، لیکن تحریم کے بعد ایک ایسے مال پر قبضہ کرنا ہوتا جو مسلمانوں کے لیے اب حرام ہو چکا تھا، ظاہر ہے کہ اس سے وہی اصول پیدا ہوتا ہے جس کی بنیاد پر مذکورہ بالا شکل میں اس مستامن مسلمان کے لیے مال مقبوضہ حلال قرار دیا گیا تھا، یعنی معاہدہ امن کی وجہ سے غیر معصوم مال پر بلا رضا مندی قبضہ ناجائز تھا لیکن رضامندی نے حرمت کی وجہ کا ازالہ کر دیا اب جائز ہوگیا، فرق دونوں میں اگر کچھ ہے تو صرف تقدم و تاخر کا قرآن والے فتویٰ میں حرمت سے پہلے قبضہ کیا گیا تھا اور حرمت کی کیفیت بعد کو اس مال پر طاری ہوئی، اور امام والے فتویٰ میں حرمت کی کیفیت معاہدے کی وجہ سے پہلے طاری تھی، رضامندی کے ثبوت کے بعد جواز کی کیفیت اس میں پیدا ہوگئی۔ (ج)

قرآن کے بعد اب آیئے بخاری شریف اٹھایئے، نکالیے فتح مکہ والی مشہور حدیث جس میں یہ فرماتے ہوئے کہ:

"ان کل الربا کان فی الجاهلیة فهو موضوع" (۵۵)

"قطعاً ہر قسم کا سود جو جاہلیت میں تھا، وہ ساقط کر دیا گیا"۔

سب سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اپنے عم محترم حضرت عباسؓ کے سود کے متعلق یہ اعلان فرمایا:

Marfat.com

"اول ربا یوضع هو ربا العباس ابن المطلب"(۵٦)

"سب سے پہلے سود کی رقم جس کی ساقط کی جاتی ہے، وہ عبد المطلب کے بیٹے عباس کی ہے"۔

مشکل الآثار میں امام طحاوی نے بدلائل یہ ثابت کرنے کے بعد حضرت عباسؓ فتح خیبر سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے، اور یہ کہ ربا کا حکم فتح خیبر یا فتح خیبر سے پہلے نازل ہو چکا تھا، پہلے دعوے کے ثبوت میں حجاج بن غلاطؓ صحابی کی مشہور روایت پیش کی ہے، جو فتح خیبر کے بعد اپنے اہل و مال کی خبر گیری کے لیے آئے تھے جس میں حضرت عباس کے متعلق یہ تصریح خود ان ہی کی زبانی ہے کہ اس زمانہ میں وہ مشرف با اسلام ہو چکے تھے اور دوسرے دعویٰ کے ثبوت میں فضالہ بن عبید والی روایت کو پیش کیا ہے جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ فتح خیبر کے موقع پر ایک ہار بھی مال غنیمت میں تھا جس میں سونا بھی شریک تھا، ربوا سے بچنے کیلیے رسول اللہ ﷺ نے ہار کو توڑ کر حکم دیا کہ سونے کو الگ نکال کر فروخت کیا جائے جس سے معلوم ہوا کہ خیبر جس زمانہ میں فتح ہوا ربوا اس زمانہ میں حرام ہو چکا تھا، ان دو مقدمات کے بعد طحاوی نے پوچھا ہے کہ حضرت عباسؓ کے سود کو جاہلیت کے اقتدار کے زوال کے بعد یعنی فتح مکہ کے بعد جو رسول اللہ ﷺ نے ساقط کیا، اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، کہ اس سے پہلے حضرت عباس کا سود لوگوں سے ساقط نہیں ہوا تھا اور آج ان کے سود کو ساقط کیا جا رہا ہے، اب کھلی ہوئی بات ہے کہ فتح خیبر کا واقعہ آٹھویں ہجری میں پیش آیا، جس کے یہی معنی ہوئے کہ سود آٹھویں سے پہلے مسلمانوں پر حرام ہو چکا تھا۔ پس اگر سود کا حکم عام ہوتا یعنی اسلامی علاقہ اور جاہلی علاقہ دونوں میں اس کی حرمت کی ایک ہی نوعیت ہوئی تو حضرت عباسؓ کا سود فتح خیبر سے پہلے ساقط ہو چکا تھا

Marfat.com

اور جو چیز ساقط ہو چکی تھی، پھر اسی کو فتح مکہ کے بعد ساقط کرنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"انہ لا یخلو ربا العباس الذی ادرکہ و ضع النبی ﷺ و ربا الجاھلیة من احد و جھین اما ان یکون اصلہ کا ن قبل تحریم الربا ثم طرأ علیہ تحریم الرباأ و کان فی حال تحریم الربا فان عنی بذلک التحریم فی ھذین الوجھین فی دار الھجرة و فی دار الحرب فانہ یجب ان یبطل فی انی الا ماکن کان من دارالحرب و من دار الاسلام وقد نزلت حرمة الربا قبل ذلک الا تری ان النبی ﷺ قال للسعدین یوم خیبر آربیتما فردا وقولہ تعالیٰ لا تاکلوا الربا اضعافاً مضاعفة نزلت فی وقعةٔ اُحدٍ و کان ذلک قبل فتح مکة بسنین ثم لم یبطل علیہ رسول اللہ ﷺ یوم الفتح شیئاً من معاملاتہ الا ما لم یتم بالقبض"

''حضرت عباس والے اس سود اور ایام جاہلیت کے سود کے متعلق جسے رسول اللہ ﷺ نے ساقط فرمایا، دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں یعنی سود کے حرام ہونے سے پہلے سود کے وہ رقوم چڑھے تھے اور اس کے بعد سود حرام کیا گیا یا جب سود حرام ہو چکا تھا، اس زمانہ میں سود کے رقوم لوگوں پر واجب ہوئے تھے، اب اگر یہ مانا جائے کہ سود کی حرمت کا حکم دارالسلام اور دار الحرب میں ایک ہی ہے تو پھر چاہیے تھا کہ سود حرام ہو جاتا۔ ہر علاقہ نے اجازت فرمادی، اس کے بعد حضرت عباسؓ مکہ میں سودی کاروبار کرتے رہے، اس وقت تک کرتے رہے جب تک کہ مکہ فتح ہو گیا اور سود کی حرمت کا حکم فتح مکہ

Marfat.com

سے پہلے نازل ہو چکا تھا ،تم کیا نہیں دیکھتے کہ دونوں سعدوں کو رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے مقام پر فرمایا ،تم دونوں نے سود کا معاملہ کیا ، پس معاملہ کو توڑ دو اور یہ بھی معلوم ہے کہ قرآن کی آیت یعنی مت کھاؤ سود نادوں (جس کا ترجمہ ہے) یہ احد کے واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی تھی اور احد کا واقعہ ظاہر ہے کہ فتح مکہ سے چند سال پہلے واقع ہو چکا تھا ، پھر فتح مکہ کے موقع پر بھی رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباس کی رقوم میں سے انہی کو ساقط فرما دیا جن پر حضرت عباس کا قبضہ مکمل نہیں ہوا تھا''۔

یعنی وہی بات کہ جن اموال پر جاہلیت کے اقتدار کے زمانہ میں لوگ قبضہ کر چکے تھے ، ان کے متعلق تو :

''فلہ ما سلف'' جس پر پہلے سے لوگ قبضہ کر چکے ہیں وہ ان ہی کا ہے ، کا فتویٰ نازل ہو چکا تھا ، البتہ غیر مقبوضہ اموال چونکہ زوال جاہلیت کے بعد اسلامی حکومت کی عصمت و حفاظت کے دائرے میں آ گئے تھے ، اس لیے قطعی طور پر ان کو ساقط کر دیا گیا کہ ان کے تملک کی اس راہ سے کوئی صورت باقی نہیں رہتی تھی ، سیر کبیر میں مضمون کو ختم کرتے ہوئے لکھا ہے :

"فتبین انہ یجوز عقد الربا بین المسلم و الحربی فی دار الحرب وان البقعة اذا صارت دار الاسلام قبل القبض فانہ یمتنع القبض بحکم ذلک العقد "(۵۷)

''پس کھل گئی یہ بات کہ مسلمان اور حربی میں سود جائز ہے ، جب اس کا معاملہ دارالحرب میں کیا جائے لیکن جب وہی مقام اسلامی قلمرو میں داخل ہو جائے یعنی دارالاسلام بن جائے تو قبضہ جن پر نہیں ہوا

ان پر قبضہ کرنے سے لوگوں کو روک دیا جائے گا، یعنی سود کے معاملہ کی وجہ سے اب کسی مال کے وہ مالک نہیں بن سکتے''۔

تیسری دلیل جسے ہمارے فقہائے حنفیہ پیش کرتے ہیں، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شرط کا واقعہ ہے جو جنگِ روم و ایران کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کے حکم اور مشورہ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لگائی تھی، جس میں جیت حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ہوئی اور جتنے اونٹ اس سلسلہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ آئے تھے، کہتے ہیں کہ ان کی تعداد سو تھی، بہرحال ان کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے آنحضرت ﷺ نے ان اونٹوں کو صدقہ کر دینے کا حکم دیا، سیر کبیر میں امام محمد اس واقعہ کو نقل کرکے فرماتے ہیں:

''لو کان ذلک حراما لما امرہ رسول اللہ ﷺ ان یقامھم علیہ ولو لم یملکہ بھذا الطریق ماامرہ ان یتصدق بہ ''(۵۸)

''اگر یہ اونٹ جوجوئے کے ذریعہ سے ان کے قبضہ میں آئے تھے، حرام ہوتے تو رسول اللہ ﷺ پہلے بازی لگانے کی ان اونٹوں پر اجازت ہی نہیں دیتے، اور اگر یہ اونٹ ان کی ملکیت میں نہ آتے تو ان کو صدقہ کرنے کا حکم بھی رسول اللہ ﷺ نہیں دے سکتے تھے''۔

شمس الائمہ نے اس پر تشریحاً ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے:

''فعرفنا بھذا ان ذلک کان جائز ولکن ندبہ الی التصدق شکر اللہ تعالیٰ علی ما اظھر من صدقۃ''(۵۹)

''پس اس سے ہم نے یہ بات جانی کہ اس قسم کا معاملہ جائز تھا، باقی رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خیرات کرنے کا مشورہ دیا تو اس لیے دیا گیا کہ خدا تعالیٰ نے ابوبکر صدیقؓ کی صداقت کو جو

Marfat.com

ظاہر فرما دیا تھا، یہ اس کا شکریہ تھا''۔

اس روایت کے متعلق ردو قدح کا جو طویل سلسلہ ہے یہاں اس کے ذکر کی بہ ظاہر ضرورت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ غرض میری صرف یہی ہے کہ امام ابو حنیفہ کے فتویٰ کے متعلق یہ خیال کہ ایک ضعیف روایت کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں ہے، صرف اس کا ازالہ مقصود ہے۔

چوتھی دلیل بھی حدیث ہی ہے امام محمد ہی نے سیر کبیر میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اشارہ ان کا رکانہ کے اس واقعہ کی طرف ہے جس میں رسول اللہ ﷺ سے شرط لگا کر وہ کشتی لڑے تھے۔ تین دفعہ لڑے اور تین دفعہ چت ہوئے۔ عرب کے وہ مشہور پہلوان تھے، اس شرط میں ان کی بھیڑ بکریوں کا جو گلہ تھا ایک ایک تہائی حصہ اس کا وہ ہر کشتی میں ہار کر چلے گئے جب ان کے مال پر آنحضرت ﷺ نے قبضہ کر لیا تو امام محمد کا بیان ہے کہ ابن رکانہ نہ بولے:

"ما وضع احد جنبی قط و ما انت صرعتنی "(۶۰)

''میرے پہلو کو زمین سے کسی نے نہیں لگایا، اور آپ نے بھی مجھے نہیں ٹپکا، (یعنی یہ ایک خدائی کرشمہ تھا)''۔

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ جیتا تھا سب واپس فرمایا، شمس الائمہ نے اس کے بعد لکھا ہے کہ:

"لو کان ذلک مکروها ما دخل فیه رسول الله ﷺ "(۶۱)

''اگر یہ معاملہ ناجائز ہوتا تو رسول اللہ ﷺ سرے سے اس معاملہ میں داخل ہی نہ ہوتے''۔

باقی واپس جو کر دیا تو اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں: --

"و انما رد الغنم علیه تطوعا لا منه علیه و کثیرا ما فعل ذلک

Marfat.com

رسول الله ﷺ مع المشركين يولفهم به حتى يؤمنوا"(۶۲)

''باقی بھیڑ بکریوں کو جیتنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے پھر انہی کو جو واپس فرما دیا تو یہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایک مہربانی تھی اور اس قسم کی باتیں مشرکین کے ساتھ رسول اللہ ﷺ بکثرت کیا کرتے تھے ان کے قلوب کو اسلام کی طرف مائل فرمانا چاہتے تھے''۔

پانچویں دلیل اسی سلسلہ کی جسے ہمارے فقہاء نقل کرتے ہیں، بنی قینقاع اور بنونضیر کے یہودیوں کا واقعہ ہے جب ان کی جلاوطنی کا حکم ان کی شرارتوں کی وجہ سے صادر ہوا تو ان لوگوں نے یہ عذر پیش کیا کہ لوگوں پر ہمارا باقی بقایا رہ گیا ہے، اس وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ:

"ضعوا و تعجلوا"(۶۳)

''کچھ بقایا کو ساقط کرو، اور جانے میں جلدی کرو، (یعنی دس کی جگہ مثلاً پانچ ہی لے لو اور بھاگو)''۔

شمس الائمہ اس واقعہ کے بعد لکھتے ہیں:

"و معلوم ان مثل هذه المعاملة لا يجوز بين المسلمين فان من كان له على غيره دين الى رجل فوضع عنه بعضه بشرط ان يعجل بعضه لم يجز"(۶۴)

''اور یہ معلوم ہے کہ باہم مسلمانوں کے درمیان اس قسم کا معاملہ جائز نہیں ہے، یعنی کسی کا دین اگر کسی پر باقی ہو تو جائز نہ ہوگا، کہ مدیون دیندار کہہ کر کہ کچھ رقم تم ادا کردو تو اس کے معاوضہ میں کچھ رقم کو میں چھوڑ دوں گا''۔

گویا اس میں بھی ایک شکل ربوا کی پیدا ہوجاتی ہے یعنی دس باقی تھا

اب اس کی جگہ پانچ اس لیے لینا کہ مدت سے پہلے مقروض قرض ادا کر رہا ہے گویا دوسرے نتیجہ کو بلا معاوضہ ترک کیا گیا، یا یوں سمجھا جائے کہ دس کو پانچ سے بدل دیا گیا، معاوضہ میں زیادہ سے زیادہ وقت کی عجلت کو پیش کیا جا سکتا ہے لیکن طے ہو چکا ہے کہ سود کے باب میں زمانہ کی کوئی قیمت نہیں ہے، شمس الائمہ ہی نے لکھا ہے کہ صحابہ کے زمانہ میں حضرت عمرؓ، حضرت زیدؓ اور ابن عمرؓ عدم جواز کا فتویٰ دیتے تھے، نیز السرخسی نے اسی کی توجیہ دوسری جگہ ان الفاظ میں بھی کی ہے:

"ان فيه مبادلة لاصل الدراهم "(٦٥)

''اس میں اصل دراہم کو اس سے کم دراہم سے بدل دینا ہے''۔

بہر حال ربوا کی ایک شکل یہ ضرور ہے پھر شمس الائمہ نے جیسا کہ لکھا ہے:

"جوزه رسول الله ﷺ فعرفنا انه يجوز بين الحربى و المسلم ما لا يجوز بين المسلمين "(٦٦)

''رسول اللہ ﷺ نے جب اس کو جائز قرار دیا تو ہم نے یہ جانا کہ مسلمان اور الحربی میں ایسے ایسے معاملات جائز ہیں، جو خود باہم مسلمانوں میں جائز نہیں ہیں''۔

چھٹی دلیل وہی مکحول کی روایت ہے، یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے قدماء کی کتابوں میں اس کا ذکر بہت کم کیا گیا ہے، مشہور اس روایت کو خود امام شافعیؒ نے کیا ہے اور غالباً ان ہی کے واسطے سے یہ روایت احناف میں منتقل ہوئی۔ قاضی ابو یوسف کے حوالہ سے امام شافعی بیان کرتے ہیں، کہ ان سے امام ابو حنیفہؒ نے یہ کہا تھا کہ بعض بڑے بوڑھوں سے انہوں نے سنا کہ مکحول ان سے یہ کہتے تھے

Marfat.com

کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ۔

"لا ربوا بين اهل الحرب" (٦٧)

''اہل حرب کے درمیان ربوانہیں ہے''۔

قاضی ابو یوسف کہتے ہیں کہ مجھے خیال آتا ہے کہ اس کے بعد شاید اہل الاسلام کا لفظ وہ بولے تھے بہر حال مشہور شافعی محدث علامہ بیہقی نے اپنی سند سے امام شافعی تک اس کو پہنچایا ہے، اور امام شافعی نے جس طرح اس کو روایت کیا ہے اس کا قصہ آپ سن چکے، کوئی شبہ نہیں کہ سنداً اس روایت کے متعلق گفتگو کا بہت کچھ موقع ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ان دلائل کی حیثیت شواہد و مؤیدات کی ہے اور انداز سے معلوم بھی یہی ہوتا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ نے اسی حیثیت سے اس کو استعمال بھی فرمایا، خیال گذرتا ہے کہ اصلی کلیہ سے تو بیسیوں مسائل پیدا ہوتے تھے، یعنی میتہ، شراب، خنزیر، قمار وغیرہ سب ہی ان کے نیچے مندرج ہیں، منجملہ ان کے ایک شکل ربوا کی بھی تھی لیکن بہ نسبت اوروں کے ربوا میں چونکہ زیادہ اہمیت تھی، اس لیے بطور مزید تائید اور تشفی کے امام نے قاضی ابو یوسف کے سامنے اسے بھی دہرایا کہ بعض بڑے بوڑھوں (مشیخہ) سے میں نے یہ بات سنی ہے جس سے اصل مسئلہ کی تائید ہوتی ہے بہر حال کم از کم اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ مکحول نے بیان کرنے والے پر بھروسہ ہی کر کے اس کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا ہوگا اور نہ کسی بادہوائی بات کو ظاہر ہے کہ مکحول جیسے ثقہ امام منسوب کرنے کی مشکل ہی سے جرأت کر سکتے تھے۔ گویا مکحول کی مرسل روایت ہوئی، سرخسی نے مبسوط میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"هذا مرسل و مكحول ثقة و المرسل من مثله مقبول" (٦٨)

''یہ روایت مرسل ہے اور مکحول ثقہ ہیں قاعدہ ہے کہ ثقہ کی مرسل

Marfat.com

روایت بھی قابل قبول سمجھی جاتی ہے''۔

آخر کچھ نہیں تو جو مسئلہ قرآن و حدیث کے بیّنات سے ثابت ہو رہا ہو اس کی مزید تائید وتقویت بھی کیا اس سے نہیں حاصل ہوتی۔

پس بجائے خود آپ اس پر اعتماد نہ کریں لیکن دوسری دلیلوں کے ساتھ مل کر خود ایک دلیل یہ بھی کیا نہیں بن جاتی۔

اس ساتویں دلیل کے ناقل بھی امام محمد ہی ہیں، سیر کبیر میں اس حدیث کو درج کرنے کے بعد یعنی:

"ان رجلا من اشجع جاء الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فشکا الیہ الحاجۃ فقال اصبر ثم ذھب فاصاب العدد غنیمۃ و اتی بھا الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فطیبھا لہ فانزل اللہ تعالیٰ و من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا و یرزقہ من حیث لا یحتسب"(۶۹)

''قبیلہ اشجع کا ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اپنی حاجت اور ضرورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کہا کہ ذرا صبر کر اس کے بعد وہ آدمی چلا گیا اور دشمن سے غنیمت کا مال اس نے حاصل کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اسے لے کر حاضر ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مال کو اس کے لیے پاک اور حلال قرار دیا تب قرآن کی آیت نازل ہوئی جس کا ترجمہ ہے کہ جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے کشائش کی راہ کھولتے ہیں اور روزی دیتے ہیں اس کو ایسی جگہ سے جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہو''۔

امام محمد اس کے بعد ارقام فرماتے ہیں:

"فھذا اصل علمائنا فیما یصیبہ الواحد و المثنی من

Marfat.com

دارالحرب"(۷۰)

''دارالحرب سے کوئی مال کسی ایک یا دو آدمی کو مل جائے تو اس کے حلال ہونے کی ایک وجہ ہمارے علماء کے نزدیک یہ بھی ہے''۔

یعنی دارالحرب کا یہ مال چونکہ غیر معصوم مال تھا، اس لیے اشجعی قبضہ کرنے کے بعد اس کا مالک ہوگیا اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کے طیب ہونے کا فتویٰ دیا، بلکہ شانِ نزول کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے اگر صحیح ہے تو خود قرآن بھی اس کو رزق لا یحتسب قرار دیا گیا ہے۔ اب اس سے زیادہ پاک چیز اور کیا ہوسکتی ہے۔

(۸) ممکن ہے کہ دوسرے اسے دلیل نہ قرار دیں لیکن امام محمد کے قلم سے جب یہ الفاظ نکلے ہیں، یعنی حضرت عباس کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے جو یہ لکھا ہے کہ اسلام لانے کے بعد حضرت عباس:

"استأذن رسول الله ﷺ فی الرجوع الی مکة فاذن له فکان یربی بمکة الی زمن الفتح وقد حرم الربوا قبل ذلک "(۷۱)

''مکہ واپس جانے کی (مسلمان ہونے کے بعد) حضرت عباسؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت چاہی، آنحضرت ﷺ نے ان کو اجازت عطا فرمادی، تب وہ مکہ میں فتح مکہ کے زمانے تک سودی کاروبار کرتے رہے، حالانکہ ربوا فتح مکہ سے پہلے حرام ہوچکا تھا''

تو میں اس کو صحابی کا ایک اثر قرار دیتے ہوئے منجملہ دیگر دلائل کے ایک مستقل دلیل اس کو بھی سمجھتا ہوں، یعنی کہا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت امام کے فتویٰ کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے، حدیث سے بھی ہوتی ہے اور آثارِ صحابہ سے بھی ہوتی ہے اور اگر صحابہؓ کے بعد ان کے دیکھنے والے کے قول اور

فتویٰ کو تائیدی دلائل میں لوگ شمار کرتے ہیں تو لیجیے صحابہ کے بعد تابعی کا فتویٰ بھی لیجیے۔

(۹) ابراہیم نخعی کے اسم گرامی سے کون ناواقف ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت انسؓ بلکہ ان کے سوا بھی بعض دوسرے صحابیوں کے دیکھنے والے ہیں، کہا تو یہاں تک گیا ہے کہ براہ راست بعض صحابیوں سے روایت بھی کرتے ہیں، کچھ بھی ہو نہ ان کی تابعیت میں شک ہے اور امامت تو ان کی مسلم عندالکل ہی ہے۔ امام ابوجعفر طحاوی اپنی مسلسل سند سے راوی ہیں، فرماتے ہیں:

"حدثنا محمد بن العباس قال حدثنا علی قال حدثنا محمد بن الحسن قال حدثنا محمد بن ابا ن بن صالح عن حماد عن ابراهیم قال لا باس بالدینار بالدینارین فی دارالحرب بین المسلمین و بین اهل دا رالحرب"(۷۲)

''مجھ سے بیان کیا محمد بن عباس نے، وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے بیان کیا علی نے، وہ کہتے ہیں مجھ سے بیان کیا محمد بن حسن (امام) نے وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے بیان کیا محمد بن ابان ابن صالح نے کہ حماد ابراہیم نخعی سے یہ روایت کرتے تھے کہ ابراہیم کہتے تھے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ دارالحرب میں ایک اشرفی سے دو اشرفیوں کا معاملہ مسلمان اور دارالحرب والوں سے کیا جائے''۔

(۱۰) ائمہ اجتہاد و تفقہ کے اختلاف کو اپنی تائید میں جب مولانا ظفر احمد صاحب نے پیش کیا ہے تو یقیناً ان ہی ائمہ میں سے کسی ایسے امام کا اتفاق جو صرف تفقہ و اجتہاد ہی کا نہیں بلکہ روایت اور حدیث کے حلقہ کا بھی امام ہو، ایسا امام کہ آج بخاری و مسلم جیسی حدیث کی صحیح کتابوں کی روایتوں کا ایک بڑا ذخیرہ

Marfat.com

محض انہی کے استناد پر قابلِ اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ میری مراد حضرت سفیان ثوریؒ سے ہے۔ مشکل الآثار ہی میں طحاویؒ نے جہاں اس مسئلہ کو ابراہیم نخعی کا مذہب قرار دیا ہے وہیں سفیان ثوری کے براہِ راست شاگرد محدث جلیل عبداللہ ابن المبارک کے حوالہ سے نقل کیا ہے، کہ اس مسئلہ میں سفیان ثوری کا خیال بھی وہی تھا، جو امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ طحاوی نے مندرجہ ذیل اپنی متصل سند کیساتھ سفیان ثوریؒ کے قول کو نقل کیا ہے:

"حدثنا ابراهيم بن ابى داؤد وقال حدثنا نعيم قال حدثنا ابن المبارك عن سفيان بذلك "(۷۳)

"مجھ بیان کیا ابراہیم بن ابی داوٗد نے، وہ کہتے ہیں مجھ سے بیان کیا نعیم نے، وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے بیان کیا ابن المبارک نے کہ سفیان بھی یہی کہتے تھے"۔

اس کے معنی یہی ہوئے کہ ائمہ اجتہاد میں سے صرف ان کے شاگرد محمد بن حسن الشیبانی امام اعظم کے ساتھ نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے ہمعصر وہم وطن امام سفیان ثوری کا بھی یہی فتویٰ تھا اور میں تو سمجھتا ہوں کہ مکحول والی روایت کے مطابق انقطاعاً اقتصالاً وارسالاً دوفقا جو بحث چاہے کی جائے لیکن خود مکحول تک تو اس روایت کا انتساب محل تردد نہیں ہے۔ پھر مکحول سے جب ان کی روایت اور اس حدیث کے خلاف کوئی فتویٰ منقول نہیں ہے تو کیوں نہ سمجھا جائے کہ جس فتویٰ کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنے کی وہ جرأت کر رہے ہیں، خود اس کے مخالف وہ کیوں ہوں گے، بلکہ بجنسہ اسی بنیاد پر میں تو یہ بھی سمجھتا ہوں کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے استاذ حماد بن ابی سلیمان کا مسلک بھی یہی ہونا چاہیے، وجہ اس کی یہ ہے کہ طحاوی (د) نے ابراہیم نخعی کی طرف اس قول کو حماد ہی کے

حوالہ سے منسوب کیا ہے، یعنی حماد بیان کرتے ہیں کہ ان کے استاد ابراہیم نخعی کا یہی قول تھا، سوچنے کی بات ہے کہ حماد کے استاد ابراہیم کا بھی اور حماد کے شاگرد امام ابوحنیفہ کا بھی جب یہی مسلک ہے تو اس کے کوئی معنی ہو سکتے ہیں کہ درمیان میں حماد اس کے مخالف ہوں گے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی، یعنی حماد اس مسئلہ میں اپنے استاد اور براہِ راست شاگرد سے مختلف خیال رکھتے تو یقیناً بیان کرنے والے ایسے موقع پر اسے ضرور بیان کرتے۔

پس سچ پوچھیے تو میرے نزدیک امام ابوحنیفہؒ نے اپنے ذاتی اجتہاد سے اس مسئلہ کو پیدا بھی نہیں کیا ہے، بلکہ اگر کہا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ فقہ کوفہ کا بظاہر یہ ایک عام فتویٰ ہے، کیا ابراہیم نخعی اور سفیان ثوری کے دائرے سے باہر کوفہ کی فقہ جا سکتی ہے؟ یقیناً جاننے والوں سے یہ امر مخفی نہیں ہے کہ علمائے کوفہ کا مذہب ابراہیم نخعی اور سفیان ثوری ہی پر عموماً منتہی ہوتا ہے۔

مولانا ظفر احمد صاحب کا دعویٰ کہ:

''امام ابوحنیفہؒ کے پاس بجز ایک ضعیف حدیث یا ضعیف قیاس کے کوئی بھی دلیل قوی نہیں''۔ (ص ۴)

اس دعویٰ کے مقابلہ میں غالباً تلک عشرة کاملة یعنی امام کی تائید میں دس دلیلیں سردست ان شاء اللہ کافی سمجھی جائیں گی ولئن استزدتم زدنا، کیونکہ جو دلائل اب تک پیش کیے گئے ہیں عموماً یہ وہی ہیں جن کا تذکرہ فقہائے حنفیہ نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ خود خاکسار ذاتی طور پر بھی اس مسئلہ کی تائید میں کچھ چیزیں اپنے پاس رکھتا ہے لیکن ان کی بحث اگر چھڑ جائے گی تو بات بہت طویل ہو جائے گی، اس لیے بالفعل انہی دس باتوں پر قناعت کرتے ہوئے مولانا سے باادب دریافت کرتا ہوں کہ دلائل تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن یہ کہنا کہ ابوحنیفہ

Marfat.com

نے اس مسئلہ میں صرف ایک ضعیف حدیث یا ضعیف قیاس سے متاثر ہو کر اتنے اہم فتویٰ کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے، کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔

اور یہ واقعہ تو یہ ہے کہ لفظ ربوا سے متاثر ہو کر جس چیز کو خواہ مخواہ ربوا قرار دے کر اتنا ہنگامہ مچایا گیا ہے جب معلوم ہو چکا ہے کہ سرے سے وہ ربوا ہی نہیں ہے بلکہ اس ذیل کی ایک آمدنی مسلمانوں کی ہے جس کے متعلق فکلوہ حلالاً طیباً کا فتویٰ خود قرآن میں دیا گیا ہے، اس کے بعد سچ پوچھیے تو مزید کسی دلیل کی حاجت ہی باقی نہیں رہتی، ابن ہمام کے حوالہ سے جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں یعنی اس مفہوم کو سمجھانے کے لیے کہ بظاہر جس چیز کو لوگ ربوا سمجھ رہے ہیں وہ ربوا ہی نہیں ہے اس کے لیے تو صرف مکحول والی روایت لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب ہی کافی ہے کیونکہ یہاں قرآنی نصوص جن میں مطلق الربوا کو حرام قرار دیا گیا ہے ان کے اطلاق میں دست اندازی کر کے باوجود ربوا ہونے کے ربوا کی کسی شکل کے حلال ہونے کا (العیاذ باللہ) فتویٰ نہیں دیا جا رہا ہے۔ بلکہ قرآن کے اطلاق کو بالکلیہ اپنے حال پر قطعی طور سے محفوظ رکھتے ہوئے صرف اس واقعہ کا اظہار مقصود ہے کہ مسلمانوں کی جس آمدنی کو لوگ غلطی سے ربوا سمجھ کر حرام قرار دے رہے ہیں، بتا دیا جائے کہ واقعہ میں نہ وہ ربوا ہے، نہ حرام ہے۔ محض یہ بتانا کہ وہ حلال چیز کو تو حرام نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ واقعہ میں جو حلال ہے اسی کے حلال ہونے کا فتویٰ امام دے رہے ہیں جو چیز سفید ہو، اگر کوئی سمجھانا چاہتا ہے کہ لوگ اس کو سیاہ نہ سمجھیں تو کیا یہ ایسا جرم ہے جس پر اسے ملامت کی جائے۔ خصوصاً جب تائید میں ایک نہیں دس دس چیزیں آپ کے سامنے پیش کی جا رہی ہوں، تو اب اس سلسلہ میں آخر کیا چاہا جاتا ہے۔

Marfat.com

فقیر کے گذشتہ بالا معروضات کا مطالعہ اگر توجہ سے کیا جائے گا تو ان ہی میں مولانا ظفر احمد صاحب کے دوسرے مطالبات کے جوابات بھی لوگوں کو مل سکتے ہیں، مثلاً مولانا نے امامؒ کو اس فتویٰ کا تنہا مفتی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''اس مسئلہ میں جملہ ائمہ نے امام حنیفہؒ کی رائے سے اختلاف کیا ہے''

مگر جو کچھ میں عرض کر چکا ہوں۔ اس کے بعد بھی مولانائے ممدوح کا یہ الزام امام ابوحنیفہؒ کے متعلق واقعی الزام باقی رہ سکتا ہے، نہ صرف یہی کہ فقہ اسلامی کی مستقل شاخ جسے علمائے عراق کی فقہ کہتے ہیں، اسی کا یہ ایک عام مسئلہ معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ مکحول کو بھی اگر اسی گروہ میں شریک کرلیا جائے، تو عراق کے ساتھ شامی فقہاء کے ایک بڑے امام مجتہد و محدث کو اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کا ہمنوا قرار دیا جاسکتا ہے۔ غالباً قاضی ابو یوسف کے سامنے بجائے دوسرے عراقی اساتذہ ابراہیم یا حماد یا سفیان ثوری کے شامی امام مکحول کی جو روایت امام ابوحنیفہؒ نے پیش کی، ہوسکتا ہے کہ اس کی ایک مصلحت یہ بھی ہو کہ صرف ہمارے کوفی ائمہ ہی نہیں بلکہ شام کے ایک امام حجت سے بھی یہی فتویٰ منقول ہے، کیسی عجیب بات ہے کہ جس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کی حیثیت صرف مقلد ہونے کی ہے اسی مسئلہ کو امام کے انفرادی اجتہاد کا نتیجہ قرار دیا جارہا ہے۔ اس موقع پر ہمیں اہل علم کے اس قول کو بھی نہ بھولنا چاہیے کہ طحاوی جن کی سند سے میں نے دوسرے ائمہ کا فتویٰ نقل کیا ہے، نقل مذاہب میں ان کے متعلق یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ ھو اعلم الناس بمذاھب الناس یعنی علمائے اسلام کے فقہی اختلاف کے وہ سب سے بڑے عالم ہیں۔

چونکہ خود مسئلہ اور اس کے مالہا و ماعلیہا کے بیان کرنے میں میں نے یہ التزام کیا ہے کہ انہی عبارتوں کو پیش کروں جو امام محمد کی کتاب (سیر کبیر) میں

Marfat.com

پائی جاتی ہیں، یا زیادہ سے زیادہ ان کے بعد میں شمس الائمہ سرخسی، علامہ ابو بکر کاسانی صاحب بدائع اور ابن ہمام کے اقوال پیش کیے ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس کے بعد متاخرین اربابِ فتاویٰ کی تعبیروں پر مولانا نے بے اعتمادی کا اظہار کرتے ہوئے امام کی طرف سے اس مسئلہ کے انتساب ہی کو کنایۃً محل اشتباہ جو قرار دینا چاہا ہے، انشاء اللہ اس کی بھی گنجائش باقی نہ رہی ہوگی۔ آخر حنفی فقہ کے مسائل کی تعبیر میں ان بزرگوں کے تصریحات پر بھی اگر اعتماد نہ کیا جائے گا تو اب اس کے بعد اور کون لوگ ہیں جن کے اقوال پر اس باب میں بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

باقی مولانا نے اموال کے غیر معصوم و مباح ہونے کیلیے یہ دعویٰ جو فرمایا ہے کہ مسلمانوں اور مسلمانوں کی حکومت سے بالفعل برسر جنگ ہونا بھی اس کے لیے ضروری ہے، یعنی جو برسر جنگ ہوں گے ان ہی کے اموال شرعاً غیر معصوم اور مباح قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ میں قطعاً ناواقف ہوں کہ مولانا کے اس دعویٰ کی بنیاد کیا ہے، کم از کم فقہ حنفی کی حد تک تو میں کہہ سکتا ہوں کہ باوجود تلاش و جستجو کے مجھے کوئی ایسی چیز اب تک نہیں ملی ہے جس سے مولانا کے اس عجیب و غریب دعویٰ کی کسی حد تک بھی تائید ہو سکتی ہو۔ ہاں الحربی کے لفظ سے عوام شاید یہی سمجھتے ہیں۔ لیکن مولانا جیسے مستند و خبیر عالم کے متعلق یہ کیسے باور کراؤں کہ عوام کے اس عامیانہ خیال سے وہ متاثر ہیں۔ بہر حال دعویٰ کے لیے دلیل کا مطالبہ تو ہر شخص سے کیا جائے گا۔ مولانا نے پاس اگر کوئی ایسی چیز ہے تو پیش فرمائیں، میں تو حیران ہوں کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی ذمہ داریوں سے بری ہونے کیلیے قرآن تو صرف المشرکین کے لفظ کو کافی قرار دے رہا ہے، شہادتِ لا الٰہ الا اللّٰہ وان محمداً رسول اللّٰہ (جو دراصل دین اسلامی کا

Marfat.com

عنوان اور اس کی اجمالی تعبیر ہے) صرف اس سے انکار صحیح حدیثوں کے رو سے اموال کو غیر معصوم بنا دیتا ہے، یا پھر قانون معاہدہ سے عصمت کی اس کیفیت کو اموال میں پیدا کیا جا سکتا ہے، جہاں تک میں جانتا ہوں اموال کے معصوم ہونے کی یہی دو شرعی اور قانونی وجوہ (اسلام اور معاہدہ) قرآن و حدیث سے ثابت ہوتے ہیں لیکن بالفعل برسر جنگ ہونا، میں نہیں جانتا کہ اس سلسلہ میں مولانا کی طرف سے اس قید کا اضافہ جو فرمایا جا رہا ہے اس کی بنیاد کیا ہے۔

اگر ان اموال کی حلت کے لیے بالفعل محاربہ و مقاتلہ بھی ضروری ہے تو غنیمت میں اور ان آمدنیوں میں جنہیں فئی یا فی حکم الفئی کے ذیل میں فقہاء شمار کرتے ہیں، فرق ہی کیا باقی رہ جاتا ہے۔ فئی کے متعلق تو قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ایجاف خیل و رکاب سے جو نہ حاصل ہوا ہو اور آپ کے نزدیک لڑائی بھڑائی کے بغیر ان اموال کے حلال ہونے کی کوئی صورت ہی جب نہیں ہے، تو آخر قرآن کے ان الفاظ کا کیا مطلب ہوگا۔

اصولی طور پر اس مسئلہ کے متعلق فقہی نقطہ نظر سے جو بحث ہو سکتی تھی میں اپنے گذشتہ بیانات ہی میں اس سے فارغ ہو چکا ہوں، اس وقت پھر اس کے چھیڑنے سے یہ غرض ہے کہ اصل مضمون میں تو نہیں لیکن ایک جگہ حاشیہ میں مولانا نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ والی روایت کا تذکرہ فرماتے ہوئے بعض شافعی مسلک شارحین حدیث کے اقوال سے اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں یعنی قاتلہ و مغالبہ بھی ان اموال کی حلت کے لیے ضروری ہے، استفادہ فرمانا چاہا ہے۔ دراصل اسی کے متعلق میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ظاہر ہے کہ کسی فقہی مسئلہ کی تنقیح و تحقیق کے لیے شارحین حدیث خصوصاً جب وہ حنفی بھی نہ ہوں، ان کے اقوال ہم جیسے حنفیوں پر کیا حجت ہو سکتے ہیں،

Marfat.com

البتہ حدیث یقیناً قابلِ توجہ ہے، خصوصاً جب امام بخاریؒ نے بھی اپنی کتاب میں اس کو جگہ دی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ الحربی والمسلم کے درمیان مالی معاملات کے سلسلہ میں امام محمد نے بھی اس حدیث کا تذکرہ اپنی کتاب ''سیر کبیر'' میں بھی فرمایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ حدیث اور امام محمد نے اس موقع پر اس حدیث سے جو نتیجہ پیدا کیا ہے، پہلے اس کا ذکر کرلوں، اس کے بعد مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے اس کی طرف توجہ کروں گا۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ مشرف بہ اسلام ہونے سے پہلے حضرت مغیرہ فرماتے ہیں کہ میں نے بعض جاہلی کفار کی صحبت و رفاقت اختیار کی۔ ایک دن غافل پاکر میں نے ان کو قتل کر دیا اور جو کچھ ان کے پاس تھا اس پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد وہی کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دو باتیں آپ کی خدمت میں پیش کیں۔ یعنی چاہتا ہوں کہ میں مسلمان ہو جاؤں اور یہ مال جو ان لوگوں کا میرے ہاتھ لگا ہے، اس سے خمس (پانچواں حصہ) قبول فرمایا جائے، اسی کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

''اما الاسلام فاقبل و اما المال فلست منه فی شئی''(۷۵)

''اسلام کو تمہارے تو میں قبول کرتا ہوں، لیکن مال سو اس سے مجھے کوئی تعلق نہیں ہے''۔

یہ تو ہوا حدیث کے مضمون کا خلاصہ، امام محمد نے جس مسئلہ کے سلسلہ میں اس حدیث کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک سوال یہ اٹھایا کہ ایک مسلمان مستامن بن کر یعنی امن و امان کے ساتھ آئینی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کر کے کسی غیر اسلامی حکومت کے قلمرو میں داخل ہوتا ہے اور اس ملک کے غیر مسلم باشندے کا مال اس کی رضامندی کے بغیر لے کر اسلامی علاقہ میں

Marfat.com

چلا آتا ہے۔ اب وہی شخص جس کا مال لے کر یہ مسلمان اسلامی حکومت کے حدود میں چلا آیا ہے مسلمان ہو کر یا ذمی یا مستامن بن کر اسی اسلامی علاقہ میں آتا ہے اور اس مسلمان پر اسلامی عدالت میں دعویٰ دائر کرتا ہے اور اس کا دعویٰ ثابت بھی ہو جاتا ہے، سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں اسلامی عدالت کیا فیصلہ کرے گی۔ امام محمد نے اس کا جواب یہ دیا ہے:

"امر برده ولا يجبر عليه في الحكم "(۷۶)

''مال کو واپس کر دینے کا عدالت اسلامی حکم دے گی لیکن واپس کرنے پر اس مسلمان کو مجبور نہیں کر سکتی۔''

پہلی بات یعنی مال کے واپس کر دینے کا حکم اس مسلمان کو قاضی کیوں دے گا، اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے:

"كان على ذلك الرجل ان لا يغدر بهم حين دخل اليهم بامان "(۷۷)

''جب امن و امان کے ساتھ رہنے کا معاہدہ کر کے اس ملک میں یہ مسلمان داخل ہوا تھا تو اس پر واجب تھا کہ ان کے ساتھ عہد شکنی نہ کرے''۔

لیکن دوسری بات یعنی مال کے واپس کرنے پر اس مسلمان کو مجبور کرنے کا حق قاضی کیوں نہیں رکھتا اس کی یہ توجیہ کرتے ہوئے کہ:

"انه اخفر ذمة نفسه لا ذمة الا مام والمسلمين "(۷۸)

''اس نے اپنی شخصی ذمہ داری کی خلاف ورزی کی ہے، مسلمانوں کے امام اور حکومت اور خود مسلمانوں کی کسی ذمہ داری کو اس نے نہیں توڑا ہے''۔

کہا گیا ہے کہ:

"لانه حين اخذ المال لم يكن لصاحب المتاع امان من المسلمين في نفسه ولا في ماله "(۷۹)

Marfat.com

''کیونکہ مسلمانوں نے جس وقت مال لیا تھا اس وقت مال والے آدمی نے نہ مسلمانوں کی امان میں اپنے مال کو داخل کیا تھا اور نہ اپنی جان کو''۔

اور اب اسی موقع پر امام محمد نے حضرت مغیرہؓ والی اسی روایت کو پیش کر کے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے:

''ابی ان یقبل ذلک و لم یجبرہ علی رد ذلک علی ورثتھم''(۸۰)

''مال کے قبول کرنے سے تو انکار فرمایا لیکن اسی کے ساتھ حضرت مغیرہؓ کو اس پر بھی مجبور نہیں کیا کہ جس مال کو وہ لائے ہیں، اسے ان لوگوں کے ورثہ کو واپس کردیں جن کے مورثوں کو قتل کرکے انہوں نے مال پر قبضہ کیا تھا''۔

مجھے اس وقت اس مسئلہ سے بحث نہیں ہے، بلکہ دکھانا صرف اس قدر ہے کہ حضرت مغیرہ والی روایت کو اس موقع پر پیش کرنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ حضرت مغیرہ کے فعل کو امام محمد بھی خلاف معاہدہ قرار دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے پیش کردہ مال سے خمس لینے کا جو انکار کیا، تو اس کی وجہ امام محمد کے نزدیک بھی یہی ہے کہ انہوں نے خلافِ عہد اس کام کو کیا تھا، جس کے معنی یہی ہوئے کہ حنفیہ بھی حضرت مغیرہؓ کے فعل کو خلاف عہد سمجھتے ہیں۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اسی حدیث کو آپ'' لا ربوا بین المسلم و الحربی ''والے مسئلہ پر کیسے منطبق کررہے ہیں۔ لا ربوا والے فتویٰ کی بنیاد تو جیسا کہ تفصیلاً عرض کرتا چلا آرہا ہوں، اس پر قائم ہے کہ لینے والا، مال والے کی رضامندی سے بغیر کسی خیانت و غدر کے مال پر قبضہ کرتا ہے۔ مسئلہ کا سارا دارومدار محض اسی واقعہ پر ہے۔

اور حضرت مغیرہ والی روایت میں جیسا کہ سب مان رہے ہیں، خود حنفیہ

Marfat.com

بھی مان رہے ہیں کہ اس میں خلافِ معاہدہ رضامندی کے بغیر غدراً مال پر قبضہ کیا گیا تھا، تو اب آپ ہی بتایئے کہ اس حدیث سے اصل مسئلہ کو کیا تعلق جس میں مال والے کی رضامندی سے غیر معصوم مال پر مسلمان قبضہ حاصل کرتا ہے۔ اس مال کو جس پر غدراً معاہدے کے خلاف قبضہ کیا گیا تھا، اگر رسول اللہ ﷺ اس کو بھی واپس کردیتے، آخر دونوں میں کوئی تعلق بھی تو ہو۔

البتہ مغیرہ والی اسی حدیث سے امام محمد نے جس نتیجہ کو پیدا کیا ہے یعنی اسلامی عدالت مال کے واپس دینے کا حکم تو دے گی لیکن واپس کرنے پر مجبور نہیں کرے گی، اور اس کی تائید واقعہ کے اس خبر سے کرنا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے:

"لم یجبرہ علی رد ذلک علی ورثتھم" (۸۱)

"رسول اللہ ﷺ نے بھی حضرت مغیرہؓ کو مجبور نہیں فرمایا کہ (مقتولوں) کے وارثوں پر مال کو واپس کریں"

اور اسی کو پیش نظر رکھ کر اس کی قانونی وجہ جو یہ بتائی گئی ہے کہ حضرت مغیرہؓ نے یہ مال جن لوگوں کا جس زمانہ میں لیا تھا، اس وقت تک مسلمان اور مسلمانوں کی حکومت کی ذمہ داری میں نہ وہ خود تھے، اور نہ ان لوگوں کا مال تھا، اور اسی لیے اسلامی عدالت اس مال کے واپس دلانے کی ذمہ دار نہیں بن سکتی تھی، جس کی حفاظت کی ضمانت اس نے نہیں لی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے گو خود اس مال کے قبول کرنے سے انکار فرمایا لیکن حضرت مغیرہ کو اس پر بھی مجبور نہیں کیا کہ مقتولوں کے وارثوں کو تلاش کر کے اس مال کو ان تک پہنچا دو۔ تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی حکومت اس وقت ان مقتولین کے مال کی ذمہ دار نہ تھی، اب اسی قانونی نکتہ کو امام ابوحنیفہؒ نے اپنے سامنے رکھا اور لا ربوا بین المسلم والحربی والے مسئلہ کے ایک خاص پہلو کے متعلق انہوں نے ایک جواب پیدا کیا ہے

Marfat.com

چونکہ بعض حلقوں میں اس کے متعلق بھی غلط فہمی پائی جاتی ہے، اس لیے مناسب ہے کہ اس کا یہاں ذکر کر دیا جائے۔ مطلب یہ کہ حربی و مسلم کے درمیان ربوا باقی نہیں رہتا، جیسے یہ حنفی فقہ کا مسئلہ ہے، اسی طرح یہ مسئلہ بھی مسلم ہے کہ دارالحرب میں ہوں یا دار الاسلام میں کہیں بھی دو مسلمان ہوں، ان میں ربوا بہر حال ربوا ہی رہے گا، متفقہ فتویٰ سیر کبیر میں امام محمد نے یہ نقل کیا ہے:

"لو کانت هذه المعاملة بين مسلمين فی دار الحرب مستامنين او اسيرين كان باطلا مردودا" (۸۲)

''دارالحرب میں دو مسلمان باہم اس ربوا کے معاملہ کو اگر کریں تو وہ بہر حال مردود اور باطل معاملہ ہوگا، خواہ دارالحرب میں ان دونوں مسلمانوں کی حیثیت ان لوگوں کی ہو جو امن و امان کا معاہدہ کر کے غیر اسلامی ملک میں داخل ہوتے ہیں، یا قیدیوں کی حیثیت ہو''۔

اور وجہ وہی لکھی ہے کہ مسلمان کا مال مسلمان کے لیے معصوم ہے، خواہ وہ کہیں بھی ہو:

"انهما ملتزمان احكام الا سلام فی كل مكان" (۸۳)

''اسلامی احکام کی تعمیل کے وہ ذمہ دار ہیں جہاں کہیں بھی وہ ہوں''۔

لیکن ایسے دو مسلمان جو دارالحرب ہی میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور وہاں سے نکل کر کسی اسلامی سلطنت میں نہیں آئے ہیں یعنی ان کی حالت ان ہی مسلمانوں کی ہو جن کے متعلق قرآن میں فرمایا ہے:

﴿الذين آمنوا ولم يهاجروا مالكم من ولايتهم من شئی حتی يهاجروا﴾ (۸۴)

''جو لوگ ایمان لائے لیکن ابھی انہوں نے ہجرت نہیں کی ہے، ان کی

ولایت کسی حیثیت سے بھی مسلمانوں کے ذمہ عائد نہیں ہوتی تا آنکہ وہ ہجرت کر کے (اسلامی علاقہ میں آ جائیں)۔''

اگرچہ مسلمانوں کی ولایت (یعنی ان کی حفاظت و نگرانی میں وہ داخل نہیں ہوئے ہیں) لیکن مسلمان چونکہ ہو چکے ہیں اور اسلام بذات خود اموال ونفوس کو معصوم بنا دیتا ہے اس لیے کسی مسلمان کے لیے جائز نہ ہوگا کہ ان کے مال کو غیر معصوم یا مباح سمجھے۔ اسی وجہ سے ربوا کے باب میں بھی ان کے متعلق حکم یہی ہے کہ:

"فان جری بین الذین اسلما فی دار الحرب فکذا لک الجواب"(۸۵)

''اور دو آدمی جو دارالحرب ہی میں مسلمان ہوئے ہوں ان میں بھی اگر سود کا معاملہ جاری ہو، تو اس کا بھی یہی جواب ہے یعنی یہ معاملہ مردود اور باطل قرار دیا جائے گا''۔

یعنی ربوا کا معاملہ کر کے ان دونوں میں سے جو سود کھائے گا وہ سود خوار ہوگا اور ان ہی سزاؤں کا مستحق ہوگا جن کا مستحق قرآن نے سود خواروں کو قرار دیا ہے۔

لیکن فرض کیجیے کہ دارالحرب کے ان دونوں نومسلموں نے باہم ربوا کا معاملہ دارالحرب ہی میں کیا، اور اس ذریعہ سے ایک نے دوسرے سے سود کی رقم وصول بھی کی اور یہ سب کچھ کر کے دونوں دارالاسلام چلے آئیں اس کے بعد سود دینے والا اگر اسلامی عدالت میں سود لینے والے پر دعویٰ دائر کر دے کہ اس نے مسلمان ہونے کے بعد دارالحرب میں مجھ سے سود کی رقم وصول کی ہے تو سوال یہ ہے کہ عدالت اس وقت کیا فیصلہ کرے گی۔

Marfat.com

عام قاعدہ تو یہی ہے کہ اسلامی قلمرو یعنی دارالاسلام میں رہنے والے مسلمان اسلامی حکومت کے حدود میں سود کا معاملہ اگر کریں گے تو عدالت ان کے اس معاملہ کو باطل قرار دے گی اور ربوا کے ذریعہ سے جو رقم وصول کی جائے گی اسے واپس کرا دے گی، نہ صرف مسلمانوں ہی کے درمیان بلکہ ربوا کا معاملہ کرنے والے اگر اسلامی حکومت کے ذمی رعایا بھی ہوں گے تو ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا جائے گا۔

سیر کبیر میں ہے:

''القاضی یبطل عقود الرباء التی تجری بین اهل الذمة اذا اختصموا الیه فیها''(۸۶)

''ربوا یعنی سود کے معاملات (اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا یعنی) باہم ذمیوں کے درمیان اگر کیے گئے ہیں تو قاضی ان کو بھی باطل قرار دے گا اگر ان معاملات میں ذمی لوگ اسلامی عدالت کی طرف رجوع کریں''۔

حتی کہ ایسے دو آدمی جو نہ مسلمان ہی ہیں اور نہ اسلامی حکومت کے رعایا ہیں، لیکن فقط امن و امان کا معاہدہ کر کے اسلامی حدود میں مقیم ہیں، یعنی مستامن ہیں، اگر یہ دونوں بھی ہماری قلمرو میں سود کا کاروبار کریں گے تو پیش ہونے پر عدالت ان کے اس معاملہ کو بھی باطل قرار دے گی، اسی کتاب میں ہے:

''لو ان مستامنین من اهل الحرب فی دار نا باشروا هذه المعاملة ثم اختصما الی القاضی فانه یبطل ذلک''(۸۷)

''اگر غیر اسلامی قلمرو کے دو باشندے جو امن کا معاہدہ حاصل کر کے اسلامی علاقہ میں داخل ہوں اور باہم سود کا معاملہ کریں اور قاضی (اسلام) کی طرف اپنے اس معاملہ کو رجوع کریں، تو قاضی ان کے بھی اس

Marfat.com

معاملہ کو باطل قرار دے گا''۔

وجہ اس کی وہی ہے کہ:

"لان ذلک مال متقوم فی حقهم والمستامنون و اهل الذمة فی ذلک سواء "(۸۸)

''کیونکہ جس مال پر یہ معاملہ سود کا کیا جائے گا ان دونوں کے حق کے لحاظ سے یہ متقوم مال ہے اور مستامن ہوں یا ذمی اس باب میں دونوں برابر ہیں''۔

لیکن ظاہر ہے کہ مسئلہ کی جو صورت اس وقت ہے یعنی جس مال کو ربوا کے ذریعہ سے جس وقت جس مقام پر لیا گیا ہے اس وقت مسلمانوں کی حکومت اور خود مسلمانوں کی ولایت اس مال کو حاصل نہیں ہوئی تھی اور ایسی صورت میں سود ہی کیا بلکہ لکھا ہے کہ:

"لو اتلف ماله انسان فی دار الحرب لم یضمن بشئی "(۸۹)

''اگر اس قسم کے مسلمان کا مال کوئی ضائع بھی کر دے تو اس کا تاوان کچھ بھی اس کو نہ دلایا جائے گا''۔

اسی کے بعد یہ الفاظ ہیں:

"کذلک المعاملة بالرباء أو غیره یتبین هذا الحکم "(۹۰)

''اور یہی حال ربوا کے معاملہ کا بھی ہے، یا اس کے سوا دوسرے معاملہ (عقود فاسدہ) میں یہ حکم ظاہر ہوگا''۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ سود لینے والے کو قاضی سود کی اس رقم کے واپس کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا، جو دارالحرب میں اس مسلمان نے وصول کی تھی اور بجنسہٖ وہی بات ہے جو حضرت مغیرہؓ والی روایت سے ثابت ہوتی ہے۔ یعنی

Marfat.com

خود تو رسول اللہ ﷺ نے اس مال کے لینے سے انکار کیا کیونکہ غدر اور عہد شکنی کر کے یہ مال وصول کیا گیا تھا لیکن باوجود اس کے حضرت مغیرہؓ کو آپ نے مجبور نہیں کیا کہ مال والوں کے وارثوں کو واپس کر دیں تو جیسا کہ حضرت مغیرہؓ والی روایت کے ذیل میں جس مسئلہ کا امام محمد نے ذکر کیا تھا، سرخسی نے اس موقع پر لکھا تھا کہ:

"لانہ حین اخذ المال لم یکن لصاحبہ المتاع امان المسلمین فی نفسہ ولا فی مالہ و انما کان علی ذلک الرجل ان لا یغدر بھم حین دخل الیھم بامان ذلک غیر داخل تحت حکم الا مام فلا یجبرہ علی الر د بذلک القدر من السبب"(۹۱)

"کیونکہ جس وقت لینے والے نے مال کو لیا تھا اس وقت اس مال والے کو مسلمانوں کی امان نہ اپنی جان ہی کے متعلق میسر ہوئی تھی اور نہ مال ہی کے متعلق البتہ خود اس شخص پر واجب تھا کہ اس غیر اسلامی علاقے کے باشندوں کے ساتھ غدر اور عہد شکنی نہ کرے، جب کہ وہ ان کے علاقے میں امان کا معاہدہ حاصل کر کے داخل ہوا تھا اور اس قسم کا آدمی بھی امام یعنی مسلمانوں کی حکومت کی نگرانی کے نیچے داخل نہیں ہوا تھا پس اسلامی عدالت اس کو مال کے واپس کرنے پر محض اس وجہ سے مجبور نہ کرے گی"۔

پھر ایک نظیر کو پیش کر کے مسئلہ کو سمجھاتے ہیں:

"الا تری انہ لو فقأعین رجل منھم وقتل رجلا منھم او استھلک مالا ثم خرج ھارباً الیٰ دار الاسلام فجاء صاحب الحق و خاصمہ فی ذلک لم یقض القاضی لہ بشئی فکذلک اذا خرج ما لھم"(۹۲)

"کیا تم نہیں دیکھتے۔ اس قسم کے آدمی کی آنکھ اگر کوئی نکال لے یا ان

میں سے کسی کو کوئی قتل کر دے یا ان کے مال کو ضائع کر دے اس کے بعد بھاگ کر وہ اسلامی علاقہ میں چلا آئے یعنی آنکھ نکالنے والا یا قاتل یا مال کا ضائع کرنے والا اسلامی علاقہ میں چلا آئے اور اس کے بعد وہ بھی جس کا حق اس نے ضائع کیا ہے وہ بھی اسلامی علاقے میں پہنچ کر اسلامی عدالت میں اس پر دعویٰ دائر کر دے تو قاضی ان تمام صورتوں میں دعویٰ کرنیوالے کے منشاء کے مطابق کچھ بھی فیصلہ نہیں کرے گا، پس یہی حکم اس مال کا بھی ہوگا جسے لے کر وہ اسلامی علاقہ میں چلا آیا ہے''۔

بہر حال اس قسم کے مسلمانوں کے متعلق اسی بنیاد پر امام ابو حنیفہؒ نے اصول مقرر کیا ہے کہ:

"ان اسلامہ یوجب العصمۃ فی نفسہ و مالہ فی الآثار دون الاحکام "(۹۳)

''مسلمان ہونے کی وجہ سے اس کی جان اور اس کا مال معصوم تو ہو جاتا ہے لیکن صرف گناہ ہونے کی حد تک نہ کہ احکام کے لحاظ سے بھی معصوم ہوگا''۔

یعنی مسلمان ہونے کے ساتھ ہی دینی عصمت تو اس شخص کے جان اور مال کو اسی وقت حاصل ہو جاتی ہے جس وقت وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے اب اس کی جان و مال میں بے جا دست اندازی جائز نہ ہوگی۔ یعنی دارالاسلام کے مسلمان کی جان و مال میں بے جا دست اندازی جس قسم کا جرم اور گناہ ہے، جرم اور گناہ ہونے کے لحاظ سے یہی حکم اس شخص کے مال اور جان میں بے جا دست اندازی کا ہوگا جو دار الحرب میں مسلمان ہو کر ابھی وہیں مقیم ہے، اور اسلامی حکومت کی ولایت میں نہیں آیا ہے۔ اصطلاحاً اسی کی تعبیر ان الفاظ

Marfat.com

میں کی جاتی ہے کہ دینی عصمت اُس کو حاصل ہوگئی۔

لیکن یہ بات کہ اسلامی حکومت اور اسلامی حکومت کی عدالت اس کے مال کی ضامن ہو جائے یعنی بے جا طور پر اگر کوئی اس کے مال پر قبضہ کر لے تو اسلامی عدالت اس مال کے واپس لانے کی ذمہ دار ہو، امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ عصمت کی یہ کیفیت اس وقت حاصل ہوگی جب دارالاسلام میں پہنچ کر اسلامی حکومت کی ولایت میں وہ آ جائے ان کا فتویٰ ہے کہ:

''عصمة المال بنفس الاسلام تثبت فی حق الآثام فاما فی الاحکام فیعبر الا حراز بالدار و لم یوجد''(۹۴)

''گناہ گار بنا دینے کی حد تک تو صرف مسلمان ہونے کی وجہ ہی سے اس کا مال معصوم ہو جاتا ہے لیکن احکام کے لحاظ سے بھی اس کا مال معصوم ہو جائے یہ بات اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ اسلامی علاقہ میں سمیٹ کر اپنے مال کو وہ نہ لائے اور ظاہر ہے کہ (مذکورہ بالا صورت میں) یہ بات ابھی اس کے مال کو حاصل نہیں ہوئی ہے''۔

فقہ حنفی میں اموال کے متعلق عصمت مقومہ اور عصمت موثمہ، عصمت کی یہ جو دو قسمیں پائی جاتی ہیں ان کا یہی مطلب ہے، یعنی اسلام لانے کے ساتھ ہی ایسی عصمت ثابت ہو جاتی ہے کہ جس کے بعد دست اندازی گناہ ہو جاتی ہے، یہی عصمت موثمہ ہے لیکن حکومت کی ضمانت مال کو جس عصمت کی وجہ سے حاصل ہوئی اس کے لیے ضروری ہے کہ دارالاسلام میں پہنچ کر اسلامی حکومت کی ولایت میں وہ آ جائے اور یہ عصمت دار کی وجہ سے جو حاصل ہوئی ہے، اسی کا نام عصمت مقومہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کسی قسم کا مسلمان ہو اس سے سود کا معاملہ کرنا اور اس ذریعہ سے سود وصول کرنا قطعاً حرام ہے کہ اسلام لانے کے ساتھ دینی

Marfat.com

عصمت اس کے مال میں اسی وقت پیدا ہو جاتی ہے لیکن عصمت کی دوسری قسم جو دارالاسلام میں آنے اور اسلامی حکومت کی ولایت حاصل کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے چونکہ دار الحرب میں یہ عصمت اس کے مال میں نہیں پیدا ہوتی ، اس لیے واپس دلانے کی ذمہ دار اسلامی عدالت نہیں ہوسکتی ۔ یہی مسئلہ ہے جسے حنفی فقہ کی کتابوں میں مختلف الفاظ سے ادا کیا گیا ہے ۔ بعض مصنفین کی تعبیروں سے لوگوں کو مغالطہ ہوگیا کہ جیسے حربی و مسلم میں ربوا کا معاملہ ابوحنیفہؒ کے نزدیک ربوا نہیں رہتا اسی طرح دارالحرب کے مسلمانوں میں بھی امام ابوحنیفہؒ (العیاذ باللہ) ربوا کے جواز کے قائل ہیں ۔ لیکن مسئلہ کی اصل حقیقت وہی ہے جو میں نے بیان کی آخر اس کے بھی کوئی معنی ہوں گے ۔ الحربی کے ساتھ جو کہا جاتا ہے کہ ربوا ربوا باقی نہیں رہتا تو ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد مال کے غیر معصوم و مباح ہونے پر قائم ہے لیکن مسلمان کا مال تو کسی حالت میں بھی غیر معصوم نہیں ہوتا یعنی دینی عصمت تو بہر حال اس میں باقی ہی رہتی ہے ۔ البتہ عصمت مقومہ یعنی دار الاسلام کی ولایت کی وجہ سے جو عصمت مال میں پیدا ہوتی ہے وہ بلا شبہ دارالحرب میں اسلام لانے والے مسلمان کے مال میں پیدا نہیں ہوتی اور اس کا اثر جو کچھ بھی مرتب ہوتا ہے اس کا تعلق عدالتی احکام سے ہے ، نہ کہ حرام اور گناہ ہونے میں کوئی کمی اس عصمت کے فقدان کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے ۔ حنفی فقہاء دار الحرب کے مسلمانوں کے اموال کو غیر معصوم اگر کبھی کہہ دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ عصمت مقومہ اس کو حاصل نہیں ہے ، ورنہ عصمت موثمہ کا کون انکار کر سکتا ہے اور جب تک یہ عصمت مال میں باقی ہے ، ربوا بہر حال ربوا رہے گا ۔ مذکورۂ بالا تفصیلات سے اسی مسئلہ کے ایک اور پہلو کا مطلب واضح ہوتا ہے ۔

مطلب یہ ہے کہ لا ربوا بین الحربی و المسلم کے مسئلہ کو بیان

Marfat.com

کرتے ہوئے ہمارے فقہاء عموماً فی دار الحرب کی قید کا اضافہ جو کرتے ہیں اس سے عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ ربوٰا کے متعلق ایسی صورت میں ابو حنیفہ جو یہ کہتے ہیں کہ وہ ربوا باقی نہیں رہتا اس کے لیے ضروری ہے کہ معاملہ دار الحرب میں کیا جائے۔ یعنی سمجھا جاتا ہے کہ دار الاسلام میں الحربی ہی سے کوئی مسلمان یہ معاملہ کیوں نہ کرے وہ ربوا اور سود ہی باقی رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ کو اٹھانے والوں نے ہندوستان کی موجودہ حالت میں جب کبھی اٹھایا ہے تو اسی کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی فوراً پیدا کر دیا جاتا ہے کہ پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ ہندوستان دار الحرب ہے بھی یا نہیں۔ اگرچہ مولانا ظفر احمد صاحب نے خلافِ دستور اپنے اس مضمون میں ہندوستان کے دار الحرب ہونے یا نہ ہونے کے مسئلہ کو نہیں اٹھایا ہے لیکن بہر حال اس مسئلہ کا ضروری جزء بحث کا یہ حصہ بھی ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ مسئلہ کی جو اصل حقیقت ہے اسے بیان کروں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے جب دار الحرب کی قید ہمارے فقہاء بڑھاتے ہیں تو بظاہر اس کا اقتضاء یہی ہے کہ دار الاسلام میں ربوا ہی باقی رہتا ہے، خواہ الحربی ہی کے ساتھ یہ معاملہ کیوں نہ کیا جائے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسئلہ کی بنیاد جب اموال کے غیر معصوم ہونے پر قائم ہے تو پھر اس میں دار الحرب یا دار الاسلام کی قید کے کچھ معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ غیر معصوم مال پر مال والے کی رضامندی سے غدر اور عہد شکنی کے بغیر جہاں کہیں مسلمان کو قبضہ حاصل ہو جائے اس مال کے مالک ہونے سے اب کوئی چیز اس کو روک نہیں سکتی۔ خواہ واقعہ دار الحرب میں پیش آئے یا دار الاسلام میں۔ مگر فقہاء آخر دار الحرب کی قید کیوں لگاتے ہیں، یہی سوچنے کی بات ہے۔

قصہ یہ ہے کہ قرآن نے ربوا کی ممانعت کرتے ہوئے منجملہ اور دھمکیوں

کے جو یہ دھمکی دی ہے کہ:

﴿فان لم تفعلو افا ذنو ابحرب من الله و رسوله﴾(۹۵)

''اگر ایسا تم نہیں کرتے (یعنی ربوا کے کاروبار کو ترک نہیں کرتے) تو پھر اعلان جنگ دے دو اللہ اور اس کے رسول کو''۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ربوا کو اسلام نے ان جرائم کی فہرست میں داخل کیا ہے، جن کا انسداد اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔ یعنی صرف وعظ و نصیحت ہی سے کام نہیں لیا جائے گا، بلکہ بزور شمشیر بھی اس کے لیے انسداد کی کوشش اسلامی حکومت کو کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا یعنی ذمیوں کو مذہبی آزادی کے ساتھ ساتھ اس کی بھی آزادی حالانکہ بخشتی ہے کہ باہم مسلمانوں میں جو معاملات ناجائز ہیں، مثلاً شراب فروشی، خنزیر فروشی وغیرہ لیکن ذمیوں کے مذہب میں وہی معاملات اگر جائز ہوں تو اجازت دی گئی ہے کہ باخود ان معاملات کو وہ اسلامی حکومت میں بھی کر سکتے ہیں اور ان کے اعتبار سے یہ افعال غیر آئینی نہیں قرار دیئے جاتے ہیں لیکن اس قسم کے تمام معاملات میں سے صرف الربوا یعنی سود کے معاملہ کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ کا قاعدہ تھا کہ غیر مسلم ذمیوں سے جب معاہدہ فرماتے تو مذہبی امور اور معاملات کی آزادی کے ساتھ ساتھ اس کی تصریح بھی معاہدہ نامہ میں کر دی جاتی تھی کہ سود کا کاروبار ہمارے علاقہ میں نہیں کریں گے۔ نجران کے عیسائیوں سے عہد ذمہ کا معاملہ جب طے ہوا تو منجملہ اور باتوں کے عہد نامہ میں لکھا گیا جیسا کہ کتاب الاموال میں ابو عبید نے نقل کیا ہے اس کے یہ الفاظ بھی تھے:

"علی ان لا یاکلوالربا فمن اکل الرباء من ذی قبل فذمتی منه بریئة"(۹۶)

''عیسائی عہد ذمہ جن کا قبول کیا گیا ہے ان پر حکم بھی عائد کیا جاتا ہے کہ

وہ سود نہ کھائیں گے پس ان میں جو سود کھائے گا تو میرا یہ عہد ذمہ ان سے الگ ہو جائے گا یعنی باقی نہ رہے گا''۔

شمس الائمہ سرخسی نے لکھا ہے کہ علاوہ نجران والوں کے ہجر کے ذمی مجوسیوں کو بھی آنحضرت ﷺ نے لکھ کر بھیجا تھا:

"ان تدعوا الربا او یاذنوا الحرب من الله و رسوله"(۹۷)

''یہ کہ سودی کاروبار کو ترک کر دیں یا پھر اللہ اور اس کے رسول سے جنگ پر تیار ہو جائیں''۔

اسی بنیاد پر ہمارے فقہا نے طے کر دیا ہے کہ اسلامی قلمرو میں سودی کاروبار کی اجازت کسی کو نہیں دی جائے گی حتی کہ ان غیر مسلموں کو بھی نہیں جو امن کا معاہدہ کر کے ہمارے علاقہ میں تجارت وغیرہ کے لیے آئیں یعنی مستامنوں کو بھی اس معاملہ سے بزور حکومت روکا جائے گا۔ گذر چکا کہ اسلامی عدالت ہر حال میں اس کو مسترد کر دے گی خواہ معاملہ جن لوگوں پر بھی ہوا ہو۔

سود کے ساتھ جب اسلامی آئین کا یہی نقطہ نظر ہے تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ ہر وہ شخص جو اسلامی حکومت کے حدود میں مقیم ہے اس کے متعلق اسلامی حکومت یہ طے کیے ہوئے ہے کہ ربوا کے اعتبار سے سب کا مال معصوم ہے۔

شمس الائمہ نے مبسوط میں لکھا ہے:

"فان دخل تجارا هل الحرب دار الاسلام بامان فاشترى احد هم من صاحبه در هما بدر همين لم اجز ذلك الا ما اجيزه بين اهل الاسلام و كذلك اهل الذمة اذا فعلوا ذلك لان ما ل كل واحدٍ منهم معصوم متقوم لا يتملكه صاحبه الا بجهة العقد و حرمة االربا ثابتة "(۹۸)

Marfat.com

''غیر اسلامی علاقہ کے باشندے تاجر بن کر ہمارے (اسلامی علاقہ میں) داخل امان کے معاہدہ کے ساتھ اگر ہوں تو اگر ان میں سے کوئی اپنے ہی لوگوں میں سے کسی سے یہ معاملہ کرے، یعنی ایک درہم سے دو درہم خریدے تو ہم اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ پس انہی باتوں کی اجازت ہم انہیں (اپنے علاقہ میں) دے سکتے ہیں جو معاملات خود باہم مسلمانوں میں جائز ہیں اور یہی حکم اہل ذمہ کا بھی ہے (یعنی اسلامی حکومت کی ذمی غیر مسلم رعایا کا حکم بھی یہی ہے) اگر وہ اس قسم کا کاروبار کریں گے اور یہ اس لیے کیا جارہا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا مال معصوم بھی ہے اور متقوم بھی ہے (یعنی اسلامی حکومت اس کی قیمت دلانے کی ذمہ دار ہے) اور اس قسم کے مال کا مالک دوسرا فریق اسی وقت ہوسکتا ہے جب معاملہ ابھی باہم ہوا اور سودی کاروبار کی حرمت جب ان سب کے متعلق ثابت ہے کیونکہ معاہدہ میں اس کاروبار کو مستثنیٰ کردیا جاتا ہے''۔

بہرحال جب دارالاسلام میں رہنے والے خواہ متوطن ہوں یا مستامن جب سب کے مال معصوم اور متقوم ہوجاتا ہے تو ربوا کے متعلق جو یہ صورت پیدا ہوتی تھی یعنی الحربی کے ساتھ ربوا باقی نہیں رہتا تھا اب اس کی گنجائش دارالاسلام میں باقی ہی کیا ہے، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ **لا ربوا بین الحربی و المسلم** کا حکم صرف دارالحرب ہی کی حد تک محدود ہے۔ یعنی مال کے غیر معصوم ہونے کی شکل دارالحرب ہی میں پیدا ہوسکتی ہے۔ اور مسئلہ کی بنیاد اس کے غیر معصوم ہونے پر قائم ہے۔

لیکن فرض کیجیے کہ اسلامی علاقہ کے کسی خاص حصہ میں کافروں کی فوج

Marfat.com

گھس آئی اور ایسی صورت پیدا ہوگئی کہ مسلمانوں کی اسلامی حکومت اپنے احکام وفرامین کو اس علاقہ میں نافذ نہیں کرا سکتی تو کیا اس وقت بھی اس علاقہ کے باشندوں کے اموال کی عصمت باقی رہتی ہے۔ گذر چکا کہ مسلمانوں کے اموال میں تو عصمت کی دوگونہ کیفیت دارالاسلام میں پیدا ہو جاتی ہے یعنی دینی عصمت اور دار والی عصمت، لیکن غیر مسلموں کے اموال کو صرف دار کی عصمت حاصل ہوتی ہے۔ اب دارالاسلام کے جس علاقہ میں اسلامی حکومت اپنے احکام وفرامین کی تعمیل کرانے سے مجبور ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس علاقہ کے مسلمان باشندوں کے اموال کی دینی عصمت تو باقی رہے گی لیکن دار والی عصمت جس کی بنیاد اسلامی حکومت کی ولایت پر قائم ہے جب ولایت ہی باقی نہیں رہی تو عصمت کے باقی رہنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ دار والی عصمت سے اس علاقہ کے باشندوں کے اموال محروم ہو جاتے ہیں اور غیر مسلموں کے اموال کو چونکہ صرف یہی عصمت حاصل تھی اس لیے ان کے اموال ایسی صورت میں محض اس علاقہ کی حد تک غیر معصوم ہو جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ عام حالات میں تو لا ربوا بین المسلم والحربی کے مسئلہ میں فی دارالحرب کی قید کتابوں میں لگائی جاتی ہے، لیکن سیر کبیر میں امام محمد نے لکھا ہے کہ:

"لو دخل عسكر من المشركين دار الاسلام ثم دخل اليهم مسلم بامان فعاملهم بهذه الصفة كان هذا و ما لو كان مستامناً فی دارالحرب سواء "(۹۹)

''اگر مشرکوں کی کوئی فوج اسلامی علاقہ میں داخل ہو جائے اور اس کے بعد کوئی مسلمان ان کا معاہدہ حاصل کر کے مشرکوں کی اس فوج میں داخل ہو کر ربوا کا معاملہ کرے، تو اس وقت اس کا حکم بھی وہی ہو گا جو دار

Marfat.com

الحرب میں غیر مسلموں کے ساتھ ربوا کا حکم ہے''۔

شمس الائمہ اسی کی شرح وتوجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لان العسكر اذا كانوا اهل منعة فحكم الاسلام لا يجری فی معسكرهم كما لا يجری فی دار الحرب''(۱۰۰)

''کیونکہ مشرکوں کی فوج جب اس مقام میں قوت والی ہوگئی، تو اس علاقے کا حال وہی دار الحرب کا حال ہوگیا، یعنی اسلام کا حکم مشرکوں کی اس چھاؤنی میں اسی طرح نہیں چل سکتا، جیسے دار الحرب میں نہیں چل سکتا''

اس کے بعد پھر زیادہ صراحت کرتے ہوئے وہی ارقام فرماتے ہیں:

''هذاه الاجوبة علی الحكم فيما اذا كان حكم الكفر فی الموضع الذی جرت المعاملة فيه كان الحكم فيه علی ما ذكروا اذا كان الحكم حكم المسلمين فلا يجوز من المعاملة فی ذلک الموضع الا ما يجوز فی دار الاسلام ''(۱۰۱)

''یہ جواب (یعنی سودی کاروبار کے متعلق مشرکوں کی چھاؤنی) میں جو حکم دیا گیا ہے، اس حکم کا تعلق اسی علاقے سے ہے جہاں کفر کا حکم جاری ہو، تو اس علاقہ میں صرف وہی معاملہ جائز ہوگا، جو دار السلام میں جائز ہو سکتا ہے''۔

مسئلہ کو سمجھانے کے لیے اسی کی معکوس شکل کو پیش کر کے وہی لکھتے ہیں:

''الا تری ان عسكر المسلمين لو دخلوا دار الحرب ثم جرت هذه المعاملة فی المعسكر فان حكمها و حكم ما جرت فی دار الاسلام سواء''(۱۰۲)

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ مسلمانوں کی فوج اگر دار الحرب کے کسی علاقہ میں

Marfat.com

داخل ہو جائے اور مسلمانوں کی اس چھاؤنی میں یہ معاملہ کیا جائے، تو پھر اس وقت اس کا حکم وہی ہوگا جو دار الاسلام میں اس معاملہ کا ہے"۔

اسی کتاب میں دوسری جگہ امام محمد نے مذکورہ بالا مسئلہ کا اعادہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"ولو ان عسکرا من اهل الحرب لهم منعة دخلوا دار الاسلام ثم استامن الیهم مسلم و عاملهم بهذه المعاملة التی لا یجوز فیما بین المسلمین فلا باس ذلک"(۱۰۳)

"اگر اہل حرب (یعنی کافروں) کی ایسی فوج جو قوت و طاقت رکھتی ہو، اسلامی علاقوں میں گھس آئے پھر کوئی مسلمان ان کافروں سے امن کا معاہدہ کر کے ان کی چھاؤنی میں داخل ہو اور ان کے ساتھ اسی معاملہ کو کرے جو باہم مسلمانوں میں جائز نہیں ہے۔ (مثلاً ربوا کا معاملہ کرے) تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے"۔

شمس الائمہ اسی کے ذیل میں یہ اضافہ کرتے ہیں:

"لان المعنی الذی لا جله جازله ذلک فی دار هم موجودة فی منعة فی دار الاسلام و هو ان اموالهم مباح الا خذ للمسلم و علیه التحرز عن غدر الامان فهو بهذه المعاملة یکتسب سبب التحرز عن الغدر"(۱۰۴)

"کیونکہ جس وجہ سے یہ معاملہ کافروں کے علاقہ میں جائز قرار دیا گیا ہے۔ وہی وجہ تو اس علاقہ میں بھی اب پائی جاتی ہے جہاں قوت کے ساتھ دار الاسلام کے کسی علاقہ میں وہ گھس پڑے ہیں یعنی دار الحرب میں جیسے ان کے اموال پر قبضہ مسلمانوں کے لیے جائز و مباح ہے۔ البتہ

Marfat.com

جن کے معاہدے کی خلاف ورزی نہ ہونی چاہیے اور معاملہ کرنے کے لیے معنی ہی یہ ہیں کہ عہد شکنی سے وہ ان کے مال پر قبضہ کرنے میں بچنا چاہ رہا ہے''۔

اور اس کے بعد آخر میں شمس الائمہ ہی اس پر تنبیہ کرتے ہیں کہ:

''و بهذالقدر تبين ان الا صح ما ذهب اليه المشائخ ان موضع نزولهم لم يا خذ حكم دار الحرب و مع ذلك جا ز للمسلم هذه المعاملة لبقاء الا باحة فی مالهم ''(۱۰۵)

''اور اس سے یہ امر واضح ہوگیا ہے کہ صحیح تر بات وہی ہے جس کی طرف ہمارے مشائخ گئے ہیں ۔یعنی کافروں کی فوج جہاں گھس کر اتر پڑی ہے اگرچہ صرف اتنی سی بات سے وہ علاقہ دارالحرب نہیں بن جاتا لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ اس معاملہ کو وہ اس علاقہ میں بھی کرسکتے ہیں ۔(یعنی سودی کاروبار کے ذریعہ غیر مسلم کے مال پر قبضہ) کیونکہ ان کے مال کا مباح ہونا جو مسئلہ کی بنیاد ہے تو وہ یہاں بھی پایا جارہا ہے''۔

گذشتہ بالا تصریحات سے معلوم ہوا کہ ''فی الحرب کی قید ''لا ربوا بین المسلم و الحربی'' کے مسئلہ میں عموماً جو لگائی جاتی ہے تو یہ عام حال کا بیان ہے ، یعنی اموال کے غیر معصوم و غیر متقوم ہونے کی شکل عموماً دار الحرب ہی میں ممکن ہے ۔لیکن باوجود دار الاسلام ہونے کے اگر ایسی صورت پیش آجائے جس کی وجہ سے اسلامی علاقہ میں بھی الحربی کا مال غیر معصوم و مباح ہو جائے تو اس وقت دارالاسلام کے اس علاقہ میں بھی ربوا کا جو معاملہ الحربی سے کیا جائے گا اور اس ذریعہ سے جو مال مسلمانوں کے قبضہ میں آئے گا وہ ربوا نہ ہوگا اور مسلمان اس

کے جائز مالک قرار دیئے جائیں گے۔

مسئلہ کی جب اصلی صورت یہی ہے تو ظاہر ہے کہ دار الحرب کی قید کو پیش کر کے ہندوستان کے دارالحرب و دار الاسلام ہونے کی جو بحث اٹھائی جاتی ہے وہ مسئلہ کی حقیقت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ مان بھی لیا جائے کہ ہندوستان اب تک دارالاسلام ہی باقی ہے یا دار الاسلام نہیں، بعض لوگوں کے متعلق میں نے سنا ہے کہ ایک تیسری شکل دار کی یعنی دار الامن انہوں نے پیدا کی ہے۔ فرض کیجیے کہ وہ دار الامن ہی ہو، لیکن غیر اسلامی حکومت کے اس اقتدار کا انکار کیا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے اسلامی احکام و قوانین کے نافذ کرنے کی قدرت مسلمانوں میں باقی نہیں رہی ہے، کیا مسلمان اس ملک میں اگر سودی کاروبار کو بزور روکنا چاہیں تو روک سکتے ہیں؟ پس دار الاسلام کے کسی علاقہ میں غیر اسلامی حکومت کی صرف چھاؤنی اگر اتنی قوت کے ساتھ قائم ہو جائے کہ اسلامی احکام کا نفاذ وہاں نہ ہو سکے، جب وہاں ربوا الحربی کے ساتھ باقی نہیں رہتا تو ہندوستان کی موجودہ سیاسی حالت بدرجہ اولیٰ ربوا کو غیر ربوا بتا دینے کے لیے کیا کافی نہیں ہے؟

بہر حال میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ ربوا کو بدترین معاشی جرم قرار دیتے ہوئے اسلام نے جہاں اس کے انسداد میں پورا زور صرف کیا ہے، اسی کا یہ اثر ہے کہ ربوا کے ساتھ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ الربیہ (یعنی سود سے ملتی جلتی شکلوں) کو بھی ترک کر دیں، فقہائے اسلام نے اسی لیے الربوا کے ساتھ الربیہ کی شکلوں کو منقح کر کے ان پر احکام لگائے اور کوئی شبہ نہیں کہ جب تک دنیا کے سیاسی اقتدار کی باگ مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی وہ خدا کی زمین پر ایک ایسے معاشی نظام کے قائم کرنے میں کامیاب ہوئے جس میں سود تو سود یہ واقعہ ہے کہ

Marfat.com

سود سے معمولی مشابہت رکھنے والے معاملات کا بھی پتہ نہ تھا۔ خصوصاً امام ابو حنیفہؒ کے انتہائی نازک محتاط مسلک نے اس باب میں جو نتائج کو پیدا کیے ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یقیناً ایک واقعہ تھا اور اب بھی ہے کہ اس معاشی جرم کو جرم سمجھنا یا دوسروں کو سمجھانا آسان نہیں ہے۔ معاشی مسائل کے ادھیڑ بن میں علمائے معاشیات ایڑی سے چوٹی تک کا زور صرف کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں لیکن اس وقت تک اس مسئلہ کے متعلق کسی آخری مختتم فیصلہ تک وہ نہیں پہنچے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشی جرائم کی جو فہرست مذاہب نے دنیا میں پیش کی ہے مثلاً چوری، ڈاکہ، فریب، خیانت وغیرہ وغیرہ ان کے جرم ہونے کو تو اقوام عالم نے عموماً تسلیم کر لیا ہے اور غیر دینی آئین ودساتیر میں بھی ان کے جرم ہونے کو مان لیا گیا ہے۔ لیکن سود کا حال اس معاملہ میں بالکل مختلف ہے۔ ایک طرف یہ بھی دیکھا جا رہا ہے کہ مشکل سے ہی کسی قوم یا ملک کے آئین میں اس کو جرم قرار دیا گیا ہو، مذہبی حیثیت سے خواہ دنیا کا کوئی مذہب ہو ایک چور، بٹ مار، ڈاکو، جیب تراش میں اور سود خوار میں حالانکہ مجرم ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے بلکہ سود خواری کا مجرم دوسرے جرائم کے ارتکاب کرنے والوں کے مقابلہ میں مذہباً شاید زیادہ ناپاک مجرم ہے لیکن عموماً ممالک واقوام کی سوسائٹیوں میں سود خواری کے مجرم کو مجرم کی حیثیت سے صرف یہی نہیں کہ نہیں دیکھا جاتا بلکہ اس کے مجرم ہونے کا خطرہ بھی عام قلوب میں پیدا نہیں ہوتا۔ حالانکہ اس کا مقام وہاں تھا، جہاں چور اور بٹ مار، ڈاکو اور فریبی رہتے ہیں لیکن دیکھا جاتا ہے کہ وہ شرفا اور شائستہ ترین طبقہ کے ایک معصوم رکن کی حیثیت سے امن واطمینان کی زندگی آبادیوں میں گذار رہا ہے اور آج تو بینک کاری

Marfat.com

کے نظام نے سود خوار بننے کی راہوں میں جو آسانیاں پیدا کر دی ہیں، ان کا نتیجہ تو یہ ہے کہ وہ شریف ہی نہیں ہے۔ جو سود خوار نہیں ہے، جب تک سود خواری کے کسی مرکز (بنک) کی کتاب آپ کے پاس نہ ہو سمجھا جاتا ہے کہ مہذب طبقہ میں آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

یہی سوچنے کی بات ہے کہ ایسی صورت میں سود خواری کی ممانعت اور اس کے انسداد کی تدبیروں کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام نے مسلمانوں کے لیے کچھ ایسی راہیں بھی اگر کھول رکھی ہیں جن کیوجہ سے مالیات کی بین الاقوامی کش مکش میں مبتلا ہو کر دوسری قوموں کے منہ کے تر لقمہ بننے سے مسلمان محفوظ ہو جائیں تو اسلامی قانون کے بنانے والے عالم خبیر سے کیا اس کی توقع بے جا توقع ہو سکتی ہے؟

ایک گال کے تھپڑ کے جواب میں دوسرے گال کے پیش کرنے کی غیر عملی اور غیر فطری تلقین اسلام نے مسلمانوں کو نہیں کی ہے کہنے کی حد تک تو سب کہتے ہیں۔ جھوم جھوم کر وعظوں اور تقریروں میں مسلمانوں کو سنایا جاتا ہے کہ:

جزاء سیئة سیئة مثلها (۱۰۶)

فان اعتدوا فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدی علیکم (۱۰۷)

فان عاقبتم فعاقبوا بمثل ماعوقبتم به (۱۰۸)

لیکن اسی کے ساتھ دیکھنے والے آخر یہ کب تک دیکھتے رہیں گے کہ مسلمانوں کو دنیا کی سود خوار قومیں نگلتی چلی جا رہی ہیں لیکن اس برائی کے جواب میں مسلمان ان کا کچھ نہیں کر سکتے، کیا مسلمانوں کے دین الفطرة کا یہی اقتضاء ہے؟

مسلمانوں کے ائمہ اجتہاد و تفقہ میں سے اس آنے والی مصیبت کا احساس ان کے سب سے بڑے اور اعظم امام کو اس کے نازل ہونے سے پہلے

Marfat.com

اگر ہو چکا تھا اور اسی احساس نے ان کے ذہن کو ان قرآنی اشارات اور نبوی ایمادات کی طرف متوجہ کر دیا جن میں اس آنے والی بین الاقوامی معاشی مصیبت کا علاج مستور تھا تو اس کی بڑائی اقتضا یہی تھا لیکن بیان کر چکا ہوں کہ بحمد للہ اس فتویٰ میں وہ تنہا بھی نہیں ہیں بلکہ ان کے اساتذہ اور بعض جلیل القدر معاصرین کا بھی یہی خیال تھا، البتہ اصل فتویٰ کی اشاعت کی ذمہ داری اگر کہا جائے تو بلا شبہ امام اعظم ہی پر عائد ہوتی ہے، اسی لیے عام طور پر یہی مشہور ہو گیا کہ یہ امام اعظم کی تنہا رائے ہے۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے اپنے مضمون میں بعض دوسری ذیلی باتوں کا بھی تذکرہ اپنے خیال کی تائید اور حنفی مذہب کے اس جزئیہ کی تردید میں فرمایا ہے۔ اگرچہ اپنے تمہیدی مضمون میں ان ذیلی باتوں کے جواب کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں لیکن مضمون کو ختم کرتے ہوئے چاہتا ہوں کہ صراحتاً بھی ان کا یہاں ذکر کر دوں۔

مولانا نے صغریٰ و کبریٰ بنا کر قیاس اقترانی کی شکل میں ایک چیز اس سلسلہ میں یہ پیش کی ہے کہ مال الحربی مباح اگر اس صغری کو مان بھی لیا جائے تو اس کا کبریٰ یعنی جو مال مباح ہے اس میں عقد ربوا جائز ہے۔ اس کے ثابت کرنے کی ذمہ داری میرے سپرد کر کے پھر خود ہی اس کے بطلان کے ذمہ دار بن کر مولانا نے چند فقہی جزئیات کو بطور نظیر پیش کیا ہے۔ مثلاً فقہ کا مسئلہ ہے کہ حاجت اور ضرورت کے وقت باپ کے لیے مباح اور جائز ہے کہ بیٹے کے مال سے "بقدر حاجت" لے لے۔ مولانا اس جزئیہ کو پیش کر کے مجھ سے پوچھتے ہیں، تو کیا باپ کے لیے اسی صورت میں جائز ہوگا کہ بیٹے کے اس مال مباح کو ربوا کی شکل میں لے؟

Marfat.com

اب میں کیا عرض کروں، مولانا کے الفاظ بقدر حاجت کے اندر اس کا جواب خود ہی مستور ہے۔ یعنی بیٹے کا مال دراصل غیر معصوم نہیں ہوتا۔ لیکن باوجود معصوم ہونے کے بقدر ضرورت اس میں اباحت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ربوا کی شکل کے متعلق امام ابو حنیفہؒ قائل ہیں، کہ وہ ربوا باقی نہیں رہتا، اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی غیر معصوم مباح مال کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ بقدر حاجت و ضرورت والی اباحت سے مال جب غیر معصوم نہیں ہو جاتا تو اس پر یہ صورت منطبق ہی کہاں ہوتی ہے۔

باقی اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ جس کا جی چاہے میرا مال لے لے، یعنی اپنے مال کو مباح کر دے۔ میں تو خیال کرتا ہوں کہ اس شخص کا مال اگر ربوا کے نام سے بھی کوئی لے گا تو یقیناً وہ ربوا نہیں ہوگا، اس کی مثال تو ایسی ہے کہ ایک شخص اپنی آمدنیوں کو مختلف مد میں جمع کرتا ہے اور ہر مد کے مصارف متعین کر دیتا ہے۔ اگر بضرورت ایک مد کی آمدنی سے دوسرے مد کے مصارف میں کچھ خرچ کرے اور پھر اسی مد میں مثلاً دس اگر لیے تھے، بیس روپیہ یہ کہتے ہوئے جمع کرے، کہ دس زائد سود ہے تو کیا واقع میں یہ دس کی رقم سود ہو جائے گی۔ آخر لا ربوا بین العبد و المولی والی صورت میں مولانا نے بھی تو اقرار کیا ہے کہ گو ربوا کا لفظ بولا جائے، لیکن درحقیقت وہ ربوا نہیں ہوگا۔

مولانا نے غنیمت کے مسائل و احکام کا تذکرہ کر کے چاہا ہے کہ لا ربوا بین المسلم و الحربی والے مسئلہ پر بھی ان کو منطبق کریں۔ یعنی غنیمت کے مال پر امام کی تقسیم کے بغیر قبضہ کرنا ناجائز ہے یا دار الاسلام میں جب تک غنیمت کا مال نہ پہنچ جائے اس وقت تک اس میں مسلمانوں کی ملکیت نہیں پیدا ہوتی، ان باتوں کا جواب میں شروع ہی میں دے چکا ہوں اور عرض

کر چکا ہوں کہ الحربی سے جو اموال لیے جاتے ہیں ان کی ایک قسم تو وہ ہے جن کے حصول میں حکومت کی پشت پناہی اور فوج کی مدد شامل ہو اور یہ سارے احکام اسی سے متعلق ہیں، لیکن الحربی کے جس مال پر حکومت اور حکومت کی فوج کی امداد کے بغیر قبضہ ہو گیا ہو تو امام محمد کے حوالہ سے گذر چکا کہ:

"ھذا الیس بغنیمة بل ھو احراز المباح فیکون بمنزلة الا صطیا د والاحتشاش "(۱۰۹)

''یہ مال غنیمت نہیں ہے بلکہ ایک جائز اور مباح مال پر قبضہ حاصل کرنا ہے، پس اس کی مثال وہی شکار اور گھاس گڑھنے کی مانند ہوگی''۔

اور امام محمد نے اموال کی اس قسم کے متعلق یہ فتویٰ نقل کیا ہے:

"فالمأخود لمن اخذہ ولا خمس فیه "(۱۱۰)

''پس اس ذریعہ سے جو مال لیا جائے گا وہ صرف لینے والے ہی کا ہوگا اور اس میں حکومت کا حصہ خمس بھی نہیں ہے''۔

ان امور کے متعلق تفصیلی طور پر تمہید میں مجھے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا ہوں، اعادہ ان کا صرف مزید تنبیہ کے لیے کیا گیا۔

آخر میں مولانا نے ایک سوال جو یہ اٹھایا ہے کہ لینے کے ساتھ کیا حربیوں کو مسلمان سود بھی دے سکتے ہیں؟ اور جواب میں آپ نے امام ابو حنیفہ کی طرف یہ منسوب کیا ہے کہ حربیوں کو سود دینے کی اجازت وہ نہیں دیتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو اس مسئلہ پر گفتگو بھی کرنا نہیں چاہتا، اور نہ میں نے کوئی ایسا دعویٰ کیا ہے، لیکن بین الاقوامی اباحت کے جس قانون کا اپنے مضمون کی ابتداء میں میں نے ذکر کیا ہے اگر وہ صحیح ہے تو جس طرح حربیوں کا مال مسلمانوں کے لیے ایسی صورت میں مباح ہو جاتا ہے، خود مسلمانوں کا مال بھی تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک

Marfat.com

حربیوں کے لیے مباح ہے اور اس بنیاد پر مسئلہ کی جو صورت ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے، کہ ابن ہمام نے اسی لا ربوا بین المسلم والحربی کے ذیل میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا مطالعہ مفید ہوگا، شمس الائمہ سرخسی کی ایک عبارت میں بھی پیش کر دیتا ہوں، وہ لکھتے ہیں:

''المسلم یبائع الحربی بذلک فی دار الحرب ثم اسلم الحربی و خرج الی دار نا قبل التقابض فان خاصمه فی ذلک الی القاضی ابطله و ان کانا تقابضا فی دار الحرب ثم اختصما لم انظر فیه و یستوی ان کا ن المسلم اخذ الدرهمین بالدرهم و الدرهم بالدرهمین لانه طیب نفس الکافر بما اعطاه قل ذلک او کثر واخذ ما له بطریق الأ باحة کما قررناه'' (۱۱۱)

''ایک مسلمان کسی حربی سے یہی معاملہ (سود) کا دار الحرب میں کرتا ہے پھر وہ حربی مسلمان ہو جاتا ہے اور غیر اسلامی علاقہ سے منتقل ہو کر ہمارے علاقہ میں اس وقت آ جاتا ہے جب کہ سود والے کاروبار کے ذریعہ سے لین دین کا جو معاملہ ہوا تھا اس میں تقابض بدلین کی تکمیل نہیں ہوئی تھی یعنی مسلمان نے سود کی رقم پر قبضہ نہیں کیا تھا، اب مگر ایسی صورت میں وہ دار الاسلام میں پہنچ کر مسلمانوں کے قاضی کے اجلاس میں دعویٰ دائر کرے، یعنی چاہے کہ سود کے ذریعہ اس پر جو رقم واجب مسلمان کی ہوئی ہے اسے باطل ٹھہرایا جائے تو قاضی اس معاملہ کو باطل قرار دے گا۔ لیکن اگر تقابض بدلین کا معاملہ دار الحرب ہی میں مکمل ہو چکا ہو اس کے بعد اگر ہماری عدالت میں وہ رجوع کرے گا، تو ہم اس معاملہ کی طرف توجہ نہ کریں گے اور برابر ہے اس مسئلہ میں یہ بات کہ مسلمان نے ایک

Marfat.com

درہم دے کر دو درہم لیے ہوں ، یا ایک درہم لے کر اسی مسلمان کو دو درہم دینے پڑے ہوں (یعنی مسلمان سے سود لینا اور سود دینا دونوں برابر ہیں) کیونکہ مسلمان نے مال کافر کے جی کو خوش کر کے لیا ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ اور یہ کہ اس مسلمان نے جس مال کو قبضہ کر کے اپنی ملکیت بنایا ہے وہ اباحت کی راہ سے بنایا ہے، جیسا ہم اس کی تقریر کر چکے ہیں۔''

خاتمہ مسئلہ سود و قمار وغیرہ

میں متلصص (یعنی جاسوس جو بطور جاسوسی دار الحرب میں جائے) اس کے ''جواز عقد ربا'' کا قائل ہوں۔ حالانکہ اہل حرب اس سے بالفعل برسر جنگ نہیں ہوتے مگر چونکہ ان سے نہ حکومت اسلام کا معاہدہ ہے نہ جاسوس نے معاہدۂ امن کیا ہے اس لیے اس کے حق میں اہل حرب کے نفوس واموال دونوں غیر معصوم اور مباح ہیں اور اس کے لیے اہل حرب کے وہ اموال بھی حلال ہیں جو عقد ربا سے حاصل کرے۔ (۱۱۲)

ہمارے واجب الاحترام بزرگ مولانا ظفر احمد صاحب کا جب یہی فتویٰ ہے تو اب ان سے خاکسار کا اختلاف ہی کیا رہ گیا۔ مسلمانان ہند نے موجودہ غیر اسلامی حکومت سے اگر معاہدہ بھی کیا ہے تو ظاہر ہے کہ اسی بات کا معاہدہ کیا ہے کہ جو قانون قیام امن وامان کے لیے وہ نافذ کرے گی اس کی پابندی کریں گے اور جو قانون اس حکومت نے نافذ کیا ہے اس میں چوری ڈاکہ فریب وغیرہ کے ذریعہ سے ملک کے کسی باشندے کے مال کے لینے کو جیسے ناجائز ٹھہرایا گیا ہے اسی طرح ربوا اور اسی قسم کے بعض دوسرے عقود جو اسلامی نقطہ نظر سے عقود فاسدہ ہیں ان کے ذریعہ سے لین دین کو نہ صرف جائز ہی قرار دیا گیا ہے بلکہ ان فاسد ذرائع سے لوگوں کے جو مطالبات ایک دوسرے پر عائد ہوتے ہیں ، ان کی

Marfat.com

باضابطہ ادائیگی کی وہ ذمہ دار ہے۔ اس لیے حکام ان کی ڈگریاں دیتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکومت قائمہ کے اس قانون کے بعد کسی کی حیثیت سے بھی یہ کہنا درست ہوسکتا ہے کہ مسلمانانِ ہند نے قانون کے ان جائز ذرائع سے اس ملک کے باشندوں کے اموال کے نہ لینے کا معاہدہ کیا ہے؟ پس غیر مسلم اقوام سے جو روپیہ ان ذرائع سے مسلمانوں کے قبضہ میں آئے گا اس کے لینے کی وجہ مسلمانوں کے لیے کیا ہوسکتی ہے؟ شریعت اسلامی ان اموال کو مسلمانوں کے لیے مباح کرچکی ہے، قانون بھی اس کے لینے کو جائز قرار دے رہا ہے یعنی اس روپے کے لینے میں معاہدے کی خلاف ورزی بھی لازم نہیں آتی تو پھر مولانا کس بنیاد پر مسلمانوں کے لیے غیر مسلم اقوام سے حاصل کی ہوئی ان رقوم کے لینے اور اپنی ملک بنانے کو ناجائز ٹھہرا رہے ہیں۔

Marfat.com

حواشی

الف۔ مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب کے یہ مضامین بعنوان ''مسئلہ سود مسلم و حربی میں'' مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ مولانا ظفر احمد عثمانی کے مضامین بھی قسط وار معارف کے مندرجہ ذیل شماروں میں چھپتے رہے ہیں۔ (معارف، جنوری ۱۹۴۵ء، جولائی ۱۹۴۵ء، جنوری ۱۹۴۶ء، جولائی ۱۹۴۶ء)

ب۔ مولانا نے یہ فرق جو پیدا کیا ہے کہ غلام کا مال آقا غلام کی رضامندی کے بغیر لے سکتا ہے۔ لیکن حربی کا مال اس کی رضامندی کے بغیر نہیں لے سکتا، لیکن کیوں نہیں لے سکتا؟ گذر چکا کہ معاہدۂ امن مانع ہے۔ افسوس ہے کہ اپنے پورے مضمون میں اس رضا میں جس کی ضرورت غدر و خیانت سے بچنے کے لیے پیش آتی ہے اور اس رضا میں جو مال معصوم کے مالک کے لیے ضروری ہے فرق نہیں، فرمایا فشتان بینهما، اور پھر اسی کو بنیاد بنا کر مولانا نے بحث شروع کر دی۔

ج۔ فقہائے احناف نے مذکورۂ بالا آیت کے اس پہلو کی طرف حالانکہ اشارے کیے ہیں۔ خصوصاً شمس الائمہ سرخسی نے شرح سیر کبیر میں لیکن مولانا ظفر احمد صاحب نے جو تائید کے اسی سے حنفی مسلک کی تردید محض اس بنیاد پر نکالنی چاہی ہے کہ مسلم و حربی والے قصے میں ملک کی وجہ اخذ و قبض نہیں، بلکہ ان کے خیال میں شاید عقد ہے، اسی لیے فرماتے ہیں کہ حلال معاملہ سے جو حق کیا واجب ہوگا، معاملہ تو صرف رضا کی دلیل بن کر ختم ہو جاتا ہے۔ کما فصلنه آنفاً اس کے بعد اب مولانا فرمائیں کہ وصول شدہ سود کی رقم جسے وصول کرنے والے ابھی نہیں خرچ کر پائے تھے، اس کے مالک وہ کیوں بنائے گئے؟ امام کے مسلک سے ہٹنے کے بعد اس سوال کا ہی کوئی جواب نہیں۔

د۔ اگرچہ طحاوی نے مشکل الآثار میں اس فتویٰ کو مطلقاً بغیر کسی تفصیل کے سفیان ثوری کی طرف منسوب کیا ہے لیکن شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط میں بھی اور شرح سیر کبیر میں بھی سفیان ثوری کے فتویٰ کی جو تفصیل بیان کی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لا ربوا بین الحربی والمسلم میں المسلم سے مراد ان کے نزدیک فقط اس قسم کا مسلمان ہے جو بغیر کسی معاہدہ کے۔

Marfat.com

غیر اسلامی حکومت میں داخل ہو کر وہاں کے غیر مسلم باشندوں سے اس قسم کا معاملہ کرتا ہو۔ لیکن جو امن و امان کے ساتھ رہنے کا معاہدہ کر کے غیر اسلامی ملک میں داخل ہوگا۔ یعنی مسلم مستامن کو اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ بہر حال اتنی بات کہ الحربی والمسلم میں ربوا کا معاملہ بعض صورتوں میں ربوا اور سود باقی نہیں رہتا۔ اس کے قائل یقیناً سفیان ثوری بھی ہیں اور اثبات کے لیے یہ کافی ہے۔ (مشکل الآثار، ۱۶۹/۴، طحاوی، احمد بن سلامہ، الازدی، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۵ھ)

ھ۔ قرآنی الفاظ ﴿فما اوجفتم علیہ من خیل ولا رکاب﴾ (الحشر/۶) کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو کر حملہ کر کے یہ مال حاصل نہیں کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ البراۃ/۳

۲۔ الجامع الصحیح للمسلم، کتاب الایمان: ۱۲۴، قشیری، مسلم بن الحجاج، موسوعۃ الکتب الستۃ الریاض، مکتبہ دار السلام، ۱۴۲۱ھ

۳۔ المائدۃ/۱

۴۔ بنی اسرائیل/۳۴

۵۔ البراۃ/۴

۶۔ النساء/۳۹

۷۔ النساء/۲۹

۸۔ الانفال/۶۹

۹۔ السیر الکبیر مع الشرح، ۲۲۶/۳، شیبانی، محمد بن الحسن، شارح، السرخسی، محمد بن احمد، حیدرآباد، دائرۃ المعارف، ۱۳۳۵ھ

۱۰۔ الہدایہ مع نصب الرایہ، ۶۵۲/۳، مرغینانی، علی بن ابی بکر، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۶ھ

۱۱۔ محولہ بالا

۱۲۔ السیر الکبیر، ۸۵/۳

۱۳۔ ایضاً، ۸۶/۳

۱۴۔ فتح القدیر، ۵/۳۳۳، ابن ہمام، محمد بن عبداللہ، مصر، المطبعۃ الکبری الامیریہ، ۱۳۱۶ھ

۱۵۔	محولہ بالا	۱۶۔	السیر الکبیر، ۳/۸۵
۱۷۔	محولہ بالا	۱۸۔	السیر الکبیر، ۳/۸۸
۱۹۔	ایضاً، ۲/۸۲	۲۰۔	فتح القدیر، ۴/۴۱۳
۲۱۔	ایضاً، ۴/۳۱۵	۲۲۔	السیر الکبیر، ۳/۲۷۳
۲۳۔	محولہ بالا	۲۴۔	السیر الکبیر، ۱/۱۹۵
۲۵۔	ایضاً، ۳/۱۷۸	۲۶۔	السیر الکبیر، ۴/۱۳۰
۲۷۔	محولہ بالا	۲۸۔	فتح القدیر، ۴/۴۱۵
۲۹۔	السیر الکبیر، ۳/۸۸	۳۰۔	السیر الکبیر، ۳/۱۷۹
۳۱۔	محولہ بالا	۳۲۔	السیر الکبیر، ۳/۱۷۸
۳۳۔	محولہ بالا	۳۴۔	السیر الکبیر، ۳/۱۷۹

۳۵۔ المبسوط، ۱۰/۹۶، السرخسی، محمد بن احمد، بیروت، دارالمعرفہ، ۱۴۰۹ھ

۳۶۔ بدائع الصنائع، ۷/۱۹۶، الکاسانی، ابوبکر بن مسعود، بیروت، دارالفکر، ۱۴۱۷ھ

۳۷۔	محولہ بالا	۳۸۔	السیر الکبیر، ۳/۱۱۲
۳۹۔	ایضاً، ۳/۱۷۹	۴۰۔	فتح القدیر، ۵/۳۰۰
۴۱۔	محولہ بالا	۴۲۔	فتح القدیر، ۵/۳۰۱

۴۳۔ حاشیہ بر فتح القدیر، ۵/۳۰۰، چلپی سعدی، سعد اللہ بن عیسیٰ، مصر، المطبعۃ الکبری الامیریہ، ۱۳۱۶ھ

۴۴۔	فتح القدیر، ۵/۳۰۱	۴۵۔	البقرۃ/۱۸۸

۴۶۔ الانفال/۶۹،

۴۷۔ سنن الترمذی، کتاب البیوع، باب بیع المیتۃ والاصنام: ۱۲۹۷، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، مصر، مطبعہ مصطفی البابی، ۱۳۹۸ھ

۴۸۔ بدایۃ المجتہد، ۱/۳۴۵، ابن رشد، محمد بن احمد، لاہور، فاران اکیڈمی، س ن

۴۹۔ البراۃ/۳

Marfat.com

۵۰۔ الجامع الصحیح للمسلم، کتاب الایمان: ۱۲۴

۵۱۔ البقرۃ/۲۷۸

۵۲۔ البقرۃ/۲۷۵

۵۳۔ الجامع الصحیح للمسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبی: ۲۹۵۰

۵۴۔ محولہ بالا

۵۵۔ مشکل الآثار، ۲۳۵/۴۔۲۳۴، طحاوی، احمد بن سلامہ ازدی، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۵ھ

۵۶۔ البقرۃ/۲۷۵

۵۷۔ السیر الکبیر، ۲۲۵/۳

۵۸۔ السیر الکبیر، ۱۷۹/۳

۵۹۔ محولہ بالا

۶۰۔ السیر الکبیر، ۱۸۰/۳

۶۱۔ محولہ بالا

۶۲۔ محولہ بالا

۶۳۔ سنن الدارقطنی، کتاب البیوع: ۲۹۵۰، الدارقطنی، علی بن عمر، بیروت، دار المعرفہ، ۱۴۲۲ھ

۶۴۔ السیر الکبیر، ۱۸۰/۳

۶۵۔ ایضاً، ۲۲۹/۳

۶۶۔ ایضاً، ۱۸۰/۳

۶۷۔ فتح القدیر، ۳۰۰/۱

۶۸۔ محولہ بالا

۶۹۔ السیر الکبیر، ۸۵/۳

۷۰۔ محولہ بالا

۷۱۔ السیر الکبیر، ۲۲۵/۲

۷۲۔ مشکل الآثار، ۱۶۹/۴

۷۳۔ محولہ بالا

۷۴۔ ظفر احمد عثمانی، مولانا، غیر اسلامی ممالک میں سود و قمار وغیرہ کا حکم، ص ۱۱۱، معارف، جنوری، ۱۹۴۵ء، ہندوستان، اعظم گڑھ

۷۴الف۔ محولہ بالا

۷۵۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی صلح العدو: ۲۷۶۵، ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، بیروت، مکتبہ دار الجیل، ۱۴۱۲ھ

۷۶۔ السیر الکبیر، ۹۴/۳

۷۷۔ السیر الکبیر، ۹۵/۳

۷۸۔ محولہ بالا

۷۹۔ محولہ بالا

Marfat.com

۸۰۔ محولہ بالا

۸۱۔ محولہ بالا

۸۲۔ السیر الکبیر، ۳/۲۲۶

۸۳۔ محولہ بالا

۸۴۔ الانفال/۷۲

۸۵۔ السیر الکبیر، ۳/۲۲۶

۸۶۔ محولہ بالا

۸۷۔ محولہ بالا

۸۸۔ محولہ بالا

۸۹۔ السیر الکبیر، ۳/۱۴

۹۰۔ محولہ بالا

۹۱۔ السیر الکبیر، ۴/۱۰۱

۹۲۔ محولہ بالا

۹۳۔ السیر الکبیر، ۳/۲۲۶

۹۴۔ محولہ بالا

۹۵۔ البقرۃ/۲۷۹

۹۶۔ کتاب الاموال، ص ۲۴۵، ابو عبید، القاسم بن سلام، بیروت، دار الفکر، ۱۴۰۸ھ

۹۷۔ المبسوط، ۱۴/۵۸

۹۸۔ محولہ بالا

۹۹۔ السیر الکبیر، ۴/۱۳۲

۱۰۰۔ محولہ بالا

۱۰۱۔ محولہ بالا

۱۰۲۔ محولہ بالا

۱۰۳۔ السیر الکبیر، ۳/۲۲۸

۱۰۴۔ محولہ بالا

۱۰۵۔ محولہ بالا

۱۰۶۔ الشوریٰ/۴۰

۱۰۷۔ البقرۃ/۱۹۴

۱۰۸۔ النحل/۱۲۶

۱۰۹۔ السیر الکبیر، ۳/۱۶

۱۱۰۔ ایضاً، ۳/۸۸

۱۱۱۔ المبسوط، ۴/۵۹

۱۱۲۔ ظفر احمد عثمانی، مولانا، مسئلہ ربا مسلم و حربی میں، ص ۲۱، معارف، جولائی ۱۹۴۶ء، ہندوستان، اعظم گڑھ

Marfat.com

جدید علم کلام قدیم زبان میں

تقریباً دو سال (چونکہ یہ مضمون جولائی و دسمبر ۱۹۳۵ء کے شمارے میں طبع ہوا تھا، اندازاً ۱۹۳۳ء کا سال مراد ہے) (از محقق) ہوتے ہیں کہ گیا (بہار) کے اردو ماہ نامہ ''ندیم'' کے سالانہ نمبر میں خاکسار نے صوبہ بہار کی اردو نثر کی پہلی کتاب کے عنوان سے مولانا محمد احسن گیلانیؒ کے ایک مخطوطہ کا ذکر بطور استفسار کے کیا تھا۔ چند دنوں کی خاموشی کے بعد کچھ روز ہوئے ہیں کہ پٹنہ کے ایک رسالہ میں ایک مخطوطہ کا ذکر کیا گیا، جس کے متعلق صاحب مضمون کا بیان ہے کہ میری پیش کردہ کتاب سے اس کتاب کی تصنیف کا زمانہ مقدم ہے۔ غالباً اس مخطوطہ کے مصنف مولانا شاہ ظہور اللہ نامی پھلواروئ ہیں اور شاید اس میں دینیات کے مسائل ''راہ نجات'' یا ''مفتاح الجنۃ'' وغیرہ کے نہج پر لکھے گئے ہیں۔ وہ مضمون اس وقت میرے سامنے موجود نہیں ہے، اور صحیح طور پر یہ یاد بھی نہیں رہا کہ اس کتاب میں اور کیا کیا مضامین ہیں۔ بہر حال تقریباً دو سال کی مدت میں اربابِ خبر و واقفیت کا ''صوبہ بہار'' کے تصنیفی ذخیروں سے صرف ایک ہی مخطوطہ کا پیش کرنا کم از کم میرے لیے اس اطمینان کو ضرور پیدا کرتا ہے کہ مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم کی کتاب کا نمبر صوبہ کی لسانی تاریخ (حصہ نثر) میں اگر اول نہیں تو دوم ضرور ہے، اور تاریخی اہمیت کے لیے یہ مزیت بھی ناقابل التفات نہیں قرار پا سکتی۔

میری حیثیت اپنے اس مضمون میں صرف سائل اور مستفسر کی تھی، لیکن اس مضمون کے بعد اب اگر اپنے ''استفسار'' کو دعویٰ کی شکل میں بدل دوں اور گیلانی کی اس کتاب کو نثر بہار کی دوسری کتاب قرار دوں تو غالباً مجھ کو اس کی اجازت مل سکتی ہے۔ اگرچہ اب بھی عدم العلم، علم العدم کو مستلزم نہیں ہے لیکن استقرائی نتائج کی بنیاد جن مقدمات پر قائم کی جاتی ہے عام طور پر اس کا یہی حال ہوتا ہے۔

ندیم چونکہ صرف ادب اردو کا پرچہ ہے، اس لیے اس میں کتاب کے متعلق میرے مضمون

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں جولائی و دسمبر ۱۹۳۵ء کو دو اقساط میں شائع ہوا۔

Marfat.com

کا صرف وہ حصہ شائع ہو سکا جس کا تعلق صرف صوبہ کی لسانی تاریخ سے تھا لیکن مضمون کا وہ قطعہ جس میں فقیر نے بہار کے اس قدیم مخطوطہ کے چند اہم مسائل اور حقائق پر اجمالی تبصرہ کیا تھا وہ اب تک غیر مطبوعہ پڑا ہوا تھا۔ بلکہ طاق نسیاں کی نذر ہو چکا تھا۔ میرے دوست مولانا سید احمد حیدر آبادی سلمہ اللہ کو خدا جانے اس مسودہ میں کیا نظر آیا کہ ان فرسودہ اوراق کو ادھر ادھر سے جمع کر کے خوشخط اور صاف حرفوں میں نقل کر کے میرے سامنے لائے، ان کا اصرار ہے۔ کسی علمی رسالہ میں اسے شائع کر دیا جائے۔ ہندوستان میں ''علمی'' مجلّہ کے لفظ کے ساتھ ذہن کی ذہنی حرکت اعظم گڑھ کے مجلّہ علمیہ معارف غراء کی طرف ہو جاتی ہے اور یہی ہوا، دفتر میں مضمون بھیج دیتا ہوں، کارکنان معارف پسند فرمائیں تو اسے شائع کر دیں ممکن ہے کہ ارباب بصیرت اس کے بعد اردو زبان کے اس صد سالہ مسودہ کو بہار ہی کی اردو کی نہیں بلکہ ہندوستان کی اردو کی شاید ایک اچھی یادگار قرار دیں۔

المغرور بالا مانی

مناظر احسن گیلانی عفی اللہ عنہ

مذکورالصدر کتاب اگرچہ غدر سے پہلے اس وقت تصنیف ہوئی ہے جب مغربی اثر و اقتدار شمالی ہند میں خصوصیت کے ساتھ بنگال و بہار پر تسلط حاصل کر چکا تھا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ملک میں اس وقت تک بزبان (الف) اکبر مرحوم صرف توپ (بسولا) پہنچا تھا اور پروفیسر یعنی (رندوں) کی نوبت ابھی نہیں آئی تھی، یا بہت کم آئی تھی۔ اس لیے غیر حساس فطرتوں پر خصوصاً مسلمانوں پر زیادہ تر یورپ کے حیلی آلات کیمیائی اشتعال انگیز مواد ہی کا عموماً رعب قائم تھا، اسی لیے ملک کے دردمندوں کو جو کچھ بھی قلق تھا یا ہونا چاہیے تھا وہ اپنی جانی مالی پریشانیوں کا تھا، اتنی نزاکت کن دماغوں میں تھی کہ بے تمیزی کے اس طوفان کا بھی اندازہ کر لیتے جو اس مغربی آندھی

Marfat.com

کے پیچھے دبے پاؤں آرہا تھا، کون جانتا تھا کہ آج جس زد کو زرّوزمین تک محدود سمجھا جاتا ہے آئندہ چل کر یہی ناموس وایمان پر کاری ضرب کی شکل اختیار کرے گی۔

حیرت ہوتی ہے کہ مؤلف کتاب باوجودیکہ اس وقت کی سرکار برطانیہ کے ایک معزز عہدہ دار یعنی داروغہ شجاعت علی مرحوم کے صاحبزادے تھے، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ چند تھانوں کے سرکل انسپکٹر تھے اور گھر کی ساری فراغ بالیاں انہیں کی بدولت تھیں تاہم انگریزی پولیس افسر کے گھر میں خدا نے اس بچہ کو پیدا کیا جس کے نازک شعور کی رگ ریشوں میں آنے والے طوفانی ہلچل کی تصویریں چھپ رہی تھی۔ جو آخر ایک سو سال کے بعد ہندوستان کے طول وعرض میں اسکولوں اور کالجوں، رسالوں اور اخباروں کے دامنوں سے ابل ابل کر یہ دھمکی دے رہے ہیں کہ ہندوستان میں رحمۃ للعالمین، خاتم الانبیاء والمرسلین ﷺ کی امتِ مرحومہ وفاداری کے عہد پر زیادہ دن تک قائم نہیں رہ سکتی، اگر نام کے اعتبار سے نہیں تو کام کے لحاظ سے (لا فعله الله) اسماً نہیں تو اعتقاداً وعملاً مسلمان، مسلمان باقی رہیں گے۔

بہرحال آج محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کے قائم کردہ آئین ونظام کے متعلق وساوس واوہام کی جو زہریلی گیسیں اور سیاہ بخارات، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، سائنس، وغیرہ وغیرہ کے پرفریب انتساب کے ساتھ دجل اور حق پوشی کی انتہائی کوششوں کے پردوں میں پھیلائے جارہے ہیں یقین کیجیے کہ مولانا موصوف نور اللہ مرقدہ کی وقارفطرۃ نے اس کا اندازہ آج سے سو برس پیشتر کرلیا تھا اور غایت بالغ نظری ژرف نگاہی، متانت وسنجیدگی کے ساتھ انہی کے تشفی بخش جوابوں کو اس کتاب میں درج فرمایا ہے۔

کتاب تو ۱۲۶۶ھ میں اپنی طالب علمی کے وسطانی عہد میں لکھی گئی ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عظیم خطرہ کا احساس ان کو اس سے بہت پہلے اپنے اس کوردہ گاؤں گیلانی میں ہو چکا تھا کیونکہ ان کی سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ طلب

Marfat.com

علم کی راہ انہوں نے ماں باپ کے جبر و اکراہ سے نہیں، بلکہ بالغ و جوان حتی کہ متاہل ہونے کے بعد سوچ سمجھ کر اختیار کی تھی اور بڑی وارفتگی و سرمستی کے ساتھ اختیار کی تھی، خود اپنی ایک دوسری کتاب حل العقود کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"و فقنی الله فی اول الریعان فرط الشغف لا خذ العلم من افاضل الاعیان"

"آغاز شباب ہی میں حق تعالیٰ نے مجھے اس کی توفیق انتہائی ذوق و شوق کے رنگ میں عطا فرمائی کہ ملک کے جلیل القدر فضلاء و علماء سے تحصیل علم کروں"

پھر گھر بار، بیوی، بچے (ب) اور وطن کے چھوڑنے کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں:

"ولم یتیسر لی ذلک الا بمفارقة الا وطان و ترک العشائر والخلان، فاخترت السفر علی الحضر و أوقعت نفسی فی البلایا و الخطر"

"لیکن اس کا موقع بغیر اس کے مجھے میسر نہ آ سکتا تھا کہ وطن و یارانِ وطن سے جدا ہو جاؤں اور اس لیے میں نے گھر کو چھوڑ کر سفر اختیار کیا اور اپنی جان کو ہر قسم کے مصائب و خطرات میں قصداً ڈال دیا"

اپنے علمی سفر کی داستان دہراتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ثم ألجأنی تحصیل شطر من العلوم الدینیة و المعارف الیقینیة الی ان یلفظنی من بلد الی بلد و وهدالی و هد"

"دینی علوم کی تحصیل اور یقینی معارف کی تلاش نے بالآخر مجھے اس پر مجبور کیا کہ ایک شہر سے دوسرے شہر ایک جگہ سے دوسری جگہ مارا پھرتا تھا"

پھر یہ سارا سفر کس لیے ہو رہا تھا، اس کا اندازہ ان کی مختلف تحریروں اور یادداشتوں سے

ہوتا ہے۔ بنارس میں انہوں نے یہ کام کیا، لکھنؤ پہنچے اس وقت لکھنؤ لاٹ صاحب کا لکھنؤ نہیں، واجد علی شاہ مرحوم کا لکھنؤ تھا لیکن واجد علی کی زمین بھی ان کے لیے چند دنوں کے بعد آسمان بن کر رنجدہ ثابت ہو چکی تھی۔ فلسفہ الہیات کی ایک قلمی کتاب کی تصحیح سے فراغت پانے کی بعد اس کے آخر میں لکھتے ہیں:

"وقع الفراغ من تصحیح الکتاب فی بلدة لکھنؤ فی ۱۲۷۲ شھر ذیعقدة حین تسلطت النصاری خذلھم اللہ علی ھذہ البلدة و ذھب السلطان واجد علی شاہ للاستغاثہ الی کلکتہ"

"کتاب کی تصحیح سے لکھنؤ میں ۱۲۷۲ء میں فراغت پائی اور ذی قعدہ کا مہینہ تھا، یہ وہ زمانہ ہے کہ نصاریٰ خدا انہیں رسوا کرے، شہر پر قبضہ کر چکے ہیں اور سلطان واجد علی شاہ استغاثہ کے لیے کلکتہ روانہ ہوئے ہیں"

اسلام کی ایک عقل عادل، روحِ صافی، قلبِ ذکی کی اس کشمکش کو دیکھیے کہ اس کے بعد ایک طرف اگر واجد علی شاہ کے لیے دعا بھی کرتے ہیں لیکن معاً ان کمزوریوں کا احساس بھی ہوتا ہے جن کے بعد قدرت کے عدل وقسط کی میزان اپنے آخری نتیجہ کا اعلان ہمیشہ انقلاب حکومت کی شکل میں کرتی رہی ہے۔ یادداشت کے آخر میں لکھتے ہیں:

"اللھم انصرہ و اھدہ الی الصراط المستقیم"

"اے اللہ تو ان کی مدد فرما اور انہیں سیدھی راہ پر چلا"

کیا خلف کے لیے سلف کے اس طرزِ عمل میں اچھا اسوہ نہیں ہے، مولانا مرحوم باوجود یکہ کم سنی تھے، لیکن ایک شیعی بادشاہ جس سے بجز اسلامی تعلق کے آپ کو کوئی تعلق نہیں تھا اور قیصر باغ کے قیصر کی جان جو اس کے جھوٹے خوشامدیوں کی زبانوں میں

Marfat.com

عالم کی جان تھی، جب مٹی کے برج میں دفن ہونے کے لیے لکھنؤ سے روانہ ہو چکی تھی تو آئندہ بھی اس سے کیا توقع قائم کی جا سکتی تھی، لیکن اخوت کی ٹیس فروعی اختلافات پر کسک پر غالب آئی، اور اسے آنا بھی چاہیے، ومثل ھذا فلیعمل العاملون۔

حکومت کے اس انقلاب نے جو چیخ آپ کے سینہ میں پیدا کی، حل العقود کے دیباچہ میں اس کی آواز بازگشت ان لفظوں میں گونجی ہے، فرماتے ہیں:

"تسلط النصاری علی تلک البلدان فوا اسفاہ علی الداھیة الکبری العظمی"

"ان علاقوں پر نصاریٰ کا قبضہ ہو چکا ہے، حسرت اور واویلا ہے، اس بڑی اور سخت ترین مصیبت پر"

لیکن کیا یہ رونا صرف مچھلی بھون اور چتر منزل کے لیے تھا، اودھ کی مٹی اور گومتی کے پانی کے لیے تھا ان ہی کے الفاظ میں سنو، روتے ہیں اور کتنے دردناک لہجوں میں روتے ہیں۔

"عفوا اطلال العلوم ومعالمھا و محوا اثارھا و مراسمھا حتی کادت شموس العلم الی الافول واختار الماھرون زوایا الخمول"

"ان نصرانیوں اور فرنگیوں نے علوم کے سارے نشانات اور اس کی سب یادگاروں کو مٹا دیا، علم کے آفتاب غروب ہونے لگے ہیں اور ماہرین گمنامی کے کونوں میں اپنے کو چھپا رہے ہیں"

مولانا مرحوم کے نفس کا جو شعوری نقطہ تھا، اور جس کے ارد گرد ان کی ساری علمی سرگرمیوں کے دائرے گردش کر رہے تھے، ان ہی چند جملوں سے اس کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے اور جس کا شعور اس درجہ بیدار اور دماغ چوکنا ہو، سمجھا جا سکتا ہے کہ

Marfat.com

یورپ جہاں سے ابھی عوام کے کانوں میں صرف توپ کی آواز آرہی تھی، وہاں اس کی روح ان پر فریب نغموں کی باطنی لہروں سے اگر متاثر ہو رہی ہو، جس کی آوازیں آج ہندوستان کے گھاس اور پھوس کے چھپروں سے آ رہی ہیں تو اس پر کیا تعجب ہے۔

خصوصاً اس زمانہ میں اگر کالج اور اسکولوں، اخبار و رسائل، ناول اور افسانے ڈرامے اور تماشوں کی شکل میں تو نہیں لیکن لمبی داڑھیوں، نیچی نیچی عباؤں والے ہٹ پوش پادریوں کی ایک خاصی تعداد بجائے رانچی کے جنگلوں اور دکن کے بیابانوں کے ہندوستان کے مختلف شہروں میں بائبل کے ترجے اور مناظروں کی کتابیں بغلوں میں دبائے مصنوعی خوش خلقیوں، ریائی نرم زبانیوں کے ساتھ سڑکوں اور گلیوں میں عام طور پر پھر رہی تھی، یہ بھلے مانس پادری اپنے اخلاق کی بلندی کا ثبوت اپنے وطن یورپ میں رومن کیتھولک اور پروٹسنٹ فرقوں کی کلیسائی خانہ جنگیوں کی شکل میں پیش کر چکے تھے، جس کی نظیر (ج) دنیا میں کوئی دوسری موجود نہیں اور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دس لاکھ آدمی مختلف شکلوں میں موت کے گھاٹ اتارے گئے، مذہب جس کے نام سے اور محض نام سے حرب و قتال اور دار و رسن کا یہ ہنگامہ برپا کیا گیا تھا، یورپ کے انتہا پسند طبائع نے اسی کی ضرورت کا شدت سے انکار کرنا شروع کر دیا اور یوں وہاں ایک مستقل خیال ریشنلزم کے نام سے قائم ہوگیا، یہ فرقہ باطنی طور پر محض ملحد اور بے دین تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر مذہب خون کے اسی سمندر اور انسانی ہڈیوں کے اسی پہاڑ کا نام ہے تو آخر ایسے مذہب کی انسان کو کیا ضرورت ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جا و بیجا انہوں نے اپنے ملک کے عام مذہب یعنی عیسائیت پر اعتراضات و شکوک و شبہات و وساوس کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔

بہر حال یورپ میں اعتراضات کے یہ تیر عیسائی مذہب اور اس کے عقائد و مسائل پر الحاد و شکوک کی کمانوں سے نکل نکل کر برس رہے تھے، ان پاک باطن پادریوں

۱۳

Marfat.com

نے ان ہی تیروں کو اپنے دل وجگر سے نکال نکال کر ہندوستان میں ناواقف مسلمانوں پر چلانا شروع کیا اور غایت دیدہ دلیری و بے باکی سے یہ باور کراتے تھے کہ یہ سارے اعتراضات صرف قرآن اور محمد رسول اللہ ﷺ کے پیغام پر وارد ہوتے ہیں ورنہ عیسائی مذہب کا دامن ان تمام مطاعن سے پاک ہے۔

خود مولانا کے بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان اعتراضات کا علم آپ کو ان ہی پادریوں کے ذریعہ سے ہوا جیسا کہ دیباچہ ہی میں لکھتے ہیں:

''اتفاقاً پادریوں سے وہاں (بنارس) کے ایک دن اتفاقِ مباحثہ ہوا''

مباحثہ کا اتفاق تو کل ایک دن ہوا، لیکن غضب یہ ہوا کہ حریف کی روشن گہری کا صحیح اندازہ کئے بغیر کسی ممکن مسکین پادری نے ایک رسالہ بھی آپ کے حوالے کیا، جس میں سرور کائنات ﷺ کی نبوت پر اعتراضات کئے گئے تھے۔ لکھتے ہیں:

''بالآخر انہوں نے (یعنی پادری صاحب نے) ایک رسالہ جس کو کسی پادری نے... بطلان رسالت خاتم النبیین، شفیع المذنبین محمد مصطفی ﷺ کی مرزا پور میں منطبع کیا ہے، اس خاکسار کے حوالہ کر کے کہا کہ اس کا جواب لکھو''

کچھ نہیں معلوم کہ یہ رسالہ کون سا تھا تا کہ اندازہ ہوتا کہ اس میں کیا کیا باتیں تھیں، مگر بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بالکل معمولی تھا، خود لکھتے ہیں:

''چونکہ وہ رسالہ قابل التفات نہ تھا، چنانچہ یہ بات اوپر ناظرین اس کے پوشیدہ نہیں''

رسالہ کے ناقابلِ التفات ہونے کی وجہ سے آپ نے پادری کے چیلنج ''جواب لکھو'' تو نامنظور کر دیا لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سارے مباحث وعنوانات جن سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے، اس کا ابتدائی سرمایہ یہی رسالہ تھا اور اسی

Marfat.com

مضامین کی دلچسپیوں سے آپ کو اس عہد کے مشہور مسیحی یورپین علماء فنڈر اور اسمٹ کی کتابوں کے مطالعہ کا بھی موقع ملا جیسا کہ ایک موقعہ پر لکھتے ہیں:

''رسالہ میزان الحق پادری فنڈر'' اور ''تحقیق دین حق'' پادری اسمٹ صاحب کی جو مناسب مباحث اس رسالہ کی تھیں ان سے بحث کی گئی''

بہر حال سرکار انگریزی کے ایک ہندوستانی افسر کے گھر میں پیدا ہونا یا بنارس میں ایک دن پادری سے اتفاقیہ طور پر بحث کرنا یا مرزا پور کے مجہول الاسم والکتاب پادری کی کتاب دیکھنا یا فنڈر و اسمٹ کی کتابوں کا مطالعہ کرنا ہی وہ کچھ اسباب ہیں، جنہوں نے آج سے سو برس پیشتر آپ کے دماغ کو ان سوالات و شکوک اور ان کے جوابات کی طرف منتقل کیا، جنہیں آج ہم جدید علم کلام کے نام سے منسوب کرتے ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ خود اپنی ذاتی کاوشوں دماغی کوششوں، مصر و قسطنطنیہ کے علماء کی امداد سے ہندوستان کے قدیم و جدید طبقہ نے مختلف پیرایوں میں تقریباً پچاس سال کی مدّت میں مختلف صوبوں سے اسلامی اصولوں کی تائید میں آج جو جوابات پیش کئے، یا کر رہے ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ ان میں سے اکثر مسائل کے عمیق و دقیق پہلوؤں تک مولانا کا ثاقب ذہن ایک صدی پہلے پہنچ چکا تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض باتیں اس کتاب میں ایسی بھی ہیں کہ جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک وہ صرف انکا مخصوص حصہ ہے۔

مضامین کی وثاقت و بلندی، مقدمات کی استواری و ترتیب، معلومات کی وسعت و تنقیح، عبارت کی سنجیدگی و متانت ان سب کا صحیح اندازہ تو اصل کتاب کے پڑھنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، بشرطیکہ پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو آج سے ایک صدی پہلے کی اردو زبان پڑھنے پر راضی کر سکتا ہو، کیونکہ موجودہ طریقہ انشاء و بیان کے عادیوں کے لیے سب سے بڑا صبر آزما کام یہی ہو جاتا ہے اور اسی

Marfat.com

عبارتی لذت کی بد عادت نے ہمیں قدیم بزرگوں کے اکثر افادات سے محروم کر رکھا ہے۔ لفظوں کے جال میں موجودہ نسل کی پیداوار کچھ اس طرح الجھ پڑی ہے کہ معنی کے آب روان اور در منثورہ تک پہنچنے کی ہمت باقی نہیں رہتی۔ تاہم ناظرین کے سرسری اندازہ کے لیے مضامین کتاب کی ایک اجمالی فہرست مختصر تبصرہ کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔

سب سے پہلے مولانا مرحوم نے اس کتاب میں اس دعویٰ کو حل کیا ہے کہ اسلام کے سوا چونکہ دنیا کے تمام مذہب اپنا تاریخی ثبوت کھو چکے ہیں، اس لیے:

"بدوں تصدیق رسالت محمد ﷺ کی کوئی سبیل تصدیق انبیاء ماسبق کی نہیں"

لیکن آپ کے سامنے چونکہ اس وقت یورپ اور اس کے مذاہب تھے، اس لیے آپ نے نہایت بسط و تفصیل سے پہلے یورپ کے دونوں مذہب یعنی عیسائیت و یہودیت کی تاریخ لکھی ہے۔ ابتداء میں ان دونوں مذاہب کے دینی وثیقوں اور مستندات کی فہرست دی ہے۔ عربی، فارسی، انگریزی اور عبری میں ان کتابوں کے جو نام ہیں انہیں درج کر کے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں اندرونی و بیرونی شہادتوں سے ایک ایسی روشنی مہیا کی ہے کہ جس کے سامنے آنے کے بعد آج جن اساسوں پر ان مذاہب کی بنیاد قائم ہے، یکایک درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ تورات کے متعلق بیرونی شہادتوں کے سلسلہ میں آپ نے یورپ کے بڑے بڑے علماء کے اقوال مع دلائل نقل کیے ہیں۔ خصوصاً اسمٹ، ٹیلر، رابرٹ وغیرہ کے کلام سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی طرح اندرونی شہادتوں کے ذیل میں خود تورات کی ایسی آیتیں پیش کی ہیں جن سے عیاناً یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جن انبیاء کی طرف یہ کتابیں منسوب کی جاتی ہیں، خود ان کتابوں کی آیتیں گواہ ہیں کہ یہ انتساب قطعاً غلط ہے۔ آخر میں عہد عتیق کے مجموعہ کے متعلق آپ نے اپنا آخری فیصلہ ان عجیب و غریب تشبیہوں کے ساتھ درج کیا ہے:

Marfat.com

''اصل حقیقت یہ ہے کہ موسیٰ کی کتاب ایسی ہے، جیسے کوئی کسی تفسیر مثلاً تفسیر حسینی کا ترجمہ اردو کرڈالے اس طرح کہ قرآن کی عبارت نہ لکھے، بلکہ صرف اس کا ترجمہ کر کے لکھے، (د) اور کتابیں (یعنی موسیٰ کی کتاب کے سوا) ایسی ہیں جیسے ہمارے یہاں معارج النبوۃ، یا معراج نامہ، یا مولد نامہ، یا قیامت نامہ کہ جس میں قرآن اور احادیث کے الفاظ لے کر یہ کتابیں بنائی گئی ہیں اور بعض مثل حاتم طائی کی ہفت سیر اور شاہ نامہ کے لکھی گئی ہیں''

جاننے والے جانتے ہیں کہ آپ نے اپنے اس فیصلہ میں اسلامی عدل کے قرآنی حکم ﴿اعدلوا ھو اقرب للتقوىٰ﴾ سے سرموتجاوز نہیں فرمایا ہے، اس کے بعد آپ نے عہد جدید کی کتاب انجیل کو لیا ہے اور ٹھیک اسی طرز سے اس پر بھی بحث کی ہے۔ عیسائیوں کے اس دعویٰ کی تغلیط کے لیے کہ لکھنے والوں نے اپنی اپنی انجیلیں روح القدس کی امداد سے لکھی ہیں۔ آپ نے چاروں انجیلوں کی متناقص عبارتوں کا ایک محاذاتی نقشہ پیش کیا ہے۔ جس کے دیکھنے کے بعد بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ان چار مختلف باتوں میں سے صرف ایک ہی بات صحیح ہو سکتی ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جن کتابوں میں ایسی صریح غلطیاں ہوں ان کو روح القدس کی طرف منسوب کرنا خود عیسائیوں کی غلطی ہے اور پھر آخر میں عہد جدید کے متعلق اپنا فیصلہ اس متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں:

''اصل حقیقت یہ ہے کہ تالیف اناجیل، مثل ملفوظات بزرگوں کے ہے کہ جس میں ان کے نشست و برخاست کے قصے اور ان کا نسب نامہ اور سلسلہ اور ان کی تقاریر مندرج ہوتے ہیں''

فیصلہ کے آخر میں کیسے جچے تلے الفاظ میں اپنی اس رائے کو درج فرماتے ہیں:

''مگر اس کے (یعنی انجیل کے) ضمن میں جو کلام عیسوی منقول ہے اگرچہ وہ

Marfat.com

بلفظ عیسوی زبان میں نہیں کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بسبب یہودی نژاد ہونے کے عبری بولتے تھے لیکن جائز ہے کہ وہ کلام الٰہی کا ترجمہ ہو''

مجموعہ بائبل کے متعلق اپنی اس رائے کے بعد آپ کی نظر ان اختلافات کی طرف بھی گئی جو کہیں کہیں قرآن اور بائبل کے مضامین میں نظر آتے ہیں۔ آپ نے اس باب میں ایک عجیب مسلک پیش کیا ہے، فرماتے ہیں۔

''جس طرح کی تاویل بعض انجیل کے جملوں کی اپنے اصول موضوعہ کی صحت کے لیے عیسائی کرتے ہیں، اس سے کم تاویل میں وہ جملے قرآن کے موافق ہو سکتے ہیں''

نہ صرف یہودیوں اور عیسائیوں، بلکہ دنیا کے وہ تمام مذاہب جن کی ابتدا، تاریخ کے عہد تاریک میں ہوئی اور سامان حفاظت کی کمی نے ان کے دینی وثائق کو اپنے اصلی حال پر باقی نہ رہنے دیا، قرآن کی روشن اور تابناک تاریخی ثبوت کے نور میں اپنی تصحیح اس ٹھوس اور منصفانہ تجویز کی بنیاد پر کتنی آسانی سے کر سکتے ہیں۔ یقیناً مشکوک و مشتبہ مسودوں کی تصحیح کی یہی صورت ہو سکتی ہے اور آج دنیا کے کس مذہب کو اس کی ضرورت نہیں؟ کتنی افسوس کی بات ہے، جس قرآن کا تعلق دنیا کے سارے مذاہب اور انبیاء سے صرف تصدیق و تصحیح کا تھا، نادانوں نے بلاوجہ اس سے تردیدی و تکذیبی تعلق پیدا کر کے ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔

یورپ کے مذاہب کے بنیادی اساسوں کی بحث سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے اسلام کے بنیادی وثیقوں کو پیش فرمایا ہے۔ لیکن جیسا کہ سر ولیم میور نے لکھا ہے کہ قرآن کا تاریخی طور پر محمد (ﷺ) کی طرف منسوب ہونا، ہم عیسائیوں کے نزدیک بھی اس قدر قطعی ہے جس طرح مسلمان اس کو خدا کا کلام قطعی طور پر سمجھتے ہیں، اس لیے قرآن کے تاریخی پہلو پر بحث کرنے کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے صرف اس

کے مضامین کی اندرونی شہادتوں پر آپ نے قناعت کی ہے۔ قرآنی مضامین کی افادی حیثیت کے متعلق لکھتے ہیں اور کس قدر جامعیت سے کل بیس نمبروں میں تیس پاروں کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

''کوئی رکوع بلکہ کوئی پنج آیت بلکہ کوئی آیت متوسطہ خالی نہیں ہے جس میں امور مفصلہ ذیل سے کوئی نہ کوئی بات نہ ہو''

(۱) حضرت مبدء، جل شانہٗ کی صفات کاملہ کا بیان

(۲) ترغیب ذکر الٰہی

(۳) نصیحت تقویٰ الٰہی

(۴) تاکید رجوع الی اللہ در ہر امر

(۵) نصیحت تہذیب اخلاق مجملاً

(۶) ستایش اخلاق مثل حلم و تواضع و عفت و کرم و سخاوت و شجاعت و عفو و سماحت

(۷) نکوہش اخلاق رذیلہ مثل تہور و جبن، وقاحت و بخل و کبر و ظلم و اتلاف

(۸) ترغیب بہ توکل و زہد و قناعت و اخلاص و حریت

(۹) تہدید از ریاء، و سمعہ، و عجب، و تملق، و چاپلوسی، و حرص، و حب دنیا

(۱۰) ترغیب محبت مع اللہ و اہل اللہ

(۱۱) تہدید از صحبت بے ادباں و ارباب جہل مرکب

(۱۲) مسائل تدبیر منزل

(۱۳) سیاست مدنیہ

(۱۴) ذکر خیر حضرات انبیاء علیہم السلام

(۱۵) نکوہش دشمنان آنہا

(۱۶) حکم بایمان آوردن بعیسیٰ و موسیٰ وغیرہما انبیاء بنی اسرائیل و ابراہیم، و نوح

Marfat.com

وغیرہما، از انبیاء پیشین خصوصاً وعموماً علیٰ نبینا وعلیہم الصلاۃ والسلام

(۱۷) سخنان معرفت وحقیقت کہ موثر قوی برائے وصول الی اللہ باشد

(۱۸) ذکر معاد انسانی، ولذت والم جاودانی، از برزخ تا جنت و نار

(۱۹) ذکر بے ثباتی ارکان عالم

(۲۰) دعوت بہ توحید الٰہی

ان مضامین پر قرآن کا مشتمل ہونا اور پھر فصاحت و بلاغت کے انتہائی معیار پر اس کی ہر آیت کا کھرا ہو نکلنا اس کے متعلق فرماتے ہیں:

''ظاہر ہے کہ بیان خط و خال، قد و بالا، ناز وادا، شادی وغم، ہجر و وصل، شراب و کباب، بزم و رزم، باغ وصحراوغیرہ، مضامین جن میں فصاحت بلاغت اور صنائع و بدائع معانی بیان کی گنجائش بہت ہوا کرتی ہے، نہ کہ اس میں جس میں مبدء اور معاد کے صفات اور حالات اور قوانین عبادات و معاملات، تمدن و سیاسیات، سراپا حکومت کی باتوں میں ہے، اور معھذا معانی و بیان کے قواعد ومحسنات بدیعہ کے لطائف باحسن وجوہ اس میں مرعی ہیں''

آپ نے اس کو محدود قوت والے انسان کی پرواز سے بالا تر ٹھہرا کر صرف غیر محدود کلامی قوت کا مظاہرہ قرار دیا ہے اور یہی آپ کے نزدیک اعجاز قرآنی کی اندرونی اور ہمیشہ باقی رہنے والی ابدی شہادت ہے، جب تک دنیا میں قرآن موجود ہے اس اعجازی وجہ کو اس سے کوئی جدا نہیں کر سکتا، قرآن کے ساتھ آپ نے اسلام کے دوسرے سر چشمہ یعنی حدیث پر بھی بحث کی ہے یہ بحث ذرا طویل ہے لیکن جستہ جستہ مقامات سے اس کی بعض چیزیں یہاں درج کی جاتی ہیں فرماتے ہیں:

''ہمارے یہاں ایک عظیم الشان فن مقرر ہوا ہے اور اس فن کے بیسیوں بلکہ سینکڑوں دانا لوگ ایسے گزرے ہیں کہ ان کی وثاقت اور ان کی اس فن میں

مہارت جتنے اہلِ علم ہیں سب جانتے ہیں، اور جان سکتے ہیں''

اور آگے چل کر فرماتے ہیں:

''اس فن میں یہ بحث ہے کہ فلانی بات جو فلانے شخص کی طرف منسوب ہے، اس کے ناقل نے بلاواسطہ سن کر لکھا ہے، یا بالواسطہ اور اگر بلاواسطہ ہے وہ ناقل کون شخص ہے، کہاں رہتا تھا، کب پیدا ہوا، کب مر گیا، فضول گو تھا، یا راست گو تھا، مغلوب النسیان تھا، یا حافظہ والا، صاحب تفتیش تھا، یا سفاہت والا اور اپنے بیان میں مضطرب یا مستقل اور اس کے مذہب میں تمیز بین الحق والباطل کی جگہ تلبیس بین الحق والباطل جائز تھا، یا ممتنع''

اہل علم اندازہ کر سکتے ہیں کہ رواۃ حدیث کی صفات کو اردو زبان میں مصنف نے کس منقح شستہ پیرایہ میں ادا کیا ہے، پھر حدیث کی مختلف قسموں، متواتر، مشہور، آحاد کی تعریف اور علمی نتائج کے درج کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''اور اگر ہر طبقہ میں اس کے متعدد ثقہ راوی نہیں تو دیکھا جاتا ہے کہ آیا بداہت عقل کے خلاف کوئی بات اس میں ہے یا نہیں، اگر بداہت عقل کے خلاف ہے تو وہ بھی کان لم یکن متصور ہوتی ہے، یعنی اسے یہ سمجھتے ہیں کہ کسی نے سہو سے یہ بات بڑھادی، یا گھٹادی، یا اس کی تاویل عرف کے موافق کچھ کی جاتی ہے۔ جیسے عیسائی لوگ تورات کی اس روایت کی کہ سرزمین کنعان میں دودھ اور شہد کی ندیاں بہتی ہیں، کرتے ہیں''

حدیث کے ان ظنی حصوں کے متعلق یہ لکھ کر کہ علاوہ بداہتہ عقل کے اگر قرآن یا متواتر خبروں کے بھی وہ مخالف ہو، تو فنی طور پر محدثین اس کو بھی رد کرتے ہیں، آپ لکھتے ہیں:

''اور اگر ان دو قباحتوں میں سے کوئی قباحت اس میں (حدیث) نہ ہوئے تو

دیکھا جائے کہ آیا تفصیل ہے، انہیں قطعیات کی تو اس کی بھی تصدیق کرتے ہیں، جیسے سخاوت اور صبر تحمل و زہد و توکل کے فضائل وغیرہ اور اگر ان قطعیات کی تفصیل نہیں ہے بلکہ ایک الگ بات ہے تو اگر سب راوی اس کے ثقہ ہیں اور بیچ میں کہیں سے سلسلہ منقطع نہیں ہوا ہے اور اس کے معارض کوئی ایسی روایت نہیں ہے، سو اگر عملیات میں ہے تو بظن غالب واجب العمل ہوتی ہے جیسے اکثر مسائل، نماز، روزہ، بیع و رہن وغیرہ کے اور منجملہ اعتقادات کے ہیں تو بظن غالب اس کا ماننا بھی ہوتا ہے، نہ بر سبیل جزم و یقین''

اگر خود اس قسم کی حدیثیں باہم ایک دوسرے کی ضد ہوں تو اس کے متعلق آپ نے اس عجیب مسلک کو پیش کیا ہے:

''اور اگر ایسی روایتیں ہمہ گر مختلف ہوتی ہیں سو اگر منجملہ عملیات ہے، تو احدالروایتین پر عمل کرنے کے لیے ترجیح ظنی دیکھا جایا کرتی ہے اور اگر یہ حاصل ہو تو فبہا ورنہ جس پر چاہا عمل کیا اور منجملہ نظریات سے ہے تو کسی جانب عقیدہ نہیں باندھا جاتا''

آج معمولی فروعی مسائل مثلاً آمین، رفع الیدین، قراءۃ فاتحہ وغیرہ کے متعلق ان ہی اختلافی ظنی حدیثوں کی بنیاد پر ہندوستان میں جدلیات ونزاعات کا ایک سلسلہ چھڑ گیا ہے، اردو زبان کے ایک قدیم مصنف نے کتنی آسانی کے ساتھ اسے کس طرح طے کر دیا ہے۔ **فجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء**

حدیث کی ان تاریخی استواریوں، اعتماد کی عقلی بنیادوں کے استحکامات کو دکھانے کے بعد آپ نے یورپ کو چیلنج دیا ہے کہ قرآن تو خیر حدیث ہی کے مقابلہ میں تم اپنی اساسی کتابوں کے کسی ایک فقرہ کے متعلق اس قسم کا کوئی ثبوت بہم پہنچا سکتے ہو، فرماتے ہیں:

Marfat.com

''تورات کی سندیں انبیاء منسوب علیہم سے بطلیموس کے وقت تک اور انجیل کی حضرت عیسیٰ سے قسطنطین تک کے لکھ دیجیے''

آخر میں لکھتے ہیں اور کس قدر سچ لکھتے ہیں، دنیا کے تمام مذاہب کو اس سے عبرت پذیر ہونا چاہیے اور فقط یہ کہنا کہ یہ کتاب الہام سے لکھی گئی ہے اس واسطے واجب التسلیم جاننا چاہیے تو مؤلف ہاتم کی ہفت سیر اور داستان امیر حمزہ کا بھی یہی کہہ سکتا ہے۔

اسلام اور اس کے مسائل و قوانین کی ان دونوں بنیادی یادداشتوں پر بحث کرنے کے بعد ضرورت نہیں رہتی کہ قرآن و حدیث کی طے شدہ شکلیں جن کا نام فقہ و تصوف ہے، مؤلف علام بحث کرتے لیکن مسیحی علم کلام کے متعلق ڈاکٹر ٹیلر کی اس رائے کو درج کرنے کے بعد:

''کہ ابتدا میں ان قابل شخصوں (یعنی مسیحی متکلمین) کے سبب بھی جنہوں نے قصد کیا احکام دین مسیح کو گبروں کے حکماء کی حکمت سے تطبیق دیں، مسیحی کلیسا نے بہت ضرر اٹھایا''

مولانا مرحوم نے مسلمانوں کے علم کلام کو بھی اسلام کے لیے ایک بلا قرار دیا ہے، فرماتے ہیں:

''بعض علمائے اسلام بھی اس بلا میں بمتقضائے لتتبعن سنن الذین من قبلکم میں پڑے''

ان کل مباحث سے فارغ ہونے کے بعد آپ کی توجہ اسلام کے ان جزئی مسائل کی طرف منعطف ہوئی ہے، جن سے یورپ کی ساختہ پرداختہ جدید ذہنیت و عقلیت کو خواہ مخواہ دکھ پہنچتا ہے، یا پہنچ سکتا ہے۔ ان تمام مباحث میں آپ نے خصوصیت کے ساتھ دو باتوں کا التزام کیا ہے۔

۱۔ یورپ کے اسی فی صد باشندے جس مذہب کو اپنی زندگی کا آئین و دین

Marfat.com

بنائے ہوئے ہیں ، اسی پر جینا اور اسی پر مرنا چاہتے ہیں، خود اس مذہب میں ان مسائل کے متعلق کس قسم کے احکام اور معلومات ہیں ۔ اس سے بڑا مقصد آپ کا ان پادریوں اور باشندگان یورپ کو شرم دلانا ہے جو اسلام پر منہ آتے ہیں۔ حالانکہ وہ ساری نکتہ چینیاں خود اس دین پر ایک ایک کر کے منطبق ہیں، جسے انہوں نے اپنا دین بنا رکھا ہے ۔ اس قسم کی باتوں کے بعد آپ نے لکھا ہے اور بجا لکھا ہے کہ:

''وہی حضرت عیسیٰ کی بات پوری ہوئی کہ اپنی آنکھ کی شہتیر نہیں دیکھتے ہو، اور بیگانہ کی آنکھ کا تنکا دیکھتے ہو''

۲۔ دوسری یہ کہ جن مسائل کے متعلق دعویٰ کیا جارہا ہے کہ انسانی عقل وفطرت پر وہ گراں ہیں ، گرانی کا یہ افسانہ آیا واقعی ہے یا صرف یورپ کے منہ زوروں ، قلم کے چالاک دستوں، کلیساء کے دشمنوں کے انتہا پسند گروہ کے فقط شور وغوغا جدل و مشاغبہ سے یہ وہم پیدا ہو گیا ہے ۔

آپ نے ہر ایسے سوال کو جہاں تک اس زمانہ میں رسائی ممکن تھی ، اٹھایا ہے اور ان ہی دونوں اصولوں کے ماتحت سب کے ایسے جوابات دیئے ہیں کہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ آج تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ایک بڑا کارآمد اور قیمتی حصہ اس کتاب میں آ گیا ہے ۔ نمونہ کے لیے چند مسائل کا ذکر کرتا ہوں ۔

اس ذیل میں آپ نے مسئلہ تقدیر جسمانی ، دوزخ اور جنت ، تعدد ازواج رسول اللہ ﷺ ، ایمان وعمل کے نتائج اور ان کے امتیازات ، حقیقت عبادات ، قانون مغفرت کی تشریح ، زمین کے قطبی علاقے جہاں دن رات مہینوں دراز ہو جاتے ہیں، وہاں نماز و روزہ کی ادائیگی کی شکل ، ذوالقرنین کے قرآنی قصہ میں آفتاب کے چشمہ میں غروب ہونیکی نوعیت، مسئلہ نسخ ادیان ، مسئلہ جہاد کی حقیقت ، اسلام میں تلوار کا تعلق ، قانون قتل مرتد ، اشاعت اسلام کے اسباب، اسلامی حکومت اور غیر اسلامی حکومت میں

Marfat.com

اصولی فرق، آنحضرت ﷺ کے متعلق بائبل میں پیشین گوئیاں، خود آنحضرت ﷺ کی وہ پیشینگوئیاں جو اس وقت تک پوری ہوتی جائیں گی، آپ کے معجزات وغیرہ۔

تعارف وتبصرہ کے کسی مضمون میں مشکل ہے کہ ان تمام مباحث کا استقصاء کیا جائے جو اس کتاب میں درج ہیں تاہم بطور نمونہ کتاب کی چند اہم باتوں سے ناظرین کو محروم رکھنا بھی ایک ظلم ہے۔

مسئلہ تقدیر

حسب دستور اس مسئلہ کے متعلق مغربی مذاہب یعنی یہودیت و نصرانیت کی مستند کتابوں سے ان شہادتوں کا انبار لگا دیا ہے جن سے مسئلہ تقدیر ثابت ہوتا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ دنیا کا کون سا مذہب یا دھرم ایسا ہے جس میں فطرت کے اس اٹل قانون کی تعلیم نہیں دی گئی ہے۔ پھر تحقیقی طور پر اس مسئلہ کی تقریر کی ہے، فرماتے ہیں:

''آیتوں اور حدیثوں کے جمع کرنے سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک تقدیر کا مسئلہ اور دوسرے یہ کہ آدمیوں کے افعال بہ مشیت الٰہی ظہور میں آتے ہیں''

آپ نے ان دونوں مسئلوں کو الگ الگ مسئلہ قرار دیا ہے، پہلے مسئلہ تقدیر کی

تقریر کتنے صاف اور واضح لفظوں میں کرتے ہیں:

''سو تقدیر کے معنی ہمارے اصول میں یہ ہیں، کہ جو کچھ عالم ظہور میں نمودار ہوتا ہے، منجملہ جواہر ہو، خواہ منجملہ اعراض، سب کا انداز ظہور کا یعنی یہ کہ، کیا؟ کون؟ کیسا؟ کتنا؟ اور کب؟ وغیرہ لوازم ظہور ازل سے خداوند تعالیٰ کے علم میں داخل ہے کہ سر مو اس کے خلاف ظہور میں نہیں آ سکتا ہے اور جو چیز جس انداز سے ظاہر ہوتی ہے وہ خداوند تعالیٰ کے سابقہ علم ازلی سے باہر نہیں ہوسکتی۔ جو کچھ اسے معلوم ہے اس کا ظہور اس کی نسبت سے ہوتا ہے یعنی اگر وہ چاہتا

ہے تو ظاہر ہوتا ہے اور اگر نہیں چاہتا تو نہیں ظاہر ہوتا''

گویا آپ کے نزدیک تقدیر کا منکر وہی ہو سکتا ہے جو عالم کو بجائے خدائے علام الغیوب کے مادہ اور اور اس کے قوانین کا مظہر سمجھتا ہے، یا جو سمجھتے ہیں کہ خدا نے عالم کو بغیر کسی سابقہ پروگرام کے بنایا ہے ان کے نزدیک اپنے لفظوں میں:

''خدا غیر مآل اندیش ٹھہرے گا''

یعنی کم از کم منکر تقدیر کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ عالم اور اس کے نظام کو کسی غیر مآل اندیش کا کارنامہ قرار دے، حالانکہ خدا اور غیر مآل اندیش دونوں متضاد باتیں ہیں۔ اس کے بعد دوسرے مسئلہ کی تشریح ان لفظوں میں فرماتے ہیں:

''دوسرا مسئلہ مشیت کا سو ہمارے اصول میں اس طرح پر ہے کہ معلومات حضرت حق جل وعلا کا ظہور نہیں ہوتا، مگر بموجب اس کے ارادے کے نہ کہ کسی اور کے ارادے سے''

مطلب یہ ہے کہ جب افعال انسانی بھی معلومات حق ہیں، اس لیے ان کا ظہور بھی بغیر ارادہ حق کے نہیں ہو سکتا، لیکن پھر بالاتفاق انسان کو اپنے اعمال و افعال کا ذمہ دار فطرۃً قانوناً شرعاً کیوں قرار دیا جاتا ہے۔ اس باریک مسئلہ کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں:

''اور جس چیز کو خداوند تعالیٰ نے عرصہ ظہور میں ذی علم اور صاحب ارادہ بنایا ہے، مثلاً انسان کو سو اس کے ارادے کے آثار نہیں متفرع ہوتے ہیں، اس طرح پر کہ اس میں ارادۂ الٰہی کو دخل نہ ہو''

لیکن انسانی ارادہ کے ساتھ ارادۂ الٰہی کس طرح دخیل ہے، اس کا حل محققانہ اور گہرے لفظوں میں پیش کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

''جس طرح انسان کی ہستی حدوثاً و بقاءً، ہر آن حضرت وجود واجب کے

Marfat.com

فیض ارادی کی محتاج ہے، اسی طرح انسان کے خواص ولوازم کے آثار بھی حدوثا وبقاءً اسی کے فیض کے محتاج ہیں اور انسان جو مکلف بالشرع ہے، اسی ذی علم والارادہ ہونے سے اور اسی جہت سے مستحق ثواب وعذاب ہوا کرتا ہے''

کم ازکم میرے علم وتحقیق میں نہ صرف اردو بلکہ عربی کی بھی کسی کتاب میں اس ژولیدہ اور عمیق مسئلہ کی اتنی اچھی تعبیر نظر سے نہیں گذری، لیکن افسوس ہے کہ آپ نے اجمال سے کام لیا ہے، خواص تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کی گہرائیوں تک پہنچ جائیں گے، لیکن عوام کے لیے تشریح کی ضرورت تھی، جس کا موقع نہیں ہے (ھ)۔ خود مولانا اپنی اس بحث کو ختم کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''اگر اس مسئلہ کی دقت کا لحاظ نہ ہوتا تو بحول اللہ وقوتہ و بہ تصدق نعلین مقدسہ غلامانِ شاہنشاہ دو جہاں حضرت سرور کائنات محمد رسول اللہ ﷺ کے اس مقام پر اس مسئلہ کے ثبوت کی دلیلیں ایسے وضع پر لکھتا، کہ سننے والوں کو خدا چاہتا تو مزا ملتا''

اسلام اور تلوار

مسئلہ کا ذکر چھیڑتے ہوئے پہلے ایک تاریخی شہادت ادا کرتے ہیں۔

پادری لوگ عوام مسلمانوں اور اپنے تابعداروں اور ہندوؤں کو اکثر مسئلہ جہاد کو بہ تقادیر رنگا رنگ بیان کر کے دین اسلام سے بیزار کرتے ہیں اور عجیب وغریب مغالطے دیا کرتے ہیں۔

آج ہندوستان میں مختلف جماعتوں کے اندر اسلام بزور شمشیر پھیلا کا جو شوروغوغا ہے، اسلام کی سیاسی تاریخوں کے متعلق عام مسلمانوں کو کالجوں اور سکولوں کے فتنہ انگیز گمراہ کن نصاب سے جو شکوہ ہے، ایک صد سالہ مؤرخ کی اس عینی شہادت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ شوشہ کن لوگوں کا چھوڑا ہوا ہے۔ اس مغالطہ کے چہرہ پر

ہسٹری ریسرچ اور تحقیقات وغیرہ الفاظ کے غازے کس طرح ملے جا رہے ہیں ، ہندوؤں اور انگریزوں کے تابعداروں کا خیال کر کے آپ نے اس مسئلہ کے متعلق خلاف دستور علاوہ مغربی مذاہب (یہودیت ونصرانیت) کے مشرقی ادیان ہندو اور پارسی مذہب کی کتابوں سے بھی ان شہادتوں کو جمع کیا ہے جس میں اس مسئلہ کا ذکر قانوناً وعملاً زور وشور سے کیا گیا ہے اور آخر میں بائبل کے ایسے دفعات مثلاً:

''تم یہ سلوک کرو کہ ان مذبحوں کو ڈھا دو، اور ان کے بتوں کو توڑ دو ان کے باغوں کو کاٹ ڈالو، اور ان کی تراشی ہوئی مورتیوں کو آگ میں جلا دو جتنی لڑکی ہیں ، سب کو قتل کردو .... لیکن لڑکیاں جو مرد کے ساتھ سونا نہیں جانتی انہیں اپنے لیے رہنے دو''

اس کے بعد آپ نے مسیحی یورپ سے یوں دریافت کیا ہے:

''اس پر ہمارے یہاں کے مسئلہ جہاد پر ہنسنا کتنی ناانصافی ہے! اگر کوئی ملحد وبے دین ہنسے تو ہنسے ،عیسائیوں کو کوئی طعن کرنا نہیں پہنچتا''

اس کے بعد انہوں نے پوچھا کہ اسلام اور تلوار کے افسانے کو اس بلند آہنگی سے اچھالنے کا مقصد کیا ہے ، اگر یہ غرض ہے کہ چونکہ اسلام تلوار سے پھیلا ، اس لیے وہ باطل ہے تو پھر اس کا دوسرا پہلو یہ پیدا ہوتا ہے کہ جتنے خرافات ، بدعادات ، اوہام و رسوم جو دنیا میں بغیر تلوار کی مدد کے پھیل جاتے ہیں اور آئے دن پھیلتے رہے ہیں ، یہ سب حق وراست ہوں ، فرماتے ہیں:

''اگر یہی مطلب ہے تو محض جھوٹ ہے، کیونکہ اگر یہ بات سچ کہی جائے تو چاہیے کہ اگلے عربوں کی بت پرستی اور اسی طرح انگلستان کی بت پرستیاں اور ہندوستان کی ..... یہ سب مذہب حق ٹھہریں''

ان جزئی امور کے ساتھ آپ نے نفس مسئلہ پر ایک ایسی دلنشین تقریر فرمائی

Marfat.com

ہے جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ آپ کا مخصوص حصہ ہے۔

مسئلہ جہاد کی نوعیت

آپ کے خیال میں اسلامی جہاد کی ابتدا بھی تبلیغ سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا بھی تبلیغ ہی پر ہے۔ البتہ تبلیغی آواز میں زور پہنچانے یا حق وصدق کا آزاد تجربہ کرانے کے لیے بسا اوقات ضرورت ہوتی ہے کہ اصلاحی آواز کے ساتھ جو قوم مخاطب کی جائے وہ اپنی قومی سطوت صنفی وجاہت کی انانیت ونخوت کی آلائش سے پاک ہو، فرماتے ہیں:

''باتفاق اہل تجربہ بدیہی الثبوت ہے کہ آدمی کو اپنے خلاف طبع بہ نسبت امور مخصوصہ اپنے صنف کے دوسرے کی بات نہ ماننے کا بڑا سبب اکثر اپنے صنف کی وجاہت اور سطوت واقع ہوا کرتا ہے، کہ اس وجاہت وسطوت کے سبب سے دوسرے غیر صنف کی بات پر کان دھرنے کو ننگ و عار جانتا ہے۔ چہ جائے کہ اس کو قبول کرنا کہ یہ بات تو بہت دور ہے اور جب تک جی لگا کر سنے گا نہیں تو ماننے کی نوبت کاہے کو آئے گی''

پھر جس طرح تجربی طور پر یہ ضروری ہے اس طرح یہ بھی ضرور ہے کہ:

''اپنے خلاف طبع امور مخصوصہ صنفیہ کی مخالف باتیں دوسرے کے کان رکھ کر سننا، اوس کا بڑا باعث قوی، کوئی مثل غلبہ وجاہت اور سطوت صنفیہ اس کے کہنے والے کی بھی ہے''

ان چند مقدمات کے بعد آپ نے نتیجہ نکالا ہے کہ اسلام کفر کے مقابلہ میں کرۂ زمین پر اگر اپنی سیاسی برتری کا خواہاں ہے تو کیا تبلیغ و دعوت کی آواز کو مؤثر بنانے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے؟ باقی دشمنوں کا یہ مشہور کرنا کہ اسلام میں لوگوں کو بزور شمشیر مذہب بدلنے یا دوسرے لفظوں میں منافق بننے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس کی شدت کے ساتھ تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

Marfat.com

''اگر کہیے کہ بعض جبابرہ ملوک اسلامیہ نے کسی جگہ بطور اکراہ کے شمشیر زنی کی تو اول اس کا ثبوت چاہیے۔ علاوہ بریں اگر کسی نے کی تو خال خال کہیں اتفاقیہ بر سبیل ندرت کی ہو''۔

''معہذا اس شمشیر زنی سے کچھ دین نہیں پھیلا، جیسا خلفائے راشدین اور ان کے تابعین بالاحسان کے ہاتھ سے پھیلا، پس جبابرہ کے اکراہ کرنے سے اصل دین باطل نہیں ہوتا''

پھر سیاسی برتری حاصل کر لینے کے بعد اسلام اپنے فرض تبلیغ کو کس طرح ادا کرتا ہے، اس کے متعلق فرماتے ہیں:

''اور سطوت و فرمانروائی کی جہت سے دین کا پھیلنا دو طرح سے ہوتا ہے، ایک یہ کہ اہلِ حکومت کی فروتنی اور مروت تو سخاوت اور عدم تنگ گیری اور تہذیب اخلاق اور حسن اعمال اور زہد اور بزرگیاں باعث ہوتی ہیں، جیسا کہ ہمارے یہاں طبقہ والوں کے ہاتھ سے ہوا۔ جوں جوں ان کے آثار کم ہوتے گئے دین کی ترویج کم ہوتی گئی''

بعد کے خلفاء اور سلاطین نے جو قیصری و کسروی رنگ اختیار کر لیا تھا، اس پر افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کے بعد اشاعت اسلام کا مرکز ثقل بجائے سلطنت کے زور کے، بزرگوں کی روحانی و اخلاقی قوت کی طرف منتقل ہو گیا، فرماتے ہیں:

''گو کہ سلطان اور طمطراق ظاہری جبر و قہر مسلمانوں کا بڑھتا گیا، اور بعد اس زمانہ کے جو پھیلا تو اکثر بزرگوں کی کرامتوں سے پھیلا''

بہر حال یوں مسئلہ جہاد کی ابتدا اور اس کی انتہا دونوں آپ کے خیال میں تبلیغ و دعوت ہی پر ختم ہوتی ہے۔ اسلامی سیاست کے ان دونوں نتائج کو دکھانے کے بعد آخر

Marfat.com

میں آپ کی نگاہ مغربی سیاست کے ان آثار و نتائج پر بھی پڑتی ہے، جو محکوم قوموں میں سیاسی برتری کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں ۔ لیکن ان دونوں کے طریقۂ تاثیر میں جو امتیازی فرق ہے اس کو چند لفظوں میں عجیب طرح سے ادا کرتے ہیں:

''دوسری طرح (یعنی سیاسی تفوق کا اثر دوسری طرح یوں بھی) ہوتا ہے، کہ تنگی معاش رعایا اور ترفع حکام اور زرکشی حاکم کے باعث ہو''۔

کیا آج مغربی سیاست کا یہ نظام کہ عام رعایا کی دولت کو مختلف ٹیکسوں، بلکہ عجیب و غریب ہتھکنڈوں سے اس طرح چوس لیا جائے، کہ وہ کبھی پنپنے نہ پائے، سول حکام عام رعایا سے اس طرح کنارہ کنارہ رہیں جس طرح آدمی جانوروں بلکہ ناپاک جانوروں سے دور دور رہتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ آہنی قانون بھی نافذ کر دیا جائے کہ ملک کا ہر وہ باشندہ جو مغربی تہذیب و تمدن کی بھاٹ خوان یونیورسٹیوں، اسکولوں، کالجوں کی سند نہیں رکھتا، خواہ کسی دل و دماغ، سلیقہ و قابلیت کا مالک کیوں نہ ہو، رزق کے وہ تمام دروازے، عزت کے وہ تمام ابواب جو سلطنت نے کھول رکھے ہیں، اس پر بند کر دیئے جائیں گے۔

سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر اس سسٹم کو آج مغربی سلطنتیں اپنی حکومت کے اندر سے نکال دیں، تو کیا رعایا کا کوئی فرد بھی، ان کی تہذیب و تمدن و معاشرت اور عقلیت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکتا ہے۔ اونچی اونچی لمبی دلکش و نظر فریب عمارتوں، قیمتی اور دیدہ زیب فرنیچروں کے اندر کروڑ ہا روپیہ کے مصارف سے ملک کے طول و عرض میں یہ کام ہو رہا ہے، لیکن شاید دس فی صدی سے زیادہ آدمی بھی متاثر نہیں ہو سکے ہیں اور وہ بھی جو ہو رہے ہیں ان کے متعلق مولانا بجا ارشاد فرماتے ہیں:

''سوائے ان لوگوں کے جو ننگے بھوکے بہت رہے اور ابواب معیشت کے ان پر بند ہوئے''

Marfat.com

جزیہ

اس ذیل میں آپ نے جزیہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ آپ کے نزدیک جزیہ حکومتوں کا انکم ٹیکس ہے جو مسلمانوں کے اموال پر بڑی بھاری بھاری رقموں کی شکل میں زکوۃ وعشر کے نام سے عائد کیا جاتا ہے لیکن غیر مسلموں پر اس ٹیکس کو نہایت حقیر رقم کی صورت میں اس لیے لگایا جاتا ہے تاکہ دینے والے کو اپنے سیاسی صغر وحقارت کا احساس اور مسلمانوں کے سیاسی تفوق کا اندازہ ہو سکے اور اسلام اپنی تبلیغی غرض کے لیے اس احساس کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

''جو کسب وعمل کی طاقت نہ رکھتا ہو، اس سے کچھ بھی نہیں پھر ملک کے جو باشندے کماتے کجاتے ہوں تو مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کی مغلوبیت کے اظہار کے لیے فی نفر چند روپیہ سالانہ حسب استطاعت حتی کہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو (مثلاً راجہ مہراج، نائب نواب کیوں نہ ہو) تو تیرہ (۱۰) روپیہ کی آنہ سے زیادہ نہ ہو، مقرر کروالینا چاہیے''

قطب شمالی وجنوبی میں نماز روزہ کی بحث

حسب دستور یورپ کے اس مشہور طفلانہ مغالطہ کے متعلق آپ نے پوچھا ہے، کہ کیا یہ سوال صرف اسلام ہی کے نماز روزوں کے متعلق پیدا ہوتا ہے۔ آخر موقت پوجا پاٹ، نماز روزہ کس مذہب میں نہیں، خود یورپ کے مسیحی مذہب میں کیا نماز روزہ نہیں ہے اور اگرچہ اب نماز کی حقیقت عیسائیت میں یہ رہ گئی ہے، کہ:

''آٹھویں روز بے طہارت ایک وقت یہ دعا مانگیں، کہ اے عیسی ہمارے خدا پھر دنیا میں ظاہر ہو''

''مگر روزہ تو اتفاق اس کا نام تھا، کہ دن بھر کھانے پینے اور عورت کی صحبت سے علیحدہ رہنا بہ تواتر ثابت ہے، کہ عیسائی بھی اس روزہ کو رکھتے تھے، سو دیکھیے کہ

Marfat.com

حوالی قطب والے کسی طرح عیسائی نہیں ہو سکتے''

مطلب یہ ہے کہ جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوگی ، وہاں ''آٹھ دن میں ایک وقت'' وغیرہ کے کیا معنی ہو سکتے ہیں، آپ فرماتے ہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب اس قسم کی وقتی عبادتوں کے متعلق جو جواب دیں گے وہی اسلام دے گا۔ پھر اسلام کی طرف سے ایک محققانہ تقریر فرماتے ہیں، لکھتے ہیں:

''ایسے اعتراضوں کا اصلی مادہ یہ ہے کہ تعمیل بعضے احکام شرعیہ میں بعض اوقات کچھ عذرات در پیش ہو جاتے ہیں، اور یہ بات کہ بر وقت لاحق ہونے ان عذروں کے کیا کرنا چاہیے ان حکموں کے ساتھ مفسراً منصوص نہیں ہوتے۔ سو یہ معاملہ شریعت اسلامیہ ہی میں نہیں ہے بلکہ تورات و انجیل کے احکام میں بھی یہی حال ہے''

آگے چل کر فرماتے ہیں:

''ایک حوالی قطب کا عذر کیا ، ایسے عذر بکثرت ہوتے ہیں ۔ مثلاً خوف ، حدوث مرض ، یا شدت مرض اور نقصان بدن ، مثلاً اندھا ہونا اور سہو خطا یا نسیان اور فقدانِ مال اور افلاس شدید اور خوفِ دشمن یا رہزن وغیرہ از باب تعذرات''

اس کے بعد کرۂ زمین کا آپ نے نقشہ بتایا ہے ، جس میں طول البلد ، عرض البلد کے لحاظ سے دکھایا گیا ہے کہ آفتاب کی شعاعیں کن علاقوں میں کس طرح پر، کتنی مدت تک پڑتی ہیں اور سورج کے کرنوں کی ان مختلف نسبتوں کا اثر زمین کے کس قطر پر کیا مرتب ہوتا ہے بحث کو ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اور مبردہ (یعنی سرد علاقہ) اس حصہ کو کہتے ہیں جو ایک جانب جنوب و شمال میں دائرہ قطبیہ کے اندر ہے اور دائرہ قطبیہ خطِ استوا سے ساڑھے چھیاسٹھ درجے یعنی ہمارے کوسوں کے حساب سے تخمیناً دو ہزار ایک سو اٹھائیس

Marfat.com

پر ہے اور سب اہل جغرافیہ قدیم و جدید بالاتفاق لکھتے ہیں کہ مبر د حصوں پر شعاعیں آفتاب کی جب پڑتی ہیں تو ایسی ترچھی پڑتی ہیں، جیسے ہمارے ملکوں میں جاڑوں میں تین چار گھڑی دن چڑھے تک پڑتی ہیں سو اس جہت سے وہاں کا برف کبھی پانی نہیں ہونے پاتا ہے۔ بالجملہ ساڑھے چھیاسٹھ درجے سے پرے بلکہ وہاں تک بھی برف باری ایسی ہمیشہ برابر رہتی ہے کہ آدمی وہاں نہیں گھر بنا سکتا''

لیکن اگر کوئی قسمت کا مارا کسی طرح ان علاقوں میں پہنچ جائے تو یہ عذر کی صورت ہے اور اسلام کا فتویٰ اس عذر کے پیش آ جانے پر آپ کے نزدیک یہ ہے۔

''وہ لوگ جو ایسی جگہوں میں رہتے ہیں، دنوں اور راتوں کو چوبیس گھنٹوں پر تقسیم کر کے بارہ گھنٹے کی رات اور بارہ گھنٹے کا دن قرار دے کر نمازیں اپنی چوبیس گھنٹوں میں پانچ وقت کی ادا کریں''

پھر روزے کے متعلق فرماتے ہیں:

''جواب اس کا بھی وہی ہے جو میں نے اوپر نمازوں کے ادا کرنے کی نسبت لکھا''

پھر فرماتے ہیں کہ ''اس قسم کی استثنائی شکلیں دنیا کے تمام قوانین وشرائع میں پیش آتی ہیں لیکن فرق اتنا ہے کہ شریعت اسلامیہ میں از روئے کسی حجت کے منجملہ حججہائے اربعہ اجمالاً یا تفصیلاً اور کلیۃً یا جزئیۃً کوئی نہ کوئی بات ایسی مقرر ہے کہ جس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ بروقت پیش آنے ان عذروں کے کیا کرنا چاہیے بخلاف تورات وانجیل کے اس میں سے ایسا کچھ نہیں نکلتا''۔

مولانا نے جو کچھ لکھا ہے بالکل صحیح لکھا ہے، اس مسئلہ کا جواب جسے فقہ کی کتابوں سے مولانا نے نقل کیا ہے اس کی بنیاد دجال کی اس مشہور حدیث پر مبنی ہے جس میں پیشینگوئی کی گئی تھی کہ ایک دن چالیس دنوں کے برابر ہو جائے گا تو صحابہ کے یہ

Marfat.com

پوچھنے پر کہ نمازیں کس طرح پڑھی جائیں گی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اندازہ کر لینا مولانا نے اسی اندازہ کی تشریح کرتے ہوئے دنوں اور راتوں کو چوبیس گھنٹوں پر تقسیم کرنے کا مشورہ دیا ہے اور اندازہ کی یہ بہترین شکل ہے۔

مضمون طویل ہوا جارہا ہے اور کتاب کے لطائف ختم ہی ہونے کو نہیں آتے، خصوصاً یہ خیال کر کے کہ خدا جانے کتاب کی اشاعت کی نوبت آتی ہے یا نہیں، جی یہی چاہتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو، اس کتاب کی نادر مفید باتیں اس مضمون کے ضمن میں آجائیں لیکن مستقل رسالہ ہوا جاتا ہے۔ اس لیے صرف اسلامی بہشت و دوزخ کی بحث میں سے کتاب کے ایک فقرہ کو درج کر کے ناظرین کو اصل کتاب کی نشر و طباعت کا منتظر بناتے ہوئے مضمون کو ختم کر دیتا ہوں۔

اسلامی بہشت و دوزخ کا عقیدہ

جس طرح ہندو مذہب میں پاپی انسان کی اخروی سزا یہ سمجھی جاتی ہے کہ آدمی بجائے آدمی ہونے کے بیل یا گھوڑا، سور، بندر، ہوتا ہے یعنی بقول کارلائل انسان کی غیر تشفی یافتہ فطرت سزا بھگتنے کے لیے تشفی یافتہ جانوروں کی شکل اختیار کر لیتی ہے، اسی طرح عیسائیوں کا خیال ہے کہ آدمی نیکیوں کی بدولت آدمی نہیں رہتا بلکہ بجائے آدمی کے فرشتہ ہو جاتا ہے یا دوسرے لفظوں میں خدا کا انعام انسان کو اس شکل میں ملتا ہے کہ

انسانیت کے تمام نازک احساسات، لطیف جذبات، کچل کر برباد کر دیئے

جاتے ہیں۔ عیسائیوں کے خیال میں جنتی آدمی اس لنڈ منڈ غیر حساس زندہ وجود کا نام ہے۔ انجیل کی ایک آیت سے مسیحوں کو یہ مغالطہ ہوا کریلا نیم پر اس کے بعد اور بھی چڑھ گیا کہ یہودیت و مسیحیت میں خدا جانے کیوں، عورت گناہ، پاپ، گندگی، نجاست اور آلودگی کے ہم معنی خیال کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد بہشت کے پاک علاقے میں گندگی کا تخیل عیسائیوں کے لیے سخت دشوار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن نے جب

Marfat.com

انسانی مساعی کے آخری غیر مختتم نتائج کی حقیت کو واشگاف کرتے ہوئے بتایا کہ آدمی نہ گھوڑا ہوتا ہے، نہ بیل، نہ خدا، نہ فرشتہ بلکہ جو انسان ہے وہ انسان ہی رہتا ہے البتہ اسی کثیف انسان کو دوسری نشأت میں لطیف ترین درجات تک ارتقاء حاصل ہو جاتا ہے اور درجات واحساسات کی اس ارتقائی لطافت کی مناسبت سے اس کو وہ ساری نعمتیں قدرت اور اس کے قوانین کی طرف سے مہیا ہو جائیں گی جنہیں لاکھوں برس سے انسان زمین کے اس کرہ پر تلاش کر رہا ہے اور ابھی تک سرگرداں ہے۔

حور وقصور، جنات وانہار والی یہی جنت تھی، جس کا ذکر جب یورپ میں پہنچا تو پادریوں میں سخت شورش پھیلی۔ چونکہ اسلام انسان کی فطرت کو وہی دے رہا تھا جو وہ مانگ رہی تھی اور مسیحیت اس کے مقابلہ میں انسان سے جنت میں وہ سب چیزیں چھین رہی تھی جن کی تکمیل کے لیے نسلِ آدم ہمیشہ بیتاب رہی اور آج تک بیتاب ہے۔ آخر جزاء کی اس سزائی حقیقت کے ساتھ آدمی کب تک وابستہ رہ سکتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ پادریوں نے جب دستور پھبتیاں، لفظی تحریفوں اور تعبیری پینتروں سے کام لینا شروع کیا، لفظ تراشا گیا، کہ قرآن کی جنت حیوانی جنت ہے۔ پادریوں کا یہ ایسا مغالطہ تھا کہ اس میں اچھے سے اچھے عقل و دانش والے اپنے دماغی توازن کو کھو بیٹھے اور مذہبی ہر قسم کی کتابوں میں اس چست فقرہ کا اعادہ اتنے زور شور سے کیا گیا کہ خود مسلمانوں کی بھی ایک جماعت میں تزلزل پیدا ہوا۔ انہوں نے ان الفاظ کو معانی سے بیگانہ کرنا شروع کیا اور اس درجہ بیگانہ کیا کہ قرآن میں صرف لفظی طور پر اسلامی جنت باقی رہی ورنہ معنوی طور پر ان کے خیال میں بھی قرآن کا جنتی اچھا خاصہ لنڈ منڈ بے حس عیسائی جنتی بن کر رہ گیا۔ مولانا کو اس آنے والے فتنہ پر خاص طور پر تنبیہ ہوئی اور خاص باب اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے آپ نے لکھا ہے۔

بحث کو ختم کرتے ہوئے آخر میں کتنے لطیف و عمیق پیرایہ میں اسلامی جنت کی

Marfat.com

تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''عقلاً جائز اور نقلاً واجب التسلیم ہے کہ وہاں لذائذ روحانی اور جسمانی دونوں ایک ہی ہو جائیں اور ہرگز کسی طرح کی کشاکشی اور تنازع ان میں باقی نہ رہے اور جس طرح کمال لذت جسمانی ہو اس طرح عین اسی لذت میں وہ کیفیت جو دنیا میں بڑے بڑے عارفوں کو کمال ترقی کے وقت حاصل ہوتی ہے۔ بوجہ احسن حاصل ہو، بلکہ اس سے بمراتب زیادہ''۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

کی نزاکتوں کا احساس ان کثیف وغبی فطرتوں کو کس طرح کرایا جا سکتا ہے، جنہوں نے انسانیت کے لطیف ترین حصہ کو گندگی ونجاست کا سرچشمہ قرار دیا ہو، یا انسان سے انسانی جذبات واحساسات کی بربادی کو بجائے لعنت کے رحمت اور بجائے سزا کے جزا خیال کرلیا ہو۔ (ز)

Marfat.com

حواشی

(الف) لسان العصر مرحوم کے مشہور شعر کی طرف اشارہ ہے جس میں موجودہ نظامِ تعلیم پر ان مختصر لفظوں میں تنقید کی گئی ہے

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے

جب بسولا ہٹا تو رندہ ہے

(ب) آج یہ سن کر کون باور کرے گا کہ مولانا شادی بیاہ بلکہ فرزند کے تولد ہونے کے بعد اسلامی علوم کے سیکھنے کے لیے گھر سے باہر نکلے، علم کے شوق، دینی خدمت کے ذوق میں کچھ اس طرح منہمک ہوئے کہ پورے چودہ سال بعد گھر اس وقت واپس آئے کہ آپ کے فرزند اکبر جوان ہو چکے تھے، آج دوسروں کی علمی قربانیوں پر ہمیں جھڑکیاں مل رہی تھیں، لیکن کل جب علمی ذوق غیروں میں نہیں بلکہ اپنے اندر تھا تو کیا گاؤں گاؤں میں ان قربانیوں کی کمی تھی۔

(ج) میں نے نظیر کا لفظ قصداً لکھا ہے کہ دراصل اس کلیسائی جنگ یا جبر واستبداد کی نظیر دنیا کے کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی اور اگر کسی مذہب میں پائی جاتی بھی ہو تو کم از کم اسلام کی یہ دو صد سالہ روشن تاریخ بحمد للہ اس سے قطعاً پاک ہے۔ گو یورپ اب اس فکر میں ضرور ہے کہ کسی طرح اسلام میں بھی اس نقشہ کو قائم کر دے، جس کا تماشہ عیسائی مذہب اور یورپ نے صدیوں سے دیکھا ہے لیکن "یابی اللہ الا ان یتم نورہ" (التوبہ/۳۲) قرآن کا محافظ ان شاء اللہ ایسا نہ ہونے دے گا۔

(د) یعنی آپ کی رائے تورات کے متعلق یہ ہے کہ اصل کتاب کے ساتھ شارحین تورات کی تشریحی عبارتیں، اور توضیحی اضافے بھی جزو کتاب بن گئے ہیں، غالباً مسلمان مصنفوں میں ایسی منصفانہ اور اقرب الی الحق رائے بہت کم لوگوں نے دی ہے۔

(ہ) کم از کم ان دو باتوں پر غور کیا جائے، ایک تو یہ کہ انسان حق تعالیٰ کا کن فیکونی مخلوق ہے اور کن فیکونی مخلوق ذاتاً و صفاً اپنی پیدائش و بقاء میں ہر لحظہ خالق قیوم کی فیض تخلیقی

واتفاقی کی محتاج ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان باجود کن فیکونی مخلوق ہونے کے حق تعالیٰ کا خلیفہ اور اس کی تمام صفات کا مظہر ہے جن میں اختیار وآراء بھی ہے۔ پس انسان نہ تو خدا کی طرح مختار مطلق ہے اور نہ آفاقی کائنات کے مانند مجبور مطلق بلکہ وہ مختار ہے لیکن ایسا مختار جس کا اختیار حق تعالیٰ کے ارادہ واختیار کے ساتھ وابستہ ہے گویا وہ ایک مختار نما مجبور یا مجبور نما مختار ہے، یا شاہ ولی اللہ کے لفظوں میں انسان میں اختیار ہے۔ لیکن اس اختیار پر اسے اختیار نہیں (والا امر صعب والایمان به قطعی)

(و) مولانا نے فقہ کی خاص روایت کو اختیار کیا ہے ورنہ دوسری روایتیں ایسی بھی ہیں جن سے یہ رقم اور حقیر ہو جاتی ہے اور جس قدر یہ رقم حقیر ہوگی اسی قدر ادا کرنے والوں کے سیاسی صغر میں اضافہ ہوگا اور مولانا کے نقطہ نظر سے آیت:

﴿حتی یعطوا الجزیة عن ید وهم صاغرون﴾ (التوبہ/۲۹) کا یہی مفہوم ہو سکتا ہے۔

(ز) یہ مخطوطہ بطور ایک تاریخی یادگار کے انشاء اللہ تعالیٰ صوبہ بہار بلکہ شاید ہندوستان کی سب سے بڑی ''اردو لائبریری'' دسنہ (بہار) میں محفوظ کر دیا جائے گا کہ جوار اً یہ اسی کا فطری حق ہے۔

Marfat.com

میرا مجوزہ تعلیمی خاکہ

مسلمانانِ ہند کے تعلیمی مشکلات کے حل کے متعلق خاکسار سالہا سال کے غور و فکر اور مختلف تعلیمی نظاموں کے تجربہ کے بعد جن نتائج تک پہنچا ہے، ان ہی کا اظہار کتاب ''نظام تعلیم و تربیت'' (۱) میں کیا گیا تھا۔ لیکن اس کا افسوس ہے کہ جن تاریخی مواد کی روشنی میں اپنی ان تجویزوں کو میں نے پیش کیا ہے، سوچا تو یہی تھا کہ سمجھنے میں لوگوں کو اس سے مدد ملے گی۔ لیکن احباب کے ایک بڑے طبقے کی طرف سے یہ شکایتیں مسلسل وصول ہو رہی ہیں کہ اپنی تجویزوں کو الگ کر کے کسی مختصر مضمون کی شکل میں اگر شائع نہ کرو گے تو موجودہ حالت میں خود کتاب سے ان تجویزوں کی صحیح اہلیت کا اندازہ لوگوں کو نہ ہو سکے گا۔ ان ہی شکایتوں کا ازالہ اس مختصر سے مقالہ سے مقصود ہے۔

ابتدا ہی میں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ مسلمان رہتے ہوئے اور حتی الوسع اسلامی زندگی سے اپنی زندگی کو متعلق رکھتے ہوئے مسلمان کس طرح تعلیم حاصل کر سکتے ہیں، میری بحث کا دائرہ صرف اسی بحث تک سر دست محدود ہے۔ چاہتا ہوں کہ اپنی تجویزوں کو پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کر دوں کہ جن مشکلات کے تصور نے ان تجویزوں کے سوچنے پر مجھے مجبور کیا ہے، وہ کیا ہیں۔

۱۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے برخاست ہو جانے کے بعد حکومت مسلطہ نے تعلیم کا جو نظام ملک میں (اسکولوں اور کالجوں وغیرہ) کے نام سے

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں جولائی ۱۹۴۵ء کو شائع ہوا۔

Marfat.com

قائم کیا، مشاہدہ یہ بتا رہا ہے کہ اس نظام کی تعلیم سے استفادہ کرنے والے مسلمانوں میں بتدریج اسلام اور اسلامی زندگی سے بعد پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ جن خاندانوں میں جدید تعلیم تیسری اور چوتھی پشت تک اس وقت تک پہنچ چکی ہے، ان میں اسلام کا صرف نام رہ گیا ہے۔ عام ابتدائی باتیں بھی ان لوگوں کو اسلام کی معلوم نہیں۔ یہ سنی ہوئی نہیں دیکھی ہوئی بات ہے کہ اچھے لکھے پڑھے لوگ جن کا نام بھی مسلمانوں کا سا تھا، لیکن وہ اپنے پیغمبر ﷺ کی شخصیت تک سے ناواقف نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ اپنے دین سے جو اس حد تک دور ہو چکا ہو، وہ دین کی دوسری باتوں سے کس حد تک واقف رہ سکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ جیسے جیسے دن گذرتے جاتے ہیں، اس قوم کے نام نہاد مسلمانوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی جا رہی ہے اور حالات میں کوئی تغیر اگر خدانخواستہ واقع نہ ہو تو یوں ہی یہ تعداد اور بڑھتی چلی جائے گی۔

۲۔ حکومت کا میلان عموماً تعلیم کے لزوم کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس وقت تک تو اس تعلیم کے دائرے کو وسیع ہی کرنے پر حکومت قناعت کر رہی ہے۔ لیکن وہ دن دور نہیں ہے کہ ملک کے ہر باشندے کو مجبور کیا جائے گا کہ حکومت کے منظور کردہ نصاب تعلیم لزوماً اپنے بچوں اور بچیوں کو دلائے۔ جس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ عام مسلمانوں کو تھوڑا بہت تعلق اسلام سے ابھی جو باقی ہے، تعلیم کی وسعت اور اس کا لزوم اس تعلق کو بھی کمزور کرتا چلا جائے گا۔ تعلیم یافتہ طبقہ سے مایوس ہو کر علمائے اسلام جن عام مسلمانوں کی دینی عقیدت پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں، اس عقیدت کی عمر بھی زیادہ دراز نظر نہیں آتی۔

۳۔ مذہب کے خلاف ہر زمانہ میں مختلف تحریکیں مختلف بھیسوں میں رونما ہوتی رہی ہیں۔ ان تحریکوں کا مقابلہ ہر زمانہ کے علماء نے ان تحریکوں کی گہرائیوں تک خود پہنچنے کے بعد کیا ہے اور ہے بھی یہی بات کہ مرض کا علاج مرض کی صحیح واقفیت ہی کے

Marfat.com

بعد ممکن ہے۔ لیکن مرض کو مرض جیسی ناپاک چیز قرار دے کر اگر طبیب اس کے جاننے سے گریز کرے گا تو مریضوں کا علاج ہو چکا۔

دراصل یہی تین باتیں ہیں جنہیں دیکھ دیکھ کر شعوری اور غیر شعوری طور پر اسلام کے مخلصین بے چین ہیں۔ خاکسار بھی ان حالات سے ہمیشہ متاثر ہورہا ہے۔ تیس چالیس سال کے اس طویل عرصہ میں کیا کیا تجویزیں خود میرے دماغ میں آئیں۔ یا مجھ سے پہلے لوگوں نے اس سلسلہ میں مشکلات کے حل کی جو تدبیریں سوچیں ان سے بحث میں طوالت ہوگی۔ اس وقت جن تجویزوں کو اپنے دماغ میں رکھتا ہوں اور تفصیلی ذکر جن کا اپنی کتاب تعلیم و تربیت میں میں نے کیا ہے، ان کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کے جو مستقل نظام (حکومت مسلط) کے قیام کے بعد جاری ہوگئے ہیں، اس کی دوئی اور اثنیت کو توڑ کر صرف ایک ہی نظام کو قبول کرلیا جائے، اسی لیے اپنی تعلیمی تجویز کا نام میں نے ''نظریہ وحدتِ نظامِ تعلیم'' رکھا ہے۔

میں نے اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ حکومتِ مسلط سے پہلے مسلمانانِ ہند میں تعلیم کا جو نظام قائم تھا، عام طور پر ''درس نظامیہ'' کے نام سے جسے شہرت حاصل ہوگئی ہے، اسکے متعلق لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے صرف دینی تعلیم کا نظام تھا۔ میں نے تفصیل سے دکھایا ہے کہ درحقیقت اس نصاب میں اس عہد کی دفتری زبان فارسی کی نظم و نثر و انشاء وغیرہ کی بیسیوں کتابوں کے ساتھ ساتھ حساب خطاطی وغیرہ کی مشق کرانے کے بعد اعلیٰ تعلیم عربی زبان کی کتابوں کے ذریعہ دی جاتی تھی۔ ابتداء سے آخر تک اس زمانہ کے تعلیمی نصاب کے ختم کرنے کی مدت پندرہ سولہ سال سے کم نہ تھی۔ اور اس پوری مدت تعلیم میں درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے علماء صحیح معنوں میں خالص دینیات کی کل تین کتابیں پڑھا کرتے

Marfat.com

تھے۔ یعنی چند مختصر فقہی متون کے سوا قرآن کے متعلق جلالین (جو عربی زبان میں قرآن کا ترجمہ اور مختصر حل ہے) حدیث کے متعلق مشکوۃ اور فقہ کے سلسلہ میں گو بظاہر نام تو دو کتابوں کا لیا جاتا تھا، یعنی شرح وقایہ اور ہدایہ لیکن عملاً ان کو ایک ہی کتاب سمجھنا چاہیے، کیونکہ کچھ ابواب شرح وقایہ سے کچھ ہدایہ کے اس طور پر پڑھا دیئے جاتے تھے کہ جن ابواب کی تعلیم شرح وقایہ میں دی جاتی تھی، ہدایہ کے ان ابواب کو نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ حکماً و عملاً یہ ایک ہی کتاب کی تعلیم تھی۔ زیادہ سے زیادہ میرے اس بیان پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ ڈھائی پارے قرآن کے تفسیر بیضاوی کی مدد سے بھی پڑھائے جاتے تھے۔ اولاً یہ ڈھائی پارے ہر جگہ نہیں پڑھائے جاتے تھے۔ خیرآبادی خانوادے میں صرف سوا پارہ بیضاوی کا جزء نصاب تھا۔ لیکن اگر مان لیا جائے کہ بیضاوی بھی قرآن کے متعلق ایک کتاب درس نظامیہ والوں کو پڑھائی جاتی تھی، تو مطلب کیا ہوا؟ یہی تو کہ پندرہ سولہ سال کی مدت میں گویا خالص اسلامی دینیات کی چار کتابوں کا پڑھنا دینی علوم سے مناسبت پیدا کرانے کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا۔ ان چار کتابوں کے سوا تعلیم کی اس طویل مدت میں طلبہ جو کچھ بھی پڑھتے تھے، فارسی (یعنی دفتری زبان) کی مذکورہ بالا بیسیوں نظم و نثر کی کتابوں کے سوا منطق، فلسفہ، ہیئت، اقلیدس، ادب عربی، اور بعض ایسے عقلی و ادبی علوم جنہیں خود مسلمانوں نے ایجاد کیا تھا۔ یعنی علم کلام، اصول فقہ، معانی و بیان وغیرہ ان ہی علوم و فنون کی اتنی کتابوں کا ختم کرنا ضروری تھا جن میں صرف منطق و فلسفہ کی کتابوں کی تعداد آخر زمانہ میں چالیس پچاس سے متجاوز تھی۔

میں نے بزرگوں کے اسی طرز عمل کو پیش کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا کہ دینیات کی عمومی تعلیم کے لیے جب تین یا زیادہ سے زیادہ چار کتابوں کا پڑھ لینا کافی خیال کیا گیا تھا اور زیادہ وقت غیر دینی علوم ہی کی تعلیم میں صرف ہوتا تھا، تو آج بھی

Marfat.com

کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ غیر دینی علوم کے اس حصہ کو جس کے اکثر نظریات و مسائل مسترد ہو چکے ہیں کم از کم دنیا میں ان کی مانگ باقی نہیں رہی ہے، ان کو نکال کر عصر جدید کے مقبول علوم اور عہد حاضر کی دفتری زبان انگریزی کے نصاب کو قبول کر کے مذہب کی تعلیم کو ان ہی تین کتابوں کے معیار کے مطابق باقی رکھتے ہوئے دینی اور دنیاوی تعلیم کے مدارس کی اس تفریق کو ختم کر دیا جائے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے حکومت سے یہ استدعا کی جائے کہ جیسے پہلے ان کی تعلیم میں دین کا عنصر ہر زمانہ میں ایک لازمی اور ضروری مضمون کی حیثیت رکھتا تھا، اب بھی اس عنصر کو لازم کر دیا جائے اور اس طور پر لازم کر دیا جائے کہ جیسے درس نظامیہ سے فارغ ہونے والے دین کا علم ان کتابوں کے معیار کے مطابق اپنے پاس رکھتے تھے، اسی طرح بی اے کی تعلیم سے فارغ ہونے والے اس زمانہ میں بھی اس حد تک مذہب کے عالم ہو کر نکلا کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں پھر دینیات کے مدارس کے نام سے الگ عام مدرسوں کے قائم کرنے کی ضرورت مسلمانوں کو باقی نہ رہے گی۔ ہر عالم اس وقت گریجویٹ ہوگا اور گریجویٹ عالم، ملا ہی مسٹر ہوں گے اور مسٹر ملا، عالم و تعلیم یافتہ کی تفریق کا قصہ ختم ہو جائے گا۔

یہ ہے خلاصہ اس تجویز کا جسے نظریہ ''وحدت نظام تعلیم'' کے نام سے اپنی کتاب میں میں نے پیش کیا ہے۔ اور اس کے تمام پہلوؤں پر جہاں تک میرے امکان میں تھا، بحث کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہاں درج کرتا ہوں۔ میری تجویز پر جو شبہات کیے جاتے ہیں ان ہی کا جواب اس خلاصہ میں دیا جائے گا۔ پہلا شبہ یہ ہے کہ دینیات کی ان تین کتابوں کے پڑھنے کے لیے عربی زبان سے کافی واقفیت ناگزیر ہے اور عربی زبان کا سیکھنا آسان نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ

Marfat.com

عربی زبان کے الفاظ کا ایک حصہ تو وہ ہے جس میں مسلمانوں کی دینی چیزیں مثلاً قرآن و حدیث و فقہ وغیرہ محفوظ ہیں۔ اس حصہ کے متعلق یہ بتایا گیا ہے کہ اردو بولنے والی قوموں کے لیے عربی زبان کا یہ حصہ تقریباً مادری زبان کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی اسی پچاسی فیصد الفاظ اس حصہ کے ہر اردو بولنے والے ہندی مسلمان کو باضابطہ عربی زبان سیکھے بغیر یوں ہی معلوم ہیں۔ چند اصولی باتوں کے جان لینے کے بعد اس عربی کو آدمی خود بخود سمجھنے لگتا ہے۔ البتہ عربی زبان کا وہ ذخیرہ جس میں ایام جاہلیت وعہد اسلامی کے شعراء کے اشعار یا محاضرات، مسامرات و انشاء اور خاص ادبی نثر و نظم کی کتابیں ہیں یقیناً دشوار ہے۔ لیکن اس عربی کی سیکھنے کی ضرورت ہر شخص کو نہیں ہے جو اپنی واقفیت صرف اسلامی امور تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔

دوسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ صرف ان تین کتابوں کے پڑھنے سے کیا اسلام کے دینی علوم میں ماہرانہ قابلیت اور تبحر کیا کوئی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ عام لزومی واقفیت اور چیز ہے اور تبحر و اختصاص کسی علم میں یہ بالکل ایک جداگانہ مقصد ہے۔ میری گفتگو صرف عام اور لزومی واقفیت تک محدود ہے۔ درسِ نظامیہ سے فارغ ہونے والے عام علماء کی واقفیت و مناسبت کا جو معیار اسلامی علوم کے متعلق ہوتا تھا، یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ ان تین کتابوں کو صحیح طور پر پڑھ لینے کے بعد امید کی جاتی ہے کہ اب بھی ان کے پڑھنے والے واقفیت و مناسبت کے اس معیار تک پہنچ سکتے ہیں۔

باقی تبحر و اختصاص اور ان علوم میں سے کسی خاص علم میں مہارت خصوصی کا مالک ہونا اس کے لیے ظاہر ہے کہ خصوصی مدارج کی تعلیم کی یقیناً ضرورت پڑے گی۔ جیسے غیر دینی علوم کے معیار کو خصوصی کلاسوں کی تعلیم سے بلند کیا جاتا ہے۔ وہی طرزِ عمل ہم اسلامی علوم کے متعلق بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ بلکہ قطعاً اختیار کرنا چاہیے۔

Marfat.com

تیسرا شبہ یہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ارباب فکر ونظر نے اب تک جو کچھ سوچا، سمجھا، لکھا پڑھا تھا دین سے ان کا خواہ تعلق نہ بھی ہو، تو کیا ان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا مناسب ہوگا۔ علی الخصوص ایسے علوم جن کا دین سے گو نہ تعلق بھی ہے، خصوصاً جن فنون کو مسلمانوں نے اسلام ہی کی صحیح تشریح وتوضیح کے لیے ایجاد کیا تھا۔ مثلاً اصول فقہ، کلام یا بیان و معانی و بدیع وغیرہ کا جو جال ہے میں نے اس کا اپنی کتاب میں بھی جواب دیا ہے کہ ان علوم کو زندہ رکھنے کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ دوسرے اختیاری مضامین کے ساتھ ان مضامین کو بھی اختیاری مضامین کے ذیل میں رکھ دینا کافی ہوگا۔ کچھ لوگوں کا پڑھنا پڑھانا ان کی بقاء وارتقاء کے لیے کافی ہے۔

بلکہ عربی زبان کے دوسرے ادبی حصہ کے متعلق بھی میرا یہی خیال ہے کہ ان کو بھی اختیاری مضامین میں شریک کر کے زندہ رکھا جائے۔ لیکن ہر مسلمان کا میلان باقی رہنے کے لیے خصوصاً موجودہ حالات میں یعنی دماغ کی تعلیمی بیداری کے بعد اس عربی کی لزومی تعلیم قطعاً ضروری نہیں ہے۔

ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ موجودہ مغربی تعلیم گاہوں کے نصاب میں دینیات کی تعلیم کے لازم کر دینے کے بعد بھی اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ پڑھنے والوں کی زندگی اسلامی زندگی بن جائیگی؟ کیا ان کا جو ماحول ہے اس کے سمی اثرات کے ازالہ کے لیے صرف تعلیم کافی ہے؟ بلا شبہ یہ آخری سوال بڑا جان گسل زہرگداز اور حوصلہ شکن سوال ہے۔ ماحول حکومت کے نقطہ نظر کا تابع ہوتا ہے۔ جب تک حکومت غیر اسلامی ہے اس کے پیدا کردہ ماحول میں اسلام کی قدر وعزت کی توقع غلط توقع ہے لیکن پھر کیا کیا جائے، کیا مسلمانوں کو اسی حال میں چھوڑا جائے؟ میرا خیال ہے کہ تعلیم کا بھی کچھ نہ کچھ اثر قلوب پر ضرور پڑتا ہے، خصوصاً اگر پڑھانے والوں میں اثر کو متعدی کرنے کا سلیقہ ہو۔ اسی کے ساتھ طبائع بھی ایک

Marfat.com

طرح کے نہیں ہوتے۔ اسی مخالفانہ ماحول سے آخر مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر اقبال مرحومؒ جیسے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جب ناواقفیت کے باوجود اسلام نے ان لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ بالآخران کو صحیح اسلام سے واقف ہونا پڑا تو پھر خدا کی رحمت سے ناامیدی کی راہ کیوں اختیار کی جائے، ہوسکتا ہے کہ قرآن کی، پیغمبر کی زندگی کی، اسلامی نظام حیات (فقہ) کی تعلیم ان کو خود متاثر کرے، سب کو نہیں تو بعض کو تو انشاءاللہ ضرور متاثر کرکے رہے گی اور ان بعض کا تاثر انشاءاللہ دوسروں کے متاثر ہونے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

بلکہ تعلیمی نظام کی وحدت کے ساتھ ساتھ مسلمان محکومیت کے اس دور میں اتنا کام اسی تعلیم کے متعلق اپنے ذمہ اگراور لے لیں، یعنی ہر تعلیم گاہ کے ساتھ ساتھ مسلمان طلبہ کے لیے خاص اسلامی اقامت خانے بھی قائم کیے جائیں اور ان اقامت خانوں کی نگرانی اربابِ تقویٰ و دیانت کے سپرد کی جائے۔ ان کا ماحول بالکلیہ اسلامی ماحول رکھا جائے تو جو اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے اس کے علاج کی ایک کافی کارگر صورت یہ بھی ہوسکتی ہے۔

علاوہ ازیں تمام باتوں کے ایک چیز اس سلسلہ میں قابل غور یہ بھی ہے کہ انگریزی جوامع اور مغربی طرز کی یونیورسٹیوں کے ماحول پر اگر ہم قابو پا سکتے تو آج مسلمانوں کے جو دینی مدارس ہیں ان میں جب جدید نصاب کو جاری کردیا جائے گا تو ان کے ماحول تو ہمارے زیر اقتدار رہ سکتے ہیں۔ جدید علوم وفنون اور سرکاری عصری زبان کی تعلیم کے لیے مدرسین ان مدارس میں ایسے منتخب کیے جائیں جو نام کے ساتھ کام بھی مسلمانوں کا کرتے ہوں۔ بحمد للہ اب ان کی ایک کافی تعداد ملک میں پیدا ہوچکی ہے۔ تلاش سے ایسے لوگ مل سکتے ہیں اور بالفرض سردست نہ بھی ملیں تو ایسی صورت میں میرا خیال ہے کہ بجائے ملحد اور بے دین نام نہاد مسلمانوں کے

Marfat.com

غیر اقوام کے اہل علم کا تقرر کر کے ہم خود اپنے یہاں ایسے لوگ پیدا کر سکتے ہیں جو آگے چل کر خود ہمارے قدیم مدارس میں جدید علوم وفنون کی تعلیم کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ میں ملحد مسلمانوں سے غیر اقوام کے دھرمی معلموں کو اس باب میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔

آخری بات اس سلسلہ میں ابتدائی تعلیم کے متعلق میری جو تجویز ہے اس کا پیش کرنا ہے۔

میرا خیال ہے کہ مسلمانوں پر عربی تعلیم کے لزوم کا مطالبہ شروع ہی سے حکومت کے آگے پیش کرنا چاہیے۔ لیکن عربی پڑھانے کا طریقہ یہ اختیار کرنا چاہیے کہ پہلے بچوں کو بغدادی قاعدہ کے اصول پر عربی حروف ہجا سے آشنا کیا جائے اور اسی طرح آشنا کیا جائے کہ جیسے اس وقت تک کیا جاتا ہے۔ پھر ناظرہ قرآن بھی ہر بچے کو اسی طرح پڑھایا جائے جیسے اب تک رواج ہے۔ قرآن کے بعد یا موقع ہو تو قرآن کے ساتھ ان ہی عربی حروف کی دوسری شکل یعنی خطِ نستعلیق (۲) سے بھی ان کو آشنا کیا جائے۔ یعنی اردو پڑھائی جائے اور یہ دیکھ لینے کے بعد کہ خواندگی کی قدرت بچے میں اردو کی پیدا ہو چکی ہے، آئندہ اردو کو چھوڑ کر فارسی کے آمد نامہ اور کچھ تھوڑی بہت مناسبت اس سے پیدا کرا کے عربی میں طلبہ کو لگا دیا جائے۔ یہی عربی بڑھتے ہوئے بی اے تک پہنچے گی۔ اور اسی سلسلہ میں کچھ تھوڑی بہت ابتدائی عربی کے بعد دینیات کی مذکورہ بالا درس نظامیہ والی کتب ثلثہ کے ختم کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ عربی زبان کی تعلیم کا مطلب دینیات کی ان ہی تین کتابوں کا پڑھانا ہوگا۔

میری تجویز کا اجمالی خاکہ ہے، رہیں تفصیلات تو اصول کے طے پا جانے کے بعد ان کا مسئلہ چنداں دشوار نہیں ہے، مشورہ سے ان تفصیلات کو مرتب کیا جا سکتا

Marfat.com

ہے۔ البتہ اجمالاً چند کلی باتیں اس سلسلہ میں بھی جو میری سمجھ میں آئی ہیں اگر عرض کردوں تو نامناسب نہ ہوگا۔

۱۔ تعلیم کی مدت اگر وہی باقی رکھی جائے جو اس وقت یونیورسٹیوں میں مقرر ہے تو میٹرک تک عربی کے اس سلسلہ کو اس طریقہ سے پہنچانا چاہیے کہ میٹرک پاس کرنے والے معنی اور مختصر مطلب کے ساتھ قرآن ختم کرلیں اور انٹرمیڈیٹ پاس کرنے والوں کو مشکوۃ یا اسی قسم کی کوئی کتاب مجموعہ حدیث کی پڑھادی جائے اور بی اے پاس کرنے والوں کو فقہ کے متعلق اتنے معلومات حاصل کرلینا چاہیے جو شرح وقایہ اور ہدایہ کے پڑھنے سے حاصل ہوسکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دینیات کی جن تین کتابوں کا تذکرہ شروع سے میں کرتا چلا آرہا ہوں ان میں سے قرآن کو تو بہر حال قرآن ہی کے ذریعہ سے پڑھانا چاہیے۔ لیکن مشکوۃ و ہدایہ وغیرہ کا تذکرہ میں نے تمثیلاً کیا ہے، مقصود معیار کو متعین کرنا ہے۔ یعنی ان کتابوں کو پڑھ لینے کے بعد حدیث و فقہ میں جتنی دسترس کے حاصل ہونے کی توقع کی جاتی ہے اسی کو کسی ذریعہ سے حاصل کرنا چاہیے۔ املاء کا طریقہ اگر مفید سمجھا جائے تو اسی کو اختیار کیا جائے اور اگر یہ خیال ہو کہ کتاب کے ذریعہ سے زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے تو کتابی تعلیم کے اس طریقہ کو باقی رکھا جائے جو اب تک عربی مدرسوں میں جاری ہے۔

۲۔ میرا خیال ہے کہ وحدتِ تعلیم کے نظریہ پر اگر اتفاق کرلیا جائے تو عربی کے عام مدارس کو مدارسِ فوقانیہ (ہائی اسکول) کی شکل میں بدل دیا جائے۔ جن میں دینیات کی تعلیم صرف قرآن پڑھانے تک ختم ہو جائے گی۔ البتہ بعض بڑے تعلیمی مراکز ان کے تحتانی درجوں کو تو ہائی اسکول کی حیثیت دے دی جائے اور ان بڑے مراکز میں سے مختلف مرکزوں کو مختلف دینی و اسلامی علوم کی تکمیل کی تعلیم گاہ بنادی جائے، جہاں عام یونیورسٹیوں کے فارغ شدہ طیلسانیوں کو دینی علوم میں سے کسی

Marfat.com

خاص علم مثلاً تفسیر یا حدیث یا فقہ یا کلام میں اعلیٰ تکمیلی تعلیم کے حاصل کرنے کا موقع مل سکتا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ تفسیر کے لیے ندوہ کو اور حدیث کے لیے دیوبند کو مختص کردیا جائے اور فقہ کے لیے فرنگی محل میں کوئی تکمیلی ادارہ قائم کیا جائے، کلام اور تصوف کے لیے اجمیر شریف میں انتظام کیا جائے جہاں اس وقت بھی سرکار نظام کی طرف سے عربی کا ایک بڑا مدرسہ قائم ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں جن باتوں کا اجمالاً تذکرہ مقصود تھا وہ ختم ہو چکا۔ آخر میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ بعضوں نے جو یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حکومت مسلمانوں کے اس تعلیمی مطالبے کو کیا تسلیم کرے گی؟ اس کے متعلق مجھے یہ کہنا ہے کہ اس سے بھی زیادہ سخت اور خطرناک مطالبوں کے تسلیم کرنے پر اس زمانہ میں جب حکومت کو مجبور کیا جا سکتا ہے تو مسلمانوں کا صرف اتنا مطالبہ کہ ایسی تعلیم جو بتدریج ہماری نسلوں کو غیر مسلم بناتی چلی جارہی ہے اس کی تعلیم میں اتنی ترمیم کردی جائے جس سے ارتداد و بے دینی کے اس سیلاب کا انسداد ممکن ہو جائے تو یقیناً کوئی ایسا مطالبہ نہیں ہے جسے خواہ مخواہ حکومت مسترد کرنے پر ضد کرے گی، ممکن ہے کہ ہندوستان اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے باہمی اختلاف کو حیلہ بنا کر پیش کیا جائے لیکن اس حیلہ کا جواب بآسانی دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ پٹنہ یونیورسٹی میں یہ تحریک جو ہندو لیڈروں نے پیش کی تھی، پاس ہوگئی ہے کہ سنسکرت زبان کی تعلیم ہندو طلبہ کے لیے لازم کردی جائے۔ گو مسلمانوں کی طرف سے کوئی بولنے والا کھڑا نہ ہوا لیکن تعلیمی وزن کو برابر کرنے کے لیے مسلمان طلبہ پر بھی ان کی کلاسیکل زبانوں (عربی و فارسی) میں سے کسی زبان کا لینا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ نہ جاننے کی وجہ سے کہیے یا خود مولویوں کی طرف سے عربی کی دشواری کی غلط شہرت عموماً بجائے عربی کے فارسی ہی کے لینے

Marfat.com

پر طلبہ کو سنا ہے کہ آمادہ کر رہی ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے اور جن ذرائع سے یہ خبر مجھ تک پہنچی ہے اس میں شک کی بہ ظاہر کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی تو یوں سمجھیے کہ جس مطالبہ کی منظوری میں لوگ مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں، حکومت اس مطالبہ کو منظور کر چکی ہے۔ کلاسیکل زبان کی تشریح و تفصیل خود ہم مسلمانوں کو اسی شکل میں کرنا چاہیے جس کا ذکر اپنی تجویز میں خاکسار نے کیا ہے جس میں اردو فارسی وعربی تینوں زبان کی تعلیم عربی زبان کی تعلیم کی عملی شکل ہوگی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اردو زبان کے مسئلہ کو بھی اسی تعبیر اور اسی تدبیر سے ہم بغیر کسی کشمکش کے بآسانی حل کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اردو کو مضبوط اور قوی کرنے کا صحیح ذریعہ یہ نہیں ہے کہ اردو کی ایک کتاب کے بعد اردو ہی کی دوسری کتاب مسلسل بچوں کو پڑھائی جائے۔ بلکہ اردو کو قوی کرنے کے لیے ضرورت ہے، فارسی سے مناسبت پیدا کرنے کی اور فارسی میں قوت وہی حاصل کر سکتا ہے جس نے عربی زبان سیکھی ہو۔ پانی میں پانی ملاتے چلے جانے سے کوئی نئی کیفیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح اردو کی ایک کتاب کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کے پڑھانے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ جو وقت اردو کے پڑھانے میں صرف کیا جاتا ہے اسی وقت میں اردو کے بعد فارسی، اور فارسی کے بعد عربی سے طلبہ کا لگاؤ پیدا کیا جائے یہ اردو ہی کے قوی کرنے کا ایک کارگر بے خطا نسخہ ہوگا۔ بعض بزرگوں نے میری تجویز پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ علومِ جدیدہ خصوصاً سائنس کیمیا وغیرہ جیسے علوم کی تعلیم بہت پُر مصارف ہے۔ عربی کے غریب مدارس سے ان مصارف کی پابجائی ناممکن ہے۔ لیکن خاکسار یہ کب کہتا ہے کہ عربی مدارس میں ان علوم کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ میری تجویز تو یہ ہے کہ دینیات کی تعلیم کو ان مدارس میں منتقل کر دیا جائے جہاں حکومت نے جدید علوم وفنون کی تعلیم کا نظم کر رکھا ہے۔ چاہے تو کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی مدارس کو انگریزی مدارس نہیں، بلکہ

Marfat.com

انگریزی مدارس کو میں چاہتا ہوں کہ مسلمان بنالیا جائے۔ رہے عربی مدارس سو عرض کر چکا ہوں کہ غیر مرکزی مدارس جو عموماً اس وقت شہروں اور قصبوں میں قائم ہیں ان کو قرآن کی بامعنی تعلیم کا مدرسہ قرار دے کر جدید علوم وفنون کا ہائی اسکول مسلمانوں کے لیے بنالیا جائے اور اسلامی علوم کی تکمیلی تعلیم کا مرکز عربی کے مختلف مرکزی مدارس کو قرار دے دیا جائے۔

اس وقت ہر صوبہ میں شرکائے وطن کے سینکڑوں فوقانی مدارس یعنی ہائی اسکول قائم ہیں۔لیکن مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ بعض صوبوں میں تو ان کا کوئی اسلامی اسکول ہی نہیں ہے اور جہاں کہیں ہیں بھی تو ان کی تعداد شرکائے وطن کے قائم کردہ اسکولوں کی تعداد کے مقابلہ میں صرف صفر کی حیثیت رکھتی ہے۔لیکن جو تجویز پیش کی گئی ہے، اگر عمل کا قالب اس نے اختیار کرلیا تو مسلمانوں کے اسکولوں کی تعداد بھی اپنی آبادی کی نسبت سے کم نہ رہے گی، بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس مناسبت سے ان کی تعداد بڑھ جائے۔ کیونکہ مشکل ہی سے ہندوستان کے کسی صوبہ کا کوئی ضلع ،ضلع کا کوئی ایسا تعلقہ برٹش انڈیا خصوصاً شمالی ہند میں ایسا ہوگا، جہاں کسی نہ کسی قسم کا عربی مدرسہ نہ قائم ہو۔ جدید علوم وفنون کی تعلیم کو قبول کر لینے کے بعد حکومت کا محکمہ تعلیمات مالی اعانت پر مجبور ہوگا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ حکومت کی مالی اعانت اور چنددن سے جو امداد اب تک ان مدارس کو مل رہی ہے ان دونوں قسم کی رقوم سے بآسانی ہمارے عام عربی مدارس اچھے ہائی اسکولوں کی شکل اختیار کرلیں گے۔ کہنے کو تو یہ ہائی اسکول کہلائیں گے لیکن دراصل قرآن پڑھانے اور سمجھانے کے یہ مدارس ہوں گے۔علماء ہی کی نگرانی میں عموماً چونکہ یہ مدارس ہوں گے اس لیے توقع کی جاتی ہے کہ تعلیم کا یہ ابتدائی دور مسلمان بچوں کا اسلامی ماحول ہی میں گذرے گا۔ باوجود اختصار کی شدید کوشش کے مضمون میں پھر بھی کافی طوالت پیدا ہوگئی۔لیکن کیا کروں

ضروری چیزوں سے خاموشی اختیار کرنے پر دل راضی نہیں ہوتا۔ آخر میں اتنی بات جس پر اپنی کتاب میں میں نے کافی بحث کی ہے اور بھی کہہ دینی چاہتا ہوں کہ مسلمانان ہند کی تعلیم کے ان دو مستقل نظاموں کو ختم کر کے ایک ہی نظام تعلیم عمومی کا اگر نہ قائم کیا جائے گا تو اس علمی رقابت کی وجہ سے جو ان دونوں نظاموں سے استفادہ کرنے والے طبقات میں پیدا ہوگئی ہے، روز بروز اس میں اور شدت پیدا ہوتی چلی جائے گی، اس کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ آج تو اس کے نتائج چنداں اہم نہیں محسوس ہورہے ہیں لیکن خدانخواستہ بات اگر یوں ہی بڑھتی رہی تو کچھ بعید نہیں ہے کہ مسلمانوں ہی میں مذہب اسلام کے دشمن اس لیے پیدا ہوجائیں، کہ مذہب کے نمائندوں سے ان کے قلوب میں نفرت بڑھ رہی ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ مذہبی نمائندوں کی یہ نفرت خدانخواستہ خود مذہب سے نفرت کا ذریعہ بن جائے (لافعلہ اللہ) میرا خیال ہے کہ ملا اور مسٹر یا عالم اور تعلیم یافتہ کی تفریق کا جہاں تک جلد ممکن ہو خاتمہ کر دینا چاہیے اور نظام تعلیم کی وحدت کے سوا اس کا بظاہر کوئی دوسرا علاج کم از کم میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

بلکہ آج اپنے مذہب اور مذہب کی اساسی کتابوں سے ناواقف تعلیم یافتہ مسلمانوں کو یہ دھوکا جو دیا جارہا ہے کہ جس شکل میں مذہب ان کے سامنے پیش کیا جارہا ہے یہ مولویوں کا خود تراشیدہ مذہب ہے۔ اس مغالطہ کے ازالہ کی شکل بھی یہی ہے کہ ہر پڑھے لکھے مسلمان میں اس کی صلاحیت پیدا کردی جائے کہ اپنے دین کی بنیادی کتابوں کا وہ خود مطالعہ کرسکے، جو تجویز خاکسار نے پیش کی ہے انشاء اللہ اس سے یہ توقع پوری ہوجائے گی۔

یہ خدشہ کہ جدید تعلیم یافتہ طبقات کو قرآن وحدیث سے واقف بنانا

دادنِ تیغے بدستِ راہ زن

Marfat.com

کے انجام کو کہیں نہ پیدا کرے، بہ ظاہر بے بنیاد خطرہ نہیں ہے۔ بلکہ اولاً قرآن کی لاہوتی قوت پر اعتماد کرنا چاہیے۔ تجربہ اس کا مصدق ہے کہ انسانی دماغ کی منطق کے سلجھانے میں قرآن سے زیادہ کارگر کوئی دوسری چیز نہیں ہوسکتی۔ یہ درست ہے کہ مغربی تعلیم کے باطنی رجحانات آدمی کی فطرت کو سلامتی وصحت کے نقطہ اعتدال سے ہٹادیتے ہیں اور اسی لیے

ہر چہ گیرد علتی علت شود

کا خطرہ غلط نہیں ہے۔ ڈر ہے کہ مذہب بھی ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر علت کی شکل نہ اختیار کر لے۔ لیکن پہلے بھی میں نے کہا ہے کہ ہمیں یہ امید رکھنی چاہیے کہ ان ہی الجھے ہوؤں میں سے انشاء اللہ سلجھے ہوئے بھی نکلتے رہیں گے اور بگڑے ہوؤں کو درست کرنے کا کام بھی انشاء اللہ وہی انجام دیں گے۔ بہرحال مذہب اور مذہبی تعلیم کی عمومیت سے گریز میرے نزدیک تو برہمنیت ہے۔ اسلام نے ان خطرات کا مقابلہ کیا ہے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ جس حد تک عمومیت اسکی تعلیم میں پیدا ہونے کا امکان ہواس سے نفع اٹھائیں اور اس قسم کے خطرات کو خدا کے سپرد کریں، اپنے آخری دین کی بہرحال وہ حفاظت فرمائے گا۔

واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون۔

Marfat.com

حواشی

۱۔ کتاب کا پورا نام ''مسلمانانِ ہند کا نظام تعلیم و تربیت'' ہے جس کی پہلی جلد تقریباً ۳۰۰ صفحات میں ادارہ ندوۃ المصنفین سے شائع ہو چکی ہے اور دوسری جلد زیرِ طبع ہے، ندوۃ المصنفین دہلی قرول باغ سے مل سکتی ہے۔

۲۔ نستعلیق یا فارسی حروف سے طلبہ کو آشنا کرنے کی ضرورت بھی اسی وقت تک ہے جب تک طباعت کے لیے نسخ کے حروف کو اردو کے لیے تسلیم نہیں کیا گیا ہے، اگر یہ مسئلہ طے ہو گیا تو پھر اس کی بھی چنداں ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ البتہ لکھنے کی حد تک نستعلیق کو باقی رکھنا چاہیے، انگریزی میں طباعت اور کتابت کے حروف کی شکل جیسے ذرا بدلی ہوئی ہے، یہی طرزِ عمل ہم بھی اختیار کریں گے۔ نسخ طباعت کے لیے اور نستعلیق کتابت کے لیے۔

انسانی تاریخ کی ایک مثالی حکومت

کوئی تراشا ہوا خیالی افسانہ نہیں بلکہ معتبر راویوں کی مسلسل سند کے ساتھ مشاہدات اور تجربات کا جو مجموعہ ابن سعد کے طبقات میں پایا جاتا ہے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ ہر ہر واقعہ کے لیے حوالہ کی ضرورت اس لیے نہیں سمجھی گئی کہ یہاں جو کچھ بھی درج کیا جا رہا ہے صرف ایک ہی کتاب سے ماخوذ ہے۔

دنیا کے تین (الف) مشہور دل کشا اور دل آویز سیر گاہوں مین وہ خود شہر اور اس کا مینو سواد علاقہ سمجھا جاتا ہے، جہاں کے حکمران کی یہ تاریخی داستان آپ کے سامنے ہم دہرانا چاہتے ہیں۔

جانشین کے انتخاب کے کاغذات مرتب ہو چکے ہیں۔ جس حکمران کی جانشینی کا مسئلہ طے کیا گیا ہے، وہ اپنی آخری سانسیں پوری کر رہا ہے۔ انتخاب کے وثائق ملک کے جس باوقار صاحب علم بزرگ کے سپرد کیے گئے ہیں، ان کا حکم ہے کہ جب تک موت اپنے فیصلہ کو قطعی شکل میں صادر نہ کر لے، اس وقت تک انتخاب کس کا ہوا، اس کو صیغہ راز میں رکھا جائے۔ جس کا انتخاب کیا گیا ہے، اس کو خود اس کی خبر نہیں ہے۔ مسئلہ معمولی نہیں ہے۔ ایک بڑی حکومت کی حکمرانی اور فرمانروائی کا مسئلہ جس کی قلم رو کے حدود میں ایشیا اور افریقہ ان دونوں براعظموں کے تقریباً اکثر اور بڑے آباد علاقے شریک ہو چکے ہیں اور جو شریک نہیں ہوئے، حالات ایسے سازگار

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں مارچ ۱۹۵۰ء کو شائع ہوا۔

ہیں کہ ان کی شرکت کی توقع بھی بعید از قیاس نہیں ہے۔ بلکہ یہ سمجھا جائے کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اس زمانہ میں کرۂ ارض کی سب سے بڑی قاہرہ اور ہر لحاظ سے ممتاز ترین حکومت یہی تھی، تو یہ مبالغہ نہیں، بلکہ واقعہ کا اعتراف واظہار ہوگا۔

بہر حال راز کے وثائق کے امین سے وہی جن کا اس حکومت کی فرمانروائی کے لیے انتخاب ہو چکا ہے دیکھا گیا کہ وہی ان سے کہہ رہے ہیں:

''اگر کچھ بھی میری محبت اور قدر و قیمت آپ کے دل میں ہے تو خدارا مجھے آگاہ کیجیے کہ کہیں قرعہ فال میرے نام تو نہیں ڈالا گیا ہے، مجھے اس کا اندیشہ ہے کہ کہیں یہی نہ ہوا ہو''۔ (۱)

''ابھی اس کا وقت باقی ہے، کہ اس فیصلہ کو میں بدلوا سکتا ہوں، بات اگر ہاتھ سے نکل گئی، تو جو کچھ میں اس وقت کر سکتا ہوں، آئندہ وہ میرے بس کی بات نہ رہے گی''۔ (۲)

جو اس حکومت کی صدارت نہیں، بلکہ بادشاہی کے لیے چنا جا چکا ہے، مگر اپنے انتخاب کے اس واقعہ سے بے خبر ہے، گڑگڑانے لگا، خود ان ہی کا بیان ہے، جن سے وہ کہہ رہا تھا کہ

''دیکھیے اس بڑے کام کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل اپنے آپ کو نہیں پاتا''۔ (۳)

بار بار اسی فقرے کو وہ دہراتے جاتے تھے، ''امانت میں خیانت ہوگی، اگر وقت سے پہلے تم کو میں آگاہ کر دوں'' یہی جواب ان کو ملتا رہا۔ جب تقاضا حد سے زیادہ گذر گیا تب میں نے یہ جان کر کہا کہ یہی ایک ذریعہ ان کے خاموش کرنے کا ہو سکتا تھا بولے:

''خوب میں سمجھتا ہوں اپنے دل کی آرزو کو اس طریقہ سے تم میرے آگے

Marfat.com

پیش کرر ہے ہو، چاہتے ہو، کہ تمہارے لیے میں کوشش کروں، تم پر حکمرانی کے شوق کی حرص سوار ہے''۔(۴)

یہ ایسا سخت اور کارگر حملہ تھا کہ منہ لٹکا کر بے چارے چلے گئے، قدرت نے فیصلہ کر دیا، اربابِ بست وکشاد جمع ہوئے، لفافہ کھولا گیا اور بادشاہی کے لیے جو چنا گیا تھا، اس کے نام کا اعلان کر دیا گیا، جن کے سپرد یہ امانت ہوئی تھی، ان ہی کا بیان ہے:

''میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس شخص کے بازو کو پکڑا اور اٹھا کر بزور اس منبر پر لے جا کر بٹھا دیا، جس پر انتخاب کے بعد حکمران کو کھڑے ہو کر خطبہ دینا پڑتا ہے''۔(۵)

وہی کہتے ہیں میں ان کو منبر کی طرف لیے چلا جا رہا تھا اور ان کی زبان پر بے ساختہ انا للہ وانا الیہ راجعون جاری تھا اور یہ کہہ رہے تھے کہ میں جس چیز کو نہیں چاہتا تھا، وہی زبردستی میرے سامنے آئی۔ بادشاہی کا اعلان ہو گیا، تخت نشینی کہیے یا منبر نشینی کی تقریب ختم ہوگئی (ب)۔(۶)

گھوڑے ہیں، خچر ہیں، طرح طرح کی سواریاں قطار در قطار سامنے ہیں، ہر گھوڑے اور خچر کی لگام ایک سائیس کے ہاتھ میں ہے۔

ان ہی سواریوں میں مرحوم سابق حکمران کا شاہی گھوڑا بھی اپنی کامل زیب وآرائش کے ساتھ سامنے لا کھڑا کیا گیا اور کہا گیا سوار ہو جائیے۔ انہوں نے گردن جھکائی اور بغلہ شہباء اشہب رنگ کا خچر جس پر ہمیشہ سوار ہوتے تھے، حکم دیا کہ سب کو لے جاؤ اور اسی خچر کو میرے آگے لاؤ۔ چنانچہ وہ لایا گیا اور آپ سوار ہو کر چل پڑے۔ جلوس کی شاہانہ سواریاں واپس ہوگئیں۔ جا رہے تھے، سامنے دارالخلافت کا قصر رفیع تھا۔ مگر اپنے خچر کا سوار آگے بڑھا جا رہا تھا۔ عرض کیا گیا کہ

بادشاہ کا محل یہ ہے۔ فرمایا اس میں مرحوم کے بچے اور اہل و عیال ابھی ہیں۔ میرے لیے تو میرا فسطاط (خیمہ) ہی کافی ہے، یہ فرماتے ہوئے حکم دیا گیا کہ مرحوم کے لوگوں کے لیے پہلے مکان کا نظم کر لیا جائے، تب حکومت کے کاموں کی نگرانی کے لیے میں حکومت کے اس مکان میں آؤں گا، یہ بھی کیا گیا۔ (۷)

شاہی توشک خانہ سے غالیچوں، قالینوں، گدوں، شطرنجیوں، مسندوں کا ایک انبار اسی پرانے گھر یا خیمہ میں بھیج دیا گیا۔ یہ کیا ہے شاہی فراش خانہ کا سامان ہے، جواب دیا گیا، سب کو واپس لے جاؤ۔ صرف آرمینہ کا بنا ہوا ایک نمدہ اس سے نکال لیا گیا، زمین پر خود ہی اسے بچھا کر بیٹھ گئے۔ حکومت کے کام کو اسی پر بیٹھ کر اگر انجام نہ دیتا تو میں تجھ پر ہرگز نہ بیٹھتا۔ یہ فقرہ آرمینیہ کے اس نمدے کو خطاب کر کے کہا گیا۔ (۸)

فرمان پر فرمان حکم پر حکم جاری ہونے لگا، غیر قانونی ذریعہ سے جس کے پاس جو چیزیں بھی پہنچی ہیں، ایک ایک کر کے واپس کر دی جائیں، خواہ وہ کوئی ہو اور خود فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے اس کام کو چاہیے کہ میں خود اپنی ذات سے شروع کروں۔

کوڑی کوڑی کا حساب کیا گیا، قانون نے جس کی واپسی کا حکم دیا وہ واپس کر دی گئیں، جن میں بعض غیر معمولی پتھر کے نگینے بھی تھے۔

ہر صوبہ اور ہر صوبہ کے ہر ضلع میں ردمظالم کا نظم کیا گیا، یعنی غیر قانونی ذرائع سے جن کے پاس جو کچھ ہے اس کو حق داروں تک پہنچایا جائے اس کا خاص رشتہ کھولا گیا۔ صوبہ کے مقامی خزانے کی رقم اگر کافی نہیں ہوتی تھی، تو مرکزی خزانہ سے روپیہ بھیجا جاتا تھا اور یوں حق داروں تک ان کے حقوق پہنچا دیئے گئے۔

طے کیا گیا کہ حکومت کی چیزوں کے استعمال کا حق صرف اسی وقت تک

Marfat.com

ہے جب تک کہ حکومت کا کام انجام دیا جائے ، اس قسم کے عملی نمونوں کو پیش کر کر کے حکام اور عہدہ داروں پر اپنا منشا واضح کیا جاتا تھا۔ مثلاً حکومت کا کام رات کو جب کرتے تو حکومت کی شمع استعمال ہوتی ، مگر اسی وقت کسی ذاتی ضرورت کے لیے کچھ لکھتے تو وہ ہٹادی اور ذاتی مملوکہ شمع دان کی روشنی سامنے لا کر رکھ دی جاتی ۔ (۹)

شاہی خزانے سے مشک کا ذخیرہ برآمدہ ہوا ، دیکھا گیا کہ ناک کو انگلیوں سے بند کیے ہوئے ہیں کہنے والے نے کہا اگر خوشبو ناک میں آ گئی ، تو یہ مشک میں تو تصرف نہ ہوا ، فرمایا بجز خوشبو کے مشک میں اور ہوتا ہی کیا ہے ۔ (۱۰)

عوام کے لیے حکومت کی طرف سے سردیوں کے موسم میں گرم پانی کا انتظام غسل اور وضو کے لیے کیا جاتا تھا ، ابتدا میں دو ایک مہینے تک وہی پانی آپ کے لیے استعمال میں بھی آیا ، بعد کو معلوم ہوا کہ حکومت کے خرچ سے پانی گرم کیا جاتا ہے تو حساب کر کے اتنی لکڑیاں حکومت کے ذخیرے میں جمع کر دی گئیں ۔ (۱۱)

معذوروں ، مسکینوں ، مسافروں کے لیے شاہی مہمان خانے سے کھانا کھلانے کا نظم کیا گیا تھا ، اسی باورچی خانہ سے دہی کا پیالہ آپ کی بیوی صاحبہ کے لیے لونڈی مانگ کر لیے جارہی تھی ، پوچھا کیا ہے؟ لونڈی نے عرض کیا آپ جانتے ہیں کہ بیوی صاحبہ حاملہ ہیں ، دہی کی خواہش ان کو ہوئی ، وقت پر کہیں نہیں ملا ، لونڈی نے یہ بھی کہا ، مشہور ہے کہ حاملہ عورت کی خواہش اگر نہ پوری کی جائے تو کہا جاتا ہے کہ بچہ ساقط ہو جاتا ہے ، اسی لیے مہمان خانے سے دہی مانگ کر لے جارہی ہوں ، لونڈی کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا گیا اور گھر پہنچے تو کڑکتے ہوئے کہہ رہے تھے ، ''اگر غرباء اور فقراء ہی کے کھانے سے بچہ پیٹ میں ٹھہر سکتا ہے تو خدا تیرے پیٹ کے بچہ کو گرادے''۔ (۱۲)

اور دہی کا پیالہ واپس کر دیا گیا۔

Marfat.com

اس معاملہ میں حکام کا شعور اس حد تک بیدار ہو چکا تھا کہ ایک بڑے محکمہ کے ذمہ دار افسر کا بیان ہے کہ حسب دستور میں کاغذات پیش کر رہا تھا، اب ایک بالشت تھا، یا چار انگل کے برابر سادہ کاغذ تھا، میں نے دیکھا کہ اس سادہ کاغذ کو اپنی ذاتی ضرورت میں انہوں نے استعمال کیا، چونکہ یہ پہلا واقعہ تھا، جو اس افسر کے سامنے گذرا تھا، دل میں خیال آیا آج غفلت کا شکار یہ شخص بھی ہوا، مگر دوسرے دن وہی کہتے ہیں کہ خلافِ دستور کاغذات جو دیکھے ہوئے تھے ان کے بستے کو واپس منگایا، میں نے بھیج دیا، واپسی کے بعد جب اپنے بستے کو کھولا تو دیکھا کہ سادہ کاغذ کا ایک ٹکڑا جو اسی کاغذ کے برابر تھا، بستے میں دوسرے کاغذوں کے ساتھ لپٹا ہوا رکھا ہے، ''غفلت کا شکار ہوا''، اپنے اس خیال میں ان کو ترمیم بھی کرنی پڑی اور حکمران کی نظر ان معاملات میں کتنی کڑی اور سخت ہے اس کا بھی تجربہ ہوا۔ (۱۳)

خیر یہ تو ان کے ذاتی قصے ہیں، دیکھنے کی بات حکمرانی کے وہ خاص طریقے ہیں جو انہوں نے اختیار کیے تھے، سب سے پہلی چیز تو وہی ہے کہ خود اپنے آپ کو انتخاب کے لیے پیش نہیں کیا، بلکہ آپ سن چکے ہیں کہ اس سلسلہ میں ان کی کوشش کی نوعیت اس طریقہ کار کے بالکل برعکس تھی، جسے آج انتخابی قصوں میں لوگ اختیار کر رہے ہیں، در مدح خود قصیدہ گفتن جس کا دوسرا ترجمہ مینی فسٹو کیا جا سکتا ہے اور لوہے کا وزن نہ سہی لیکن چاندی اور سونے کے دباؤ سے رائے عامہ کو دبانے اور ضمیر و احساس کے خلاف اپنے مطابق بنانے میں کرنے والے جو کچھ کر رہے ہیں، سب کے سامنے ہے۔ آخر کیا فرق ہے، چنگیز و تیمور کی آہنی تلوار اور انتخابی ارکان کے نقرئی و طلائی گرزوں میں یقیناً روح کے لحاظ سے دونوں کے جرم کی نوعیت ایک ہی ہے۔ صرف بیرونی قالب بدلا ہوا ہے۔

دوسری بات اس سلسلہ کی وہ ہے کہ عنانِ حکومت کو ہاتھ میں لینے کے ساتھ

ہی انہوں نے ملک کی چند ایسی ممتاز اور نمایاں ہستیوں کا انتخاب کیا جن کی سیرت و کردار کی استواری، علم وفہم کی گہرائی پر اس عہد کی عام مخلوق کامل اعتماد رکھتی تھی۔ یہ دس آدمیوں کی مجلس شوریٰ تھی۔ ارکینِ شوریٰ کو سامنے بٹھا کر حکمران کی طرف سے یہ عہد نامہ پیش ہوا کہ:

''میں آپ لوگوں میں سے ہر ایک کی یا جو مجلس شوریٰ میں حاضر رہیں گے، ان کی رائے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کروں گا''۔ (۱۴)

اور حکومت کے پورے دور میں اس عہد نامہ کی پابندی کی گئی۔

ملک کافی وسیع تھا، انتظام کے لیے جتنے آدمیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہو گی، اس کا خود اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس مجلس شوریٰ کے ایک رکن نے بڑی بات اس وقت کہی جب بھروسے کے قابل کارآمد آدمیوں کے مہیا کرنے کا سوال انہوں نے پیش کیا، مجلس شوری کے رکن نے کہا:

''آپ اس کی زیادہ پروا نہ کریں، آپ کی حیثیت تو گویا بازار کی ہے، ہر بازار میں جس چیز کی طلب ہوتی ہے، رسد بھی اسی طلب کے مطابق ہوتی ہے، آپ کے بازار میں، جس چیز کی مانگ ہے، قدرۃً وہی آپ کے ہاں آئے گی''۔

مگر اس بازار کے لوگوں کو جب مفصلات میں بھیجتے، تو وہاں کی عام پبلک کے نام حکمران اپنا ایک خریطہ بھی بھیجتا تھا جس میں لکھا ہوتا کہ:

''میں جنہیں بھیج رہا ہوں یہ تو نہیں کہتا کہ وہ تم میں سب سے بہتر ہیں، مگر اتنی بات کہہ سکتا ہوں کہ تم میں جو برے لوگ ہیں ان سے شاید یہ اچھے ہوں''۔ (۱۶)

سب سے زیادہ توجہ اپنے ولاۃ اور حکام کو اس مسئلہ کی طرف دلاتے تھے کہ رعایا پر محصولوں کا جو بار ہے، حتی الوسع اس بار کو ممکنہ حد تک کم کرنے کی کوشش کی

Marfat.com

جائے۔عموماً محصولوں کی وہ قسم جسے اس زمانہ میں مکس اور آج کل ٹیکس کہتے ان کا اوران کی مختلف قسموں کا فرامین میں ذکر کر کے لکھا کرتے:

''یہ مکس نہیں بلکہ بخس ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآن میں

﴿ولا تبخسو النا س اشیاء هم ولا تعثو فی الا رض مفسدین﴾(۱۷)

''اور نہ کم کرو لوگوں کی چیزوں میں،اور بگاڑ پیدا کرنے والے ان مفسدین میں نہ بنو جنہوں نے زمین میں سر اٹھا رکھا ہے''۔(۱۷،الف)

ایک دفعہ شکایت پیش آئی کہ محصولوں کی تخفیف کی وجہ سے آمدنی فلاں علاقہ کی بہت کم ہوگئی ہے،فرمان والی کے نام گیا،''میں نے ان محصولوں کو نہیں ساقط کیا، بلکہ خدا نے ساقط کیا ہے''۔(۱۸) دارالسلطنت میں خبر پہنچی کہ علاقہ میں حکام کا دستور ہے کہ پیداوار کی قیمت بازار کے مطابق نہیں بلکہ من مانے طریقہ سے لگا کر رعایا سے خراج وصول کرتے ہیں،اسی وقت حکومت نے اپنے دو معتبر نمائندے بھیجے،حکم دیا گیا کہ جس کسی سے جتنی مقدار بھی زائد وصول کی گئی ہو،فوراً واپس کردی جائے۔

اور گورنر کے لیے حکم تھا''ان دونوں کے کام میں تمہاری طرف سے کسی قسم کی رکاوٹ اگر ڈالی تو گئی تو یاد رکھو کہ تمہیں جو بات ناگوار ہوگی اسے اپنے سامنے پاؤ گے''۔(۱۹)

گھوڑوں پر ڈاک آتی تھی ، راستہ میں کسی مقام کی ڈاک کے گھوڑے بیکار ہوگئے ،مقامی کسانوں کو بطور بے گار کے حکام نے پکڑا،اوران ہی پر ڈاک لاد کر دارالسلطنت روانہ کر دی گئی ، اطلاع ہوئی ،لکھا ہے کہ بے گار لینے والے پر پہلے تو چالیس کوڑے لگائے گئے اور کہا کہ میری حکومت میں اور بے گار۔(۲۰)

شاہی خزانے کے تین شعبے کر دیئے گئے ، ایک شعبہ میں خراج اور مالگذاری کی عام آمدنی جمع ہوتی تھی ، دوسرے میں فوجی فتوحات کی آمدنی کا

پانچواں حصہ جسے خمس کہتے تھے، جمع ہوتا تھا۔ اور تیسرا مستقل شعبہ ملک کے حاجت مندوں، غریبوں، یتیموں، تاوان زدہ افراد، مسافروں وغیرہ کے لیے مختص تھا، صدقات وزکوٰۃ کی آمدنی اسی شعبہ میں جمع ہوتی تھی، دیکھا گیا تھا، دیکھنے والوں کا چشم دید بیان ہے، ایسا نظم قائم کر دیا گیا کہ گذشتہ سال جو خود خیرات کا مستحق تھا، اس کے پاس اتنا سرمایہ اکٹھا ہو گیا ہے کہ خود صدقہ ادا کر رہا ہے۔

تجارت میں زراعت میں یا کسی اور کاروبار میں جو نقصان اٹھاتے تھے یا مقروض ہو جاتے تھے، بیان کیا گیا ہے کہ ملک کے دور دراز گوشوں سے اس قسم کے تاوان زدہ افراد آتے۔ ان کے واقعہ کی تحقیق کی جاتی جب ثابت ہو جاتا کہ واقعی تاوان کے وہ شکار ہوئے ہیں تو صدقات کے شعبہ سے ان کی تلافی کر دی جاتی تھی۔ لکھا ہے کہ چار چار سو طلائی اشرفیاں بسا اوقات کسی ایک ایک آدمی کو اس سلسلہ میں ملتی تھیں۔ نہ صرف مرکزی خزانہ سے یہ امداد لوگوں کو ملتی تھی، بلکہ ہر ہر علاقہ کے مقامی خزانوں میں یہ سلسلہ جاری رہتا تھا، عام فرمان تمام ملک میں گشت کرا دیا گیا تھا کہ جس شخص پر کوئی ایسا بار ہو جس کے ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تو خزانے سے رقم اس کی طرف سے ادا کر دی جائے۔

یہی نہیں بلکہ اسی فرمان میں یہاں تک لکھا پایا جاتا ہے کہ جو شادی کرے اور مہر ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس کو بھی مہر ادا کرنے کے لیے خزانے سے رقم عطا کی جائے۔

سرکاری خزانے کی ان مدوں سے استفادے کے لیے صرف یہ شرط تھی کہ وہ ملک کا باشندہ اور قانونی رعیت ہے، کسی نسل سے ہو، کسی فرقہ کا ہو، کسی قسم کا مذہب رکھتا ہو، ہر ایک کے لیے دروازہ کھلا ہوا تھا لکھا ہے کہ

"ایک ایک بطریق (عیسائی پادری) کو ہزار ہزار طلائی اشرفیاں دی

Marfat.com

گئیں''۔(۲۱)

کم سے کم رعایا سے لیا جائے اور زیادہ سے زیادہ مقدار میں ان ہی کے لیے ہوئے مال کو انہی تک ایک خاص نظم کے تحت واپس کر دیا جائے ، یہی ایک معاشی اصول جس پر مثالی حکومت کارفرما نظر آتی ہے ،اس سلسلے کے تفصیلات اگر تلاش کی جائیں تو ان سے کافی مجلد ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

مگر امکان اس کا سچ پوچھئے تو اسی ابتدائی قاعدے سے پیدا ہوا تھا جس کا ذکر میں نے شروع ہی میں کیا تھا ،یعنی حکومت کی آمدنی کی یا جن لوگوں کی حکومت تھی ان کی آمدنی سمجھی جاتی تھی ، نہ کہ ان لوگوں کی جن کے سپرد حکومت کی باگ کردی جاتی ہے۔

اسی مثالی حکمران کے متعلق لکھا ہے کہ امیر خاندان میں پیدا ہوئے تھے والد ان کے ملک مصر کے گورنر تھے۔انتخاب سے پہلے ان کی زندگی امیرانہ تھی ،ایک ایک قمیص کا کپڑا چار چار سو درم کا استعمال کرتے تھے ،کھانے پینے ،رہنے سہنے الغرض زندگی کے تمام شعبے میں ان ہی امیرانہ عادتوں کے عادی تھے۔

لیکن حکومت کی ذمہ داری جب سر پر آ گئی ،تو اسی شخص کے اس لباس کا جسے جمعہ کے دن پہن کر منبر پر آئے تھے ، جب حساب کیا گیا تو بارہ درم (ڈھائی روپے) سے زیادہ پورے لباس کی قیمت نہ ٹھہری ،لکھا ہے اس لباس میں عمامہ بھی ، اور قمیص بھی ،قبا بھی اور قرطق (کرتا) بھی ،موزے بھی اور چادر بھی۔(۲۲)

عمدہ کھانے کے عادی تھے ،مگر حکومت کے بعد اس کا میسر ہونا دشوار ہو گیا ، چنے اور مسور کی دال ہی پر کبھی قناعت کرنی پڑتی ، پیٹ پھول جاتا ، نفخ کی شکایت پیدا ہو جاتی ،مگر صرف یہ فرما کر کہ

''اے پیٹ یہ تیرے گناہوں کا جنازہ ہے''(۲۳)

Marfat.com

خاموش ہو جاتے۔

ان کا غلام جنگلوں میں لکڑیاں اور مینگنیاں تلاش کرتا پھرتا، کیونکہ بازار سے ایندھن خریدنے کی قیمت کبھی نہیں ہوتی، ایک دن اسی غلام نے جو اپنے وقت کی سب سے بڑی طاقت کا غلام تھا، اسی نے ایک دن عرض کیا:

''آج ساری دنیا اچھے حال میں ہے، بجز آپ کے اور میرے'' (۲۴)

اور یہی رُوح ہے مثالی حکومت کی، جس میں حکومت کی آخری اقتداری طاقت حکومتی آمدنی سے استفادے میں سب سے آخری ہستی سمجھی جاتی ہے۔

یہ سیدنا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں، جن کی حکمرانی کا زمانہ خواہ جتنا بھی مختصر ہو، لیکن صدیوں قائم رہنے والی حکومت کے لیے ان کی ''مثالی حکومت'' پہلے بھی قابلِ رشک تھی اور جب تک الدین یا انسان کی قانونی زندگی پر پولیس وفوج کی نگرانی کے ساتھ اللہ کی نگرانی کا یقین مسلط نہ ہوگا، ان کی یہ مثالی حکومت آئندہ بھی قابلِ رشک رہے گی۔ کیونکہ جب تک الدین للہ کے اصول کو مان کر خواص وعوام کو اس راہ پر نہیں لائیں گے، فتنہ کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔

گاندھی جی نے بھی حضرت ابوبکر وعمرؓ کی حکومتوں کو مثالی حکومت قرار دے کر مطالبہ کیا تھا کہ اسی کو چاہیے کہ نمونہ بنایا جائے۔ میرے خیال میں اسی کے ساتھ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے نام کا بھی اضافہ ہونا چاہیے۔

حواشی

الف۔ اسلامی تاریخوں میں غرناطہ دمشق ،وادی سمرقند ،نہر آبلہ زیر ،دریائے دجلہ کے متعلق یہی باور کرایا گیا ہے۔

ب۔ (نوٹ از مدیر ''معارف'') حضرت عمر بن عبدالعزیز نے صرف انتخاب سے پہلے اپنی نامزدگی کی مخالفت پر بس نہیں کیا بلکہ چونکہ آپ کا انتخاب شوریٰ سے نہیں ہوا تھا، اس لیے انتخاب و بیعت کے بعد مجمع عام میں دست برداری ظاہر کی اور مسلمانوں کو مخاطب کر کے تقریر فرمائی: لوگو! میری خواہش اور عام مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر مجھ کو خلافت کی ذمہ داری میں مبتلا کیا گیا ہے اس لیے میری بیعت کا جو طوق تمہاری گردن میں ہے، میں خود اسے اتار ہی دیتا ہوں، تم جسے چاہو اپنا خلیفہ منتخب کرلو۔ یہ تقریر سن کر مجمع میں شور بلند کیا کہ ہم سب نے آپ کو خلیفہ بنایا ہے اور آپ کی خلافت سے راضی ہیں۔ جب آپ کو اس کا یقین ہوگیا کہ کسی شخص کو آپ کی خلافت سے اختلاف نہیں ہے اس وقت اس منصب کو قبول فرمایا:

(سیرۃ عمر بن عبد العزیز ،ص ۲۷، ابن جوزی ،ابو الفرج عبدالرحمٰن بن علی ،
Leipzig Drugulin، 1899ء)

حوالہ جات

۱۔ الطبقات الکبریٰ ،۱۶۴/۵،ابن سعد،محمد بن منیع ،بیروت ،داراحیاء التراث العربی ،۱۴۱۷ھ

۲۔ محولہ بالا

۳۔ محولہ بالا

۴۔ الطبقات الکبریٰ ،۱۶۵/۵

۵۔ محولہ بالا

۶۔ محولہ بالا

۷۔ محولہ بالا

۸۔ الطبقات الکبریٰ ،۱۶۶/۵

۹۔ الطبقات الکبریٰ ،۱۷۰/۵

۱۰۔ ایضاً ،۱۸۲/۵

Marfat.com

۱۱۔ ایضاً، ۵/۲۰۰

۱۲۔ ایضاً، ۵/۱۸۹۔۱۸۸

۱۳۔ ایضاً، ۵/۱۸۸

۱۴۔ ایضاً، ۵/۱۶۳

۱۵۔ الطبقات الکبریٰ، ۵/۱۷۳

۱۶۔ ایضاً، ۵/۱۶۸

۱۷۔ ہود ۷/۸۵

۱۷۔الف۔ الطبقات الکبریٰ، ۵/۱۹۲۔۱۹۱

۱۸۔ ایضاً، ۵/۱۸۷

۱۹۔ ایضاً، ۵/۱۹۲

۲۰۔ ایضاً، ۵/۱۸۶

۲۱۔ ایضاً، ۵/۱۷۲

۲۲۔ ایضاً، ۵/۲۰۲

۲۳۔ ایضاً، ۵/۱۸۲

۲۴۔ ایضاً، ۵/۱۷۹

Marfat.com

اسلامی حکمرانوں سے مسلمانوں کی

ایک بے جا شکایت

انسان کو سوچنے سے نہ کبھی منع کیا گیا، اور نہ منع کیا جا سکتا ہے، سوچنا اگر چھوڑ دے تو انسان، انسان ہی کب باقی رہتا ہے، اس کے بعد تو وہ زندہ جانوروں کی بھیڑ میں شریک ہو جاتا ہے۔

لیکن صحیح سوچ بچار یا فکر ونظر کو چاہیے کہ ہمیشہ واقعات کے تابع ہو، جان بوجھ کر دلائل کو ایسے مقدمات سے مرتب کرنا جن میں قصداً بعض حقائق و واقعات سے چشم پوشی اختیار کی گئی ہو، دنیا کی ہر منطق اس قسم کے دلائل کو مسترد کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی۔

یورپ والے بیچارے تو ایک حد تک معذور بھی ہیں۔ کیونکہ حقائق و واقعات کی صف میں صرف مخلوقات کو مان کر خالق کے وجود سے اپنے دل و دماغ کو انہوں نے خالی کرلیا ہے۔ بقول اقبال مرحوم

پا بزندانِ مظاہر بستہ — از حدودِ حس بروں ناجستہ

یہی ان کی فکری تعمیر کی بنیادی اینٹ ہے ...... یاظاھرا من الحیوۃ الدنیا ہی میں الجھ کر جن کی دانائیاں پھڑ پھڑا رہی ہوں، ان سے اس کی توقع ہی کیوں کی جائے کہ اس ''الاولی'' کے لیے ''الآخرۃ'' کا خیال بھی ان کے سامنے آئے گا۔

خدا اور خدا کی کارفرمائیوں سے قطع نظر کر کے اگر وہ سوچتے ہیں، تو جن

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں اگست تا دسمبر ۱۹۴۸ء کو پانچ اقساط میں شائع ہوا۔

Marfat.com

کے قلوب حق کی روشنی سے محروم ہیں، آپ ہی بتائیے کہ آخر وہ اس کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔

لیکن مجھے تعجب تو مسلمانوں پر ہے ان لوگوں پر ہے جنہوں نے اب تک اس بیعت کو نہیں توڑا ہے جو انہوں نے اور ان کے باپ دادوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کے دست حق پرست پر کی تھی۔ وہ اپنے فکری و عملی نظام میں بھی اور عملی زندگی میں بھی اسی عہد و پیمان کے ساتھ جی رہے ہیں کہ اسی کو واقعہ یقین کریں گے جسے محمد رسول اللہ ﷺ نے واقعہ قرار دیا ہے۔ اسی کو حقیقت تسلیم کریں گے جسے حضور ﷺ نے باور کرایا ہے کہ وہی حقیقت ہے۔ مگر جب تک سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی وہ بھی مانتے اور یہی جانتے ہیں۔ لیکن حافظہ کی اس کمزوری کا کوئی علاج ہے کہ جوں ہی سوچنے اور سمجھنے کی کوئی مہم پیش آتی ہے، ضرورت ہوتی ہے کہ فکر و تامل سے کام لیا جائے، تو اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والوں میں اکثروں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ بھی اسی طرح سوچنے لگے، جیسے حقائق و واقعات کے سلسلہ میں خدا کا انکار کرنے والا، یا نہ ماننے والا سوچتا ہو۔ اسباب وعلل کے طویل وعریض زنجیرے کی ایک ایک کڑی پر ان کی نظر پڑتی ہے۔ آگے پیچھے جو کچھ دیکھا جا سکتا ہے، دائیں بائیں جو کچھ سوچا جا سکتا ہے، سمجھا جا سکتا ہے، سب کو ٹٹولتے ہیں اور سب کو پرکھتے ہیں، لیکن فکر ونظر کے اس عمل میں ان کے حافظہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہی نکلا ہوا ہے جس پر چاہیے تھا کہ سب سے پہلے نظر ان کی پڑتی۔

﴿ما قدروا اللہ حق قدرہ﴾ (۱)

''خدا کی قدر جیسی چاہیے ہے انہوں نے نہ کی''

﴿ما لکم لا ترجون للہ وقارا﴾ (۲)

''تم کو کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کے وقار اور وزن سے لو نہیں لگاتے''۔

Marfat.com

اس لحاظ سے میں مسلمانوں کے افکار وتغیرات اور ان سے نکالے ہوئے نتائج کا موازنہ حیران دماغوں اور دلوں کے افکار ونظریات کے نتائج سے کرتا ہوں جن میں خدا اور خدائی کارفرمائیوں کا کوئی وزن باقی نہیں رہا ہے، تو دونوں میں مجھے کسی قسم کا کوئی فرق اور امتیاز نظر نہیں آتا۔

اسی مسئلے کو دیکھیے جس کا اجمالی تذکرہ اس وقت کرنا چاہتا ہوں۔ بعض عصری مصائب میں مبتلا ہو کر مسلمانوں کی عمومیت میں ایک عام چرچا کچھ دنوں سے جس کا پھیلا ہوا ہے۔ یعنی گذشتہ اسلامی حکمرانوں اور فرمانرواؤں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ باوجود اقتدار واختیار کے انہوں نے اپنے مقبوضہ ومفتوحہ ممالک میں غیر مسلم عناصر اور طبقات کو باقی رہنے کا موقع کیوں عطا کیا۔ تعبیری ردو بدل کے ساتھ اسی مقصد کو کبھی ان الفاظ میں بھی ادا کیا جاتا ہے کہ اسلام کی اشاعت وتبلیغ میں اسلامی سلاطین اور بادشاہوں نے جتنی توجہ کرنی چاہیے تھی، نہ کی۔ مطلب کہنے والوں کا یہ ہوتا ہے کہ غیر اسلامی قوتوں کے ساتھ جس قسم کی مہیب کش مکش میں آج مسلمان الجھ گئے ہیں، یہ صورت ہرگز نہ پیش آتی، اگر اپنے مطلق العنانہ اختیار واقتدار سے ہمارے گذشتہ سلاطین وملوک کام لیتے۔

میں اسی عام چرچے کے متعلق اس وقت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ یہ مسئلہ کہ غیر اسلامی عناصر سے پاک ہو جانے کے بعد جس بہشتی زندگی کا تصور موجودہ زمینی زندگی میں لوگ کر رہے ہیں، اگر چہ بجائے خود غور طلب ہے اور غور طلب کیا، حجاج بن یوسف اور ابو مسلم خراسانی، تیمور لنگ اور ان جیسے ظلمہ کے عہد میں جن تجربات سے مسلمانوں کو گذرنا پڑا ہے، ان کو جانتے ہوئے یہ توقع خود ہی سوچنا چاہیے کہاں تک صحیح ہو سکتی ہے کہ مصائب کے جن ہولناک طوفان میں اس وقت وہ گھر گئے ہیں ان میں وہ نہ گھرتے، اگر ہمارے گذشتہ سلاطین وملوک اپنے

Marfat.com

غیر مسئول اقتدار سے کام لے کر صرف مسلمانوں کے لیے زمین کے ان خطوں کو مختص کر دیتے جن میں وہ آج آباد اور پھیلے ہوئے ہیں۔ اس بحث کو خیر جانے دیجیے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ سلاطین اسلام کے متعلق یہ عام شکایت جو مجلسوں میں کی جاتی ہے، شکایت کرنے والوں کی اس سے آخر مراد کیا ہے؟

کیا جبر اور زور سے اسلام کے قبول کرنے پر چاہتے ہیں کہ ہمارے سلاطین لوگوں کو مجبور کرتے اور اس جبر و اکراہ کے بعد بھی جو انکار پر اصرار کرتا محض اس لیے کہ ان سے زمین پر کوئی پوچھنے والی بالاتر قوت انسانی گروہوں میں باقی نہیں رہی تھی، اس لیے ان انکار کرنے والوں کا صفایا کر دیا جاتا۔

اسلام کو خدائی دین ماننے والوں کو سوچنا چاہیے کہ کیا اس خیال کی گنجائش کسی حیثیت سے بھی ان کے قلب میں پیدا ہو سکتی ہے؟ اسلامی سلاطین تو بیچارے جا چکے، آج بھی میں مسلمانوں سے پوچھتا ہوں کہ خود اسلام نے ان کے اندر اس خیال کے لیے کوئی جگہ کیا باقی رکھی ہے، پھر وہ ایسی باتیں کیوں بولتے ہیں جنہیں وہ خود سوچ بھی نہیں سکتے۔

خود ہی بتایئے کہ جبراً کسی کو اسلام کے قبول کرنے پر آمادہ کرنا کیا یہ اسلام کے قبول کرنے کا مطالبہ ہوگا۔ یہ کفر کی بدترین قسم نفاق پر مجبور کرنے کی عملی تدبیر ہوگی۔ میں نہیں جانتا کہ کافر ہی نہیں بلکہ منافق بنانے کی اس مہم کی سرانجامی کی صلاحیت باوجود مسلمان ہونے کے کوئی اپنے اندر کیسے رکھ سکتا ہے، ما ہم میں ایسا کون ہے جو کسی کو کافر بننے پر مجبور کرنے کی ہمت کر سکتا ہو۔ پھر منافق کا مقام تو کافر سے بھی فروتر ہے۔ ہم جب کسی کو کافر بننے پر مجبور نہیں کر سکتے ہیں تو منافق بننے پر بتایا جائے کہ کیسے جبر کر سکتے تھے، یا آج کر سکتے ہیں؟

رہ گیا نہ ماننے والوں کا صفایا یہ سچ ہے کہ جن کی فکری تجویزوں میں

Marfat.com

خدا اور خدائی تعلیمات شریک نہیں ہیں جب ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اس قسم کے اعمال کے ارتکاب کی جسارت کر گزرتے ہیں، ان کے اگلوں نے بھی اس پر عمل کیا ہے اور ان کے جو پچھلے ہیں، اپنے اگلوں کے ان سیاہ اعمال کو سلف کے کارناموں میں شریک کر کے ایسی حرکتیں اب بھی کر رہے ہیں۔ ان کے بڑے چھوٹوں کو اس قسم کے قصے مزے لے لے کر سناتے ہیں، کہ جڑ پیڑ سے اکھاڑ کر فلاں مذہب والوں کو فلاں ملک سے ہم نے ختم کر دیا۔ لیکن محمد ﷺ کو اللہ کا رسول جن بادشاہوں نے مانا تھا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان بادشاہوں سے توقع کرنے والے صفایا کے اس عمل کی توقع آخر کس بنیاد پر کر رہے ہیں یا کر رہے تھے؟ رسول اللہ ﷺ عبداللہ بن ارقم صحابی کو پکار پکار کر فرما رہے تھے جب وہ دور جا چکے تھے، کہ دیکھنا خبردار! خبردار! جن لوگوں سے امن کا عہد کر لیا گیا ہے ان پر ہرگز ہرگز ظلم نہ ہونے پائے۔ دیکھو ان کی برداشت اور تحمل سے زیادہ ان پر بار نہ ڈالا جائے اور ان کی رضامندی کے بغیر ان کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ خبردار! جو ایسا کرے گا:

''فانا حجیجه یوم القیامة (الف)''(۳)

''میں اس پر قیامت کے دن دعوی کروں گا اور اس سے لڑوں گا''

یہی میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ حق تعالیٰ کی آخری عدالت میں محمد ﷺ کا مدعی بن کر پیش ہونے کی طاقت کیا مسلمانوں کے بادشاہوں میں تھی۔ میں مانتا ہوں کہ وہ معصوم نہ تھے۔ ان میں ایسے بھی گذرے جن پر اسلام کی طرف سے بہت الزامات عائد ہو سکتے ہیں، اور بہتوں کے فرار اور جرم کی فہرست بہت طویل ہے۔ لیکن یہ سب کچھ سہی، پر جو جرم ایسا ہو کہ خود پیغمبر نے مدعی بن کر اس کے مقابلہ کے لیے کھڑے ہو جانے کی دھمکی دی ہو، سوچنے کی بات ہے کہ اس نظارے کے برداشت کی تاب بتایا جائے آخر ان بیچاروں میں کیسے پیدا ہوتی؟

Marfat.com

اسلامی حکومت کے نظام کو عملی قالب میں ڈھال کر پیش کرنے والے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سانس اکھڑ رہی ہے اور اکھڑی ہوئی سانسوں ہچکیوں میں ان کی یہ آواز کانوں میں گونج رہی ہے:

''جن غیر مسلموں کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے لی ہے، ان کے ساتھ بھلائی کی وصیت کرتا ہوں، ان سے جو عہد کیا گیا ہے، اس کو پورا کیا جائے، ان کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان پر حملہ کرنے والوں سے جنگ کریں اور جس بار کو وہ برداشت نہ کر سکتے ہوں ہرگز ایسا بوجھ ان پر نہ ڈالا جائے''۔(۴)

آپ کو اس کا افسوس ہے کہ ان کا صفایا کیوں نہ کر دیا گیا اور یہاں حکم یہ دیا گیا ہے کہ:

''جب تک اسلامی قلم رو میں وہ مقیم ہوں اس وقت تک اسلامی بیت المال سے ان کے معذوروں اور مجبوروں اور ان کے بال بچوں کی پرورش کی جائے''۔(۵)

قاضی ابو یوسف کے الفاظ یہ ہیں کہ:

"عیل من بیت مال المسلمین عیاله ما اقام بدار الھجرة و دار الاسلام "(۶)

''اسلامی قلم رو کے غیر مسلم لوگوں میں جو معذور ہوں ان کے مصارف کا بار اسلامی بیت المال برداشت کرے ان کا بھی اور ان کے اہل و عیال کا بھی جب تک دار الھجرۃ اور اسلامی قلم رو میں وہ مقیم رہیں گے''

قرآنی آیت جس میں ''الصدقات'' کے مصارف بتائے گئے ہیں اسی کی تفسیر کرتے ہوئے فاروقِ اعظمؓ نے فرمایا تھا کہ:

''الفقراء ھم المسلمون و ھذا من المساکین''(۷)

Marfat.com

''فقراء سے مراد تو مسلمانوں کے محتاج لوگ ہیں، مساکین سے مراد غیر مسلموں کا وہ طبقہ ہے اسلامی حکومت نے جس کی ذمہ داری لی ہو اور کمانے کے قابل نہ رہا''۔

اور جان و مال تو خیر بڑی چیزیں ہیں۔ آپ کو اسلامی قانون کی دفعات کا علم ہوتا تو یہ بات بھی آپ کے علم میں آتی کہ اسلامی قلم رو میں رہنے والے غیر مسلم باشندوں کی عزت و آبرو تک کے متعلق یہ حکم ہے کہ جیسے کسی مسلمان کی ہجو حرام اور ناجائز ہے۔ اسی طرح حرام ہے کہ کسی غیر مسلم باشندے کی ہجو میں کوئی لفظ منہ سے نکالا جائے، فقہاء نے لکھا ہے کہ ''والهجاء لمسلم او ذمی حرام''۔(۸)

''مسلمان یا غیر مسلم باشندے کی ہجو گوئی بھی حرام ہے''

اور صرف زندگی ہی کی حد تک احترام کا یہ قانون محدود نہیں ہے بلکہ:

''عظامهم لها حرمة اذا وجدت فی قبورهم كحرمة عظام المسلمين حتى لا تكسر لان الذمی لما حرم ايذاوه فی حياته لذمته فتجب صيانة عظمه عن الكسر بعد موته''. (۹)

''اسلامی قلم رو کے غیر مسلم باشندوں کی ہڈیوں کا بھی احترام کرنا چاہیے اگر ان کی قبر میں وہ پائی جائیں، اسی طرح احترام کرنا چاہیے جیسے مسلمانوں کے مردوں کی ہڈیوں کا احترام کیا جاتا ہے، چاہیے کہ غیر مسلم مردوں کی ہڈیوں کو توڑا نہ جائے۔ کیونکہ اسلامی حکومت نے جس غیر مسلم کی ذمہ داری لی ہے جیسے زندگی میں اس کو دکھ دینا حرام ہے، اسی طرح واجب ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس کی ہڈی کو توڑنے کی اہانت سے بچایا جائے''۔

پس واقعہ وہی ہے کہ خدا کو درمیان سے نکال کر سوچنے والے جب سوچیں گے تو اسی قسم کے ناقص ادھورے افکار ان کے دماغ میں آئیں گے، لیکن جو خدا کو

مانتا ہے، خدا کی نگرانیوں پر یقین رکھتا ہے وہ بہر حال قوموں کے ساتھ انصاف کرے گا، خواہ وہ ظلم کے کسی نقطہ تک چڑھ کر نہ پہنچ جائیں۔ ظالم خود تباہ نہیں ہوتا، خدا اسے تباہ کرتا ہے۔ اور انصاف و عدالت خود کامیاب نہیں ہوتی، خدا اس کی پشت پناہی کرتا ہے۔

جن دماغوں اور دلوں کی تربیت قرآنی منطق کے زیر اثر ہوئی ہے، وہ یہی سمجھتے ہیں۔ حق و انصاف صداقت و عدالت خواہ بجائے خود جیسے قیمتی صفات بھی ہوں، لیکن ان بے جان اور بے روح اضافی صفات کو اعتماد اور بھروسہ کی آخری چٹان وہ کسی طرح نہیں بنا سکتے، بلکہ ان کی نظر ہمیشہ اس ہمہ شنوائی ہمہ بینائی جیتی، جاگتی، حی و قیوم ذات پر جمی رہتی ہے، جس کی حمایت اور نصرت کی دستگیریوں کو مظلوموں اور ستم دیدوں نے ہمیشہ اپنے سامنے بے حجاب پایا ہے۔ ایمانی بصیرت کی اسی روشنی کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ عہد و پیمان کے قصوں میں ذہنی محفوظات کی مصری آلودگیوں کو ان کی فطرت قطعاً برداشت نہیں کرسکتی، نہ خود اس قسم کی گندگیوں کو اپنے دماغ کے کسی گوشہ میں چھپا رکھنے کو وہ جائز سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ معاہدہ کے دوسرے فریق کا دامن بھی ذہنی محفوظات کی ناپاکیوں سے پاک ہو۔ زبان سے جو کچھ کہا گیا، یا قلم سے جو کچھ لکھا گیا، ہم اسی کی پابندی کریں گے (ب)، اس پر اتنا اصرار کیا گیا ہے کہ زبان یا اصطلاح و محاورہ یا کسی دوسری وجہ سے مطلب سمجھے بغیر اگر معاہدے کو فریق نے تسلیم کرلیا ہو تو اس صورت میں بھی مسلمانوں سے ان کے دین کا مطالبہ ہے، کہ بہر حال ان کو چاہیے کہ الفاظ کا جو اقتضاء ہو اسی کو پورا کریں۔ غیر مسلم اقوام سے ''قانون معاہدہ'' کے دفعات کی تفصیل کرتے ہوئے شمس الائمہ سرخسی نے سیر کبیر میں ایک دفعہ یہ بھی درج کی ہے:

''انهم اذا لم یفهموا فانما ذلک لمعنی من المسلمین حیث

Marfat.com

نا دو هم بلغة لا یعرفونها فلا یبطل حکم الآمان فی حقهم"۔(۱۰)

''معاہدے کے غیر مسلم فریق کی سمجھ میں بات اگر نہ آئی تو یہ کوتاہی مسلمانوں کی طرف سے ہوئی کہ انہوں نے ایسی زبان میں ان کو خطاب کیا جسے وہ نہیں جانتے تھے۔ پس معاہدے کے الفاظ کی رو سے جس امن کے وہ مستحق ہو چکے ہیں، یہ حق ان کا باطل نہیں ہو سکتا''۔

اسی موقع پر انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ غدر یعنی عہد شکنی ہی نہیں بلکہ:

''التحرز عن صورۃ الغدر واجب''(۱۱)

''عہد شکنی کی ظاہری شکل وصورت سے بھی پرہیز مسلمانوں کے لیے واجب ہے''

فراخ قلبی، بلند نظری، علو حوصلہ کے یہ جذبات کیا ان لوگوں میں پیدا ہو سکتے ہیں جو حق وصداقت، عدالت وانصاف کا رشتہ خدائے قادر وتوانا سے توڑ کر یہ باور کراتے پھرتے ہیں، کہ ان کی کامیابیوں کی ضمانت حق وصداقت، عدالت وانصاف کے ان ہی الفاظ اور صرف الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ ایسے الفاظ جن کے معانی کا صحیح تصور خود ان باور کرانے والوں کے دماغوں میں بھی پوچھنے کے بعد بسا اوقات پتہ چلتا ہے کہ نہیں پایا جاتا۔ کیا الفاظ نرے ان الفاظ سے آدمی کی عقلی فطرت میں زور بھرا جا سکتا ہے؟

کہنے والے جب کہتے ہیں کہ سچائی ہمارے ساتھ ہے۔ اس لیے ہماری کامیابی یقینی ہے تو اسی وقت کیا وہ یہ نہیں سوچتے کہ سچائی کوئی مست ہاتھی نہیں ہے، جو دشمن کی صفوں میں گھس کر اس کی فوج اور فوج کے سپاہیوں کو اپنے پاؤں کے نیچے مسل ڈالے گا، یقیناً وہ جانتے ہیں کہ حق وصداقت کے الفاظ جوہری بم نہیں ہیں جسے اٹھا کر وہ باطل پرستوں اور جھوٹ کے حامیوں پر دے ماریں گے، اور یوں

Marfat.com

فتح مند و بامراد ہو کر میدان جنگ سے واپس لوٹیں گے۔

مگر کیا کیجیے کہ حق و صداقت کا جو واقعی پشت پناہ اور عدالت و انصاف کا آخری سرپرست ماویٰ و ملجا ہے، اسی زندہ و خبیر و بصیر خدا بلکہ اس کے خیال تک سے یہ خود بھڑکتے ہیں اور دوسروں کو بھڑکاتے ہیں، احتیاط کرتے ہیں کہ بات چیت یہ عام تقریر و گفتگو میں بھی قرون وسطیٰ کی اس فرسودہ یادگار کا ذکر بیسویں صدی کی ترقی یافتہ شائستہ مجلسوں میں نہ آنے پائے۔ وہ اپنے اسی ارحم الراحمین مالک و خالق سے روٹھے ہوئے ہیں۔ پھر یہ کیا عجیب تماشا ہے کہ جہاں قوت تھی بلکہ اس کے سوا جہاں کہیں بھی قوت و طاقت کی نمائش کسی حیثیت سے بھی ہو رہی ہے، سب کا آخری سرچشمہ طاقت کا وہی آخری خزانہ ہے۔ اس سے بھاگ کر بے جان صفات بلکہ ان بے جان صفات پر دلالت کرنے والے حق و صداقت کے الفاظ کی پناہ ڈھونڈھنے پر آج یہ مجبور نظر آتے ہیں۔ صفاتی تماثیل کی پوجنے والی قدیم قوموں اور ان ہی صفات پر دلالت کرنے والے لفظی پیکروں کے ان نئے پجاریوں میں بتایا جائے کہ آخر کیا فرق ہے لم تعبد ما لا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنک شیئا (۱۲)

دوسروں کے متعلق تو میں نہیں کہتا، لیکن میرا ذاتی حال تو یہ ہے کہ ان خدا بے زاروں سے جب کبھی ایسی باتیں سنتا ہوں مثلاً ان ہی میں بعض کہنے والے بے دھڑک کہہ اٹھتے ہیں کہ میں فطرۃً رجائی پیدا ہوا ہوں۔ رجائیت کے سوا میرے دل پر کبھی کسی دوسرے پہلو کا خطرہ بھی نہیں گذرا، قنوطیت (ناامیدی اور یاسیت) کے تصور کی بھی اپنے اندر گنجائش نہیں پاتا۔ امید پروروں کی ان باتوں یا اس قسم کی دوسری ادعائی لن ترانیوں کو جب کبھی میں نے سنا تو بے ساختہ میرا ذہن ان لڑ پڑنے والی عورتوں کی طرف عموماً منتقل ہو جاتا ہے جو غضب ناک ہو کر اپنی پڑوسنوں کے متعلق کن فیکونی فرامین جاری کرنے میں کبھی مشغول ہو جاتی ہیں۔ کسی کو پاؤں

Marfat.com

(گوز) سے محروم کردینے کا فیصلہ صرف ایک لفظ ''نگوڑے'' سے اور کسی دھڑ سے سر یا (منڈی) کے اتر جانے کا حکم فقط ''منڈی کاٹے'' کے تلفظ سے کر کے شاید یہ باور کر لیتی ہیں کہ واقعی قدرت کا قانون بجائے قدرت والے کے ان عورتوں ہی کے ہاتھوں میں دے دیا گیا ہے اسی لیے وہی ہو بھی جاتا ہے جو کچھ یہ کہتی ہیں یا کہہ بیٹھتی ہیں (ج)۔

میں پوچھتا ہوں کہ رجائیت اور امید پروری کے جذبات کے تسلط کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اس کے سوا اور کیا باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہی ہو کر رہے گا اور ہمیشہ وہی ہوتا رہا، یا ہو کر رہا ہے جو ہم سوچتے رہے، یا جس کی آرزو ہم پکاتے رہے، دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہوا کہ قدرت کے قوانین قدرت کے قبضہ اقتدار میں نہیں بلکہ ہر اس شخص کے ہاتھ میں ہیں جس نے اعلان کر دیا ہو کہ میں رجائی یا رجائیت پرست واقع ہوا ہوں۔

عہد حاضر کے درحقیقت یہی عقلی مغالطے اور ذہنی ژولیدگیاں ہیں جن میں الجھ کر اس زمانہ کا انسان ان بلند حوصلوں سے محروم ہو گیا ہے، جن کے بل بوتے پر وہی کیا جاتا تھا جو کہا جاتا تھا۔ بات کے دھنی اب جو پیدا نہیں ہوتے، چھوٹے ہی نہیں، بڑائی کے بلند سے بلند میناروں پر آج جو چڑھے نظر آرہے ہیں، ان تک کا یہی حال ہے کہ فریق مخالف زبان یا محاورے اصطلاحات وغیرہ کی ناواقفیت کی وجہ سے الفاظ کے جس مطلب کو نہیں سمجھ سکا ہے، ان کے اقتضاء کو تو یہ کیا پورا کریں گے۔ آئے دن یہ دیکھا جا رہا ہے کہ طے کرنے کے بعد جن فقروں کے مقاصد و اغراض و معانی کے متعلق دورایوں کی بھی گنجائش کسی حیثیت سے نہیں نکل سکتی ان پر بھی ان کی قلبی کمزوریاں ان کو جمنے نہیں دیتیں۔ وہیں مستقبل کا ابہام ہمیشہ ان کو ہول دل میں مبتلا رکھتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ معاہدہ کی مجلسوں سے نکلنے بھی نہیں پاتے کہ الفاظ

Marfat.com

کے الٹ پھیر سے نفع اٹھانے کی تدبیروں کو سوچنے لگتے ہیں۔ پھر ذہنی کرتبوں سے کام لے لے کر الفاظ کو معانی سے معانی کو الفاظ سے بے گانہ بنانے کی ممکنہ کوششوں میں دیکھا جاتا ہے کہ یہ منہمک و مشغول ہیں۔ وہ باتیں بناتے ہیں، منہ زوریوں سے کام لیتے ہیں۔ چیختے چلاتے ہیں۔ بظاہر شاید یہ خیال کرتے ہیں کہ حقائق و واقعات کے ساتھ وہ تمسخر کر رہے ہیں مگر شاید ان کو یہ محسوس نہیں ہو رہا ہے کہ حقائق و واقعات ہی نے ان کو اپنا مسخرہ بنا رکھا ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ انسانیت کی ذہنی تنظیم میں آج جس بودی اور پھسپھسی قوتوں سے کام لینے والے کام لے رہے ہیں اس کا آخری انجام اور لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا، وہی ہو کر رہا۔

خیال تو کیجیے کہ خدا سے ڈرنے کے لیے انسانی فطرت میں ضمیر یا کانشنس (Conscious) کے احساس کا جو کانٹا چبھا دیا گیا ہے، بجائے خدا کے اس غریب ضمیر اور ضمیر کی بیکس آواز کے ڈر ہی کو اگر کافی قرار دیا جائے یا پیدا کرنیوالے خالق کے آگے اس کی بخشی ہوئی قوتوں اور قوتوں کے اعمال و نتائج کی جواب دہی کی ذمہ داری کی جو کھٹک آدمی اپنے اندر پاتا ہے، بجائے خالق کے اگر یہ سمجھایا جائے، جیسا کہ اس زمانے میں عموماً سمجھانے والے یہی سمجھا بھی رہے ہیں کہ جس سے ہم پیدا ہوئے ہیں یا جس نے ہمیں پیدا کیا ہے اس کے آگے نہیں بلکہ آئندہ نسلیں خود ہم سے جو پیدا ہونیوالی ہیں ان کے آگے چاہیے کہ جواب دہی کی ذمہ داری کو ہم اپنے اندر پیدا کریں تو خدا جس کے ہاتھ میں ہماری زندگی بھی ہے اور موت بھی اس سے نڈر بن جانے اور بنا دیئے جانے کے بعد کیا واقعی اس مسکین ضمیر کی ٹوک سے یہ آدم زاد ڈر جائیگا؟ وہی مسکین لاوارث ضمیروں کا گلا جب اور جس وقت ہمارا جی چاہے، خود گھونٹ کر رکھ سکتے ہیں، بلکہ بسا اوقات گھونٹ کر رکھ

Marfat.com

دیتے ہیں۔

یا جس کا دیا ہوا سب کچھ ہے، اس کی بخشی ہوئی نعمتوں اور عطا فرمودہ توتوں کے استعمال میں بخشنے والے اور دینے والے کے سامنے تو جواب دہی کا خیال صرف خیال ہے، یہ باور کراتے ہوئے کہ باز پرس اور جوابدہی کی یہ دھمکی کیا نتیجہ خیز دھمکی ہوسکتی ہے کہ اگلی نسلوں کو ان ہی سے پیدا ہونے والی پچھلی نسلوں کے ان افراد کے سامنے جواب دینا پڑے گا، جو اپنی عدالت کی کرسی جس وقت بچھائیں گے، اس وقت جواب دینے والی اگلی نسلوں کی ہڈیاں چونا بن کر خاک میں مل چکی ہوں گی۔ بہر حال آئندہ نسلوں کے سامنے باز پرس اور جواب دہی کا قصہ ہو یا تاریخ کی عدالت کے آگے اعمال و افعال کی جائزہ آرائیوں کے افسانے ہوں، ان نفسیاتی حملوں کی انسان کی خود غرض اور چالاک فطرت کام نکالتے وقت کیا واقعی کچھ پرواہ کرسکتی ہے؟

کچھ بھی ہو میں تو اس کو بھی قدرت ہی کے انتقام کی ایک مخفی شکل سمجھتا ہوں کہ جنہوں نے مالک یوم الدین کے ڈر کو انسانی قلوب سے نکالنے کی کوشش کی تھی، خود بھی نڈر بننا چاہتے تھے اور دوسروں کو بھی نڈر بنانا چاہتے تھے، خدا کے خوف کا جنہوں نے مضحکہ اڑایا تھا، آج وہی ضمیر اور کانشنس سے ڈرنے اور ڈرانے کا وعظ کہتے پھرتے ہیں۔ پیدا کرنے والے سب کچھ دینے والے خالق کارگر کے آگے اعمال کی جواب دہی کا اعتقاد، صرف اعتقاد، بلکہ خوش اعتقادی کی پیداوار ہے۔ پرانے عہد کے منبر ومحراب کی پرانی یادگار ہے جو اس کا چرچا کرتے پھرتے تھے، وہی پکار رہے ہیں کہ پچھلی نسلوں کے سامنے اگلی نسلوں کو اپنے کرتوتوں کا جواب دینا پڑے گا۔

پھر ہوا کیا؟ جو ڈرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، ڈر تو اس کے دل سے اب

Marfat.com

بھی نہ نکلا، ذمہ داریوں کے بوجھ سے جس کے سر کو چاہا گیا تھا کہ ہلکا کر دیا جائے اس کے کندھے پر جواب دہی کی گٹھری تو اب بھی لدی ہوئی ہے۔ بندگی کے لیے جو بنایا گیا ہے، بندہ بننے پر تو وہ اب بھی مجبور ہے۔ بقول اکبر مرحوم

بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو

فرق خدا والی بندگی اور بے خدا والی بندگی میں اگر کچھ پیدا ہوا ہے تو اسی قدر ہوا ہے کہ خدا کا ڈر، اور خدا کے سامنے جواب دہی کی ذمہ داریاں جن نتائج کو پیدا کر رہی تھیں، ان نتائج وثمرات کے پیدا کرنے سے ضمیر (د) کا غیر منطقی خوف بھی قاصر نظر آ رہا ہے، تجربہ سے اسی کی تصدیق ہو رہی ہے اسی طرح مشاہدہ بتا رہا ہے کہ آئندہ نسلوں یا تاریخ کے سامنے جواب دہی کی سوفسطائی دھمکیاں بھی وقت پر بے نتیجہ دھمکیوں سے زیادہ کبھی کارآمد ثابت نہ ہو سکیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ ہم ڈرتے بھی رہے، جواب دہی کی ذمہ داری کا کانٹا دل میں کھٹکتا بھی رہا، لیکن ان برکتوں اور بلند نظریوں سے نسل انسانی محروم ہوگئی، جو صرف خالق اور پیدا کرنے والے ہی کے ڈر اور اسی کے آگے باز پرس کے خوف سے پیدا ہو سکتی ہیں، پیدا ہو رہی تھیں اور چاہا جائے تو تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے، کہ اب بھی ان کے پیدا کرنے میں اسی راہ سے نسل انسانی کامیاب ہو سکتی ہے۔

بہر حال سلاطین سلف یا گذشتہ اسلامی حکمرانوں کے متعلق اس قسم کے وسوسوں کے بھپھارے قلوب میں آج کل جو اٹھ رہے ہیں، کہ قابو پانے کے بعد جبراً لوگوں کا دین کیوں نہ بدلوا دیا گیا، اور جبر کے بعد بھی آبائی دین پر اصرار کرنے والوں کا ہمارے ان بادشاہوں نے صفایا کیوں نہ کر دیا، جن سے پوچھنے والا ان کے زمانہ میں روئے زمین پر کوئی باقی نہ رہا تھا۔

یقین مانیے کہ ان رذیل اور کمینے وسوسوں کی تہ میں درحقیقت

Marfat.com

بے اعتقادیوں اور قلبی کمزوریوں کے وہی جراثیم چھپے ہوئے ہیں جو ہراس دماغ اور ہر اس دل میں قدرتاً اس وقت پیدا ہو جاتے ہیں جب خدائے قادر ذوالجلال فعال لما یرید کے وزن سے وہ خالی ہو جاتا ہے۔ ہر ایمانی پژمردگی، اور دینی افسردگی کے یہ ناگزیر لازمی نتائج ہیں۔

سچے مسلمانوں کی پشت سے جھوٹے مسلمانوں کی جو نسلیں آج دنیا میں نکل آئی ہیں، نکل نکل کر پھیل رہی ہیں، ان پر یہ بات گراں گذر رہی ہے کہ لذیذ تر لقموں، فاخرہ طاؤسی لباسوں، حسین و پرشوکت سواریوں اونچے اور بلند ایوانوں کے استعمال میں دوسرے ادیان و مذاہب کے ماننے والی قومیں آج ان سے کیوں مزاحمت کر رہی ہیں، وہ سوچتے ہیں کہ موقع کی پیشانیاں ہمارے آبا و اجداد کے ہاتھوں میں جب بار بار آتی رہیں تو بجائے گھسیٹنے کے ان پیشانیوں کو اپنے ہاتھوں سے انہوں نے کیوں نکل جانے دیا۔

یہ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کا سا نام رکھ کر اسلامی طاقت سے فراہم کردہ ثروت و دولت سے ہماری گذشتہ نسلیں بھی انتہائی بے شرمی و بے حیائی کے ساتھ استفادے میں اگر اسی طرح مشغول ہونے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتیں، جیسے مسلمانوں میں مردہ ضمیروں کا ایک طبقہ آج کل یہی کر بھی رہا ہے اور مسلمانوں جیسے اپنے ناموں کو پیش کر کر کے غریب ناواقف مسلمانوں سے ووٹ حاصل کرتا ہے، اسی ذریعہ سے حکومتوں کی کرسیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو رہا ہے، لیکن اخلاقی جرات کی شدت افلاس نے اتنی ہمت بھی ان بزدلوں میں باقی نہیں چھوڑی ہے کہ دل میں ان کے جو کچھ ہے، اس کو زبان تک لانے کی جسارت کریں۔ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ پر جس اعتماد کی ضرورت ہے، اعتماد کی اس دولت کو وہ کھو چکے ہیں لیکن اپنے اس باطنی دیوالیہ پن اور ایمانی افلاس کا اعلان بھی نہیں کر سکتے، نقرئی اور طلائی

Marfat.com

مصالح یا جھوٹے آنر جاہ کا ذب کی بے پناہ آرزو، اس اعلان کی راہ میں ہمیشہ روک بن جاتی ہے۔

وہ اپنی چھچھوری طبیعتوں اور فطری تنگ ظرفیوں کے اقتضا کی توقع اپنے بلند نظر، خدا دوست، خدا اعتماد اسلاف سے بھی رکھتے ہیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ ضعف ایمان کی بے اعتمادی کی یہی لعنت خدانخواستہ اگر ہمارے بزرگوں پر مسلط ہوتی، تو جو کچھ آج سوچا جا رہا ہے، شاید اسے وہ کر گذرتے۔

لیکن ظاہر ہے کہ محمد ﷺ نے جو کچھ سنا ہے ہم اس کو نہیں سنیں گے۔ جن کے دماغوں میں یہ گندے فیصلے جگہ بنا چکے ہیں، ان پر ان بزرگوں کے نفسیات واحساسات کو قیاس کرنا کتنا غلط ہوگا، جنہوں نے محمد ﷺ ہی کو اپنی آنکھ بھی بنا لیا تھا اور ان ہی کو اپنے کان بھی بنا چکے تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اپنی آنکھوں کی دیکھی ہوئی چیزوں اور اپنے کانوں سے سنی ہوئی چیزوں کی ان لاہوتی معلومات کے مقابلہ میں ان کی نگاہوں میں کوئی قیمت باقی نہیں رہی تھی، جنہیں قدرت کی عطا کی ہوئی اس جدید بینائی اور جدید شنوائی کی راہوں سے وہ پا رہے تھے، بینائی کی ایک نئی تازہ اور مقدس روشنی نے اور شنوائی کے اس معصوم نئے احساس نے ان کے لیے غیب کی شہادت بنا دیا تھا۔ ان دیکھے حقائق، دیکھے بھالے حقائق کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ انجانی باتیں جانی بوجھی باتوں سے بھی زیادہ جانی بوجھی نپی تلی باتیں بن چکی تھیں۔ بلکہ بینائی کی اس نئی قوت اور شنوائی کی اس نئی راہ کے مسلسل اور پیہم تجربوں نے ایسے استوار و محکم غیر متزلزل اعتماد کو ان کی فطرت میں راسخ کر دیا تھا کہ اپنی جسم کی آنکھوں اور کانوں سے ان کو اگر اس کا حکم بھی دیا جاتا کہ غیب کے ان ہی حقائق اور واقعات کا خود معائنہ کر لو، تو شاید وہ خود اس کا انکار کر دیتے (ھ)۔

اور سچ بھی یہی ہے کہ علم کے بے خطا معصوم ذریعہ سے جن معلومات تک

Marfat.com

ہماری رسائی ہو رہی ہو ان ہی معلومات کو غیر معصوم اور غلطی میں مبتلا ہونے والے ذریعہ جانچنے کی ضرورت ہی کیا رہتی ہے، نفع سے زیادہ یہ واقعہ ہے کہ نقصان ہی کا احتمال اس میں زیادہ ہے۔

دوربین شیشہ کا عدسہ کسی فضائی سیارے کی خصوصیات کو ہم پر جب واشگاف کر چکا ہے، تو اسی سیارے کو دوربین سے ہٹ کر دیکھنے کی سعی، سعی لا حاصل ہی نہیں، بلکہ سعی مضل ہی ہو سکتی ہے، نبوت کہیے یا رسالت، وحی نام رکھئے یا پیغمبری، حاصل سب کا یہی ہے کہ

زمغربی نظرے (.) دام کن بدست نگر کہ تا بدیدۂ کامل کمال او بینی

خلاصہ یہ ہے کہ تاریکی صرف ان کے لیے جنہوں نے روشنی کے مشاہدہ اور یافت کی فطری قوت سے رشتہ توڑ لیا ہو، لیکن ٹٹول ٹٹول کر چلنے کی اس شخص کو کیا ضرورت ہے جو آنکھیں رکھتا ہے۔

ہم جن کی جان و مال، عزت و آبرو کے احترام کی ذمہ داری زندگی ہی کی حد تک نہیں بلکہ مرنے کے بعد لاش کی ہڈیوں تک کے متعلق قبول کرتے ہیں، جن کو اسلامی قلمرو میں اس معاہدہ کے ساتھ سکونت پذیر ہونے پر راضی ہوتے ہیں کہ معذوری و مجبوری کی صورت میں حکومت کا خزانہ بیت المال، ان کی ضروریات زندگی کو اسی طرح مہیا کرے گا، جیسے اپنے قلمرو کی ہر مسلم رعیت کا کفیل بن کر بیمہ وغیرہ جیسے قماری معاملات کے سوچنے سے وہ مستغنی کر دیتا ہے۔

اسلامی حکومت کے ان امن پسند شہریوں کے ساتھ معاہدے کرنے میں ذہنی محفوظات کی گنجائش اسلام میں کیا ہو سکتی ہے، جب معاہدے کی وہ خطرناک قسم جس کے آگے پیچھے فریقین کو اوہام اور خطرات کے بادل منڈلاتے نظر آتے ہیں، یعنی جنگ کرنیوالے دشمنوں کے متعلق:

Marfat.com

﴿وان جنحوا للسلم فاجنح لها﴾ (۱۳)

''اگر دشمن صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی صلح کی طرف جھک جاؤ''

کا مشورہ دیتے ہوئے ان سارے سوراخوں کو بند کرنے کے لیے جن کی راہ میں قدرتاً خطرات کے گھس پڑنے کا احساس قلوب میں پیدا ہوتا ہے۔ ان ہی سوراخوں کو بند کرنے کے لیے قرآن میں حکم دیا گیا کہ:

﴿وتوکل علی اللّٰہ انہ ھو السمیع العلیم﴾ (۱۴)

''خدا پر اعتماد رکھو وہ سننے اور جاننے والا ہے''

صرف اسی حکم کو دیگر خطرات کے سارے سوراخوں کو بند ہی نہیں کر دیا گیا ہے، بلکہ ''دشمنوں کے ساتھ اس نوعیت کے معاہدوں میں فریب اور دھوکے کے خطرناک نتائج کا تجربہ کبھی کبھی جو ہوتا رہتا ہے، معاہدے کے اسی سبب سے بڑے خطرے کا ذکر ان الفاظ میں فرمانے کے بعد یعنی:

﴿فان ارادوا ان یخدعوک﴾ (۱۵)

''صلح کے معاہدے کی شکل میں اگر دشمن دھوکا دینا چاہتے ہوں''

تو بجائے ذہنی محفوظات کے جس نے اپنے معاہدے کی بنیاد ''توکل علی اللہ'' کی مخفی چٹان پر قائم کی ہے اس کو:

﴿فان حسبک اللّٰہ﴾ (۱۶)

''تو (ایسی صورت میں) اللہ میرے لیے کافی ہے''

کا قرآنی وثیقہ عطا کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہی ہوا کہ دھوکہ اور فریب خواہ جتنا بھی خطرناک ہو، معاہدے کے ذریعہ دشمن اگر دینا چاہیں گے تو خدا نے مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے کہ ان کے ہر فریب اور چال کو بے کار کر کے رکھ دیا جائے گا اور خدا کی غیبی نصرتیں ان کو خطرے سے نکال لیا کریں گی۔

Marfat.com

ان لوگوں سے تو بحث ہی نہیں ہے جنھوں نے قرآن کو خدائے قادر و توانا کی کتاب ہی نہیں تسلیم کیا ہے، یا تسلیم کرنے کے بعد جو شک میں مبتلا ہیں، یا العیاذ باللہ مرتد ہو چکے ہیں، بلکہ میری گفتگو سلف کے ان مسلمانوں تک محدود ہے جنھوں نے یہ مان لیا تھا کہ فان حسبی اللّٰہ (تو قطعاً اللہ میرے لیے کافی ہے) کے یہ الفاظ خدائی الفاظ اور آسمانی وثیقہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ذمہ داری اس نے لی ہے جس سے ظاہر و باطن، اندرو باہر کا کوئی حال مخفی نہیں ہے اور جس کا زور، زور والے کے زور کو قطعی طور پر ہر حال میں ختم کر دینے کے لیے کافی ہے، ذرا سوچیے تو سہی کہ اس ایمان، ایقان اور لاہوتی سکینت و اطمینان کے بعد کیا اس کا امکان رہ جاتا ہے کہ معاہدے میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کے سوا بھی کچھ سوچا جائے۔

خود پیغمبر ﷺ بھی سکھاتے ہی تھے اور اسی کو کر کے دکھاتے بھی تھے، حدیبیہ کی صلح کے موقع پر کون نہیں جانتا کہ معاہدہ باضابطہ تحریری قالب میں ابھی نہیں تھا، صرف زبانی گفتگو میں منجملہ دوسری باتوں کے یہ بھی مان لیا گیا تھا کہ قریش کا جو آدمی مسلمانوں میں آکر شریک ہوگا، اسے واپس کر دیا جائے گا، بات ابھی ہو ہی رہی تھی کہ ابو جندل زنجیریں گھسیٹتے ہوئے اسلام اور اسلام کی دہائی دیتے ہوئے سامنے نمودار ہوتے ہیں۔ پیغمبر ﷺ اور پیغمبر ﷺ کے صحابیوں کو خطاب کرتے ہوئے کہ مسلمان ہونے کے جرم میں قریش نے زنجیروں میں مجھے جکڑ رکھا تھا، میں آپ لوگوں کی امداد کے بھروسے پر کسی نہ کسی طرح یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ قریش کا وکیل آنحضرت ﷺ سے کہتا ہے کہ لکھا نہ گیا ہو، لیکن زبانی مان لیا گیا ہے، اس لیے ابو جندل کو واپس کیجیے، آنحضرت ﷺ نے جیسا کہ مشہور ہے سب ہی جانتے ہیں بالمومنین رؤف رحیم ہوتے ہوئے قریش کے وکیل سے فرمایا:

صدقت (۱۷) تم سچ کہتے ہو

Marfat.com

حالانکہ ابو جندل چیختے رہے، چلاتے رہے، کہتے رہے کہ مسلمانو! کیا مجھے دین کے ان دشمنوں کے حوالہ کر دیا جائے گا، لیکن باوجود اس کے تاریخ نے اس واقعہ کو اب تک محفوظ رکھا ہے کہ ابو جندل سے تسلی کے الفاظ فرماتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہم ان لوگوں سے عہد کر چکے ہیں:

''لا نغدر بهم''(۱۸) ''ہم ان کے ساتھ عہد شکنی نہیں کر سکتے''

اور کیا امت مسلمہ اپنے پیغمبر ﷺ کے ان اٹھے ہاتھوں کو بھول سکتی ہے، جو خدا کے سامنے اٹھے ہوئے تھے، اور قبیلہ بنی خذیمہ کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ان کے چند مسلح اور ہتھیار بند سپاہیوں کو حضرت خالدؓ بن الولید نے قتل کرا دیا تھا قتل کے اسی غلط اور غیر قانونی حادثہ کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے:

''اے اللہ خالد نے جو کچھ کیا ہے تیرے سامنے اس سے اپنی برات پیش کرتا ہوں''۔(۱۹)

بار بار اسی کو دہراتے جاتے تھے اور اسی پر بس نہ فرمایا گیا، بلکہ عرب جو اس قسم کے قتل و قتال کے عموماً عادی تھے، ان کو دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اونٹوں پر سامان لادے ہوئے اسی بنی خذیمہ کے قبیلہ میں آنحضرت ﷺ کے حکم سے پہنچتے ہیں اور مال و جان کا جو نقصان حضرت خالدؓ کی غلط فہمی کی وجہ سے پہنچ گیا تھا، اس نقصان کی تلافی کے لیے آپ نے یہ اعلان عام فرمایا کہ ہر ایک اپنا دعوی پیش کرے، جس نے جو دعویٰ پیش کیا اور حساب سے جس ہرجانہ کا جو مستحق تھا، حضرت علیؓ نے ہر ایک کو ادا فرما دیا:

''حتى مبلغة كلب''(۲۰)

''حتی کہ کتے کے کھانے پینے کی ہنڈیا کا تاوان تک''

آخر میں یہ پوچھنے کے بعد کہ تم لوگوں کو تشفی ہوگئی، جواب میں سب نے

Marfat.com

رضا مندی کا جب اظہار کیا تو حضرت علیؓ نے ایک قسط زائد پیش کی، اور کہا کہ یہ اس نقصان کا معاوضہ ہے جو معلوم نہ ہو سکا، جو کہا جائے گا وہی کیا بھی جائے گا۔ اس کی ان ہی عملی نظیروں کو چھوڑ کر رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے۔ پھر مسلمانوں پر جب تک دین کا اثر غالب رہا تاریخ بتاتی ہے کہ معاہدات کی تکمیل میں غیر مسلموں کے ساتھ انہوں نے ہمیشہ وہی کیا، جس کا وعدہ کیا جاتا تھا۔

ایک اندھا میلے کچیلے کپڑوں میں بوڑھا یہودی فقیر ہے اس کے بازو کو پکڑے ہوئے اپنے عہد کے سارے حکمرانوں میں سب سے بڑے حکمران عمر فاروقؓ لیے چلے آرہے ہیں، بیت المال کے ناظم کے پاس کھڑے ہوئے ہیں اور اسی یہودی نابینا بوڑھے فقیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فاروق اعظمؓ فرماتے ہیں:

''ہم نے ہرگز انصاف نہیں کیا، اگر انکی جوانی کی کمائی کھاتے رہیں اور بوڑھاپے میں ان کو چھوڑ دیں''۔ (۲۱)

آخر میں ناظم بیت المال کو خلافت کی طرف سے یہ فرمان دیا گیا کہ:

''انظر ھذا و ضربا ءہ ''(۲۲)

''اس اندھے یہودی فقیر اور اس جیسے جو بھی ہوں سب کی خبر گیری کرتے رہو''

یہی تو غور کرنے کا مقام ہے کہ اسلامی قلم رو کے غیر مسلم طبقات کے معذوروں اور بڈھوں تک کی پرورش جب اسلامی بیت المال کے ذمہ واجب ہے تو کیا اسی اسلام اور اسلام کے ماننے والے سے یہ توقع کسی حیثیت سے بھی قابلِ تصور ہو سکتی ہے کہ اسلامی حکومتیں اپنے علاقہ کے غیر مسلم باشندوں کے صفایا کے مسئلہ کو سوچ بھی سکتی تھیں؟

حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت کا مشہور واقعہ ہے کہ حیرہ کے کسی یہودی یا نصرانی کو بکر بن وائل قبیلہ کے کسی مسلمان نے قتل کر دیا تھا، مدینہ سے حضرت عمرؓ کا

Marfat.com

فرمان والی حیرہ کے نام آیا:

''اس قاتل کو مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دیا جائے جی چاہے ان کا تو بدلہ میں اس کو قتل کریں یا جی چاہے تو معاف کر دیں''۔ (۲۳)

والی نے قاتل کو مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دیا مقتول کا وارث جس کا نام حنین تھا لکھا ہے کہ:

فقتله ''حنین نے اس مسلمان قاتل کو قتل کر دیا''۔ (۲۴)

بجنسہ اس نوعیت کا ایک مقدمہ حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانہ میں پیش آیا۔ حضرت علیؓ کے اجلاس میں مقدمہ پیش ہوا، گواہیاں گذریں، مجرم پر جرم قتل ثابت ہوا۔ حضرت علیؓ نے اس مسلمان قاتل کے قتل کا فیصلہ صادر فرمایا، فیصلہ کے بعد مقتول جو غیر مسلم تھا اس کے وارث حاضر ہوئے، اور انہوں نے درخواست پیش کی کہ ہم لوگ اس کو قتل کرانا نہیں چاہتے۔ حضرت علیؓ نے درخواست دینے والوں کو بلا کر دریافت کیا کہ:

''کیا مسلمانوں نے تجھے ڈرایا دھمکایا ہے؟''۔ (۲۵)

جواب میں انہوں نے کہا کہ:

''جی نہیں کسی نے نہ ڈرایا ہے اور نہ دھمکایا ہے، بلکہ ہم لوگ سوچتے ہیں کہ قاتل کے مارنے سے ہمارا مقتول بھائی اب زندہ ہونے سے رہا، اس لیے ہماری درخواست یہ ہے کہ ہمیں معاوضہ دلایا جائے (یعنی خون بہا کا مطالبہ)''۔ (۲۶)

یہ سن کر فرمایا کہ:

''تم اپنے معاملہ کو زیادہ سمجھ سکتے ہو''۔ (۲۷)

مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کے ڈرانے دھمکانے سے بجائے قتل کے خون بہا دلانے کی تم نے یہ درخواست اگر پیش کی ہے تو حکومت تمہاری پشت پناہی

Marfat.com

کرنے کے لیے تیار ہے، لیکن واقعی اگر تمہاری سمجھ میں یہی آیا ہے کہ قتل کرانے کا کیا فائدہ تو تم کو اس قانون نے اختیار دیا ہے (ز)، حضرت علیؓ نے اس کے بعد غیر مسلموں کو خطاب کر کے یہ اعلان فرمایا کہ:

''من کان له ذمتنا فدمه کدمنا و دیته کدیتنا'' (۲۸)

''ہم نے یعنی ہماری حکومت نے جن لوگوں کی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے (معلوم ہونا چاہیے کہ اس معاہدہ کے بعد) ان کا خون ہمارے خون کے اور ان کے خون کی قیمت (یعنی دیت) ہمارے خون کی قیمت کے برابر ہو جاتی ہے''

اسلامی قلم رو کے غیر مسلم باشندوں کی جان اور خون کی قیمت جب مسلمانوں کی جان اور خون کی قیمت کے برابر قرار پا چکی تھی تو اسلامی حکمرانوں کے لیے خود ہی سوچیے کہ صفایا تو صفایا اپنے علاقہ کے غیر مسلم باشندوں کو کیا ٹیڑھی نظروں سے بھی وہ دیکھ سکتے تھے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام رواداری کے سلسلہ میں جب اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ مسلمانوں کی خاص عبادت گاہوں یعنی مسجدوں کے اندر خود رسول اللہ ﷺ نے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) ہی کو نہیں بلکہ طائف کے بت پرست مشرکین تک کو اجازت مرحمت فرمائی کہ مسجد کے صحن کے پچھلے حصہ میں اپنے خیمے نصب کریں، پوچھنے والوں نے پوچھا بھی:

''انزلهم المسجد و هم مشرکون'' (۲۹)

''آپ لوگوں کو مسجد میں اتارتے ہیں، حالانکہ وہ تو مشرک ہیں''

جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

ان الارض لا تنجس (ح) ''زمین ناپاک نہیں ہوتی''۔ (۳۰)

Marfat.com

ذرا اندازہ کیجیے اس کا کہ خود پیغمبر اسلام ﷺ کا حال جب یہ ہو، صحابی راوی ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک آپ نے فرمایا:

''قوموا بنا نعود جارنا الیھودی''(۳۱)

''کھڑے ہو جاؤ، ہمارے ساتھ ہم سب اپنے پڑوسی یہودی کی بیمار پرسی کو چلیں''

پیغمبر خود بھی ہیں اور اپنے ساتھ اپنے صحابیوں کو لیے ہوئے اس بیمار یہودی نوجوان کے پاس پہنچتے ہیں جو مدینہ کا باشندہ تھا، جوار اور پڑوس کے حق کو اس عملی شکل میں کر کے خود رسول اللہ ﷺ نے جب دکھایا تھا تو غیر مذہب کے ہم وطنوں اور پڑوسیوں کے ساتھ بتایا جائے کہ مسلمانوں کے تعلقات کی نوعیت قدرتاً جو ہوگئی، اس کے سوا اور کیا ہوتی؟(ط)

لوگ جبر جبر کے لفظ کو اسلام اور مسلمانوں کی طرف منسوب کر کر کے اس سوال کا جواب حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اتنے قلیل عرصہ میں مشرق ومغرب، جنوب وشمال، ایشا وافریقہ، بلکہ یورپ کے بعض حصوں تک میں اسلام کیسے پھیل گیا؟ اسی یہودی بیمار کے قصہ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مزاج پرسی کے بعد اسلام کو اس پر تین دفعہ پیش کیا، تیسری دفعہ آپ کے فرمانے اور اپنے باپ کا اشارہ پانے پر نوجوان یہودی نے اسلام قبول کرلیا۔ آنحضرت ﷺ کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری ہوگئے:

''الحمد للہ الذی اعتق بی نسمۃ من النار''(۳۲)

''اس خدا کا شکر ہے جس نے میرے ذریعہ ایک انسانی روح کو جہنم کے عذاب سے آزادی عطا فرمائی''

تلاش کرنے والے تو ان واقعات میں اور غیر مسلموں کے ساتھ اسلام

Marfat.com

کے سلوک خاص میں اپنے سوال کا واقعی جواب تلاش کر سکتے ہیں۔

:

حضرت عمر فاروقؓ کے عیسائی غلام اسق کے حال سے لوگ واقف ہوں گے۔ سال ہا سال تک حضرت عمرؓ کی خدمت میں رہا، لیکن اس کا خود بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے اسلام کے قبول کرنے پر اس کو کبھی مجبور نہیں کیا، زیادہ سے زیادہ یہی فرماتے رہے کہ اسق تو مسلمان ہو جائے تو کتنی اچھی بات ہوگی۔ حضرت عمرؓ کی نرمی سختی سے زیادہ کارگر ہوئی، اسق آپ کی وفات کے بعد محض آپ کے حسن سلوک کی وجہ سے مسلمان ہو گیا۔ (۳۳)

اور سچ پوچھیے تو آئندہ اسلامی حکمرانوں کے متعلق اس قسم کے قصے تاریخوں میں جو پائے جاتے ہیں، مثلاً دولتِ عباسیہ کے معمار صادق ابوجعفر منصور ہی کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا چہیتا نصرانی طبیب جس کا نام جورجس تھا، بیمار پڑا، حالت زیادہ خراب ہونے لگی، تو منصور پیدل اس کی مزاج پرسی کے لیے دارالخلافۃ سے جورجس کے گھر پہنچا، وہ خلیفہ کی اس عنایت خاص کو دیکھ کر رونے لگا، منصور نے جورجس کو اس حال میں پا کر کہنا شروع کیا کہ:

"اتق اللہ و اسلم و انا اضمن لک بجنۃ" (۳۴)

''جورجس اللہ سے ڈر، مسلمان ہو جا، تیرے لیے جنت کی میں ضمانت لیتا ہوں''

مگر عیسائی، بہر حال عیسائی تھا جواب میں اس نے خلیفہ سے کہا:

''میں تو اپنے باپ داداؤں کے دین ہی پر مرنا چاہتا ہوں، وہی جگہ مجھے پسند ہے، جہاں وہ ہوں خواہ وہ جنت ہو، یا دوزخ'' (۳۵)

مگر آپ جانتے ہیں کہ اس جواب کو سن کر منصور جیسے غضبناک بادشاہ پر کیا

Marfat.com

اثر طاری ہوا؟ لکھا ہے کہ:

"فضحک الخلیفة من قوله" (۳۶)

"خلیفہ جورجس کے اس جواب کو سن کر ہنسنے لگا"

کیا دین پر جبر کرنے کی یہی صورت ہوتی ہے؟ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ جورجس نے منصور سے خواہش کی کہ مجھے اپنے وطن جندیساپور پہنچا دیجیے تاکہ اپنے بزرگوں کے ہزاوڑ میں دفن ہونے سے اگر مرگیا تو محروم نہ رہوں، منصور نے اسی وقت دس ہزار اشرفیوں کی منظوری صادر کی اور حکم دیا کہ شاہی انتظام کے ساتھ اس کو گھر پہنچا دیا جائے اور جورجس وطن پہنچ گیا اور وہیں جا کر مرا۔ (۳۶۔الف)

مسلمان فرماں رواؤں کے دربار میں غیر مذہب کے ارباب کمال کی جو قدر و عزت کی گئی ہے اس کی تفصیل کے لیے تو دفتر درکار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دوسروں پر جبر اور زبردستی تو خیر بڑی بات ہے۔ عباسیوں کی حکومت کا ابتدائی عہد ہے، اسی ابوجعفر منصور کے زمانے کا قصہ ہے، اس کو سنئے اور اندازہ کیجیے کہ عام مسلمانوں کے قلوب تک میں رواداری کے جذبات ترقی کے کس نقطہ تک اسلامی حکومت کے زمانے میں پہنچے ہوئے تھے۔

خطیب نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ بصرہ جو خاص مسلمانوں کی فوجی چھاؤنی تھی، یہیں ایک یہودی پہنچا اور مسلمانوں کے علماء کو مناظرے کا اس نے چیلنج دیا۔ لوگ آتے تھے اور اس سے بحث کرتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ مناظرے کے ڈھنگ میں یہودی اتنا مشاق تھا کہ جو اس سے بحث کرتا اس کو خاموش کر دیتا۔ اس زمانے میں ابوالھذیل العلاف جو بعد کو فرقہ معتزلہ کا امام ہوا، ابھی کمسن تھا، اس کا بیان ہے کہ میں نے اپنے چچا سے کہا کہ اس یہودی کی بڑی شہرت ہو رہی ہے، کیا مجھے آپ اس کے پاس لے چل سکتے ہیں، تاکہ میں

اس سے بحث کروں۔ ابوالھذیل کے چچا نے کہا بیٹا! بڑے بڑے لوگوں کو وہ خاموش کر رہا ہے، تم اس سے بھلا کیا مناظرہ کرو گے، لیکن میں نے ضد کی، آخر مجھے لے کر اس مجلس میں میرے چچا پہنچے، جہاں لوگوں کا مجمع تھا اور یہودی سے بحث ہو رہی تھی۔ اس وقت یہودی حضرت موسیٰ کی نبوت کے متعلق کہہ رہا تھا کہ ان کی نبوت تو طے شدہ مسئلہ ہے، اس لیے اس پر بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں، البتہ اپنے پیغمبر (یعنی رسول اللہ ﷺ) کی نبوت کی صحت کی دلیل تم مسلمانوں کو پیش کرنا چاہیے۔ ہمارے لیے تو صرف انکار کافی ہے، اس قسم کی باتیں وہ کر رہا تھا، اتنے میں ابوالھذیل آگے بڑھا اور یہودی کو مخاطب کر کے کہا کہ میں آپ سے بحث کرنا چاہتا ہوں، یہودی نے ایک کمسن لڑکے کو دیکھ کر کہا کہ:

''میاں صاحبزادے اپنے بڑے بوڑھوں کے حال سے تمہیں عبرت نہیں ہو رہی تم بھلا مجھ سے کیا بحث کر سکتے ہو''۔ (۳۷)

مگر ابوالھذیل کے اصرار کو دیکھ کر بحث پر آمادہ ہو گیا، سوال و جواب کا ایک طویل سلسلہ اس کے بعد نقل کیا گیا ہے جس کے درج کرنیکی یہاں گنجائش نہیں ہے پیش کرنے کی چیز آخری جزء ہے، ابوالھذیل کا بیان ہے کہ میرے سوالات سے یہودی زچ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اچانک وہ میری طرف بڑھا، ایسا معلوم ہوا کہ کان میں کچھ کہنا چاہتا ہے میں نے بھی اپنا کان اس کی طرف بڑھا دیا۔

یہی قصہ سننے کا ہے، ابوالھذیل کے الفاظ میں سنیے، ایک یہودی کی جرات بصرہ جیسے مقام میں دوسری صدی ہجری کی ابتدا تک میں کہاں تک بڑھی ہوئی تھی، ابوالھذیل کے الفاظ یہ ہیں:

'' فسبنی فقال امک کذا کذا و ام من علمک لا یکنی ''(۳۸)

''اس یہودی نے کان میں مجھے گالیاں دینا شروع کیں، کہہ رہا تھا کہ تیری

Marfat.com

ماں کی ایسی تیسی اور جس نے تجھے پڑھایا ہے اس کی ماں کی ایسی تیسی ، وہ فحش گالیاں دے رہا تھا اور اشارے کنائے سے بھی کام نہیں لے رہا تھا''

یہودی کا اپنے اس طرز عمل سے جو مقصد تھا ابو الھذیل نے بھانپ لیا اور کسی قسم کی برہمی اپنے اندر اس نے پیدا ہونے نہ دی ، پھر مجمع کی طرف خطاب کر کے ابو الھذیل نے کہا کہ:

''حضرات! خدا آپ لوگوں کی عزت کو قائم رکھے ، آپ لوگوں نے دیکھ لیا کہ میرے سوالوں کے جواب سے یہ عاجز ہو چکا ہے ، اب کان میں اس نے مجھے اس قسم کی گالیاں محض اس لیے دی ہیں تاکہ مجھے غصہ آجائے اور یوں مجلس درہم برہم ہو جائے ، یہودی کو اس کا موقع مل جائے کہ مسلمانوں نے شور شغب سے کام لیا ورنہ ان کا وکیل شکست کھا چکا تھا۔ (۳۹)

آزادی خیال ، آزادی تقریر کی آپ ہی بتائیے کہ اس سے زیادہ معیاری مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ بصرہ جیسے خالص اسلامی شہر میں وہ مسلمانوں کے محبوب پیغمبر ﷺ کی نبوت پر اعلانیہ بھری مجلس میں اعتراض کراتا ہے۔ مسلمانوں کے علماء اس سے سوال و جواب کرتے ہیں ، اپنی تقریری قوت سے وہ سب کو چپ کراتا چلا جا رہا ہے ، نہ حکومت کی طرف سے اس کی دارو گیر ہوتی ہے اور نہ مسلمانوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے خلاف شورش کرتے ہیں ، بلکہ توقع یہی کی جاتی ہے کہ تقریر کا جواب تقریر سے دیا جائے ، ذرا اس یہودی کی جسارت کا اندازہ کیجیے کہ مسلمانوں کی اس بھری مجلس میں بے لفظ یا بقول مولانا دریا بادی صنف غیر منقوط میں وہ سب کچھ سنا تا ہے جو سنانا چاہتا ہے ، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جب تک اس کو مسلمانوں کے حلم و بردباری کے متعلق اطمینان نہ تھا ، اس بزدل یہودی میں کان ہی میں سہی اس کی ہمت ہی کیسے ہو سکتی تھی۔ انتہا یہ ہے کہ کان میں ابو الھذیل کے جو گالیاں ان کو اور

Marfat.com

ان کے اساتذہ کو اس نے سنائی تھیں، اس کی خبر جب مجمع کے مسلمانوں کو ہوئی، تو جیسا کہ چاہیے تھا لوگوں میں برہمی پیدا ہوئی لیکن اس برہمی کے بعد بھی کیا ہوا؟ ابوالھذیل ہی کا بیان ہے کہ یہودی مجمع سے نکل بھاگا حالانکہ بقول ابوالھذیل:

''شتمنی بالشتم الذی یوجب الحد''۔ (۴۰)

''اس یہودی نے جو گالیاں مجھے دی تھیں، وہ اس کو قانونی سزا کی مستحق بنا چکی تھیں''

یعنی حد قذف (ی) کا یہودی قانوناً مستحق ہو چکا تھا، لیکن بایں ہمہ مسلمانوں کی حکومت نے بھی اور خود مسلمانوں نے بھی اتنا موقع اس کو پھر بھی دیا کہ:

''خرج هاربا من البصرة'' (۴۱)

''بصرہ سے بھاگ نکلا''

موجودہ زمانہ کی بے دین حکومتوں کا سب سے بڑا امتیازی وصف یہی قرار دیا جاتا ہے کہ مذہبی معاملات میں رواداری کا جذبہ لوگوں میں اس نے پیدا کر دیا ہے۔ اگرچہ اس میں زیادہ دخل جہاں تک میں سمجھتا ہوں بجائے رواداری کے پژمردگی کے ان رجحانات کو ہے جو عموماً اس زمانہ میں مذہب کی جانب سے قلوب میں پھوٹ پڑے ہیں۔ یورپ اور یورپ کے مذہب کی تاریخ کے یہ نتائج ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے (ک)۔

مگر خیال کیجیے اس زمانہ کو یعنی دوسری صدی ہجری کی ابتدائی مثالوں کو جس میں تقریباً ہر مسلمان دین کے نشہ میں سرشار اور مخمور تھا۔

لیکن ان کے دین ہی نے مسلمانوں میں بھی اور ان کی حکومت کے اندر بھی رواداری کے جذبہ کی نشو ونما میں کامیابی حاصل کی تھی، میں تو نہیں سمجھتا کہ اس کی نظیر آج بھی مل سکتی ہے۔

Marfat.com

اس قسم کے خیالات کہیے یا وساوس، لوگوں میں ان واقعات کے سننے کے بعد جو پیدا ہوتے ہیں یعنی سمجھ لیا جاتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں کی ان رواداریوں میں بھی دخل ان لاپرواہیوں کو تھا جو مذہب کی جانب سے ان میں پیدا ہو گئی تھیں، میرے نزدیک اسلامی تاریخ کی جہالت پر مبنی ہیں ورنہ جنہوں نے مسلمانوں کی تاریخ کا صحیح مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ایک دفعہ نہیں مختلف زمانوں میں مختلف ممالک میں ایسی صورتیں پیش آئی ہیں کہ اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کے متعلق وقت کے بادشاہوں اور حکمرانوں میں زیادتی کا ارادہ پیدا ہوا، لیکن مسلمانوں کا مذہب سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور زیادتی کی طرف بڑھنے والے ہاتھوں کو اسی وقت روک دیا۔

عہد صحابہ جس کا اول و آخر ظاہر و باطن جیسا کہ میں نے عرض کیا سب کچھ دین ہی دین تھا۔ دین کے عنفوان شباب کے اس عہد میں تو خیر اس قسم کے واقعات کے پیش آنے کی صورت ہی کیا تھی؟ تاہم ارادۃً نہ سہی بلا ارادہ یا عدم واقفیت کی وجہ سے اس زمانہ میں بھی بعض ایسی صورتیں جب کبھی پیش آئی ہیں، تو خود اسلام ہی نے غیر مسلموں کو نقصان سے بچا لیا۔ امیر معاویہؓ کے زمانہ کے اس واقعہ کا ذکر شاید کسی اور مناسب مقام پر آئے گا، جب ان میں اور قسطنطنیہ کی عیسائی حکومت کے درمیان خاص مدت تک کے لیے صلح کا معاہدہ طے پایا تھا۔ مدت صلح کے اختتام کی تاریخ جب قریب آ لگی تو امیر معاویہؓ نے رومی سرحد کی طرف اپنی فوج کو کوچ کا حکم دے دیا، فوج کی قیادت خود ہی کر رہے تھے۔ ارادہ ان کا یہ تھا کہ مدتِ صلح ختم ہونے کے ساتھ ہی غفلت میں رومی سرحد پر دھاوا بول دیا جائے۔ مسلمانوں کی فوج رومی سرحد کے قریب پہنچ ہی چکی تھی کہ اچانک دیکھا گیا گھوڑے پر ایک سوار:

"اللہ اکبر وفاء لا غدر" (۴۲)

''خدا سب سے بڑا ہے، معاہدے کی تکمیل ہونی چاہیے، غدر اور عہد شکنی سے کام نہ لینا چاہیے''

کا نعرہ لگا رہا ہے، امیر معاویہؓ نے اس کو طلب کیا، معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے صحابی عمرو بن عنبسہؓ ہیں۔

حضرت امیر معاویہؓ نے پوچھا کہ آپ کیا فرما رہے ہیں، بولے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ معاہدے کے بعد دشمن پر حملہ اس وقت تک درست نہ ہوگا جب تک کہ معاہدے کی تاریخ ختم ہونے کے ساتھ فریق کو مطلع نہ کر دیا جائے۔ یہ سننے کے ساتھ ہی امیر معاویہؓ اپنی فوج کو لے کر واپس ہو گئے (ل)۔ (۴۳)

اور اسلامی حکومت کے ان غیر مسلم باشندوں کے ساتھ جن کی ذمہ داری حکومت قبول کر لیتی تھی، صحابہ کی ہمدردیوں یا حکام کی زیادتیوں سے بچا لینے کے لیے خود سینہ سپر ہو جانے کے واقعات کا تو ایک سلسلہ ہے جو مختلف علاقوں میں مختلف مواقع میں پیش آتے رہے، حدیث و سیر کی عام کتابوں میں اس کے نمونے آپ کو مل سکتے ہیں۔

مگر اس عہد سعادت کے گذر جانے کے بعد بھی بنی امیہ والوں کے ہاتھ میں اسلامی حکومت کی باگ جب آ گئی، اور بجائے خلفائے راشدین کے جیسا کہ معلوم ہے اپنے طریقہ حکومت میں وہ رومیوں اور ایرانیوں کے نقش قدم کو دیکھ کر چلنے کے عادی ہو گئے تھے۔ لیکن اس زمانے میں بھی اور اس کے بعد بھی غیر مسلم طبقات کی حفاظت و صیانت میں آپ کو نظر آئے گا کہ مسلمانوں کے دین ہی نے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ مسلمانوں کی رائے عامہ پر چونکہ مذہب کا اثر تھا۔ اس لیے حکمرانوں کو ان کے سامنے سر جھکانا پڑتا تھا۔

البلاذری نے لکھا ہے کہ بنی امیہ کے مشہور عیاش و دین باختہ حکمران ولید

Marfat.com

بن یزید نے منجملہ دوسری حرکتوں کے ایک حرکت یہ بھی کی تھی کی قبرص کے غیر مسلم باشندوں کی ایک ٹولی کو اس نے قبرص کے جزیرے سے نکال کر شام میں توطن اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا، چونکہ ولید کا یہ فعل شرعاً صحیح نہ تھا اس لیے مسلمانوں کی رائے عامہ نے بھی اس کی مخالفت کی اور استعظمه الفقهاء ''اسلامی فقہاء نے اسے جرم عظیم خیال کیا'' (۴۴)

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ولید جب مارا گیا اور یزید بن الولید بن عبد الملک اس کا جانشین ہوا تو: ''ردهم الی قبرص'' (۴۵)

''ان غیر مسلم لوگوں کو اس نے قبرص سے واپس کر دیا''

لکھا ہے کہ فقہائے امت کے اس فتوے کی جب تعمیل حکومت نے کی تو:

''فاستحسن المسلمون ذلک من فعله و رده عدلا'' (۴۶)

''عام مسلمانوں نے یزید کے اس کام کو سراہا اور اس کے اس طرز عمل کو عدالت اور انصاف کا تقاضا قرار دیا گیا''

البلاذری ہی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ کوہ لبنان کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ بھی اسی قسم کی صورت ایک دفعہ پیش آئی، یعنی بعض لوگ جنہوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی، ان کے ساتھ چند ایسے آدمی جو مجرم نہ تھے ان کو بھی حکومت کی طرف سے جلا وطنی کا حکم دیا گیا۔ اس وقت امام اوزاعی موجود تھے، انہوں نے اس علاقہ کے صوبہ دار کے نام جس نے جلا وطنی کا حکم دیا تھا ایک طویل مراسلہ لکھا، اس مراسلہ کے بعض اجزاء البلاذری نے نقل کیے ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

''چند خاص لوگوں کے جرم میں تمہیں کیا حق تھا کہ جرم میں جو شریک نہ تھے ان کو بھی تم نے سزا میں شریک کر دیا، قرآن کا حکم ہے کہ ''ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا'' (م)۔ (۴۷)

امام اوزاعی نے اس قرآنی حکم کو نقل کر کے لکھا ہے کہ

''جس کے سامنے ٹھہر جانا چاہیے وہ قرآن ہی کا حکم ہے''۔ (۴۸)

پھر آنحضرت ﷺ کے اس مشہور ارشاد کی طرف توجہ دلائی یعنی اسلامی حکومت جن لوگوں کی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری لیتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے وفات سے کچھ دیر پہلے ان کی حفاظت و صیانت کی طرف خاص توجہ مسلمانوں کو دلائی تھی۔

میں نے اس حدیث کا پہلے بھی ذکر کیا ہے، الاحکام السلطانیہ میں الماوردی نے اسی حدیث کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے آخری گفتگو (ن) جو فرمائی تھی، ان کے الفاظ یہ ہیں:

''روی نافع عن ابن عمر قال کان آخر تکلم به النبی ﷺ ان قال احفظوا فی ذمتی ''(۴۹)

''نافع، ابن عمر کے حوالے سے یہ بیان کرتے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے آخری گفتگو جو فرمائی وہ یہ تھی کہ میری ذمہ کی نگرانی کیجیے، (یعنی جن لوگوں کی ذمہ داری میں نے مسلمانوں کے حکمران ہونے کی حیثیت سے لی ہے ان کی ذمہ داریاں پوری کی جائیں)''

بہر حال امام اوزاعی نے اسی حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے مراسلہ کے آخر میں لکھا تھا کہ:

''دنیا کی ساری وصیتوں میں سب سے زیادہ توجہ اور تعمیل کی مستحق رسول اللہ ﷺ کی وصیت ہے، آپ نے فرمایا کہ عہد جن لوگوں سے کیا جا چکا ہے، ان پر جو ظلم و زیادتی کرے گا، یا ان کی برداشت سے زیادہ بار ان پر ڈالے گا میں قیامت کے دن اس کے خلاف مدعی بن کر کھڑا ہوں گا''۔ (۵۰)

Marfat.com

رائے عامہ اور دین کے خصوصی نمائندے یعنی علماء فقہاء کی اسی دار و گیر کا نتیجہ تھا کہ اس قسم کے غیر مسلم اقوام کے متعلق جب حکومت کے سامنے کوئی مسئلہ پیش آتا تو عموماً قاعدہ تھا کہ وقت کے علمائے دین سے اس مسئلہ کے متعلق حکومت دریافت کرتی اور علماء کا جو فتوی ہوتا اسی کے مطابق عمل کرتی تھی۔

بنی امیہ کا دور ختم ہو چکا تھا اور عباسیوں کی دولت قائم ہو چکی تھی، اسی جزیرہ قبرص ہی کے متعلق عباسیوں کے عہد میں بھی پھر پیچیدگیاں پیدا ہوئیں، اور یہ سوال اٹھا کہ جو طرز عمل اس جزیرے کے غیر مسلم باشندوں نے اختیار کیا ہے اس سے معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی ہے یا نہیں۔ لکھا ہے کہ وقت کے علماء کی خدمت میں حکومت کی طرف سے سوال بھیجا گیا جن میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر لیث بن سعد امام مصر، مالک بن انس امام دار الھجرۃ مدینہ منورہ، سفیان بن عینیہ امام حرم مکہ کے سوا، موسیٰ بن اعین، اسماعیل بن عیاش، یحیٰ بن حمزہ و اسحاق الفزاری اور مخلف ابن حسین بھی تھے، البلاذری نے ان میں سے ہر عالم کے جواب کا ذکر کیا ہے۔ (۵۱)

الفاظ جواب کے اگرچہ مختلف تھے لیکن تقریباً اکثروں نے عموماً وہی جواب دیا تھا جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے دیا گیا تھا، امام مالکؒ نے جو کچھ لکھا تھا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ:

''قبرص والوں کے ساتھ امن وامان کا معاہدہ بہت پرانی بات ہے، اسلامی حکمرانوں نے ہمیشہ اس معاہدے کی پابندی کی''۔ (۵۲)

اسی کے بعد آپ نے ارقام فرمایا تھا کہ:

''میں نے کسی حاکم کو نہیں دیکھا جس نے صلح کے اس معاہدے کو توڑا ہو جو قبرص والوں سے کیا گیا ہے اور نہ ان کو ان کے علاقے سے نکالنے کی جرات کسی نے کی، پس چاہیے کہ ان کے متعلق جلد بازی سے فیصلہ میں کام

Marfat.com

نہ لیا جائے ، بلکہ معاہدے کو باقی رکھا جائے ۔ قرآنی حکم کا بھی یہی اقتضاء ہے ، ہاں اس کے بعد بھی اگر اپنے معاہدے پر قبرص والے قائم نہ رہیں اور دشمنوں (س) کے ساتھ اندرونی میل جول کو ترک نہ کریں ، ان کی عہد شکنی واضح ہو جائے تب پھر حکومت کے لیے صحیح ہوگا اور اس کے بعد جو معاملہ بھی ان کے ساتھ کیا جائے گا امید کی جاتی ہے کہ خدا کی طرف سے امداد ہوگی اور دشمنوں کو ذلت و رسوائی اٹھانی پڑے گی'' (ع)۔(۵۳)

لیث بن سعد نے بھی سال بھر انتظار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

عباسیوں ہی کے عہد حکومت کا مشہور واقعہ ہے کہ ہارون الرشید نے بنی تغلب کے عیسائیوں کے ان حقوق میں دست اندازی کا ارادہ کیا جو خلافت راشدہ کے زمانہ میں اس قبیلے کے عیسائیوں کو حاصل تھے (ف)۔(۵۴)

ہارون الرشید کے قاضی القضاۃ قاضی ابو یوسف کی وفات ہو چکی تھی ، اس لیے امام ابو حنیفہؒ کے دوسرے شاگرد امام محمد بن الحسن الشیبانی کو ہارون نے بلا کر مسئلہ دریافت کرتے ہوئے اپنے ارادے کا اظہار کیا اس نے امام محمد سے کہا کہ:

''بنی تغلب کے ان عیسائیوں کو میں دیکھ رہا ہوں کہ جن امور کی پابندی انہوں نے قبول کی تھی ، ان کی مسلسل خلاف ورزی کر رہے ہیں ، میں خیال کرتا ہوں کہ ان خلاف ورزیوں کے بعد ان حقوق سے وہ محروم ہو گئے جو اسلامی حکومت کی طرف سے از روئے معاہدہ ان کو حاصل تھے''۔(۵۵)

ہارون الرشید جیسے مطلق العنان حکمران کے اس ارادے اور اس کی اس تقریر کو سن لینے کے بعد آپ جانتے ہیں امام محمد نے کیا فرمایا ، لکھا ہے کہ ہارون سے امام نے پوچھا کہ جن دفعات کی خلاف ورزی کا الزام ان عیسائیوں پر آپ لگا رہے ہیں کیا یہ کوئی نئی بات ہے ، یا حضرت عمرؓ جن کی حکومت نے ان سے معاہدہ کیا تھا ، ان

Marfat.com

ہی کے زمانے سے ان خلاف ورزیوں کے وہ مرتکب ہوتے چلے آرہے ہیں، انہوں نے یہ بھی کہا کہ عمر فاروقؓ کے بعد حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں بھی کیا وہ یہی نہیں کرتے رہے، جو آج کر رہے ہیں اور جس کا الزام آپ ان پر لگا رہے ہیں۔

امام محمد نے کہا کہ حکومت کے ان سارے ادوار میں جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ بنی تغلب سے باز پرس نہیں کی گئی تو اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ:

"فهذا صلح من الخلفاء بعده و لا شئی یلحقک فی ذلک" (۵۶)

''حضرت عمرؓ کے بعد کے خلفاء کی طرف سے اب گویا ان کے ساتھ صلح کی یہی صورت طے ہوگئی، اور اس صلح میں دست اندازی کا کوئی حق آپ کو نہیں پہنچتا''

بعض روایتوں میں ہے کہ ہارون نے امام محمد سے پہلے کہا تھا کہ حضرت عمرؓ کو موقع نہ مل سکا، کیونکہ بنی تغلب کے ساتھ صلح کرنے کے کچھ ہی دن بعد ان کی شہادت کا واقعہ پیش آ گیا۔ امام محمد نے کہا کہ مان لیا جائے کہ عمرؓ کو موقع نہ ملا، لیکن ان کے بعد بھی دو عادل ائمہ (عثمانؓ و علیؓ) کے زمانہ میں بھی یہ جانتے ہوئے کہ بنی تغلب معاہدے کی بعض دفعات کی تکمیل نہیں کر رہے ہیں، ان سے پوچھ گچھ نہ کی گئی۔ جس کا مطلب یہی سمجھا جائے گا کہ بنی تغلب کے معاہدے سے اس شرط کو عملاً حکومت نے خارج کر دیا۔ آپ کے لیے ایسی صورت میں دخل اندازی کی کوئی قانونی شکل باقی نہیں رہتی۔ لکھا ہے کہ ہارون نے امام محمد کے اس فتوے کو سن کر کہا کہ:

"نجریه علی ما اجروه انشاء اللّٰه تعالیٰ" (۵۷)

''ہم بھی انشاء اللہ ان کے ساتھ اسی طرز عمل کو جاری رکھیں گے جسے ان خلفاء نے ان کے ساتھ جاری رکھا''

کہتے ہیں کہ آخر میں ہارون نے امام محمدؒ سے یہ بھی کہا کہ:

''آپ اس شخص کے لیے دعا کرتے رہیں جس کے ہاتھ میں خدا نے لوگوں کے معاملات سپرد کیے ہیں اور اپنے شاگردوں کو بھی کہیے کہ اسی کی دعا وہ بھی کرتے رہیں''۔(۵۸)

دیکھا آپ نے مسلمانوں کا حکمران اپنی حکومت کے ایک غیر مسلم طبقہ کے ساتھ زیادتی کا ارادہ کررہا تھا، لیکن اسلام نے آگے بڑھ کر اس کو روک دیا اور بنی تغلب کے عیسائیوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔

لوگ علمائے اسلام پر تنگ نظری کا الزام عائد کرتے ہیں۔ اسلام اپنی ایک طویل تاریخ رکھتا ہے۔ نرم وگرم ہر طرح کے لوگ عالم ہوتے رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کبھی بعضوں کی طرف سے ایسے خیالات کا اظہار کیا گیا ہو، جن کی تنگ نظری کا اطلاق درست ہو، لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں اکثریت علماء میں بھی ان ہی لوگوں کی نظر آتی ہے جن کی ایک مثال امام محمدؒ کا مذکورہ طرزِ عمل ہے۔

اور یہ تو خیر اسلام کے اس عہد کی مثال ہے، جس کے متعلق دوست ہی نہیں دشمنوں میں بھی جن لوگوں نے اسلامی تاریخ اور اسلامی علماء کے حالات کا مطالعہ کیا ہے وہ ان کی آزادی رائے اور وسعت نظری کے اعتراف میں مجبور ہیں۔

مگر میں تو آپ کے سامنے اس زمانہ تک کی مثالیں پیش کرتا ہوں جب یہ واقعہ ہے کہ علمائے اسلام اپنی پرانی خصوصیتوں سے محروم ہو چکے تھے، امام محمدؒ کی طرح فتوی دینے میں قانون کے ساتھ ساتھ حالات اور واقعات کو بھی سامنے رکھنے کی عادت روز بروز کم ہوتی چلی جارہی تھی۔ قانون کی روح سے زیادہ قانون کے الفاظ پر اصرار بیجا کا طریقہ مولویوں میں پھیل چکا تھا، تاہم زوال وانحطاط کے اس زمانے کی بھی یہ مثالیں لوگوں کی آنکھیں کھول سکتیں ہیں۔

Marfat.com

آپ جانتے ہیں کہ عثمانی ترکوں کے زمانہ کے علماء پر قانون کے الفاظ کا رعب چھایا ہوا تھا، تاہم اسی زمانہ کا قصہ ہے مشرقی یورپ کا بڑا حصہ ترکوں کے قبضہ میں آچکا تھا، نہ صرف اسی علاقہ کے عیسائیوں بلکہ ترکی علاقے کے ہر عیسائی کے متعلق لکھا ہے کہ سلطان سلیم عثمانی نے ارادہ کیا کہ:

''عیسائیوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے یا ان کو پھر حکم دیا جائے کہ ہمارے علاقہ سے وہ دور نکل جائیں''۔(۵۹)

سلیم اپنے ارادہ اور عزم میں جتنا پختہ تھا، اس سے سلاطین ترکی کے حالات جاننے والے واقف ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ سلطان سلیم کا یہ ارادہ اگر نافذ ہو کر عمل کی صورت اختیار کر لیتا تو سلطنت ترکی ہی میں نہیں بلکہ بلقانی ریاستوں کے اکثر حصوں میں آج عیسائیت کا نام ونشان بھی باقی نہ رہتا، مگر اس وقت بھی مسلمانوں کے اس حکمران کو جس قوت نے اپنے حدود سے آگے بڑھنے نہ دیا وہ لا مذہبیت اور بے دینی کی قوت نہ تھی بلکہ دینی طاقت کے ایک نمائندہ عالم جن کا نام مفتی جمالی تھا، وہ سلیم کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں اور اس غضبناک خونی بادشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر صاف لفظوں میں اعلان کرتے ہیں:

"لا یحل لک ذلک"(۶۰)

''تمہارے لیے یہ اقدام مذہبا کسی حیثیت سے بھی جائز نہیں ہو سکتا''

مفتی جمالی نے اس قوت کے ساتھ اسلام کے اس فتوی کو سلیم کے سامنے پیش کیا کہ اس کا آہنی ارادہ بھی موم بن کر رہ گیا۔

اسی سلطنت ترکی کے ایک دوسرے واقعہ کا تذکرہ تاریخوں میں ملتا ہے، یہ قصہ تو طویل ہے۔ حاصل یہ ہے کہ مراد رابع کا ۱۶۴۰ء میں انتقال ہو گیا اور خاندان عثمانی میں مراد کے بھائی ابراھیم کے سوا کوئی دوسرا شاہزادہ ایسا باقی نہ رہا تھا

Marfat.com

جسے بادشاہ بنایا جائے۔ ارباب حل وعقد نے ابراہیم کو بادشاہ منتخب کیا، آسٹریا اور سلطنت ترکی سے جو آویزش زمانے سے چلی آرہی تھی اس آویزش کو حالانکہ ابراہیم نے صلح کر کے ختم کر دیا تھا لیکن بااین ہمہ حسب عادت یورپ والے ترکی حکومت کو برو بحر میں زک پہنچانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ ایک جہاز ترکی سے عرب روانہ ہوا، اس میں حرم شاہی کی ایک حرم بھی تھی اور حرم کے ساتھ بچہ بھی تھا، مالٹا کے بحری قزاقوں نے اس ترکی جہاز پر حملہ کیا، کش مکش کے بعد جہاز والے مغلوب ہو گئے اور حرم سرا کی لونڈی اپنے بچہ کے ساتھ مالٹا والوں کے ہاتھ آئی، حالانکہ یہ بچہ ابراہیم کا زائیدہ نہ تھا، لیکن حرم شاہی کے ساتھ اس کو پا کر یہی مشہور کر دیا گیا کہ ایک عثمانی شاہزادہ گرفتار ہوا ہے۔ اس شہرت کے ساتھ اس بچہ کو جبراً عیسائی بنا لیا گیا، اور مذہبی تعلیم دے کر مذہبی پیشوا بھی لوگوں نے اس کو بنا لیا۔ لکھا ہے کہ مالٹا کے عیسائیوں میں ''عثمانی پادری'' کے نام سے مشہور رہا۔ سارے یورپ والے اس پادری کو ترکوں کے شاہی خاندن کا شاہزادہ سمجھتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ جزیرہ کریٹ پر بھی اسی زمانے میں مالٹا والوں نے حملہ کر دیا، بہر حال اس عام رسوائی اور فضیحت کے سوا جو اس فرضی ترکی شاہزادے کے پادری بن جانے کی وجہ سے سلطنت ترکی کی ہو رہی تھی، دوسرے واقعات نے بھی انتقام کے جذبہ کو ہوا دی، ابراہیم پر جنون کی کیفیت طاری ہوگئی، اسی جنون میں اس نے یہ فرمان نافذ کیا کہ:

''ممالک محروسہ کے ایک ایک عیسائی کو چن چن کر قتل کر دیا جائے''(۶۱)

مگر ان بے قصور عیسائیوں کی جان بچانے کے لیے اس وقت بھی جو آگے بڑھا وہ سلطنت ترکی کا شیخ الاسلام ہی تھا۔

امیر شکیب ارسلان نے لکھا ہے کہ:

''ان شیخ الاسلام عارضه بشدة فتوقف عن انفاذ هذا الأمر''(۶۲)

Marfat.com

''شیخ الاسلام نے پوری قوت کے ساتھ ابراہیم کے اس فرمان کا مقابلہ کیا تا آنکہ شاہی فرمان کا نفاذ نہ ہو سکا'' (ص)

دور کیوں جایئے، اسی ہندوستان میں یہ واقعہ پیش آ چکا ہے یعنی سکندر لودھی نے علماء کو بلا کر جیسا کہ فرشتہ نے لکھا ہے یہ دریافت کیا کہ تھانیسر (کورک شیتر) میں ہندوؤں کا جو اشنان گھاٹ ہے اور طرح طرح کے افعال کا ارتکاب وہاں کیا جاتا ہے اس کے متعلق آپ لوگوں کا کیا خیال ہے۔ ایک عالم نے سکندر کے رجحانات کو جاننے کے باوجود صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ:

''نہ وہاں کے بت خانے کو آپ ہاتھ لگا سکتے ہیں اور نہ اس تالاب میں دست اندازی کر سکتے ہیں جس میں ہندو غسل کرتے ہیں'' (۶۳)

کہتے ہیں کہ مولوی کے اس فتوے کو سن کر سکندر بیتاب ہو گیا:

''دست بخنجر کردہ گفت کہ حمایت کفار می کنی'' (۶۴)

''خنجر کو ہاتھ میں لے کر سکندر نے اس مولوی کو خطاب کر کے کہا کہ تم کافروں کی حمایت کرتے ہو''

بادشاہ بے دینی پر آمادہ تھا، خنجر بکف سامنے آ گیا ہے لیکن اسلامی دین کا نمائندہ ہر چیز سے بے پرواہ ہو کر اس وقت بھی یہی کہہ رہا تھا:

''آنچہ در شرع آمدہ ست می گویم وراہ خلاف نمی گویم'' (۶۵)

''شریعت اسلامی کا جو حکم ہے میں اسی کو دہرا رہا ہوں اور کوئی غیر شرعی بات نہیں کہہ رہا ہوں''

سکندر اور سکندر کے عہد کے وہ مولوی صاحب دنیا میں باقی نہ رہے، لیکن کورک شیتر اپنی ساری عبادت گاہوں اور نہان گھاٹوں کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔ یقیناً اس دن اسلام ہی تھا جس نے ہندو کے ان معابد اور غسل خانوں کو بچا لیا،

Marfat.com

ورنہ سکندر اور اس کی طاقت سے جو واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب درمیان میں آکر اس کا ہاتھ اگر نہ روک لیتا تو آج کوئی کورک شیئر کا جاننے والا بھی دنیا میں موجود نہ رہ سکتا تھا۔

بہر حال میری غرض یہ ہے کہ سلف کے اسلامی حکمرانوں پر مسلمانوں کا ایک طبقہ جو آج جھنجھلا رہا ہے اور اپنی موجودہ پریشانیوں کا الزام ان کے سر تھوپنا چاہتا ہے، میرا خیال ہے کہ واقعات سے واقف ہو جانے کے بعد مسلمان بادشاہوں پر نہیں بلکہ اس کو چاہیے کہ اسی دین پر الزام لگائے، جس دین کی حفاظت اور صیانت کی خیالی تدبیروں میں اپنی اس تدبیر کا بھی اضافہ کرتا ہے کہ اپنی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کو ہمارے بادشاہوں نے باقی کیوں رہنے دیا۔ ورنہ جو مصیبت ان ہی کی پچھلی نسلوں نے مسلمانوں پر توڑی ہے اور توڑ رہی ہیں، اس مصیبت کا سد باب اسی زمانہ میں ہو جاتا۔

اب ان بھولے بھالے معصوموں کو میں کیا سمجھاؤں۔ یورپ میں تو اسی کا انتظام کیا گیا تھا، چن چن کر وہاں کے باشندے عیسائی بنا لیے گئے (ق) لیکن باوجودیکہ سارا یورپ ایک مذہب کا پیرو بن گیا مگر اسی ایک دین کے ماننے والے عیسائیوں کے درمیان کیا کچھ نہیں ہوا۔ اور کیا نہیں ہو رہا ہے۔

غریب یورپ نے دینی وحدت ہی نہیں بلکہ تعلیم و جمہوریت اور خدا جانے کن کن طریقوں سے ان مصائب کے انسداد کی کوشش کی۔ لیکن کوئی تدبیر اس راہ میں کارگر ثابت ہوئی ہے؟

جب ان مصائب کے اسباب ہی دوسرے ہیں تو یہ خود ساختہ اسباب کے ازالہ کی کوشش ہمیشہ ناکام رہے گی۔

بلا شبہ تبلیغ و دعوت جیسے ہر مسلمان کے فرائض میں داخل ہے، ہمارے

Marfat.com

سلاطین و امراء پر بھی یہ فرض عائد ہوتا تھا، لیکن ہر عامی مسلمان میں اسی فرض کا کیا بہت سے دوسرے اسلامی فرائض وواجبات کا احساس جیسے مردہ ہو جاتا ہے، اسی طرح اسلامی حکمرانوں کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ سب میں اس فرض کا احساس زندہ تھا۔ تاہم اس زمانہ کے مفروضہ اغراض و مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر نہیں کہ دین کی اشاعت کا جو واقعی مقصد خود دین کے لانے والے نے بتایا ہے، اس کو سامنے رکھ کر یہ واقعہ ہے کہ ہر دور میں ہم حکمرانوں کے طبقات میں بھی اس جذبہ کو زندہ اور بیدار پاتے ہیں۔

نبوت کے منہاج اور طریقہ کی پابندی کرتے ہوئے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی جانشینی اور خلافت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں کامیابی حاصل فرمائی، یعنی حضرات خلفائے راشدینؓ انہوں نے اس راہ میں جو کچھ کیا، اس سے تو خیر دنیا واقف ہے، خلافتِ راشدہ کے اس عہد میں سچی بات تو یہی ہے کہ دین اور دین کی تبلیغ واشاعت کے سوا کوئی دوسرا کام اسلامی حکومت کے سامنے تھا ہی نہیں، اس مسئلہ میں ان حضرات کے استغراق وغلو کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ روم وایران کے علاقے جو فتح ہوئے اور جن دفاتر سے ان علاقوں کی حکمرانی وابستہ تھی، کون نہیں جانتا کہ ان دفتروں کی زبان اور خط تک کے بدلنے کی طرف توجہ نہیں کی گئی، ایرانی علاقوں میں فارسی زبان و خط اور رومی علاقوں میں رومی زبان و خط ہی کا رواج بنی امیہ کے ابتدائی عہد تک باقی رہا (ر)۔ بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے، سکہ جسے ہر زمانہ میں حکومتوں نے اپنا خصوصی شعار اور حکمرانی کی علامت قرار دیا ہے لیکن ایشیا اور افریقہ کے بہت بڑے حصے پر قابض ہو جانے کے بعد بھی آنحضرت ﷺ کے ان خلفائے راشدین کی خصوصی توجہ ٹکسال بنانے کی طرف متوجہ نہ ہوئی، جس کی وجہ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ ان کے سامنے دین کے سوا کوئی دوسری چیز تھی ہی نہیں۔

Marfat.com

ساری نسل انسانی تک پہنچانے کے لیے خدا کی طرف سے آخری دینی پیغام ان کے سپرد ہوا تھا۔ اسی پیغام کو وطنی، نسلی، لونی، لسانی وغیرہ خودساختہ قومی خصوصیات سے قطع نظر کر کے ہر اس شخص تک پہنچا دینے کی ایک ہی دھن تھی جس میں وہ ہمہ تن ڈوبے ہوئے تھے۔ نظر کی اسی وسعت کا اقتضاء تھا کہ ہر ملک کو وہ اپنا ملک، ہر قوم کو اپنی قوم خیال کرتے تھے۔ تحصیل و وصول کے دفاتر کی زبان کیا ہے اور لین دین کس حکومت کے سکے سے کر رہے ہیں، ان چیزوں کی کوئی اہمیت ہی ان بزرگوں کی نگاہ میں نہ تھی۔ اسی لیے میری گفتگو کا تعلق خلافتِ راشدہ کے حکمرانوں سے بھی نہیں۔ بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس عہد کے بعد ہزار بارہ صدیوں تک دنیا کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی جو حکومتیں قائم ہوتی رہی ہیں اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خلافتِ راشدہ کی دینی خصوصیتوں سے ان پچھلے حکمرانوں کی حکومتیں آئندہ زمانوں میں بتدریج عموماً محروم ہوتی چلی گئیں۔ تاہم آپ ابھی مجھ ہی سے کچھ دیر پہلے سن چکے کہ دولتِ عباسیہ کے دوسرے فرمانروا ابوجعفر منصور نے اپنے عیسائی طبیب جورجس کے سامنے اپنی جس آخری آرزو کا اظہار کیا تھا، وہ یہی تھی کہ جورجس! تم اسلام قبول کرلو، میں جنت کی ضمانت تمہارے لیے لیتا ہوں۔

اسی ابوجعفر منصور کے پوتے یعنی ہارون الرشید نے قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ کے نام ایک مبسوط و مفصل تبلیغی مراسلہ جو بھیجا تھا، تاریخ میں اس کی نقل آج تک محفوظ ہے، جس سے صرف اسی کا اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ دوسری قوموں اور امتوں تک اسلامی دین کے پہنچانے کا شوق ہارون پر کس درجہ مسلط تھا۔ بلکہ اسلام کے اصولی مقاصد و اغراض اور بنیادی روح کی یافت اور پھر اس کی تعبیر میں اس کا مقام کتنا بلند تھا (ش)۔

عباسی خلفا کے تبلیغی جذبہ ہی کا نتیجہ یہ تھا کہ مامون الرشید اپنے دربار میں

Marfat.com

دوسرے ادیان و مذاہب کے پیشواؤں کو بلا کر علمائے اسلام سے تحقیق حق کے لیے مباحثہ اور مناظرے کی مجلسیں منعقد کیا کرتا تھا۔ اسی سلسلہ میں فرقہ مانویہ کے پیشوا یزدان بخت کا قصہ مشہور ہے کہ آزادی کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنے کے بعد بخت خاموش ہوگیا، تب مامون نے کہا:

''یزدان بخت دیکھ اب اسلام قبول کرنے میں تیرے لیے کیا عذر باقی رہا''۔ (۶۶)

یزدان بخت جس کا چہرہ شکست کی ذلت کی وجہ سے زرد تھا اس نے مامون سے کہا:

''اے امیر المؤمنین! آپ کی بات میں نے سن لی۔ لیکن اسی کے ساتھ میں یہ جانتا ہوں کہ آپ ان لوگوں میں نہیں ہیں جو دین کے معاملہ میں جبر سے کام لیتے ہیں''۔ (۶۷)

بات اسی پر ختم ہوگئی، مامون نے یہ سن کر یزدان بخت کو کچھ نہیں کہا۔ بلکہ حکم دیا کہ وطن تک فوجی نگرانی میں اس کے پہنچانے کا نظم کر دیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی متعصب آدمی سے بیچارے کو کوئی نقصان پہنچ جائے (ت)۔ (۶۸)

بہر حال بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے اسلامی حکمرانوں نے مختلف ممالک و امصار اور مختلف زمانوں میں دوسروں تک اسلامی پیغام کے پہنچانے میں جو کوششیں کی ہیں، کوئی چاہے تو صرف ان کوششوں کی داستان پر ایک ضخیم کتاب تیار کرسکتا ہے۔ ہارون و مامون وغیرہ تو پھر بھی عہدِ قدیم کے حکمران ہیں اور خلافت راشدہ سے ان کا زمانہ زیادہ دور نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس زمانہ میں بھی بانی سلطنت آصفیہ حضرت آصف جاہ اول تغمدہ اللہ بغفرانہ کے متعلق، ان کے دربار میں ثقہ عالم مولانا غلام علی یہ روایت سناتے ہیں کہ جب کوئی نیا آدمی اسلام میں داخل ہوتا تو

آصف جاہ کا حکم تھا کہ بیعت اسلام کے لیے خود ان کی حضوری میں پیش کیا جائے۔ حضرت آصف جاہ براہِ راست اپنے دست حق پرست پر اس کی بیعت لیتے، اور کلمہ تلقین فرماتے، پھر خود ہی اس کا نام بھی تجویز فرما دیتے۔(۶۹)

اور یہ قصہ تو پھر بھی سترہویں صدی عیسوی کا ہے، انیسویں اور بیسویں صدی میں یورپ کی مذہبی تاریخ نے اس ملک میں حقارت واہانت کے جس مقام تک مذہب اور اس کے ذکر کو پہنچا دیا ہے، یہ شاعری نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ کسی مہذب سوسائٹی کے غیر مہذب بلکہ کسی شائستہ انسان کے غیر شائستہ بن جانے یا بنا دیئے جانے کے لیے یہ کافی ہے کہ اس سوسائٹی میں مذہب یا دین کا ذکر کسی حیثیت سے آ گیا ہے مگر اسی بیسویں صدی کے اسلامی حکمران کے جذبہ تبلیغ اور دعوت دین کے ذوق کو ملاحظہ فرمایئے۔ امیر شکیب ارسلان نے منیف پاشا کا ذکر ان الفاظ میں کرنے کے بعد کہ سلطان عبدالحمید کے زمانہ میں سلطنت ترکی کے یہ ناظم معارف (یعنی ناظم تعلیمات) تھے۔ خواپنا تاثر منیف پاشا کے متعلق امیر کا یہ تھا کہ گو بہ ظاہر وہ دین سے زیادہ لگاؤ نہیں رکھتے، مگر آدمی بڑے سچے تھے، یوں ہی بے بنیاد سنی سنائی روایتوں کے نقل کرنے کے عادی نہ تھے۔ بہر حال ان کے کردار اور راست بازی کی تعریف کرنے کے بعد امیر نے لکھا ہے کہ منیف پاشا نے براہِ راست مجھ سے روایت نقل کی، کہ سلطان عبدالحمید مرحوم کے زمانہ میں جاپانی امیر کی جب ملاقات ہوئی، تو گفتگو کے سلسلہ میں سلطان نے جاپانی امیر سے دریافت کیا کہ:

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ آج کل جاپان کے لوگ کسی مذہب کی جستجو میں سرگرداں ہیں''۔(۷۰)

پھر سلطان نے اس کے بعد فرمایا کہ:

''اگر یہ واقعہ ہے تو میں آپ کو دین اسلام کے قبول کرنے کی دعوت دیتا

Marfat.com

ہوں''۔ (۷۱)

جاپانی امیر نے اس کے جواب میں کہا کہ:

''جلالتماب کو جو خبر پہنچائی گئی ہے، یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ ہم لوگ اپنے قدیم دین ہی پر قائم ہیں اور اسی کے ساتھ وابستہ رہنا چاہتے ہیں''۔ (۷۲)

اور بات اسی پر ختم نہیں ہو جاتی ہے، لوتھر اسٹوڈارڈ جو The New World of Islam کے مصنف ہیں، عرب میں اسی کا ترجمہ ''حاضر العالم الاسلامی'' کے نام سے شائع ہوا ہے، اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

''سلطان عبدالحمید نے ایک تبلیغی وفد کو حکومت کے جنگی جہاز پر جاپان روانہ بھی کیا تھا''۔ (۷۳)

یہ خبر بھی اس کتاب میں درج ہے کہ مسلمانوں کا یہ تبلیغی وفد جب جاپان پہنچا تو حکومت جاپان کی طرف سے اس کو خوش آمدید کہا گیا اور ارکانِ وفد کی ملک کے اکثر حصوں میں بڑی آؤ بھگت ہوئی اگرچہ اسلام کے پیغام کو جاپانی حکومت نے قبول نہیں کیا۔ (۷۴)

بہر حال خلفائے راشدین کے بعد بھی یہ دعویٰ کسی حیثیت سے صحیح نہیں ہوسکتا کہ بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے اسلامی سلاطین اور فرمانرواؤں پر دین کی تبلیغ و دعوت کا جو فرض عائد ہوتا تھا، اس فرض کے احساس سے ہر زمانہ میں ہر ایک خالی تھا۔ مذکورہ بالا چند مثالیں جو اسلامی ابتدائی زمانہ سے بیسویں صدی عیسوی تک کے نمونوں پر مشتمل ہیں، غالباً اس غلط فہمی کے ازالہ کے لیے کافی ہوسکتی ہیں۔

مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ صرف چند سرسری نمونے ہیں، جو آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، ورنہ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث اگر کوئی کرنا چاہے تو بلا مبالغہ ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب ہی اسلامی سلاطین کی تبلیغی جدوجہد پر تیار ہوسکتی ہے (ث)۔

اور سچ تو یہ ہے کہ اصطلاحاً تبلیغ و دعوت کے الفاظ سے جو کچھ سمجھا جاتا ہے یعنی تقریری یا تحریری شکلوں میں غیر مسلم اقوام کے آگے دین کو پیش کرنا، یہ تو نہیں کیا جا سکتا کہ کلیتہً اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے مگر اسی کے ساتھ کم از کم میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ قلم اور زبان کی تبلیغ سے زیادہ اور بہت زیادہ ہمیشہ ثابت ہوا ہے کہ مؤثر ترین ذریعہ دین کی دعوت کا عمل ہے۔

اسلام کے قبول کرنے میں بھی اور مسلمانوں سے نفرت و عداوت کے بڑھانے میں بھی زیادہ تر دخل مسلمانوں کے طرزِ عمل کو رہا ہے، جس زمانہ میں اور جس علاقے میں صحیح اسلامی زندگی کی پابندی مسلمانوں نے کی ہے، قومیں ان کے عملی نمونوں کو دیکھ بھال کر خود ان کی طرف مائل ہوئی ہیں اور اسلامی تعلیمات سے مسلمان جس حد تک بے تعلق ہوئے ہیں، میں پاتا ہوں کہ قوموں کے قلوب بھی ان سے ٹوٹتے چلے گئے ہیں۔ بلکہ اسی قسم کے مسلمانوں کی غیر اسلامی زندگی نے خود اسلام کے لوگوں کو بسا اوقات دور کر دیا ہے۔ صرف خوبصورت تعبیروں، یا تقریری خوش نوائیوں، انشائی دلآویزیوں سے عملی زندگی کے اس نظام کو بنی آدم پر مسلط کرنا آسان نہیں ہے جس کی بنیاد چند ٹھوس غیر فانی صداقتوں کے یقین پر قائم ہے۔ جن لوگوں کا عمل ان کے علمی نظریات کا مسلسل مضحکہ اڑا رہا ہو آپ خیال کر سکتے ہیں کہ ان ہی نظریات یا معلومات و عقائد کے یقین کو دوسروں تک منتقل کرنے میں وہ کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ عمل کی حیثیت ظاہر ہے کہ اس باطنی اعتماد اور بھروسے کی دلیل کی ہے، جس کا دعویٰ اپنے دینی نظریات و مسلمات کے متعلق آپ کرتے ہیں، پھر اپنے دعوے کی دلیلوں کی جو وکیل خود تردید کر رہا ہو، فیصلہ کرنے والے اس وکیل کے دعووں کے متعلق جو فیصلہ کریں گے، وہ ظاہر ہے۔

اور جیسے عام مسلمانوں کے متعلق قوموں کی محبت و عداوت کا مذکورہ بالا

Marfat.com

تجربہ مسلسل ہر زمانہ میں ہوتا رہا ہے، بجنسہٖ اسی تجربہ کا مشاہدہ مسلمانوں کی حکومتوں اوران کے حکمرانوں کے متعلق بھی گذشتہ تیرہ ساڑھے تیرہ صدیوں میں کیا گیا ہے۔

یہ سوچنے کی بات ہے کہ بیت المقدس پہنچنے کے بعد حضرت عمرؓ کے متعلق عام تاریخوں میں اس واقعہ کا جو ذکر کیا گیا ہے کہ ''کنیۃ القمامہ'' میں نماز کا وقت آ گیا، بطریق سے آپ نے فرمایا کہ نماز پڑھنے کی کوئی جگہ بتاؤ، بطریق یعنی گرجا کا پادری جس کا نام صفر دینوس تھا، اس نے گرجے کے اندر کسی جگہ کی طرف اشارہ کر کے عرض کیا کہ آپؐ یہاں نماز پڑھ سکتے ہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ

''آج یہاں میں نے نماز اگر پڑھ لی تو کل اس کا خطرہ ہے کہ مسلمان اس کی دلیل بنا کر کہ عمر نے یہاں نماز پڑھی ہے، تمہارے گرجے پر دعویٰ نہ کر بیٹھیں'' (۷۵)

یہ فرما کر گرجے سے باہر ہو کر آپ نے نماز ادا کی۔ کیا عیسائیوں کے دل میں اسلامی عدل وانصاف کا وزن اس واقعہ سے پیدا ہو سکتا تھا، یا اس سے کہ زبردستی حضرت عمرؓ اس گرجے میں نماز پڑھنے پر اصرار فرماتے۔ اسی سفر میں کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ شام کے جابیہ نامی مقام میں فروکش تھے، اتنے میں ایک عیسائی یا یہودی دوڑتا ہوا آیا اور آ کر عرض کیا کہ دیکھیے آپ کی فوج کے سپاہی میرے نخلستان پر ٹوٹے پڑے ہیں اور توڑ توڑ کر انگور کھا رہے ہیں۔ سننے کے ساتھ ہی حضرت عمرؓ آپے سے باہر ہو گئے، خیمہ سے نکل پڑے، سامنے ایک سپاہی کو دیکھا کہ انگور کے خوشے اپنی ڈھال میں ڈالے چلا جا رہا ہے، پکار کر آپ نے روکا اور فرمایا:

''کیا تم نے بھی یہی کیا؟'' (۷۶)

سپاہی نے جواب میں کہا کہ ہم لوگوں پر بھوک کا غلبہ ہوا، کھانے کی کوئی چیز فوراً نہ ملی، سامنے انگور کا کھیت تھا، اسی سے ہم نے خوشے توڑ لیے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اسی وقت ایک آدمی کو اس عیسائی کے ساتھ کر دیا اور حکم دیا کہ اس کے نقصان کا

Marfat.com

صحیح اندازہ کر کے مجھے خبر دو، تخمینہ تاوان کا آ گیا، لکھا ہے:

"و امر لصاحب الکرم بقیمة عنبه" (۷۷)

''حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ انگور کی قیمت نخلستان کے مالک کوادا کر دی جائے''

اور یہ تو ایک شخصی نخلستان کا قصہ ہے کون واقف نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں غیر مسلم اقوام کی زمینوں پر جو لگان عائد کیا گیا تھا، اس میں کتنی رعایت ان کے ساتھ کی گئی تھی۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں یہ روایت نقل کی ہے کہ عراق کے سواد (یعنی دجلہ و فرات اور ان سے نکالی ہوئی نہروں سے جو زمین سیراب ہوتی تھی) اس زمین کی پیمائش کے بعد جب حضرت عمرؓ کے نمائندوں نے اس لگان یعنی خراج کی رپورٹ آپ کے سامنے پیش کی تو آپ نے فرمایا:

''کاشتکاروں پر تم لوگوں نے اتنا بوجھ تو نہیں لاد دیا ہے جسے وہ اٹھا نہ سکتے ہوں''۔ (۷۸)

جن لوگوں نے سواد کے مختلف حصوں کی پیمائش کر کے مختلف زرعی پیداواروں کے لحاظ سے لگان لگایا تھا۔ یہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے صحابی تھے، ان میں سے ایک صاحب یعنی حضرت حذیفہؓ ابن یمان نے فرمایا:

''لقد ترکت فضلا'' (۷۹)

''میں نے کاشتکاروں کے حصہ میں زیادہ چھوڑ دیا ہے''

اور دوسرے صاحب جن کا نام عثمانؓ بن حنیف تھا، قاضی ابو یوسف نے جن کے متعلق لکھا ہے کہ جیسے ریشم کا تھان ناپا جاتا ہے، زمین کی پیمائش اسی احتیاط سے انہوں نے کی تھی اور اس فن کے وہ ماہر تھے، بہر حال عثمانؓ بن حنیف نے کہا:

''لقد ترکت الضعف'' (خ) (۸۰)

''میں نے جتنا لگان لگایا اس کا دونا کاشتکاروں کے لیے چھوڑ دیا ہے''

Marfat.com

مگر پھر بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اطمینان نہ ہوا اور حکم دیا کہ ہر علاقہ کے دہقان کو میرے پاس ترجمان کے ساتھ روانہ کیا جائے، یہی کیا گیا، آپ نے دونوں سے اسی لگان کے مسئلہ پر پوچھ گچھ کی، مطلب یہ تھا کہ بیچاروں پر برداشت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے۔

اور یہ طرز عمل تو اس طبقہ کے ساتھ اختیار کیا گیا تھا جو حکومت کے وفادار اور معاہدہ کے دفعات کے پابند تھے۔ لیکن جو لوگوں نے معاہدہ کرنے کے بعد عہد شکنی کی اور خطرہ پیدا ہوا کہ دشمنوں کو ان سے مدد ملے گی۔ بلکہ مختلف نازک موقعوں پر مسلمانوں کی دشمن حکومت یعنی رومیوں کی شام کے بعض علاقوں میں ان لوگوں نے مدد بھی کی، یہ عربسوس نامی خطے کے باشندے تھے، مگر جانتے ہو غدر و بغاوت کے اس جرم کی پاداش میں ان لوگوں کو اسلامی حدود سے باہر نکل جانے کا حکم حضرت عمرؓ کی طرف سے جب دیا گیا تو اسی کے ساتھ ان سے کہا گیا تھا؟ البلاذری نے نقل کیا ہے کہ:

> ''ہر چیز جسے وہ چھوڑ کر جائیں گے اس کا دونا ہرجانہ ان کو دیا جائے گا، مثلاً ایک بکری کے معاوضہ میں دو بکریاں، ایک گائے کے بدلہ میں دو گائیں، الغرض ہر ایک چیز کے مقابلہ میں دو چیزیں ان کو اسلامی حکومت عطا کرے گی''۔ (۸۱)

کیا یہ یا اسی قسم کے بیسیوں واقعات جن کا تماشا خلافت راشدہ کے عہد میں ہر طرف پیش ہو رہا تھا، ان کو دیکھ کر یہ سوال کوئی مشکل یا لاینحل سوال باقی رہ جاتا ہے کہ دین اللہ میں افواجاً کی شکل میں لوگ جو داخل ہوتے چلے جا رہے تھے اس کا سبب کیا تھا؟ انسانی فطرت بہر حال انسانی فطرت ہے، اس میں قدرۃً حق و باطل کے امتیاز کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ مگر حق کو واقعۃً حق کی شکل میں پیش بھی تو کیا جائے۔ تقریروں اور تحریروں میں تو صرف بڑے بڑے دعوے پیش ہوتے

Marfat.com

ہیں مگر آدمی تو دلائل کا رسیا ہے۔ دعوے فقط خشک دعوے ان پر چڑھنے والے جس قسم کے حسین و دلکش الفاظ کے خول چڑھا رہے ہوں، سننے کی حد تک تو لوگ سن لیتے ہیں، بلکہ خول چڑھنے کی مہارت کی تعریف بھی ممکن ہے، تھوڑی دیر کے لیے کر دیں، لیکن جو کچھ کہا گیا وہ کیا بھی جاتا ہے یا نہیں، شعوری و غیر شعوری طور پر حقیقی فیصلہ صرف اسی سوال کے جواب کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔ دوسرا گال بھی اس کے آگے پیش کر دو، جس نے تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارا اور جو تم سے کرتا چھینتا ہو، دھوتی بھی اس کے حوالہ کر دو۔ بے گاری میں ایک میل چلنے پر تمہیں اگر کوئی مجبور کرے، تو بجائے ایک میل کے دو میل چل کر اس کے سامان کو پہنچا دو۔

عدم تشدد یا اہنسا کے ان انجیلی اصولوں کا لوگ جب ذکر کرتے ہیں، تو کوئی شبہ نہیں کہ دنیا کی موجودہ جہنمی زندگی اچانک نظر آتی ہے، کہ بہشتی زندگی کے قالب میں ڈھل گئی، لیکن ان ہی انجیلی اصولوں کی منادی کرنے والوں کو ان اصولوں کے سننے والے جب دیکھتے ہیں کہ مارنا تو خیر دور کی بات ہے، کسی کے گال پر تھپڑ کا خیال بھی جن کے دلوں میں نہ تھا، ان کی گردنیں کندھوں سے اتار رہے ہیں۔ جنہوں نے کسی کے کپڑے کے دھاگے کو بھی بد نیتی سے نہیں دیکھا تھا بلکہ اپنے کپڑے مصیبت کے دنوں میں جن لوگوں کو اتار اتار کر پہنائے تھے، ان ہی محسنوں سے کپڑے ہی نہیں چھین رہے ہیں بلکہ بچوں کو ان کی گودیوں سے اتار اتار کر ذبح کر رہے ہیں۔

سوچا جا سکتا ہے کہ انجیلی اصولوں کے واعظوں کے عمل اور فعل کا جب یہ حال ہو تو سہانے الفاظ کے خالی ڈھول کی یہ آواز دلوں کو کب تک متاثر رکھ سکتی ہے؟

مگر اسی کے مقابلہ میں سنیے، حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کا مشہور واقعہ ہے، اسلامی حکومت کی طرف سے تجارتی محصول (کردر گیری یا چنگی) کے وصول کرنے کی سرحدی علاقوں پر جب تنظیم ہوئی، فرات کی آبی راہ پر بھی چوکی قائم

Marfat.com

ہوئی، دریا پر ایک رسہ پھینک دیا جاتا تھا، تجارتی کشتیاں اسی راستہ سے آ کر اٹک جاتی تھیں اور محصول وصول کرنے والے تجارتی سامان کا تخمینہ کر کے محصول وصول کرتے تھے۔ شروع زمانہ میں یہ صورت پیش آئی کہ ایک عیسائی سوداگر اسی راہ سے اپنا تجارتی مال لے کر گذر رہا تھا، زیاد بن حدیر جو اس چوکی کے امین تھے، انہوں نے محصول وصول کر لیا، کچھ دن بعد پھر عیسائی تاجر کاروبار سے فارغ ہو کر اسی راہ سے واپس ہو رہا تھا، زیاد بن حدیر امین کردرگیری نے اس کے مال کا پھر جائزہ لینا چاہا، عیسائی سوداگر نے کہا کہ ایک دفعہ میں محصول ادا کر چکا ہوں، کیا مجھ ہی سے دوبارہ تم محصول وصول کرو گے، چونکہ ابتدائی زمانہ تھا، سابقہ حکومت کے رواج کی بنیاد پر یا اپنے اجتہاد سے زیاد نے فیصلہ کیا کہ ہاں پھر تمہیں محصول ادا کرنا پڑے گا۔

عیسائی سوداگر اور زیاد میں بات بڑھی، اس نے سامان کو اپنے آدمیوں کے سپرد کر کے زیاد سے کہا میں خود امیر المومنین حضرت عمرؓ کے پاس جاتا ہوں، اس زمانے میں حضرت عمر مکہ آئے ہوئے تھے۔ عیسائی سوداگر مکہ پہنچا، حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ کہتے ہوئے کہ میں ایک عیسائی سوداگر ہوں۔ اپنا قصہ اس نے سنایا، حضرت عمر نے اس کی روداد سن کر صرف ایک عربی لفظ یعنی ''کــفـیــت'' فرمایا، جس کا مطلب یہی تھا کہ تیرا کام پورا کر دیا جائے گا۔ لیکن عیسائی سوداگر اس مختصر لفظ سے مطمئن نہ ہوا، خود اسی کا بیان ہے کہ میں مکہ سے مایوس واپس لوٹ رہا تھا، دل میں طے کر چکا تھا کہ زیاد کے مطالبہ کی تکمیل کر دوں گا، مگر وہی کہتا ہے کہ جب میں فرات کی اس چوکی پر پہنچا، تو اس خبر نے مجھے حیرت میں ڈال دیا:

''کتاب عمر قد سبق الیہ''(۸۲)

''زیاد بن حدیر (امین چوکی) کے پاس حضرت عمرؓ کا فرمان اس کے پہنچنے سے پہلے وصول ہو چکا تھا۔''

Marfat.com

اس فرمان میں حضرت عمرؓ نے زیاد کو حکم دیا تھا کہ جب ایک دفعہ اس کے تجارتی مال سے محصول وصول کر چکے تو دوبارہ پھر اسی مال سے وصولی کا حق تم کو نہیں ہے، عیسائی سوداگر کا بیان ہے اس خبر نے مجھے بے چین کر دیا اور اسی وقت زیاد کو خطاب کر کے اس نے اعلان کیا۔

"أنی اشهد اللّٰه أنی بری من النصرانیة و أنی علی دین الرجل الذی کتب الیک هذا الکتاب(ز)". (۸۳)

''میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ عیسائی مذہب سے میں کنارہ کش ہوتا ہوں اور اب اس شخص کے دین پر ہوں جس نے تمہارے نام یہ مراسلہ بھیجا ہے''

ایک معمولی عیسائی سوداگر کی چنگی کے محصول کے ساتھ اس عہد میں روئے زمین کی جو سب سے بڑی حکمران طاقت تھی، یعنی حضرت عمرؓ کا متوجہ ہونا ور مالی نقصان سے اس بڈھے عیسائی کو بچا لینے کے لیے اتنی مستعدی کہ شاہی فرمان اس کے پہنچنے سے پہلے امین کر درگیری کے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا، درحقیقت یہ واقعہ اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے تھا ہی اتنا دل دوز کہ جو نتیجہ اس کا ہوا اس کے سوا کسی دوسرے نتیجہ کی بھلا ایسی صورت میں توقع ہی کیا ہو سکتی ہے؟ خصوصاً اس زمانہ میں تاجروں کے ساتھ یہ معاملہ جو زیاد نے اختیار کرنا چاہا تھا، حکومتوں کا عام دستور تھا۔

اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ بولنے کی حد تک تو حضرت عمرؓ کی زبان مبارک سے صرف ''کفیت'' کا ایک ہی لفظ نکلا، لیکن قول جس کا اتنا مختصر تھا، آپ دیکھ رہے ہیں، اس کے فعل اور عمل کی وسعت دامانیوں کو کہ عرب سے عراق تک یا مکہ سے ساحلِ فرات تک زلزلہ برپا ہو گیا۔ اور یہی حکومت کا مطلب اور اس کا صحیح نصب العین ہے، کہ اکثریت ہو یا اقلیت، دین و مذہب، مسلک و مشرب کسی کا کچھ بھی ہو لیکن حکومت کے دائرہ حفاظت میں جو آ چکے ہوں ان کو مطمئن کر دیا جائے کہ

Marfat.com

ان کا ہر حق خواہ معمولی ہو یا غیر معمولی، اجتماعی ہو یا انفرادی بالکلیہ محفوظ ہے۔ یہ اس دجالی عہد کا نیا نظریہ ہے کہ حکومت صرف ان لوگوں کے حقوق کی ذمہ دار ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ ملک میں ان ہی کو عددی برتری حاصل ہے۔ جس جماعت کے افراد کی تعداد پچاس ہے، ان کی قطعاً پرواہ اس جماعت کے مقابلہ میں نہیں کی جائے گی جس نے گنوانے کے وقت مردم شماری کے کارندوں سے یہ لکھوا لینے میں کامیابی حاصل کی ہو کہ بجائے پچاس کے اکیاون منڈیوں پر یہ جماعت مشتمل ہے۔ ممکن ہے کہ کہنے کی حد تک یہ نہ کہا جاتا ہو، لیکن یقیناً یہی کیا جا رہا ہے اور اسی کا قرون وسطیٰ کی ظالمانہ حکومتوں کے مقابلہ میں جمہوری حکومت نام رکھ دیا گیا ہے۔ کانوں کو یہ سنا سنا کر بہرہ بنا دیا گیا ہے کہ انسانی حقوق کی کلی ضمانت کا جو راز حکومت کے اس جدید انوکھے طرز سے بنی آدم پر منکشف ہوا ہے، اس کی نظیر تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتی، مالکم کیف تحکمون۔

خیر میں کیا کہنے لگا، عرض کر رہا تھا کہ اسلامی حکمرانوں نے قول سے زیادہ اسلام کی اشاعت میں اپنے عمل سے کام لیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ عمل کے کمانوں سے نکل نکل کر جو تیر قلوب میں اثر کر رہے تھے، کیا ان سیدھے تیروں کے نشانوں کو کوئی خطا کر سکتا تھا، حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ میں ذرا غور تو کیجیے، حمص میں وہ صورت جو پیش آئی، یعنی ہرقل اپنی آخری فوجی قوت کو فراہم کر کے شام کو مسلمانوں سے چھیننے کے لیے جب یلغار کرتا ہوا مسلمانوں کی فوج کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا، تو مسلمانوں نے یہ محسوس کر کے کہ ہرقل کے اس فوجی حملہ کی مدافعت میں ہم لوگ جس وقت مشغول ہوں گے، حمص کے شہر اور اس کے باشندوں کی حفاظت کی ذمہ داری جیسی کہ چاہیے ہم سے ممکن نہ ہو سکے گی، مشہور واقعہ ہے کہ حمص کے غیر مسلم باشندوں سے ان کی حفاظت کے مصارف کے لیے خراج کی رقم جو وصول ہو چکی تھی، یہ کہتے

Marfat.com

ہوئے پوری رقم واپس کردی گئی کہ:

''قد شغلنا عن نصرتکم و الدفع عنکم ''(۸۴)

''تم لوگوں کی امداد اور تمہاری طرف سے مدافعت کا موقع ہمارے لیے باقی نہ رہا''۔

مؤرخین نے اس واقعہ کو نقل کر کے اگر یہ لکھا ہے کہ حمص کے یہودی اور عیسائی مسلمانوں کے اس عجیب وغریب طرز عمل کو دیکھ کر کہنے لگے کہ:

''آپ لوگوں کی حکومت، آپ کا عدل وانصاف ہمیں رومی حکومت کے ظلم وستم سے زیادہ محبوب ہے، آپ کے عامل (حاکم شہر حمص) کے ساتھ مل کر ہم رومیوں کا مقابلہ کریں گے''۔(۸۵)

یہ تو عیسائیوں نے کہا، حالانکہ رومی حکومت خود عیسائی حکومت تھی، اسی طرح حمص کے یہودیوں نے جمع ہوکر اعلان کیا کہ:

''قسم ہے تورات کی کہ شہر میں ہرقل کا والی اور نمائندہ اس وقت تک داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہم لڑ کر مغلوب اور درماندہ نہ ہو جائیں''(۸۶)

مسلمانوں کے ساتھ جو وعدہ عیسائیوں اور یہودیوں نے اس واقعہ کے بعد کیا تھا، وہ پورا کیا گیا، اور یرموک ندی کے ساحل پر ہرقل کی فوج کو آخری تاریخی شکست جب نصیب ہوئی، تو لکھا ہے کہ:

''شام کے شہروں اور قصبوں کے یہودی اور نصرانی ڈھول بجاتے ہوئے باہر نکل آئے اور مسلمانوں کے آگے کھیلتے کودتے اپنے شہروں میں ان کو خود لے گئے''۔(۸۷)

یہی یرموک کی فوج جسے ہرقل نے عیسائیوں کے مرتد بادشاہ جبلہ بن ایہم کی سرکردگی میں اس لیے روانہ کیا تھا کہ عرب کے ان قبائل کی امداد بھی اس تدبیر

Marfat.com

سے میسر آ سکتی ہے، جو رومیوں کی اس باجگذار عربی حکومت یعنی غسانیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ جبلہ کی وجہ سے یرموک کی اس جنگ کو بہت اہمیت حاصل ہوگئی تھی، لیکن کون نہیں جانتا کہ جبلہ جیسی مادی قوت کی امداد سے حضرت عمرؓ اس لیے دست بردار ہو گئے تھے کہ اتفاقاً جبلہ کے دوشالے کے کسی گوشہ پر ایک غریب بدو کا پاؤں اس وقت پڑ گیا تھا، جب جبلہ مسلمان ہو کر کعبہ کے طواف میں مشغول تھا، بادشاہی کے جاہلی خیال نے جبلہ کو بے اختیار کر دیا اور غریب بدو کے منہ پر اس زور سے اس نے تھپڑ رسید کیا کہ اس کی ایک آنکھ بہ گئی، اس کی خبر حضرت عمرؓ کو ہوئی، جبلہ کی طلبی کے بعد آپ نے فرمایا کہ بدو کی آنکھ کے بدلہ میں تمہاری آنکھ پھوڑی جائے گی۔ سننے کے ساتھ غسانی حکومت کے فرمانروا جبلہ کے ہوش اڑ گئے، کہنے لگا: "اوعینه مثل عینی "(۸۸)

''کیا اس بدو کی آنکھ میری آنکھ کے برابر ہے''۔

اس نے جواب کے لیے مہلت طلب کی اور اسی حیلہ سے شبا شب اسلامی علاقہ سے بھاگ کر رومیوں کے علاقہ میں پہنچ گیا اور اسلام سے مرتد ہو کر عیسائی دین اس نے قبول کر لیا، کہتے ہیں کہ جبلہ کے ساتھ عربی قبائل کے تیس ہزار سپاہی جو اس کی فوج کے ملازم تھے، رومیوں میں جا کر مل گئے، لیکن ایک بدوی کی آنکھ کا انصافاً جو حق تھا، اس حق کی حفاظت میں سارے مادی نقصانات اسلامی حکومت نے برداشت کیے۔

اور بدو کی آنکھ تو پھر بھی آدمی کی آنکھ تھی، حضرت عمرو بن عاص صحابی جو مصر کے حاکم تھے، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مسلمان سپاہی نے مصر کے کسی غیر مسلم باشندے کے بت کی آنکھ توڑ دی، عمرو بن العاص کے سامنے مقدمہ پیش ہوا، بیان کیا جاتا ہے کہ بت کی آنکھ کے توڑنے والے سپاہی کی آنکھ تو بھی توڑ سکتا ہے۔

قبطی کو عمرو بن العاصؓ کی طرف سے یہی فیصلہ سنایا گیا، وہ سناٹے میں آ گیا، مسلمان سپاہی نے اس قبطی سے کہا کہ میری آنکھ توڑ کر کیا کرے گا میں تیرے بت کی آنکھ کے معاوضہ میں جو رقم بھی منظور کرے پیش کرنے کے لیے تیار ہوں، آخر تاوان ہی پر راضی ہو گیا اور مسلمان سپاہی کی آنکھ بچ گئی۔ (۸۹)

مصر جو ابتدائے اسلام میں تقریباً عیسائی ملک تھا، لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ وہاں کے عیسائی کیا ہوئے۔ کیونکہ بجز ایک اقلیت قلیلہ کے مصر کی ساری آبادی صدیوں سے مسلمان ہے۔

لیکن غور نہیں کرتے کہ اسی مصر میں جہاں آئے دن اسلامی حکومت کی طرف سے عدل و انصاف کی مذکورہ بالا مثالیں پیش ہو رہی تھیں، ساتویں صدی عیسوی کا عیسائی مؤرخ یحیٰی نکیو جو مصری عیسائیوں کا بطریق تھا اور مصر کی اس نے تاریخ بھی لکھی، اسی کا بیان ہے کہ:

''حضرت عمرو بن عاص نے گرجاؤں پر عیسائیوں کے قبضہ کو بحال رکھا، اور عیسائیوں کو دینی معاملات میں خود مختار بنا دیا، عمرو کی فوج نے کسی گرجے کے مال اور خزائن پر دست اندازی نہ کی اور نہ لوٹ و غارت گری سے کام لیا''۔ (۹۰)

اسی کے مقابلہ میں اسی مصر کے ان ہی یعقوبی عیسائیوں یعنی قبطیوں پر قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ جسٹی نین نے محض اس قصور میں کہ رومی کلیسا کو مصر کے قبطی عیسائی تسلیم نہیں کرتے تھے، یہ ظلم توڑا کہ آج بھی اس کے سننے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دانس لی بن کی کتاب ''مصر کی موجودہ حالت'' میں یہ تاریخی شہادت درج ہے کہ:

''جسٹی نین (شاہ قسطنطنیہ) نے دو لاکھ قبطیوں کو اسکندریہ میں قتل کرایا اور اس کے جانشینوں نے اتنے مظالم ان عیسائیوں پر توڑے کہ اکثر قبطیوں نے

Marfat.com

صحرائے اعظم میں جا کر پناہ لی (ض)''۔(۹۱)

عیسائی حکومت کا خود عیسائیوں کے ساتھ تو یہ برتاؤ تھا، اسی کے مقابلہ میں مسلمان حکمرانوں کو انہوں نے جب دیکھا کہ پتھر کی مورتیوں کی آنکھوں کے بدلہ میں زندہ مسلمان کی آنکھ تک کے توڑنے پر آمادہ ہیں، تو اسلام کو ان کے قلوب میں گھسنے سے سوچنا چاہیے کہ اب کون سی طاقت روک سکتی تھی۔ ساتویں صدی عیسوی کے اسی بطریق۔جی نکیو کے حوالہ سے آرنلڈ نے نقل کیا ہے کہ:

''مسلمانوں کی فتح مصر ابھی مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی اسکندریہ ابھی مقابلہ پر تھا کہ اکثر قبطیوں نے اسلام قبول کرلیا''۔(۹۲)

عمرو بن عاص جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ سیاسی مصالح کا ان کے فیصلوں میں کافی اثر نمایاں تھا، جب ان کا حال یہ بیان کیا جاتا ہے تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ جن بزرگوں نے دینی مصالح کے مقابلہ میں سیاسی مصالح کی کبھی پروا نہ کی، ان کا برتاؤ اسلامی قلمرو کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ کیا ہوگا؟ مالگذاری وصول کرنے میں ایرانیوں اور رومیوں کے جو یہ طریقے تھے کہ لوگوں کو باندھ کر دھوپ میں لٹا دیا جاتا اور ان کے سر پر غالباً تیل بھی ڈالا جاتا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کی نظر شام کے سفر میں وصول مالگذاری کے اس رومی طریقہ پر جس وقت پڑی تو اسی وقت آپ نے حکم دیا کہ:

''لوگوں کی برداشت سے زیادہ ان پر بار نہ ڈالا جائے اور نہ مالگذاری کے وصول کرنے میں دکھ پہنچایا جائے''۔(۹۳)

اسی طرح جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کا زمانہ آیا تو ایک صاحب جن کو آپ نے ایرانی علاقے کے کسی مقام کی طرف جس کا نام ''بندج سابورا'' (ظ) تھا مالگذاری کی تحصیل وصول کے لیے روانہ کرنا چاہا، جب

Marfat.com

وہ چلنے لگے تو حضرت علی المرتضیٰؓ نے ان کو وصیت شروع کی:

''دیکھو ایک درم کے وصول کرنے میں بھی کسی کو تازیانے کی سزا نہ دینا اور نہ ان روزمرہ کی خوراک کے ذخیرے کو نیلام کرنا، اسی طرح گرما اور سرما کے لباس کو بھی ان کے ہاتھ نہ لگانا اور جن مویشیوں سے وہ کاشتکاری میں کام لیتے ہیں ان کو بھی فروخت نہ کرنا اور نہ تحصیل و وصول کے وقت کسی کو کھڑے رہنے پر مجبور کرنا''۔ (۹۴)

حضرت علیؓ کی ان ناصحانہ وصیتوں کو سن کر تحصیل دار نے کہا کہ:

''امیر المومنین پھر تو جناب کی خدمت سے جس حال میں جارہا ہوں اسی حال میں مجھے واپس ہونا پڑے گا''۔ (۹۵)

حضرت علی نے تحصیل دار کی بات سن کر فرمایا:

''ہاں! جیسے گئے تھے، اسی حال میں واپس ہی کیوں نہ آنا پڑے''۔ (۹۶)

اس کے بعد اسی کو خطاب کر آپ فرمانے لگے:

''تجھ پر افسوس ہے (دیکھ) ہمیں ان سے صرف العفو یعنی فضل (ضرورت سے جو بچ گیا ہو) اسی سے لینے کا حکم دیا گیا ہے''۔ (۹۷)

اور ان بزرگوں کے متعلق تو خیر اس قسم کی باتیں چنداں تعجب انگیز نہیں ہیں، مگر ان ہی کے مقابلہ میں امیر معاویہؓ کے حال میں بھی ہم جب یہ پڑھتے ہیں کہ رومیوں اور حضرت معاویہؓ کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ سالانہ اتنی رقم ادا کریں گے، رومیوں نے اطمینان کے لیے اپنے یہاں کی چند ممتاز ہستیوں کو امیر معاویہؓ کے پاس بطور یرغمال کے رکھوایا دیا تھا، کہ اگر مقررہ رقم رومی حکومت نہ ادا کرے، تو آپ ان لوگوں کو قتل کر سکتے ہیں، البلاذری نے نقل کیا ہے کہ کچھ دن بعد رومیوں نے عہد شکنی کی، معاہدے کی رو سے امیر معاویہؓ کو حق تھا کہ یرغمال ہونیوالے رومیوں

Marfat.com

کو قتل کردیں، مگر مسلمانوں سے مشورہ کرنے کے بعد امیر معاویہؓ نے یہی طے کیا کہ:

''ان کو قتل نہ کیا جائے بلکہ چھوڑ دیا جائے''۔ (۹۸)

یہی کیا گیا، مسلمانوں نے یہ کہتے ہوئے کہ:

''وفاء بغدر خیر من غدر بغدر'' (۹۹)

''عہد شکنی کے جواب میں عہد شکنی سے یہ بہتر ہے کہ ہم عہد توڑنے والوں کے ساتھ معاہدہ کی پابندی کریں''۔

یرغمال بنائے جانے والے ان رومیوں کو جو بطبک میں رکھے گئے تھے، رہا کردیا۔

بہرحال مخلوقات کی پرستش اور پوجا پاٹ جن عبادتگاہوں میں ہوتی ہے، ان کو پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جدّ مجدہٗ ہی کی عبادت کے لیے مختص کرانے کے نصب العین میں کامیابی کی صحیح تدبیر یہ قطعاً نہیں ہے کہ جن عبادت گاہوں میں مخلوقات کی عبادت کی جاتی ہے، ان کو ڈھا دیا جائے، گرادیا جائے (غ)، جلا دیا جائے۔ انسانی نفسیات کی خصوصیتوں سے تھوڑی بہت بھی واقفیت جو رکھتے ہیں، وہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس قسم کے اعمال سے انتقام اور غصہ کے جذبات میں آدمی ڈوب کر تہ و بالا ہونے لگتا ہے۔ ان ہی اشتعالی جذبات کے تلاطم اور ہنگاموں میں حقیقت نگاہوں کے سامنے سے ہٹ جاتی ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ جس مصر میں آج ازہر اور مسجد ابن طولون وغیرہ کی سرنما عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں، یہ وہی ملک ہے جس کے ان گرجوں کو مسلمانوں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا، جن میں (العیاذ باللہ) خدا کے بیٹے اور خدا کے بیٹے کی ماں کی پوجا ہوتی تھی۔

دمشق کی مشہور تاریخی مسجد جامع بنی امیہ جو آج بھی اپنی پوری شان و شوکت، عظمت و اہمیت کے ساتھ موجود ہے۔ عام تاریخوں میں کس نے نہیں پڑھا

Marfat.com

ہے کہ مروانیوں کے مطلق العنان فرمانروا عبدالملک نے اس مسجد کے لیے عیسائیوں کے گرجا یوحنا نامی کے متعلق عیسائیوں سے خواہش ظاہر کی کہ جتنی رقم بھی طلب کرو میں ادا کردوں گا۔ مجھے اجازت دو کہ اس گرجا کی زمین کو میں مسجد میں شریک کردوں، لیکن عیسائی راضی نہ ہوئے۔ عبدالملک بھی خاموش ہوگیا۔ پھر جب ولید بن عبدالملک نے اپنی حکومت کے زمانہ میں اسی خواہش کو عیسائیوں کے سامنے پیش کیا، اور بہت زیادہ غیر معمولی معاوضہ ادا کرنے پر آمادہ ہوا، مگر عیسائیوں نے حسب دستور جب انکار کیا، تو ولید کو غصہ آ گیا اور کہنے لگا کہ تم لوگ گویا اس پر مجبور کر رہے ہو کہ زبردستی میں اس گرجے کو منہدم کرادوں، البلاذری نے لکھا کہ ولید کی دھمکی پر عیسائیوں نے کہا کہ:

''ان من ھدم کنیسة جن او اصابتہ عاھة''

''گرجے کو جو ڈھاتا ہے اس کو جنون ہو جاتا ہے یا کسی سخت بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے''۔ (۱۰۰)

عیسائیوں کی اسی دھمکی نے ولید کی دھمکی کو جو صرف لفظی دھمکی تھی، خواہ مخواہ واقعہ کی شکل دے دی۔

لکھا ہے کہ خود اپنے ہاتھ میں پھاوڑا لے کر گرجا کی دیوار پر ولید چلانے لگا اور یوں یوحنا کا گرجا منہدم ہوگیا اور اس کی زمین مسجد میں شریک کردی گئی۔

اب اس کو عیسائیوں کی غلط دھمکی کا نتیجہ قرار دیجیے، یا ولید کے راج ہٹ کا نتیجہ سمجھئے۔ یہ فعل اسلامی ضوابط کے لحاظ سے قطعاً غلط تھا۔ کچھ ہی دن بعد عمر بن عبدالعزیز کے ہاتھ میں مروانی حکومت کی باگ جب آئی تو آپ نے حکم دیا کہ مسلمانوں کی اس مسجد میں گرجے کی جو زمین شریک ہوگئی ہے وہ عیسائیوں کو واپس دے دی جائے۔۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے لاکھوں لاکھ روپیہ کا مالی نقصان ہی نہیں ہو رہا

Marfat.com

تھا، بلکہ دنیا کی تعمیری عجائبات میں جو عمارت اس وقت تک شمار ہوتی ہے اس کی صورت بھی بگڑ جاتی، ماسوا اس کے عام مسلمانوں کے لیے یہ خیال بھی سخت تکلیف دہ تھا کہ:

"نهدم مسجدنا اذنا فيه و صلينا و نرد بيعة "(۱۰۱)

"کیا اپنی ایک ایسی مسجد کو ہم اپنے ہاتھوں ڈھادیں جس میں ہم اذان دیتے رہے اور نمازیں پڑھتے رہے اور اس کو گرجا بنادیں"۔

مگر مسلمانوں کے دینی جذبات کی عمر بن عبدالعزیز کی دینی عقل نے قطعی پرواہ نہ کی اور گرجے کی زمین کی واپسی پر ان کا اصرار بہر حال باقی رہا۔ کوئی دوسری صورت مسلمانوں کے لیے اس کے سوا باقی نہ رہی کہ باوجود حاکم قوم ہونے کے اپنے محکوم عیسائیوں کی خوشامد درآمد کریں۔ یہی تدبیر آخر اختیار کی گئی، وقت کے علمائے اسلام جن کی قیادت سلیمان بن حبیب المحاربی نے کی، عیسائیوں کے پاس پہنچے اور منت و سماجت سے کسی نہ کسی طرح عیسائیوں کو راضی کر لیا گیا کہ اس مطالبہ سے دست بردار ہو جائیں۔ عیسائیوں کا راضی نامہ جب پیش ہوا تو:

"فسر بذلك و امضاه "(۱۰۲)

"وہ اس پر خوش ہوئے اور راضی نامہ کے مطابق فرمان جاری کیا"۔

اور یہ تو خیر ایک گرجا یا ایک مکان کا قصہ ہے، ذرا خیال تو کیجیے سمرقند جیسے غدار شہر کا، مسلمانوں کا مشہور سپہ سالار قتیبہ اس کو فتح کر چکا ہے، خراسان کے اس مشہور مرکزی شہر میں مسلمان آباد ہو چکے ہیں، مسجدوں اور مدرسوں (الف، الف) سے شہر معمور ہو چکا ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت کا زمانہ ہے، سمرقند کے غیر مسلم طبقہ کا ایک وفد خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ معروضہ پیش کرتا ہے کہ:

"غدر اور عہد شکنی سے کام لے کر قتیبہ نے ہمارے شہر پر قبضہ کیا اور

Marfat.com

مسلمانوں کو اس شہر میں اس نے آباد کیا ہے''۔(۱۰۳)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے وفد کے اس معروضہ کو حاکم سمرقند کے پاس اس فرمان کے ساتھ واپس کیا کہ:

''عدالت کے کسی قاضی کے سپرد سمرقند کا معاملہ کر دیا جائے اور حکم دیا جائے کہ واقعی ان لوگوں کے ساتھ کیا صورت پیش آئی ہے، تحقیقات سے اگر ثابت ہو جائے کہ وفد والوں کا دعویٰ صحیح ہے تو اسی وقت مسلمانوں کو سمرقند چھوڑ دینے پر مجبور کیا جائے''۔(۱۰۴)

اس فرمان کے ساتھ وفد حاکم سمرقند کے پاس واپس لوٹا، جمیع بن حاضر نامی قاضی کو بلا کر مقدمہ حاکم نے ان کے سپرد کر دیا۔

قاضی جمیع نے بھی ہر قسم کی جنبہ داری سے الگ ہو کر مقدمہ کی چھان بین شروع کی، شہادتوں اور دوسرے دلائل کی روشنی میں وہ اسی نتیجہ تک پہنچے کہ واقعتاً سمرقند والوں کے ساتھ غدر کیا گیا ہے، اسی بنیاد پر انہوں نے فیصلہ صادر کیا کہ:

''مسلمان سمرقند کو چھوڑ کر فوراً باہر نکل جائیں اور اس کے بعد سمرقند والوں کو آزادی دی جائے کہ مسلمانوں کے ساتھ جو معاملہ چاہیں اختیار کریں، اسی طرح شہر سے نکل جانے کے بعد مسلمانوں کو بھی اختیار ہوگا، جو طرز عمل چاہیں اختیار کریں''۔(۱۰۵)

الغرض شہر سے نکلنے کے بعد ''منابذہ علی السواء'' کے اصول پر قاضی نے فیصلہ کیا کہ عمل کیا جائے۔

سمرقند کے غیر مسلم باشندوں کے سامنے یہ فیصلہ جب پیش ہوا تو انہوں نے باہم مشورہ کیا کہ نکل جانے کے بعد مسلمانوں نے پھر شہر پر اگر حملہ کیا تو خواہ مخواہ جنگ کے شعلوں میں ہم گھر جائیں گے، لکھا ہے کہ مشورے کے بعد حاکم کے سامنے

Marfat.com

ان لوگوں نے حاضر ہوکر اپنا یا ز دعوی ان الفاظ میں پیش کیا کہ:

''ہم جنگ کرنا نہیں چاہتے اور خوشی کے ساتھ سمرقند میں مسلمانوں کے قیام پر راضی ہیں''۔(۱۰۶)

اور یوں بات ٹل گئی ورنہ دنیا دیکھتی کہ سمرقند جیسے شہر میں آباد ہو جانے اور مساجد و مصلی، مدارس و مکاتب کے قائم کر دینے کے بعد بھی معاہدے کی تکمیل کے لیے مسلمان محض اپنے دین کی وجہ سے باہر نکل آئے اور اس قسم کے قصے کچھ حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسے خلفاء کی حد تک محدود نہیں ہیں، اسی سمرقند ہی کے متعلق تاریخوں میں واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ خلیفہ معتصم باللہ عباسی کے زمانہ میں امام اور مؤذن کو خلیفہ کے حکم سے اس لیے درے لگائے گئے کہ اسی سمرقند کے کسی آتش کدہ کو توڑ کر دونوں نے مسجد بنا دیا تھا (ب۔ب)۔(۱۰۷)

ممکن ہے کہ اب سمرقند میں ایسی کوئی عبادت گاہ نہ ملے جس میں بجائے خالق کے آگ جیسی مخلوق کی عبادت آدم کی اولاد کرتی ہو، لیکن اس علاقے بلکہ سارے ایرانی علاقے کی عبادت گاہوں کے تعلقات میں یہ تبدیلی یعنی مخلوق سے ان کا رشتہ توڑ کر خالق ہی کی عبادت کے لیے اب جو وہ مختص نظر آ رہی ہیں، کیا اس انقلاب میں جبر اور زبردستی سے کام لیا گیا ہے؟۔ میں یہ جانتا ہوں کہ ایرانی علاقے کی عبادت گاہوں کے اس انقلاب کو نہ جاننے والوں نے ابتدائے اسلام کے پر جوش مجاہدین کے تشدد اور زبردستی کی طرف منسوب کر رکھا ہے۔ سمجھا دیا گیا کہ قبضہ کرنے کے ساتھ ہی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ کارروائی کی گئی، باور کرایا جاتا ہے کہ ایران اسی زمانہ میں غیر مسلموں سے خالی ہو گیا تھا۔

لیکن نہ جاننے والوں یا جان کر انجان بننے والوں کی ان باتوں کو میں کیسے مان لوں، جب مشاہدہ کرنے والوں کی کتابوں میں ان کے ان مشاہدات کو پڑھتا

ہوں ۔ ابن حوقل جس کے متعلق بی بی ، اسٹریج کا تخمینہ یہ ہے کہ سنہ عیسوی کے حساب سے اس نے اپنی کتاب ۹۷۸ یعنی دسوی صدی عیسوی میں لکھی ہے ۔ دوسرے الفاظ میں جس کا مطلب یہی ہوا کہ ظہور اسلام سے چار سو سال بعد جیسا کہ اس کا خود بیان ہے ، اسلامی ممالک میں گھوم گھوم کر خود اپنے چشم دید حالات قلم بند کیے ہیں ۔ بہر حال اس جغرافیائی سفر نامے میں ابن حوقل ایران کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہے ، ترجمہ کے ساتھ میں بجنسہ اس کے عربی الفاظ کو نقل کر دیتا ہوں ، جو یہ ہیں :

''و اما بیوت نیرانها فانها لا تخلوا ناحیة و لا مدینة بفارس الا القلیل من بیوت النیران و المجوس اکثر الملل بها'' (۱۰۸)

''باقی ایران کے آتشکدے سو حال یہ ہے کہ بجز ایران کے چند مقامات کے کوئی علاقہ اور کوئی شہر ان آتشکدوں سے خالی نہیں ہے اور ایران میں دوسرے ادیان و مذاہب والوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ تعداد مجوسیوں یعنی آتش پرست پارسیوں ہی کی ہے''۔

یہ سنی سنائی نہیں بلکہ اپنی آنکھوں دیکھی بات ہے ، دوسرا سیاح مسعودی ہے ۔ فتح ایران کے تین سو سال بعد اس نے ایران کی سیر کی ہے ، اس کی بھی شہادت یہی ہے کہ :

''عراق ، فارس ، کرمان ، سجستان ، خراسان ، آذربائیجان اور آران یعنی ایران کے تمام حصوں میں آتشکدے اور دو خے بنے ہوئے اس نے پائے''۔ (۱۰۹)

آرنلڈ نے نکولا دے خانکوف کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ :

''اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں بارہ ہزار خاندان آتش پرستوں کے کرمان میں موجود تھے''۔ (۱۱۰)

جب دسویں صدی عیسوی سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک کی یہ گواہیاں

Marfat.com

ہمارے پاس موجود ہیں تو بتایا جائے کہ محض دعویٰ کرنے والوں کے صرف دعویٰ کی بنیاد پر میں یہ کیسے تسلیم کروں کہ آگ جیسی مخلوق کی جگہ آج ایران کی ہر عبادت گاہ میں صرف خالق کردگار کی عبادت کا نظارہ جو دیکھا جا رہا ہے، اس انقلاب میں زور اور زبردستی سے کام لیا گیا۔ دسویں صدی عیسوی تک میں ایران کی اکثریت پارسیوں ہی کی تھی۔ تو جبر ظلم و زیادتی کا یہ افسانہ افسانہ کے سوا اور بھی کچھ رہ جاتا ہے؟ بلکہ واقعہ کی صحیح تصویر وہی ہے کہ آتشکدوں کو ڈھا کر نہیں بلکہ ڈھانے والوں کو درے کی سزا دے دے کر ایران کی عبادت گاہوں کے تعلق کے بدلنے میں مسلمانوں نے کامیابی حاصل کی۔

اس قسم کی باتیں مثلاً یہی کہ معتصم نے آتشکدے کے ڈھانے کے جرم میں مؤذن اور امام کی کوڑے سے خبر لی۔ لوگ جب ان کو سنتے ہیں دل میں ان کے خیال گذرتا ہے کہ اسلامی حمیت و غیرت کا جوش جس اسلامی حکمرانوں میں شاید ٹھنڈا پڑ گیا تھا، یہ باتیں ان کے زمانہ کی ہیں۔ بلکہ اسلامی حکومتوں میں غیر مسلم طبقات کے درخور اور بڑے بڑے منصب تک ان کی رسائی کے قصوں سے تاریخیں جو معمور ہیں تو ان سارے قصوں میں سمجھا جاتا ہے کہ دخل اسلام اور اسلام کے قوانین و تعلیمات کو نہ تھا (ج۔ج) بلکہ جیسے جیسے اسلامی امور سے لاپروائی حکمرانوں میں بڑھتی چلی گئی، غیر قوموں کے ساتھ رواداری میں زیادہ فراخ چشمی سے وہ کام کرنے لگے۔

اور اسی غلط مفروضے کو بنیاد بنا کر ہر اسلامی ملک کی تاریخ خصوصاً ہندوستان کی کچھ اس طریقہ سے مرتب کی گئی ہے جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اسلامی زندگی سے جو زیادہ قریب تھے، ان بادشاہوں نے دینی تعصب کی وجہ سے غیر قوموں پر ہر قسم کے ظلم و ستم کو روا رکھا اور طرح طرح سے ان کو پریشان کیا۔ البتہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کا وزن علماً یا عملاً جن کے قلوب میں باقی نہ رہا تھا، یا کم ہو

Marfat.com

گیا تھا اگر غیر مسلموں کے ساتھ کچھ رواداریاں ہوتی ہیں تو ان ہی کی طرف سے ہوتی ہیں۔ مگر کہنے والوں کی زبانوں اور کہنے والوں کے قلم کو کون روک سکتا ہے۔

ابھی ابھی معتصم عباسی نہیں، بلکہ حضرت عمرؓ بن عبد العزیز خلیفہ کی حکومت کے زمانہ کے چند واقعات کا ذکر میں نے ہی آپ کے سامنے کیا ہے، آپ سن چکے کہ جس مسجد میں مسلمان اذانیں دے رہے تھے، نمازیں پڑھ رہے تھے، اس مسجد تک کو گرجا بنانے پر عمرؓ بن عبد العزیز کی بے دینی نہیں، بلکہ دین داری مجبور کر رہی تھی، بلکہ پورے شہر سمرقند اور اس کی مسجدوں، مدرسوں تک کے چھوڑنے کا حکم مسلمانوں کو ان ہی عمرؓ بن عبد العزیز کی بے دینی نے نہیں بلکہ دین ہی نے دلایا تھا۔ میں یہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ اسلامی دین کے احترام کرنے والے سلاطین اور سختی کے ساتھ اس کے ایک ایک جزئیہ پر اصرار کرنے والے حکمرانوں میں عمرؓ بن عبد العزیز کے سامنے بجز خلفائے راشدین کے کیا کوئی ٹھہر سکتا ہے؟ پھر غیر مسلم اقوام کے ساتھ رواداریوں کی یہ توجیہ کتنی غلط ہے کہ اسلام سے بعد اور دوری نے ان کو پیدا کیا تھا؟ میں نے پہلے یہی کہا ہے کہ تیرہ صدیوں کے اس طویل زمانے میں دنیا کے مختلف حصوں کے اندر حکومت کرنے والے مسلمان سلاطین اور بادشاہوں کی تعداد ہزارہا ہزار سے متجاوز ہے، کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ہمارے سارے سلاطینِ سلف معصوم اور غلطیوں سے پاک تھے، ہمارا نہ عقیدہ ہے اور نہ یہ واقعہ ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ بادشاہوں کو قانون کی گرفت سے یہی وجہ تو ہے کہ اسلام نے کبھی مستثنیٰ نہیں قرار دیا۔ یقیناً اچھوں کے ساتھ ان میں بڑی تعداد ایسوں کی بھی تھی جنہوں نے غیر مسلموں ہی کو کیا، خود مسلمانوں کو اپنے حرص و ہوا کا تختۂ مشق بنانے میں کوئی کمی نہیں کی۔ لیکن ان کی ستم رانیاں جو مسلمانوں پر ہوئیں ان کو جیسے اس دین کی طرف منسوب کرنا غلط ہے، جس کی طرف اپنے آپ کو وہ منسوب کرتے تھے۔ اسی طرح غیر مسلموں کے

ساتھ جو زیادتیاں ان کی طرف سے ہوئی ہیں، یقیناً بہت بڑا ظلم ہوگا اگر اس دین کا اثر یا نتیجہ ان کو قرار دیا جائے، جس کا پیرو اپنے آپ کو وہ ظاہر کرتے ہیں۔

افسوس ہے کہ تفصیل میں بات بہت پھیل جائے گی، لیکن میرا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام کی اشاعت وتبلیغ میں ہمیشہ ان اسلامی حکمرانوں سے نقصان ہی پہنچا ہے، جنہوں نے ان ذمہ داریوں کی طرف سے لا پروائی برتی، جن کا مطالبہ اسلامی حکومت سے اسلام اور پیغمبر اسلام اور ان کے سچے اور رشید جانشینوں نے بار بار کیا ہے، اور آخر وقت تک ان ذمہ داریوں کی تکمیل کی تاکید فرماتے رہے ہیں۔ اگر ان ذمہ داریوں کو وہ اسی طرح پوری کرتے، جیسے عمر بن عبدالعزیز اور ان جیسے دوسرے دین دار خلفاء اور سلاطین نے کی، تو اسلامی جغرافیہ کا دائرہ موجودہ دائرہ سے کہیں زیادہ وسیع ہو جاتا۔

یہی عمر بن عبدالعزیز ہیں جو مسجد کو گرجا بنانے پر ایک اسلامی شہر کو بخوشی ورضا غیر مسلموں کے حوالہ کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ حالانکہ کل ڈھائی سال حکمرانی کا موقع ان کو ملا ہے۔ لیکن آپ تاریخوں کو اٹھا کر پڑھیے، مشرق ومغرب میں اسلامی دین کے حلقے میں داخل ہونے والوں کی تعداد ان کے زمانہ میں جتنی زیادہ بڑھی ہے، خلفائے راشدین کے بعد میں تو نہیں جانتا کہ دین کی اشاعت عام میں یہ کامیابی کسی دوسرے مسلمان بادشاہ یا حکمران کے زمانہ میں حاصل ہوئی، ابن عساکر نے لکھا ہے کہ:

"اسلم عامة البربر فی ولایته" (۱۱۱)

"ان کی حکمرانی ہی کے زمانہ میں افریقہ کے عام بربری قوموں نے اسلام قبول کیا"۔

اشارہ اسماعیل بن عبید اللہ کی حکومت کی طرف ہے جنہیں، حضرت عمر بن

عبد العزیز نے افریقہ کا حاکم و گورنر بنا کر بھیجا تھا۔ اسی طرح عمر بن عبد العزیز کے حالات میں مشرق مثلاً خراسان، ایران، سندھ وغیرہ کے متعلق اس قسم کی چیزیں تاریخ کی کتابوں میں بکثرت ملتی چلی جائیں گی۔ مثلاً عمر بن عبد العزیز کے خراسانی گورنر جراح بن عبد الحمید کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ:

"فاسلم علی یدہ نحوار بعۃ الآف"(۱۱۲)

"چار ہزار آدمی نے صرف جراح کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا"۔

سوال یہی ہے کہ مغرب ومشرق کے ان دور دراز علاقوں میں اسلام کی اشاعت اس وسیع پیمانہ پر عمر بن عبد العزیز کی ڈھائی سال کی حکومت میں جو ہوئی، تو ایک آدھ واقعہ بھی تاریخ سے نکال کر دکھایا جا سکتا ہے، جس سے معلوم ہو کہ غیر مسلموں کا بال بھی اس سلسلہ میں کہیں غلطی سے کھینچا گیا؟ اب میں کیا کہوں، عمر بن عبد العزیز جن کے اس گشتی فرمان کی نقل کتابوں میں آج تک نقل ہوتی چلی جارہی ہے، ترجمہ جس کا یہ ہے، فرمان حکام اور سلطنت کے ولاۃ و گورنروں کے نام تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے بندے عمر امیر المؤمنین کی طرف سے سلام علیکم!

"اللہ جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، اس کی تعریف وثنا کے بعد میں تم کو خصوصیت کے ساتھ حکومت کے ان غیر مسلم باشندوں کی طرف متوجہ کرتا ہوں جن کی جان و مال، عزت وآبرو کی حفاظت کی ذمہ داری کی گئی ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے اور یہ کہ ان لوگوں میں جو سن رسیدہ اور ضعیف ہو جائیں اور غریب ہو کر ان کے مصارف کی پابجائی حکومت کی طرف سے کی جائے اور ان کے رشتہ داروں کو بھی ان کی کفالت کی طرف توجہ دلائی جائے"۔(۱۱۳)

گویا بیمہ وغیرہ کے جھگڑوں سے مسلمانوں کو اسلامی بیت المال کے نظام

نے سبک دوش کر رکھا تھا، یہی اطمینان ملک کے ہر باشندے کو دلایا گیا تھا۔

صرف غرباء اور معذوروں ہی کو نہیں بلکہ اسلامی بیت المال سے جیسے وظائف وغیرہ مسلمانوں کو عطا کیے جاتے تھے، ابن سعد ہی نے لکھا ہے کہ غیر مسلموں کو بھی عمر بن عبدالعزیزؒ نے شریک کر لیا تھا، اسلامی سلاطین کے حالات میں لوگ جب پڑھتے ہیں کہ انعام واکرام کے سلسلہ میں فلاں غیر مسلم کو انہوں نے اتنی بڑی رقم دے دی تو خیال کر لیا جاتا کہ ان کے دینی رجحانات کی سستی کا یہ نتیجہ تھا، لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ کے متعلق یہی سوچنے والے کیا سوچیں گے جب ابن سعد سناتے ہیں کہ دس بیس روپے نہیں بلکہ:

"انه اعطى بطريقا الف دينار" (۱۱۴)

''ایک عیسائی پادری کو عمر بن عبدالعزیزؒ نے ہزار اشرفیاں دیں''۔

ہزار طلائی سکہ کی قیمت نقرئی سکے سے کیا ہوئی؟ اس کی تفصیل کے لیے سکوں کی تاریخ پڑھیے۔ یہ کوئی انفرادی معاملہ نہ تھا، عمر بن عبدالعزیز کی طرف سے مدینہ منورہ کے دفتر کا جو دیوان تھا، نام ان کا عیسیٰ بن ابی عطا ہے، ابن سعد نے ان کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ:

''بسا اوقات وہ بیت المال سے (غیر مسلم) لوگوں کی امداد کرتے تھے''۔ (۱۱۵)

اور سچ تو یہی ہے کہ ان سے پہلے بنی امیہ کے حکمرانوں نے جس کسی سے خلاف قانون ایک پیسہ بھی وصول کیا تھا، باتفاق مورخین عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنی حکومت کے زمانہ میں حساب کر کے ہر ایک تک اس کے حق کو پہنچایا، حتی کہ:

''عراق کا خزانہ جب بازگشت کی رقوم کے بندوبست کرنے سے معذور ہو گیا، تو مرکز (شام) کے خزانہ سے مزید رقم بھجوائی گئی'' (۱۱۶)

ایسی صورت میں ان کی طرف سے کسی تشدد یا سختی کا احتمال ہی کیا ہے۔

Marfat.com

مشہور ہے کہ دیر سمعان جہاں مرض الموت میں عمر بن عبد العزیزؒ مبتلا ہوئے اور یقین ہو گیا کہ اس مرض سے جان بر نہ ہوسکیں گے، تو اسی صحرائی میدان میں قبر کے لیے چاہا کہ زمین خرید لی جائے، معلوم ہوا کہ اس نواح کی ساری آراضی غیر مسلموں کی ہے، آپ نے ان ہی میں سے ایک شخص کو طلب کر کے کہا کہ میری قبر کے لیے تھوڑی سی زمین کیا تم فروخت کر سکتے ہو؟ بے چارے نے کہا کہ:

''امیر المومنین اس سے بڑی خوش نصیبی میری کیا ہوگی کہ آپ میری زمین میں دفن ہوں، میں خوش دلی سے اس زمین کو بغیر قیمت پیش کرتا ہوں''۔ (۱۱۷)

مگر عمر بن عبد العزیزؒ مفت لینے پر کسی طرح راضی نہ ہوئے بعض کہتے کہ دو اور بعضوں کا بیان ہے کہ دس اشرفیاں دے کر خلیفہ نے اپنی قبر کے لیے زمین اس غیر مسلم سے خریدی۔ (۱۱۸) ان ہی کے حالات میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کے علاقے سے مدن کے قریب کچھ لوگوں کو گرفتار کر کے غیر اسلامی علاقے کے لوگ لے گئے اور کہلا بھیجا کہ زرفدیہ کے بغیر ان قیدیوں کو ہم رہا نہیں کر سکتے، عمر بن عبد العزیز نے اسی وقت روپیہ روانہ کیا، چالان میں لکھا ہوا تھا کہ:

''اس رقم سے مرد و عورت، غلام اور اسلامی علاقے کے ان غیر مسلم باشندوں کا زرفدیہ ادا کیا جائے جس کی ذمہ دار ہماری حکومت ہے''۔ (۱۱۹)

جس کا مطلب یہی ہوا کہ دشمنوں سے چھڑانے اور رہائی دلانے تک میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں کسی قسم کی کوئی تفریق جائز نہیں رکھی جاتی تھی۔

یہ اور حسن سلوک و مراعات کے دوسرے طریقے ملک کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ عمر بن عبد العزیزؒ کی طرف سے جو اختیار کیے گئے تھے، کیا ان کی کٹر دینی زندگی کے سوا کسی دوسری چیز کو اس میں دخل تھا اور جس دین کی طرف سے اور دین

Marfat.com

پر چلنے والوں کی طرف سے اس نوعیت کے تجربات انسانی فطرت کو ہوں گے یا ان کے لازمی نتائج واثرات سے وہ بچ سکتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے متعلق ابن سعد ہی نے جو یہ لکھا ہے کہ:

"کتب ان تعمل الخانات بطریق خراسان" (۱۲۰)

"کہ انہوں نے یہ فرمان نافذ کیا کہ خراسان کے راستہ میں سرائیں بنوائی جائیں"۔

خود ان کے اس کام کا جو اثر خراسان کے غیر مسلم باشندوں پر مرتب ہوا تھا، اس کا اظہار ہرات کے دہقان (دلیس مکھ) نے خراسان کے گورنر اسد بن عبداللہ کے دربار میں جن لفظوں میں کیا تھا، آج تک تاریخوں میں محفوظ ہے۔ دلیس مکھ تحفے تحائف کے ساتھ گورنر کے دربار میں آیا تھا، اس کو تقریر کا موقع بھی گورنر کے دربار میں دیا گیا، اسی میں اس نے دوسرے امور کے ساتھ یہ بھی کہا تھا:

"میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کی کتخدائیت (حکمرانی) سے بہتر حکومت میں نے نہیں دیکھی، آپ نے اپنے اسٹاف اور حاشیہ اور اپنے خاندان کے لوگوں کو ایسے دباؤ میں رکھا ہے کہ کوئی بڑا کسی چھوٹے پر، یا کوئی امیر کسی غریب پر ظلم و زیادتی نہیں کر سکتا (۔۔۔)، میں تو کتخدائیت (حکمرانی) کا اسی کو کمال سمجھتا ہوں، اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ بیابان اور صحرائی راستوں میں جو ایوانات (یعنی مکانات) آپ کی حکومت کی طرف سے بنوائے گئے ہیں اور مشرق سے جو لوگ مغرب جاتے ہیں، یا مغرب والے مشرق کی طرف سے جب آتے ہیں تو ان ایوانات کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ بنانے والے نے کتنے اچھے مکانات (راستہ) میں یہ بنوادیئے ہیں"۔ (۱۲۱)

تاریخ کی ان شہادتوں کو پڑھنے کی بعد اس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایام حکومت میں لوگ دین اللہ یعنی اسلامی دائرے میں

Marfat.com

بلشرت یوں داخل ہوئے۔

بد اندیشیوں کی برگندہ باد آنکھیں ان اجڑے ہوئے مکانوں اور جلائی ہوئی بستیوں، ڈھائے ہوئے کل سراؤں میں اشاعت اسلام کے اسباب کو تلاش کرتی ہیں جن کا وجود ان ہی غلط سوچنے والوں کے دماغوں کے سوا نہ پہلے دیکھا گیا اور نہ بعد وان کا سراغ خدا کی زمین پر ملا ہے، لیکن یہ تو غلط مفروضات سے نکالے ہوئے غلط نتائج ہیں۔

لیکن حقائق و واقعات کی وہ ایسی گواہیاں جنہیں دوست ہی نہیں دشمن بھی جھٹلا نہیں سکتے، ان کو سن کر بتائیے کہ آدمی کس نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے، یہی اسد بن عبداللہ کی تخدائیت کا اعتراف ہرات کے دیس مکھ (دہقان) نے مذکورہ بالا الفاظ میں کیا تھا، وہ کوئی بناوٹی اور خوشامد کی بات تھی؟ اب میں کیا عرض کروں، ہرات کے دہقان نے تو صرف مسلمانوں کی حکومت کی تعریف کی تھی لیکن کچھ زیادہ دن گذرنے نہ پائے تھے کہ اسی اسد کے دربار میں ہم خراسان کے صوبہ بلخ کے اس امیر زادے کو پاتے ہیں، جس کا نام سامان تھا، کہ کھڑا ہوا ہے اور اسد کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کر رہا ہے، یہی سامان تھا جس کی طرف منسوب ہو کر غزنویوں سے پہلے سامانیوں کی اسلامی حکومت خراسان میں صدیوں بڑے جاہ جلال کے ساتھ قائم رہی، آرنلڈ نے لکھا ہے کہ:

> "سامان نے مسلمان ہو کر اپنا نام اپنے معاون (یعنی اسلام لانے میں جس نے مدد کی تھی، اسی کے نام (اسد پر) اپنا نام اسد رکھا اور یہی نومسلم امیر زادہ تھا جس سے دولت سامانیہ کا نام چلا"۔ (۱۲۲)

خلاصہ یہ ہے کہ جن ممالک اور علاقوں میں صدہا سال تک مسلمانوں کی حکومت قائم رہی ان میں سو دو سو نہیں آج بھی کروڑ ہا کروڑ کی تعداد میں جو غیر مسلم

Marfat.com

طبقات کے افراد پائے جاتے ہیں، کیا یہ خود کھلی شہادت اس مفروضہ کی تردید کے لیے کافی نہیں کہ اسلام کی اشاعت میں جبر وظلم سے کام لیا گیا اور تو اور خود ہندوستان ہی کے متعلق مسٹر آرنلڈ کا یہ سوال یقیناً قابل غور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کا انکار کون کرسکتا ہے کہ:

''دہلی اور آگرہ کے اضلاع میں جو اسلامی قوت وسطوت کے مرکز تھے، مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے بہت کم ہے، دہلی کے اضلاع میں دسویں حصہ سے زیادہ اور آگرہ کے ضلع میں چوتھائی حصہ بھی کل آبادی کا مسلمان نہیں ہے''۔ (۱۲۳)

بلکہ ہندوستان کے راجپوت مسلمانوں یا جاٹ مسلمانوں کے متعلق یہ مشہور کرنے کی کوشش جو کی جاتی ہے کہ فلاں بادشاہ کے عہد میں جبراً ان کے باپ دادوں کو اسلام میں داخل کیا گیا، کسی نے ان ہی راجپوت مسلمانوں کی بستیوں میں پہنچ کر دریافت کیا تھا کہ آپ کے گاؤں میں بنیوں اور شودروں وغیرہ کی جو آبادی ہے یہ بھی تو قدیم زمانہ ہی سے چلی آتی ہے، اگر جبر سے کام لیا گیا تو کیا یہ مان لینا چاہیے کہ بنیوں اور شودروں کے باپ دادا سے بھی زیادہ راجپوتوں کے بہادر اور جنگ جو آباؤاجداد کمزور اور بیٹے تھے کہ مسلمانوں کے تشدد کے مقابلہ میں انہوں نے بجائے مقابلہ کے گھٹنے ٹیک دیئے اور بنیوں یا شودروں کے اسلاف باوجود سختیوں کے اپنے قدیم آبائی دین پر ڈٹے رہے (د،د)۔

یہی نہیں کہ ان ممالک میں غیر مسلموں کی اکثریت اب تک باقی ہے بلکہ یہ واقعہ ہے کہ غیر اسلامی علاقوں سے ہر زمانہ میں بڑی تعداد ان ہی لوگوں کی جو مسلمان نہیں تھے، اسلامی حکومت کی رواداری، عدل وانصاف وغیرہ کا مشاہدہ کرکر کے اسلامی قلم رو میں مسلسل نقل ہوتی رہی ہے، آرنلڈ نے مغربی مورخین کی کتابوں

Marfat.com

سے ایسی بہت سی مثالیں نقل کی ہیں، مثلاً یہی کہ:

''پندرہویں صدی کی اخیر میں اسپین کے بے شمار یہودی (مسلمانوں کی ترکی حکومت کے علاقہ میں) پناہ کے لیے آئے'' (۱۲۴)

خود عیسائیوں نے عیسائی حکومت کے مقابلہ میں ترک مسلمانوں کی حکومت کو بسا اوقات ترجیح دی، تفصیل کے لیے دیکھیے آرنلڈ کی کتاب۔ دراصل یہی واقعات ہیں جن کو پڑھنے کے بعد یہ الٹی تقریر اشاعتِ اسلام کے اسباب کے سلسلہ میں بعض جوشیلے پادریوں کو کرنی پڑی، آرنلڈ ہی نے نقل کیا ہے ایک پادری سارے حالات کا صحیح جائزہ لینے کے بعد لکھتا ہے:

''یہ غلط قصہ ہے کہ مسلمان غیر مذہب والوں سے کہتے تھے کہ یا تو قرآن کو مانو یا تلوار اٹھاؤ۔ اگر سچ ہوتا تو بہت سے عیسائی ایسے تھے جو مسیحی دین کے لیے لڑکر اور مرکر شہادت کا رتبہ حاصل کرتے''۔ (۱۲۵)

پھر یہی جوشیلا مشنری مبلغ عیسائیت کہتا ہے کہ درحقیقت مسلمانوں کی حکومت کی:

''مہربانیوں نے ان عیسائیوں کو مسلمان کر ڈالا جن پر ظلم کچھ اثر نہ کرسکتا تھا (ھ، ھ)''۔ (۱۲۶) گویا:

آدمی ظلم کا مارا تو پنپ جاتا ہے   مہربانی سے مٹاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

عیسائیت کی طرف سے بھی شکایت اسلام کی جاتی ہے لیکن ہم اس کے جواب میں اردو کے اس مشہور شعر کے سوا اور کیا پڑھیں

چاہ کا نام جب آتا ہے بگڑ جاتے ہو   تم ہی بتلاؤ کہ آخر تمہیں چاہیں کیونکر

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسلامی قلم رو میں غیر مسلم طبقات کو زیادہ تر حق وانصاف سے استفادہ کا موقع ان ہی حکمرانوں کے زمانہ میں ملا ہے جو اسلام کی روح سے قریب تھے۔ مگر اب اس کا کیا علاج ہے کہ مسلمان بادشاہوں میں جو

Marfat.com

بیچارے نسبتاً اپنے دین کے زیادہ پابند تھے، محض ان کی یہی دینی زندگی اور مذہبی پابندی بدگمانی کی وجہ بن گئی اور واقعات سے ہٹ کر یہ شروع ہی میں فرض کر لیا گیا کہ اسلامی دین کی پابندی کے ساتھ بھلا دوسرے ادیان و مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ انصاف وعدل یا رحم ونرمی کا برتاؤ کوئی کیسے کر سکتا ہے؟ پھر اس غلط مفروضہ پر غلطیوں کی پوری عمارت کھڑی کرنے والوں نے کھڑی کر لی، عالمگیر یا ان جیسے دین دار سلاطین کی بدنامی اسی غلط خیال اور اسی قسم کے خود تراشیدہ اوہام پر مبنی ہے، ورنہ واقعہ وہی ہے کہ دین دار بادشاہوں نے جس حد تک اسلام کے ان ضوابط کی پابندی کی کوشش کی ہے، جن کا مطالبہ اسلامی قلم رو کے باشندوں کے متعلق اسلام نے کیا ہے، قدرتاً اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اسلام کی طرف لوگوں کی رغبت بڑھ جاتی تھی۔ اسی کو دیکھ کر شور کر دیا جاتا ہے کہ دینی تعصب کے نشہ میں سرشار ہو کر بادشاہ نے جبر وظلم سے کام لیا اور یوں مجبوراً لوگ مسلمان ہو گئے۔

حالانکہ کلیۃً اگر یہ صحیح نہ ہو تو عموماً یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ غیر مسلم باشندوں کو بھی مسلمان بادشاہوں کے عہدِ حکومت میں کچھ تکلیف اگر پہنچی بھی ہے تو زیادہ تر یہ اسی قسم کے سلاطین تھے، جن کا دین سے تعلق کمزور تھا۔ بجائے دینی ہدایات کے اپنی من مانی خواہشوں یا مصلحتوں کے ساتھ ان کی کاروائیاں وابستہ تھیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس قسم کے ست کردار، ست اعتقاد اور بدبخت بادشاہوں سے غیر مسلم رعایا ہی کو نہیں، بلکہ مسلم رعایا کو بھی کافی مصیبتیں برداشت کرنی پڑی ہیں اور اسلام کی اشاعت کی راہ میں تو اس طرز کے حکمرانوں کا وجود ہمیشہ بدترین رکاوٹ ثابت ہوا ہے، الجزیرہ یعنی دجلہ وفرات کے درمیانی علاقہ کی آبادیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن حوقل نے اپنی کتاب میں لکھا ہے، نقل کرتے ہوئے قلم کانپتا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

Marfat.com

''ان ساکنی ارض الجزیرة تنصروا بظلم (و،و) آل حمدان'' (۱۲۷)

''جزیرہ کے باشندوں نے آل حمدان کے ظلم سے تنگ آ کر عیسائی مذہب اختیار کرلیا ہے''۔

اس کے بعد اس نے بیان کیا ہے کہ عیسائی ہو ہو کر جوق کے جوق مسلمانوں کی جماعتیں رومیوں کے ساتھ مل گئیں اور اب وہی رومیوں کی معیت میں مسلمانوں پر اور ان کی آبادیوں پر حملے کر رہی ہیں ان الفاظ کو نقل کرنے کے بعد بے چارے کے قلم سے انا للہ و انا الیہ راجعون نکل گیا۔

آرنلڈ نے بھی پادری ڈن ٹن کے حوالہ سے ترکی سلطنت کے ذکر کے سلسلہ میں یہ لکھنے کے بعد کہ:

''اٹھارہویں صدی میں جب کہ عیسائی انہی سختیوں میں مبتلا تھے کہ کبھی ایسی سختیاں کسی زمانہ میں بھی ان پر نہ بیتی تھیں''۔ (۱۲۸)

ڈن ٹن لکھتا ہے کہ اس زمانے میں:

''عیسائیوں کے مسلمان ہونے کا ذکر کہیں دیکھنے میں نہیں آتا، بلکہ اس زمانہ کے ترکوں کے متعلق یہی لکھا گیا ہے کہ وہ اپنے مذہب کی ترقی سے غافل اور مذہبی شکوک میں مبتلا ہو گئے ہیں'' (ز،ز)۔ (۱۲۹)

بہر حال میں کہنا چاہوں گا کہ بجائے اسلام کے اسلامی حکمرانوں پر اس کا الزام عائد کرنا کہ ان کی غفلت یا وقت ناشناسی، یا ناعاقبت اندیشی نے مسلمانوں کے مفتوحہ و مقبوضہ ممالک میں غیر مسلموں کو باقی رہ جانے کا موقع دے دیا، صحیح نہیں ہے پہلے تو الزام سے اس طرز عمل کی تعبیر ہی غلط ہے اور کسی کو الزام ہی اگر وہ نظر آتا ہے تو چاہیے کہ اس الزام کا نشانہ مسلمان حکمرانوں کو نہیں، بلکہ اسلام اور اسلام کے ان قوانین وضوابط کو بنائے جن کا اجمالاً ذکر آپ سن چکے۔ خود قرآن میں جن جن کی پابندی

Marfat.com

کا سختی کے ساتھ مطالبہ کیا گیا ہے اور آنحضرت ﷺ آپ کے خلفائے راشدین نے برت برت کر جسے دکھایا تھا، فتح خیبر ہی کا قصہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں چند یہودی آئے کہ فوج کے بعض لوگ ہمارے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں، سننے کے ساتھ ہی عبدالرحمن بن عوفؓ کو آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ گھوڑے پر سوار ہو کر ہر سپاہی تک یہ پہنچا دو کہ:

''جنت صرف مومن (یعنی اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی باتوں کے ماننے والے) کے لیے ہے''۔ (۱۳۰)

آنحضرت ﷺ نے پھر لوگوں کو جمع کیا اور آگاہ کیا کہ معاہدہ کر لینے کے بعد کسی قسم کی غیر قانونی حرکت یہودیوں کے ساتھ قطعی حرام ہے۔

بخاری ہی میں ہے کہ اسی موقع پر اس کی منادی بھی ہر طرف کی گئی کہ:

''معاہدہ کرنے والوں کو جو قتل کرے گا جنت کی بو بھی وہ پا نہ سکے گا، حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے سونگھی جاتی ہے''۔ (۱۳۱)

اسی موقع پر مسلمانوں کو خطاب کر کے رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا

''لوگو! تم یہودیوں کے باڑوں میں گھس پڑے، حالانکہ جن سے معاہدہ طے پا چکا ان کا مال قطعاً حرام ہے، مگر وہی جس کی قانون اجازت دے''۔ (۱۳۲)

یہ اور ایسی روایتوں کا ایک ذخیرہ صحابہ کے سینوں میں محفوظ تھا، انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ایک مصری عیسائی قریش کی طرف سے ایلچی بن کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا ''رو دآواز پیمبر نے اس کی سلیم فطرت کو فتراکِ نبوت کا نخچیر بنا دیا، آیا تھا آنحضرت ﷺ کو سمجھانے اور عرض کرنے لگا کہ آپ جس پیغام کو لائے ہیں، مجھے سمجھا دیجیے۔ اس نے ارادہ ظاہر کیا کہ مسلمان ہونے کا قطعی فیصلہ کر چکا ہوں اور اب قریش کے پاس واپس نہ جاؤں گا، سنتے ہی

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ نے اس کو کیا جواب دیا، ابوداؤد ہی کے سنن میں ہے:

''نہ میں عہد شکنی کرسکتا ہوں اور نہ کسی ایلچی (سفیر) اور برد (ڈاک والے) کو روک سکتا ہوں، تم کو چاہیے کہ جن لوگوں کی طرف سے سفیر بن کر آئے ہو، ان کے پاس واپس جاؤ اس کے بعد بھی تمہارے دل میں وہی خیال اگر باقی رہے جو اس وقت پیدا ہوا ہے، تو واپس آجانا''۔ (۱۳۳)

یہ مصری عیسائی سفیر جن کا نام غالباً بعد مسلمان ہونے کے ابورافع رکھا گیا، وہی بیان کرتے تھے کہ:

''میں قریش کے پاس واپس گیا اور پھر پلٹ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام کی دولت سے سرفراز ہوا''۔ (۱۳۴)

ان ہی تعلیمات اور عملی زندہ مثالوں کا نتیجہ تھا کہ نازک سے نازک ترین مواقع پر بھی مصالح اور عقلی عواقب سے قطعاً بے پرواہ ہوکر صحابہ معاہدہ کرکے احترام پر اصرار فرماتے رہے، ابھی مجھ ہی سے امیر معاویہؓ تک کے متعلق آپ نے سنا کہ عمرو بن عنبسہ صحابیؓ سے رسول اللہ ﷺ کی حدیث سننے کے ساتھ ہی اپنی ساری مصلحت اندیشیوں کو بالائے طاق رکھ کر فوج سمیت رومی سرحد سے واپس لوٹ گئے حالانکہ حریف کو زک پہنچانے کے مغتنم موقع کو کھودینے کے سوا کافی مالی تاوان ان کو برداشت کرنا پڑا۔ شام سے رومی سرحد تک فوج کو لیجانا اور لے آنا کیا معمولی مصارف سے ممکن ہے۔ مگر کچھ بھی ہو پیغمبر نے حکم دیا مومن نے سر جھکا دیا، مشہور تابعی میمون بن مہران کے حوالہ سے سیوطی نے اپنی تفسیر درمنثور میں یہ فتوی ان کا نقل کیا ہے، خلاصہ جس کا یہ ہے کہ:

''تین باتوں میں مسلم اور غیر مسلم کوئی ہو، سب برابر ہیں، ایک تو معاہدے کے معاملے میں کہ اس کی پابندی ہر حال میں ضروری ہے خواہ مسلمانوں سے

کیا جائے یا غیر مسلموں سے، اسی طرح رشتہ داری (صلہ رحمی) کے حقوق میں مسلم اور غیر مسلم کی خصوصیت نہیں، تیسرا مسئلہ امانت کا ہے کہ مسلم کی امانت ہو یا غیر مسلم کی، خیانت حرام ہے''۔ (۱۳۵)

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی حکمرانوں اور سلاطین کا عام حال بھی یہی ہے کہ جس حد تک اسلام اور اس دین کے اصول وضوابط سے ان کی زندگیاں قریب رہی ہیں، اسلامی قلمرو کے غیر مسلم طبقات کو بھی ان ہی کے زمانہ میں امن وامان، عاقبت وراحت کی زندگی میسر آتی رہی ہے اور ان ہی دیندار سلاطین اور ان کے دیندار حکام وولاۃ کے عہد میں اسلام کی اشاعت کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا ہے۔

اور مسلمانوں کی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کو کسی قسم کی تکلیف اگر اٹھانی پڑی، یا ان کے انسانی حقوق میں دست اندازی کے واقعات پیش بھی آئے ہیں تو میں بلاخوف وتردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ جو کچھ ہوا ہے، بے دین، اور ان ہی حکمرانوں کے زمانہ میں ہوا ہے اور ان ہی کے زمانہ میں ہو بھی سکتا تھا جن کے دلوں میں اسلامی قوانین کا وزن جیسا کہ چاہیے باقی نہ رہا تھا۔ گویا کہنا چاہیے کہ اسلام نہیں بلکہ ترکِ اسلام کے ہی لازمی نتائج تھے۔ اور سچی بات وہی ہے جس کا اعتراف بہت سے انصاف پسند مغربی سیاحوں اور مصنفین نے بھی کیا ہے کہ ان سختیوں کے قصوں میں مسلم وغیر مسلم کی خصوصیت نہ تھی۔ عام طور پر اس قسم کے بادشاہوں کے عہد میں مسلمانوں پر بھی وہی سب کچھ گذر رہا تھا جس سے ملک کے دوسرے طبقات متاثر تھے اور اسلام کی تاریخ اس کی شہادت ادا کرتی ہے کہ اسی قوم کے کوتاہ نصیب، بدبخت بادشاہوں کا زمانہ ایسا زمانہ ہمیشہ رہا ہے جس میں اسلام کی روشنی دنیا کی دوسری قوموں تک پہنچ نہ سکی۔

اور یہ کیفیت کچھ بادشاہوں اور سلاطین ہی کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ عام مسلمانوں کی حالت بھی اس مسئلہ میں یہی نظر آتی ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی زندگی جس زمانہ میں جہاں کہیں دین اور مذہب سے آراستہ و پیراستہ رہی ہے تو مسلمانوں کے ساتھ ان کے پڑوس میں رہنے والی غیر مسلم قوموں کو بھی ہمیشہ آرام ہی پہنچا ہے۔ سخت اور کڑی گھڑیوں میں مدد ملتی رہی ہے اور اسی کے ساتھ اسلام کو بھی موقع دوسروں کے قلوب میں اترنے کا اسی قسم کے مسلمانوں کے ذریعہ ملتا رہا ہے۔ لیکن برعکس اس کے عام مسلمانوں نے جب کبھی اور جہاں کہیں دین سے لاپروائی اختیار کی اور محض ایک خاص قسم کے نام رکھنے والی یا چند رسوم یا شعار سے تعلق رکھنے والی قوم کی حیثیت سے دوسری قوموں کے درمیان مسلمان پائے گئے ہیں تو کسی ایک جگہ یا کسی خاص زمانہ ہی میں نہیں بلکہ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اس قسم کے مسلمانوں سے مسلمانوں کو بھی اور مسلمانوں کے ساتھ دوسری غیر مسلم قوموں کو بھی شکایتیں پیدا ہوئی ہیں۔ باہم خود بھی دست و گریبان رہے اور دوسری قوموں کی نفرت و عداوت بھی ان سے بڑھتی چلی گئی۔ تا آنکہ بالآخر اسی نے جنگ و قتال کی حدود تک نفرت و عداوت کو پہنچا دیا۔ غیر قوموں کی مسلمانوں کے ساتھ اسی نفرت و عداوت کا نتیجہ یہ ہوتا رہا ہے کہ خود اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ کی لائی ہوئی کتاب (القرآن)، اس کی تعلیمات سے لوگ بجائے قریب ہونے کے دور، بہت دور بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ بسا اوقات دشمن بن گئے۔ ان نام نہاد مسلمانوں کی بے دینی کی زندگی کو دیکھ کر قوموں نے یہ سمجھ لیا کہ یہی مسلمانوں کی دینی زندگی ہے۔ نہ جاننے والے ان کے پیغمبر اور ان کی آسمانی کتاب پر ان کی اس زندگی کی ذمہ داری عائد کرنے لگتے ہیں۔ مگر سچی بات یہی ہے کہ اسلام کی اشاعت و توسیع میں بے دین بادشاہوں کے طرزِ عمل سے بہت

Marfat.com

زیادہ دخل ان ہی عام مسلمانوں کی غیر اسلامی زندگی کو ہے بلکہ یہ واقعہ ہے کہ سلف کے سلاطین کی شکایت عموماً اسی قسم کے مسلمان کرتے ہیں، جن کے قلوب میں خود اسلام کا اثر جیسا کہ چاہیے باقی نہیں رہا ہے۔ مسلمانوں کا یہ طبقہ سمجھتا ہے کہ موقع جب مل گیا تھا تو خواہ دین کا مطالبہ کچھ بھی ہوتا، ہمارے بادشاہوں کو اس سنہرے موقع سے نفع اٹھاتے ہوئے اپنی قلمرو کے غیر مسلم باشندوں کا صفایا کر دینا چاہیے تھا، یا ڈرا دھمکا کر مجبور کر کے چاہیے تھا کہ ان کو مسلمانوں کی جماعت میں شریک کر لیتے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام اور اسلامی قوانین و ضوابط کی جن لوگوں کی نگاہوں میں کوئی قیمت ہی نہیں ہے ان کے دلوں میں اسلام کا یہ درد آخر کس بنیاد پر اٹھ اٹھ کر ان کو بے چین کیے رہتا ہے۔ جب اسلام ہی کچھ نہیں ہے تو مسلمانوں کے باقی رہنے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے؟ اسلام تو نام ہی ایک خاص قسم کی زندگی کا ہے، جس کی بنیاد صرف چند غیر فانی صداقتوں کے یقین پر قائم ہے۔ اس یقین کی چول ہی جس کے اندر ڈھیلی ہو چکی ہے، اس کو مسلمانوں کی کیا پرواہ؟ وہ ان کے فنا و بقاء کے مسئلہ کو آخر کیوں سوچتا ہے (ت۔ح)۔

ممکن ہے کہ میری یہ حق گوئی بعضوں کے لیے تلخ ثابت ہو لیکن ہر مسلمان کو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہیے۔ ضمیر اس کا اگر بالکل مردہ اور بے جان ہو کر نہیں رہ گیا ہے تو یقیناً یہی تلخ فتویٰ خود اپنے قلب سے بھی وہ پائے گا:

"بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ٥ ولو القی معاذیرہ "(۱۳۶)

''بلکہ آدمی اپنے جی کے حال سے خوب واقف ہے، خواہ اس پر عذر کے پردے ہی کیوں نہ ڈالتا جائے''۔

دور کیوں جائیے، یہی ترک ہیں، ان کے سلاطین کو چھوڑیئے، عام ترکوں کا ایک زمانہ میں یہ حال تھا۔ پادری شیفلر جو ترکی علاقے کے عیسائیوں کے متعلق یہ

Marfat.com

خبریں سن سن کر کہ بہ تعداد کثیر وہ اسلامی دائرے میں مسلسل داخل ہوتے چلے جارہے ہیں۔ ترکی ملاقے میں پہنچا، گھومتے پھرتے اور عیسائیوں کے مسلمان ہونے کے اسباب کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد وہ جس نتیجہ تک پہنچا تھا، اسی کے الفاظ میں سنیے۔ شیفلر نے لکھا تھا:

''جب تم ترکوں سے ان کی روزمرہ زندگی میں ملو گے، اور دیکھو گے کہ وہ خدا کی عبادت کرتے ہیں، غریبوں کو خیرات دیتے ہیں، مسیح علیہ السلام کی نسبت اعلیٰ درجہ کے خیالات ان میں موجود ہیں، اور انجیل کا حد سے زیادہ ادب کرتے ہیں اور ایسی نیک باتیں ان سے معلوم ہوتی رہتی ہیں''۔ (۱۳۷)

یہ لکھنے کے بعد وہی آگے رقم طراز ہے:

''تو ان باتوں کو دیکھ کر تم کو خیال پیدا ہوگا کہ ترک اچھے لوگ ہیں اور غالباً نجات کے مستحق ہیں، پھر یہ سوچو گے کہ تم بھی ترک ہو جاؤ، تو تم کو بھی نجات مل جائے گی''۔ (۱۳۸)

اس نے لکھا ہے کہ یہی نازک نقطہ ہے، جہاں ہر عیسائی روح پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے اور:

''مقدس ثالوث، خدا کا مصلوب فرزند اور مذہب کے اور راز جو سوائے نورانی عقلوں کے کوئی نہیں جانتا، ہمارے دل سے محو ہو جائیں گے اور مسیحی دین بغیر معلوم ہوئے ہمارے دل سے غارت ہو جائے گا اور تم سمجھو گے کہ عیسائی ہونا اور مسلمان ہونا تو ایک ہی سی بات ہے''۔ (۱۳۹)

قدیم ترک مسلمانوں کی زندگی کے متعلق اپنے تاثرات کو نقل کرتے ہوئے ایک دوسرا عیسائی سیاح مصنف لکھتا ہے کہ:

''مسلمان عبادت اور پرہیزگاری اور خیرات دینے کے کیسے پابند ہیں۔

Marfat.com

جس وقت وہ مسجدوں میں ہوتے ہیں تو کس محویت سے خدا کی بندگی میں مصروف ہوتے ہیں۔ پاکیزگی اور تقدس ان میں کس درجہ ہوتا ہے۔ اپنے علمائے دین کے کیسے مطیع ہوتے ہیں۔ سلطان بھی سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتا کہ مفتی سے فتویٰ لے لے (ط.ظ)۔ پنج وقتہ نماز کے خواہ کیسی اور کسی کام میں ہوں، مسلمان کیسے پابند ہیں۔ کس طرح صبح سے رات تک روزے مہینہ بھر کے رکھتے ہیں۔ ان میں آپس میں کس قدر محبت اور سلوک ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ کیسا مخیر ہے (ی.ی)، ان کے شفاخانوں سے جو غریبوں اور مسکینوں کے لیے انہوں نے بنائے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ غیروں کے ساتھ بھی ان کو کس قدر ہمدردی ہے"۔ (١٤٠)

یہی مصنف آگے لکھتا ہے کہ:

"اگر ان کے مسلمانوں کے انصاف اور ان کی پرہیزگاری اور نیکیوں کا ہم خیال کریں تو ہم کو اپنے اوپر شرم آتی ہے کہ خدا کی بندگی اور آپس کے سلوک میں ہم کیسے سست قدم ہیں"۔ (١٤١)

آخر میں مصنف کا قلم قابو سے نکل گیا ہے لکھتا ہے کہ:

"ہم کو (یعنی یورپ و ایشیاء کے عیسائیوں کو) اپنی بے انصافیوں پر اپنے ظالم ہونے اور پرہیزگار نہ ہونے پر شرم آنی چاہیے۔ بیشک انصاف کے دن مسلمانوں کا پلہ ہم سے بھاری رہے گا۔ بیشک ان کا ایمان، ان کی نیکیاں ان کی رحم دلی، وہ چیزیں ہیں جن سے اسلام کو فروغ ہوا"۔ (١٤٢)

اسی سلسلے میں شہنشاہ لیوپولڈ کے ایک ترکی سفیر کی یادداشت یا اس رپورٹ سے جو قسطنطنیہ پہنچنے اور کچھ دن رہنے کے بعد اسی سفیر نے اپنی حکومت کو بھیجی تھی، آرنلڈ نے ان ہی نیک نہاد ایمانی ترکوں کے متعلق یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

''ترک اپنے مذہب کے نہایت پابند ہیں اور ان کی یہ بات عیسائیوں سے کہیں بڑھ کر ہے کہ نماز کے وقت کسی ترک کا دھیان دوسری چیز کی طرف نہیں بٹتا، کوئی مسلمان ایسا نظر نہ آئے گا جو عبادت کے وقت ہمہ تن مصروف نہ ہو اور ادب و تعظیم کی وہ کل علامتیں اس کی صورت سے ظاہر نہ ہوتی ہوں جن علامتوں کا اپنے خالق کے لیے ظاہر کرنا اس کی مخلوق کا فرض ہے''۔ (۱۴۳)

یہی نہیں بلکہ مغربی ممالک کی ان ہی سفارتوں کے متعلق یہ عجیب وغریب رپورٹ خود یورپ کے مصنفین کی کتابوں میں پائی جاتی ہے کہ:

''قسطنطنیہ میں عیسائی سفیروں کو ہر وقت اس کا اندیشہ رہتا تھا کہ ان کے وطن کا کوئی عیسائی جو نوکری کر کے ان کے ساتھ آیا ہے کہیں وہ مسلمان نہ ہو جائے''۔ (۱۴۴)

حاشیہ میں آرنلڈ ہی نے گملن کے حوالہ سے یہ فقرہ نقل کیا ہے:

''عیسائی سفیروں کو کسی دن اس بات کا یقین نہیں ہوتا تھا کہ ان کے ملازم ان کو چھوڑ کر نہ چل دیں گے اور جب تک شام نہ ہوئی وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ دن خیریت سے گذرا''۔ (۱۴۵)

اور قسطنطنیہ یا ترکی کے متعلق تو ممکن ہے کہ اسلامی حکومت کی شان وشوکت ترکوں کے غیر معمولی فتوحات وغیرہ کا بھی اضافہ عام مسلمانوں کی دینی زندگی کے ساتھ کر دیا جائے۔ لیکن ایسے ممالک جہاں مسلمان فاتح ہونے کی حیثیت سے داخل نہیں ہوئے تھے، وہاں مسلمانوں کی عام دینی زندگی جن نتائج کو پیدا کرتی رہی ہے چند نمونے ان کے بھی دیکھ لیجیے۔ مثلاً چین ہی کے مسلمانوں کو لیجیے، یورپ کے پادریوں کو جب خبر ملی کہ مشرق کے اس دور دراز گوشے میں بھی اسلام آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے، تو کچھ لوگ وہاں بھی اس کے ٹوہ میں پہنچے۔ بڑی بڑی کتابیں چین میں اشاعتِ اسلام کے خطرے پر لکھی گئیں، ان رپورٹوں سے چند اقتباسات پیش کیے

جاتے ہیں، آرنلڈ نے اینڈرسن کے حوالہ سے ایک جگہ نقل کیا ہے:

''اسلام کو خاص چین میں بہت استحکام ہو گیا ہے، اس کا باعث یہ ہے کہ جب کسی صوبہ کی آبادی وبا یا قحط کی بلاؤں سے جن کا گذر اکثر اس ملک میں رہتا ہے، غارت ہو جاتی ہے، تو مسلمان بہت خوشی سے اور مستعدی سے ان برباد مقاموں کو آباد کر دیتے ہیں۔ قحط کے زمانہ میں مفلسوں سے ان کے بچے خرید لیتے ہیں اور ان کو مسلمان کر کے پرورش کرتے ہیں۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں تو ان کا نکاح کر کے ان کو سکونت کے لیے علیحدہ مکان دیئے جاتے ہیں۔ اس طریقہ سے گاؤں کے گاؤں نومسلموں سے آباد کر دیئے جاتے ہیں (ک،ک)''۔ (۱۴۶)

ایک دوسرا مصنف ڈبلیو جے سمتھ چین میں اسلام کی اشاعت کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''مسلمانوں میں پابندی مذہب کے لیے ہر طرح کوشش کی جاتی ہے، یہاں تک کہ غریب سے غریب آدمی کو بھی ابتدائی کتابوں کی مدد سے اسلام کے ضروری احکام اور ارکان سکھائے جاتے ہیں'' (۱۴۷)

الغرض ایک طرف مصیبت زدوں کی دستگیری، کڑے وقتوں میں مشکلات سے مقابلہ کی چینی مسلمانوں میں جو صلاحیت پائی جاتی تھی اور اسی کے ساتھ غریب بھائی بندوں کو دل کھول کر امداد، ان کی مذہبی تعلیم کی طرف ان کی غیر معمولی توجہ ان عیسائی سیاحوں کو اسلام کی اشاعت کی ایک وجہ اگر نظر آئی تو دوسری طرف چینی مسلمانوں نے ہمیشہ حکومت کے امن پسند شہری اپنے آپ کو ثابت کرنے کی عموماً ہر زمانہ میں جو کوشش کی ہے اس کا ذکر بھی مختلف طریقوں سے ان ہی لوگوں نے کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک شاہی فرمان کی نقل بھی چین کے شاہی دفتر سے ان لوگوں کو

Marfat.com

می تھی۔ ہوا یہ تھا کہ بعض تنگ نظر حکام نے بادشاہ وقت سے چینی مسلمانوں کی شکایت کی۔ اس شکایت کے بعد ۱۷۳۱ء میں چین کے خاقان نے یہ فرمان شائع کیا تھا:

''ہماری سلطنت کے ہر صوبہ میں صدہا سال سے مسلمان موجود ہیں، جو ہماری رعایا کا ایک حصہ ہیں، اور جس طرح اور ہماری رعایا مثل ہماری اولاد کے ہے، اسی طرح یہ مسلمان بھی ہماری اولاد ہیں۔ میں مسلمانوں میں اور ان لوگوں میں جو مسلمان نہیں ہیں کوئی فرق نہیں سمجھتا''۔ (۱۴۸)

پھر جس حاکم نے مسلمانوں کی شکایت کی تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے بادشاہ نے لکھا تھا کہ

''بعض حاکموں نے مسلمانوں کی خفیہ شکایتیں ہم سے کی ہیں جن کی بنا صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کا مذہب چینیوں کے مذہب سے مختلف ہے۔ مسلمان وہ زبان نہیں بولتے جو اور چینی بولتے ہیں اور لباس بھی چینیوں سے مختلف وضع کا ہے''۔ (۱۴۹)

آگے اس کے بعد ہے:

''مسلمانوں پر نافرمانی، گستاخی اور باغیانہ خیالات رکھنے کا الزام لگایا گیا ہے اور ہم سے درخواست کی گئی ہے کہ مسلمانوں کے خلاف سخت طریقے اختیار کیے جائیں''۔ (۱۵۰)

بادشاہ نے ان الفاظ کے بعد لکھا تھا کہ:

''لیکن تحقیق و تفتیش کے بعد ہم کو معلوم ہوا کہ ان شکایتوں اور الزاموں کی کوئی بنیاد نہیں ہے''۔ (۱۵۱)

پھر مسلمانوں کی طرف سے مدافعت کرتے ہوئے اسی فرمان میں لکھا گیا تھا کہ:

Marfat.com

''مسلمان جس مذہب کے پابند ہیں وہ فی الحقیقت ان کے بزرگوں کا مذہب ہے۔ پھر یہ سچ ہے کہ ان کی زبان وہ نہیں ہے جو اور چینیوں کی زبان ہے لیکن چین کے ملک میں بہت سی مختلف قوموں کی زبانیں بولی جاتی ہیں''۔(۱۵۲)

زبان کے اختلاف کا یہ واقعی منصفانہ جواب دیتے ہوئے بادشاہ نے مسلمانوں کی دوسری خصوصیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

''ان کی عبادت گاہوں کی نسبت اور لباس وطرز تحریر کے بارے میں جو چینیوں کی وضع وطرز سے مختلف ہیں جس قدر شکایتیں کی گئی ہیں، وہ ہرگز لحاظ کے قابل نہیں، یہ سب رواج اور دستور کی باتیں ہیں''۔(۱۵۳)

آخر میں بادشاہ نے لکھا تھا کہ مسلمان ہمیشہ ہماری حکومت کے بڑے بڑے عہدوں تک پہنچتے رہے ہیں اور سرکاری امتحانوں میں اور لوگوں کی طرح کامیاب ہوتے ہیں۔ پس مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں میری حکومت کسی تفریق اور امتیاز کو جائز قرار نہیں دیتی (ل۔ل)۔(۱۵۴)

اسی فرانسیسی مصنف دے تیرسان کے حوالہ سے آرنلڈ نے چینی مسلمانوں کے اس خاص طرزِ عمل کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ

''مسلمان اپنے مذہب اور کنفیوشس کے مذہب میں جو باتیں مشابہ ہیں ان کو جتلاتے ہیں''۔(۱۵۵)

گویا جیسے عیسائی مسلمانوں سے اس لیے متاثر ہوتے تھے کہ مسیح علیہ السلام اور ان کی کتاب انجیل کے احترام میں مسلمان کوئی کمی نہیں کرتے، یہ طریقہ چین کے عام مذہب کے پیشوا کے ساتھ انہوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کے دین کا بھی اقتضاء یہی ہے۔ ان کو دنیا کے تمام ادیان وملل سے تکذیب وتحقیر کا نہیں بلکہ تصدیق وتکمیل وتصحیح کا تعلق ہے۔ خصوص چین کے عام

Marfat.com

شندوں، اس ملک کی حکومت، اس ملک کے باشندوں کے مذہب کے ساتھ ایک
ہی قسم کا روادارانہ برتاؤ اور اسی کے ساتھ اس زمانہ میں ان کی پختہ دینی زندگی
ان ہی باتوں میں اسلام کے فروغ کا راز ان عیسائی سیاحوں کو نظر آیا تھا۔

افریقہ کے دور دست علاقوں یا جزیروں میں بھی یورپ والوں کو اسلام کی
ترقی کی تیز رفتاری کے اسباب جو ملے ہیں، ان ہی کی کتابوں سے بعض چیزیں جنہیں
رنالڈ نے نقل کیا ہے، پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً افریقہ کے نیگرو اقوام کو مسلمانوں نے
کس طرح متاثر کیا، اس کی تفصیل کرتے ہوئے ایک مغربی مصنف بیان کرتا ہے:

''انتہا درجہ کی ظالمانہ رسمیں جو ایک زمانہ سے تمام افریقہ میں پھیلی ہوئی تھیں
اور اب بھی براعظم افریقہ کے بعض حصوں میں گولڈ کوسٹ اور انگریزی
نو آبادیوں کے قریب جاری ہیں۔ یعنی مردم خواری اور انسان کی قربانی اور
بچوں کو زندہ دفن کرنے کا رواج اسلام قبول کرتے ہی فوراً ہمیشہ کے لیے
موقوف ہو جاتا ہے''۔ (۱۵۶)

آگے اسی کا بیان ہے کہ:

''اب تک جو برہنہ یا نیم برہنگی کی حالت میں رہتے تھے، کپڑے پہننے شروع
کرتے ہیں اور کپڑے ایسے جو پاک اور ستھرے ہوں اور وہ لوگ جو کبھی
نہانا اور منہ دھونا نہیں جانتے تھے، بار بار نہاتے ہیں اور منہ دھوتے ہیں۔
کیونکہ نفاست اور پاکیزگی کے قواعد ان کو بتائے گئے ہیں''۔ (۱۵۷)

اسی کا بیان کیا ہے:

''اس خوفناک مکان کی جگہ جسے جوجو کا گھر کہتے تھے اور جس میں بدشکل
چیزیں پوجنے کے لیے رکھی ہوئی ہیں''۔ (۱۵۸)

جوجو کے اس گھر کی جگہ:

Marfat.com

''اب خوبصورت بنی ہوئی پاک اور ستھری مسجد جس کی محراب مکہ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور جس میں مؤذن پانچ وقت اذان دے کر نمازیوں کو بلاتا ہے اور جس میں امام ہر جمعہ کو نماز پڑھاتا ہے، گاؤں کے مسلمانوں کا عام مرجع بن جاتی ہے''۔ (۱۵۹)

وہی لکھتا ہے کہ پھر ان ہی مسجدوں میں:

''سب لوگ جمع ہوتے ہیں اور اس خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرتے ہیں، جو حاضر و ناظر علیم و بصیر و رحیم ہے'' (۱۶۰)

بوسوتھ سمتھ کے حوالہ سے آرنلڈ نے ان ہی افریقی مسلمانوں کے متعلق نقل کیا ہے:

''یہ بات سب نے تسلیم کی ہے کہ افریقہ کے نومسلموں میں مذہب اسلام ایسی ہمت اور جرات اور قدرت، اپنے اوپر آپ بھروسہ کرنے کی قابلیت پیدا کر دیتا ہے، جس کا نشان ان ہی افریقی مسلمانوں کے ہم قوم ہم وطن بت پرستوں یا عیسائیوں میں مشکل سے ملتا ہے''۔ (۱۶۱)

ذرا خیال کیجیے مغربی افریقہ کا اور اس کے دریائے گامبیا جو سنگھالی قوموں کے وطن سے گذرنے والے دریائے سنگھال کے قریب ہے اور دونوں بحر اوقیانوس میں جا کر گرتے ہیں۔ ۱۷۳۱ء میں ایک مغربی سیاح اس علاقہ میں داخل ہوتا ہے اور دنیا کے آخری حصہ کے اس علاقہ میں دوسری وحشی اور بت پرست قوموں کے ساتھ مسلمانوں کو بھی ان ہی ملی جلی شکلوں میں پاتا ہے۔ اس نے اس علاقے کے مسلمانوں کی دوسری خصوصیت کے ساتھ چند باتیں یہ بھی بیان کی ہیں کہ:

''ان مسلمانوں کو میں نے بہت جفاکش اور سیدھا سادہ پایا، اپنے صرف سے زیادہ اناج وہ پیدا کرتے ہیں''۔ (۱۶۲)

Marfat.com

اس کے بعد وہی لکھتا ہے کہ:

''ان مسلمانوں کی مہمان نوازی بہت مشہور ہے''۔ (۱۶۳)

اور یہ کہ:

''اس دیس کی دوسری قومیں ان مسلمانوں کی آبادیوں کے قریب آباد ہونا، اپنے لیے نعمت تصور کرتی ہیں''۔ (۱۶۴)

اسی نے یہ بھی لکھا ہے کہ باوجود اس قدر امن پسند اور حلیم و بردبار ہونے کے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس علاقے کے مسلمان بزدل ہیں بلکہ:

''افریقہ کی اور قومیں جس قدر دلیر اور بہادر ہیں، اسی قدر بہادر یہ لوگ بھی ہیں اور ہتھیار چلانے میں بڑے مشاق ہیں''۔ (۱۶۵)

اور یہی ہے بھی درحقیقت دیندار مسلمانوں کی زندگی کی خصوصیت۔ اسی سیاح نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''یہ قوم بڑی متشرع مسلمان ہے، اس کا کوئی آدمی برانڈی یا پانی سے زیادہ تیز پینے کی چیز نہیں پیتا''۔ (۱۶۶)

ابن بطوطہ نے بھی اسی نیگرو قوم کے علاقے میں چودھویں صدی میں سفر کیا تھا، تو اس وقت بھی اس نے یہی کہا کہ:

''یہاں کے مسلمان پابند صوم وصلوۃ ہیں، قرآن پڑھتے ہیں، جمعہ کے روز کوئی شخص بہت پہلے مسجد میں نہ پہنچے تو پھر جگہ ملنی ناممکن ہے، کیونکہ جمعہ کے روز نمازیوں کی بڑی کثرت ہوتی ہے''۔ (۱۶۷)

چودھویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک کے سیاحوں کا بالاتفاق بیان ہے کہ نائیگر و علاقے کے مسلمانوں کی زندگی پر دینی رنگ چڑھا ہوا تھا اور ان کی یہی زندگی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دوسری قومیں ان کے پڑوس میں آباد ہونے کو نعمت

Marfat.com

تصور کرتی تھیں اور مسلمانوں کی دینی و اخلاقی زندگی سے متاثر ہو کر ان کے دین کو اختیار کرتی چلی جاتی تھیں۔ بلکہ انیسویں صدی کے آخر تک اس علاقے کے سیاحوں کی رپورٹوں سے ثابت ہوتا ہے کہ:

''ساحل اور اطراف نیز اندرونی علاقوں میں اشاعت اسلام کا کام ترقی پر نظر آرہا ہے (م،م)''۔ (۱۶۸)

ان ہی سیاحوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ زیادہ تر اشاعت اسلام کا یہ کام مسلمان تاجروں کے ذریعہ انجام پا رہا ہے، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ:

''ان تاجروں کی طرف سے اس ملک کے دیسی باشندوں کے قلوب میں کسی قسم کی بدگمانی نہیں پائی جاتی''۔ (۱۶۹)

اسی لیے جب کوئی مسلمان سوداگر بت پرستوں کے گاؤں میں پہنچتا ہے اور بار بار وضو کر کے رکوع اور سجدے سے نمازیں پڑھتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں وہ خدا سے مخاطب ہے، تو گاؤں کے لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ (۱۷۰) اور یہی نظارہ، نیز:

''مسلمانوں کی عقلی و اخلاقی برتری کی وجہ سے وہاں کے لوگ ان کی توقیر کرتے ہیں، ان پر بھروسہ کرتے ہیں''۔ (۱۷۱)

یہ حال تو ان قوموں کے تاثرات کا ہوتا ہے اور دوسری طرف جیسا کہ اس سیاح کا بیان ہے:

''یہ مسلمان تاجر ہر وقت تیار رہتا ہے کہ جو خوبیاں خود اس میں موجود ہیں، وہی دوسروں میں پیدا کر دے''۔ (۱۷۲)

دیکھا آپ نے مسلمان اپنی دینداری کے زور سے قوموں میں اعتماد اور بھروسہ کے پیدا کرنے اور پھر ان کو اپنے دین میں داخل کر لینے میں کس طرح

کامیاب ہوتے ہیں، اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ حاکم ہوں، یا محکوم، ہر حال میں مسلمانوں نے غیر قوموں کے ساتھ اچھا سلوک بھی کیا ہے جو دین پر قائم تھے اور ان ہی لوگوں کو دینی دائرے کی توسیع کا موقع بھی غیر قوموں میں ملا ہے۔ ورنہ جن مسلمانوں نے قوموں کے آگے اپنے آپ کو غنڈوں، اٹھائی گیروں، بدمعاشوں، جھگڑالو آدمیوں کے قالب میں پیش کیا ہے، سچ پوچھئے تو ان سے اسلام دوسروں تک تو کیا پہنچے گا، آج اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے لیے جیسا کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے لکھا تھا: امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں

آرنلڈ نے سر بارٹر فریری کے حوالہ سے افریقہ میں اسلام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ افریقہ میں تبلیغ اسلام میں جو بہت تیز ترقی ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام لانے کے ساتھ ہی ہر نومسلم افریقی یہ یقین کر لیتا ہے کہ مسلمانوں کا گھر اس کا گھر ہے، جہاں اس کو ٹھہرنے اور کھانے پینے کا سامان جس وقت بھی وہاں پہنچے گا، میسر آ سکتا ہے اور یہ کہ:

''اسلام قبول کرنے کے ساتھ اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ہی ملک میں ایک ایسی قوم کا رکن ہو گیا ہے جو حکمران تو نہیں لیکن ملکی رسوخ کے اعتبار سے ترقی یافتہ ہے''۔ (۱۷۳)

سر بارٹر نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمان ہونے کے ساتھ اس نومسلم کو اخوت اور آپس میں برابر سمجھے جانے کا عملی برتاؤ اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ انہوں نے اس پر افسوس کیا ہے کہ گو عیسائی بھی اس دینی اخوت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن:

''گورے رنگ کا عیسائی کالے رنگ کے کافر اور غلام افریقی کا مدت سے آقا سمجھا جاتا ہے''۔ (۱۷۴)

آرنلڈ نے اسلام اور عیسائیت کے اس فرق کو تفصیل کے ساتھ مختلف

شہادتوں کی روشنی میں واضح کیا ہے، آخر میں ایک مشنری رپورٹ سے یہ فقرہ بھی نقل کیا ہے کہ عیسائیوں کے اسی امتیازی سلوک کا نتیجہ ہے کہ:

''افریقیوں میں یہ عام خیال چھپا ہوا ہے کہ اسلام کالے آدمیوں کے لیے اور عیسوی مذہب گورے آدمیوں کے لیے مختص ہے، وہ جانتے ہیں کہ عیسوی مذہب ان کونجات کے لیے بلاتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ان کو مذہب عیسوی ایسا ذلیل درجہ دیتا ہے کہ وہ ہمت ہار کر یہ کہنے لگتے ہیں کہ ہماری قسمت میں اس مذہب کا حصہ نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اسلام ان کو یقین دلاتا ہے کہ یہ تم پر منحصر ہے کہ جس قدر بلندی تک پہنچنا ممکن ہو پہنچ جاؤ''۔ (۱۷۵)

پس سچی بات یہی ہے کہ مشرق ہو یا مغرب، آج ہو یا کل، اسلام نے ہمیشہ مسلمانوں کے سامنے اپنے اسی تجربہ کو پیش کیا ہے، کہ حاکم ہوں یا محکوم، کسی حال میں بھی ہوں، دین سے جس قدر قریب رہیں گے، خدا بھی ان سے قریب رہے گا۔ اس کی امداد بھی ان کے قریب رہے گی، دنیا کی قوموں کے قلوب بھی ان سے نزدیک رہیں گے۔ یہاں تک کہ یہی نزدیکی بالآخر ان کو اسلام میں داخل کرتی رہتی ہے۔ مذکورہ بالا اقتباسات تو افریقہ کے متعلق آپ نے سنے۔ مشرق کے مجمع الجزائر، ملایا جاوہ، سوماٹرہ وغیرہ میں اسلام اور مسلمانوں کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے آرنلڈ ہی نے کمتیر کی کتاب سے یہ فقرے نقل کیے ہیں:

''ملایا کے یہ مسلمان .... مذہب کے نہایت پابند ہیں، مجمع الجزائر کے کل مسلمانوں میں ان کی پرہیزگاری کی ایسی شہرت ہے کہ بطور مثال کے ان کا ذکر کیا جاتا ہے''۔ (۱۷۶)

مگر اس شدید قسم کی مذہبیت کے ساتھ یہ مصنف یہ بھی لکھتا ہے کہ:

''ملک کے ہندو، عیسائی، بدھ اور بت پرستوں سے رات دن ان کا میل

Marfat.com

جول بھی رہتا ہے''۔ (۱۷۷)

اور یہ کہ:

''مذہبی آزادی و رواداری، صلح کل کا اصول یہی ان کا دستور اور قاعدہ ہے''۔ (۱۷۸)

یہ لوگ:

''دنیا کی باتوں میں لوگوں کو نفع پہنچانے کے ساتھ ان کی مذہبی بہبودی کا خیال بھی ان کو ہے''۔ (۱۷۹)

اور ان ہی باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اس علاقہ کے باشندوں میں:

''اسلام کا اثر بہت پایا جاتا ہے۔ سپاہیوں میں جو لوگ مسلمان ہو گئے ہیں ان کو سمسام کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ ایسی زبان بولتے ہیں جو ملایا اور سامی زبانوں سے مرکب ہے۔ جزیرہ کی وحشی قوموں میں بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے ہیں''۔ (۱۸۰)

بہر حال بجائے اپنوں کے غیروں کی ان شہادتوں کو پیش کرنے کی غرض یہ ہے کہ مسلمانوں کی دینی زندگی اور اس زندگی کے نتائج کو غیروں کی آنکھوں نے کس نظر سے دیکھا ہے، خود مسلمانوں کو اپنی دینی زندگی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو یا نہ ہو لیکن مسلمانوں کو اپنے دین سے جہاں کہیں بھی پانے والوں نے قریب تر پایا ہے، وہ ہمیشہ اسی اعتراف پر مجبور ہوئے ہیں جس کی کچھ مثالیں آپ کے سامنے گذریں۔ قرآن میں اصحاب کہف کی ایمانی خصوصیتوں کو بیان کرتے ہوئے منجملہ اور باتوں کے آخر میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ:

''لو أطلعت علیهم لو لیت منهم فراراً وّ لملئت منهم رعبا''(۱۸۱)

''ان کو جھانک کر اگر تم دیکھو گے تو رعب سے تم بھر جاؤ گے''

میں تو غار میں ان پناہ لینے والے نوجوانوں کے ایمان اور ان کی قوت ہی

کو اس رعب کا سبب قرار دیتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان باتوں کو گناتے ہوئے جن سے حق تعالیٰ نے خصوصی طور پر آپ کو سرفراز فرمایا ہے ایک خصوصیت یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ:

''نصرت بالرعب علی مسیرة شهر'' (۱۸۲)

''رعب سے میری مدد ایک مہینہ کی مسافت سے کی گئی ہے''

یعنی جن مقامات تک ایک مہینہ چل کر لوگ اس زمانہ میں پہنچتے تھے، ان تمام مقامات کے باشندوں کے قلوب میں آپ کا رعب ڈال دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عام طور پر اس رعب کو رسالت مآب ﷺ کی ذاتِ مبارک کے ساتھ مختص سمجھا جاتا ہے لیکن جب دیکھا جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں دوسری چیزیں مثلاً جعلت لی الارض مسجداً و طهوراً (۱۸۲، الف) (زمین کا پورا کرہ میرے لیے مسجد بنادی گئی ہے اور یہ کہ اسی زمین کی مٹی طہارت (تیمم) کا ذریعہ بنائی گئی ہے۔ یا احلت لی الغنائم (۱۸۲، ب) (جنگ کا مالِ غنیمت میرے لیے حلال کیا گیا) ظاہر ہے کہ پیغمبر ﷺ کے ساتھ ان چیزوں میں امت کو بھی جب حصہ ملا ہے تو رعب سے نصرت و امداد کے متعلق آخر کیوں سمجھا جائے کہ پیغمبر کی امت اس نعمت سے محروم ہے اور صرف پیغمبر ﷺ کی ذاتِ اقدس تک رعب والی یہ امداد محدود تھی۔

بورنیو کے مجمع الجزائر میں جزیرہ زولو میں ڈل رمپل نامی ایک مغربی سیاح ۱۷۶۱ء سے ۱۷۶۴ء تک مقیم رہا، اور وہاں کے حالت پر اس نے ایک مضمون لکھا تھا۔ مسٹر آرنلڈ نے اسی مضمون سے نقل کیا ہے کہ:

''یہاں ایدان نامی ایک قوم ہے جس نے اب تک اسلام قبول نہیں کیا ہے، لیکن اپنی جہالت پر ان کو میں دیکھتا تھا کہ نادم اور حسرت و افسوس میں مبتلا ہیں اور دل ہی دل میں خفیف رہتے ہیں''۔ (۱۸۳)

ڈل رمپل نے اسی کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ:

''جس وقت ایدان قوم کے لوگ مسلمانوں کے گھروں میں یا مسلمانوں کے جہازوں پر آتے ہیں، تو مسلمانوں کی بے حد تعظیم کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسلمان وہ ہیں جن کو اپنے پروردگار کا علم حاصل ہے''۔ (۱۸۴)

اسی کا بیان ہے کہ اس نے یہ بھی دیکھا کہ:

''جس جگہ مسلمان سوتے ہیں وہاں یہ ایدان بیٹھتے نہیں اور مسلمان جس ڈبیہ سے چونا نکال کر کھاتے ہیں، اس میں یہ لوگ خود انگلیاں ڈال کر چونا نہیں نکالتے، بلکہ مسلمان جب ان کو خود پان یا چونہ دیتے ہیں، تو بہت ادب سے لیتے ہیں''۔ (۱۸۵)

اور آخر میں اس نے یہ عجیب بات لکھی ہے کہ:

''جس خدا کو ایدان کے لوگ خود نہیں مانتے، اس کی الوہیت کے اقرار میں وہ ایسے لوگوں کے سامنے جو خدا کا علم رکھتے ہیں، ہر بات میں عجز وانکساری ظاہر کرتے ہیں''۔ (۱۸۶)

آپ ہی بتایئے کہ ایمانی رعب کے سوا قوم ایدان کے ان نفسیاتی تاثرات کی اور کیا توجیہ کی جائے۔

غیروں کی ان شہادتوں کو پڑھ کر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اسلامی مؤرخین کی کتابوں میں اس قسم کی باتیں عموماً جو پائی جاتی ہیں ان کا انکار کیا جائے۔ مثلاً ذہبی نے منصور بن زاذان محدث کے ذکر میں لکھا ہے کہ عباد بن العوام جب کمسن تھے، منصور کے جنازے میں شریک ہونے کا موقع ان کو ملا تھا۔ یہی عباد کہتے تھے کہ:

''میں نے دیکھا کہ منصور کے جنازے میں مسلمانوں کے سوا یہود الگ شریک ہیں اور نصاریٰ الگ شریک ہیں''۔ (۱۸۷)

ابن عساکر نے ابن ابی خثیمہ کے حالات میں لکھا ہے کہ:

Marfat.com

''مصیصہ (شامی علاقہ کی چھاؤنی جو رومیوں کے حدود کے قریب تھی) اسی مقام پر ان کی وفات ۱۸۸ھ میں ہوئی۔ یہ ہارون الرشید کی خلافت کا زمانہ تھا، جس دن ان کا انتقال ہوا دیکھا گیا کہ (مسلمانوں کے سوا) اپنے سروں پر یہود و نصاریٰ بھی خاک ڈال رہے ہیں اور ان کی موت کے غم میں مسلمانوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں''۔ (۱۸۸)

ایسی صورت میں اس مشہور واقعہ پر کیوں تعجب کیا جائے جس کا تذکرہ امام احمد بن حنبل کے عام سوانح نگاروں نے کیا ہے، یعنی حضرت امام احمد کی جب وفات ہوئی تو:

''اسلم یوم مات عشرون الفا من النصاریٰ والیھود والمجوس'' (۱۸۹)

''جس دن امام کی وفات ہوئی تو عیسائیوں، یہودیوں، پارسیوں میں سے بیس ہزار آدمی مسلمان ہو گئے''۔

صحیح اسلامی و دینی زندگی گذار کر مرنے والوں نے اپنی موت سے بھی ایمانی زندگی مختلف زمانوں میں جو بانٹی ہے، اس کا افسانہ تو اتنا طویل ہے کہ چاہنے والے کوئی مستقل کتاب ہی اس موضوع پر لکھنا چاہیں تو لکھ سکتے ہیں اور اس میں عبرت ہے ان زندہ مسلمانوں کے لیے جن کی بے دینی یا دین سے دور زندگی خود مسلمانوں کی ایمانی موت کا بسا اوقات سبب بن جاتی ہے، اپنی آنکھوں سے ہم دیکھتے ہیں کہ ان ہی مسلمانوں کی بدولت کتنوں کو آج دین سے مرتد ہونے تک مجبور ہونا پڑا ہے۔

﴿و ما اصابک من سیئۃ فمن نفسک﴾ (۱۹۰)

''اور برائی جو کچھ بھی تمہیں پہنچتی ہے اس کا منشا خود تم ہو، تمہاری ذات''

بہر حال ہم غیروں کے شکوے شکایت اور ان کے جور و ظلم کی حکایت کے

Marfat.com

عادی ہو گئے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ غیروں کے رحم و کرم کے سوا اپنی پناہ گاہ اب ہمیں کہیں نظر نہیں آتی۔ حالانکہ آسان بات کو خود اپنے ہاتھوں ہم نے دشوار بنالیا ہے۔ زندگی کے وہی اوقات جو دوسروں کے شکوے شکایت کرنے میں ہم گزارتے ہیں ان سے تھوڑا بہت تھوڑا وقت بھی اپنے آپ سے شکایت کرنے میں ہر شخص ہم میں دینا اگر شروع کردے تو اس کو نظر آئے گا کہ جن چیزوں کو ہم دوسروں کے اقتدار و اختیار میں پاتے ہیں، درحقیقت وہ خود ہماری اختیاری چیزیں ہیں۔

میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ جن شکایتوں کا ازالہ خود ہمارے زیرِ اقتدار ہے جب ان کے ازالہ کی ہمت خود ہم میں باقی نہیں رہی ہے تو غیروں سے ہمیں جو شکایتیں ہیں ان کے ازالہ کی ہم توقع کس بنیاد پر کر سکتے ہیں۔ ہمیں خود اپنے آپ پر جب رحم نہیں آتا تو دوسروں سے رحم کی امید بتایا جائے کہ کہاں تک درست ہو سکتی ہے۔ خدا کے جس رسول علیہ السلام کے دستِ حق پرست پر ہمارے آباؤ اجداد نے بھی بیعت کی اور خود ہم بھی اس بیعت پر بحمد للہ آج تک قائم ہیں، اسی بیعت پر اصرار کرتے ہوئے جینا بھی چاہتے ہیں اور اسی پر طے کیے ہوئے ہیں کہ مریں گے بھی۔ کیا ہمارے لیے جائز تھا کہ اسی پیغمبر ﷺ کی ان باتوں کو سن کر جن کا حدیث کی صحیح کتابوں میں بار بار اعادہ کیا گیا ہے۔ مثلاً قریش کے جاہلی عرب کو آپ خطاب کر کے فرماتے کہ:

''ہم ان سے کچھ نہیں چاہتے بجز ایک بات کے جس کا اقرار وہ کرلیں، ایسی بات جو عرب کو بھی ان کے سامنے جھکا دے گی اور عجم سے بھی ان کو جزیہ دلا دے گی''۔ (۱۹۱)

قریش کے صنادید پوچھتے کہ ایک بات کیا اگر واقعی یہ ممکن ہے جو تم کہتے ہو تو ہم ایسی دس باتیں تمہاری ماننے کے لیے تیار ہیں۔ آنحضرت ﷺ تب فرماتے کہ:

''لا الہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) بس اس کی مان لو''۔ (۱۹۲)

اسی کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ جن باتوں کی ضمانت لی گئی ہے، خود دیکھو گے کہ تمہارے سامنے آتی ہیں یا نہیں۔ قریش پر جب تک جاہلیت کا دورہ پڑا ہوا تھا وہ اس سے انکار کرتے رہے، یہی کہتے رہے:

''ما سمعنا بهذا فی الملة الآخرة ان هذا الاختلاق (ن،ن)'' (۱۹۳)

''کسی دوسری قوم کی قومی زندگی (اللہ کو اللہ احد بنانے پر مبنی ہو) ہم نے آج تک یہ نہیں سنا، یہ تمہارا ایک خودتراشیدہ نظریہ ہے''۔

بکر بن وائل کا قبیلہ جو ایرانیوں کی حدود میں رہتا تھا۔ حج کے لیے مکہ معظمہ اسی قبیلہ کے بعض سردار آئے ہوئے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے سامنے بھی اسی ضمانت کو پیش کیا۔ کسریٰ ایران جس کے نام سے وہ لرزہ براندام ہو جاتے تھے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ فرماتے کہ تم میری بات مان لو!

''ان لم تلبث قليلا حتى يورثكم الله ارضهم و اموالهم'' (۱۹۴)

''تو نہ ٹھہرو گے تم زیادہ دن تک کہ مالک بنا دے گا اللہ تعالیٰ تمہیں ایرانیوں کی زمین کا بھی، اور ان کے اموال کا بھی''۔

اسی عرصہ میں ابولہب آ گیا اور بولا یہ دیوانہ ہے، اس کی بات کا خیال نہ کرو۔ لکھا ہے کہ بکر کے سرداروں نے تب ابولہب سے کہا کہ:

''ہاں فارس (ایران) کے متعلق جو باتیں اس شخص نے کیں، ان کو سن کر تو ہم نے بھی اس کو مجنون ہی خیال کیا تھا''۔ (س،س) (۱۹۵)

مگر دنیا نے کل پندرہ بیس سال کے عرصہ میں دیکھ لیا کہ دیوانہ کون تھا، اور کون قوانین عالم کے سلسلہ کے کلیدی قانون کے پانے میں کامیاب ہوا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ قریش کے جاہلوں نے تو دیکھنے اور تجربہ سے پہلے انکار

Marfat.com

کیا تھا لیکن اس امت کے متعلق اب میں کیا کہوں جس کے سامنے وہ سب کچھ گذر چکا ہے، جو کہا گیا تھا۔ اس نسخہ کا بار بار تجربہ کر کے نتائج کا مشاہدہ کر چکی ہے جس کے پینے کی ابتدائی دعوت قریش کو دی گئی تھی۔

لیکن بجائے خطاب ہونے کے ہوتا کہ ہم میں کل نہیں تو بعض ہی لوگ اوّاب (ع.ع) ہونے کی زندگی اختیار کرتے اور ''دیگراں'' سے ہٹ کر اپنی نصیحتوں کا رخ کچھ دن کے لیے خود اپنی طرف پھیر دیتے، پھر کہف (غار) کے نوجوانوں نے جیسے کہا تھا:

﴿ربنا رب السمٰوٰت والارض لن ندعو من دونه الٰهالقد قلنا اذا شططا﴾ (۱۹۶)

''ہمارا مالک وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے نہیں پکارتے ہم اس کے سوا کسی دوسرے الٰہ کو یقیناً اس وقت کہیں گے ہم غلط بات''۔

یہ کہتا ہوا آج بھی مسلمانوں میں نوجوانوں کا کوئی گروہ کھڑا ہو جاتا تو یقین مانیے کہ اسی کہفی زندگی سے وہ اپنے لیے بھی اور اپنی قوم کے لیے بھی مرافق حیات اور معاشی سہولتوں کے سرچشمہ کے پالینے میں کامیاب ہو جاتے اور آج زندگی کی صحیح راہ کے ڈھونڈنے میں انسانیت جو بھٹک رہی ہے اس کو اپنی اس جستجو میں ''ولی مرشد'' بھی مل جائے گا۔ وہی قومیں جو آج دنیا کے مردار پر کتوں کی شکل میں ٹوٹی پڑتی ہیں، ان کی محافظت پر دیکھیں گے کہ آمادہ ہوگئی ہیں۔ ہر دیکھنے والا ان سے مرعوب ہونے لگے گا اور مجال کسی کی نہ رہے گی جو ان کے سامنے ٹھہر سکے (ف.ف)۔

Marfat.com

حواشی

الف۔ ابوداؤد میں اس حدیث کے الفاظ یہی ہیں ،طبرانی میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس پر میں دعویٰ کروں گا ، اسے ہارنا پڑے گا ۔ (کنز العمال ،۲/۲۷۰ ، علاء الدین علی المتقی ابن حسام الدین ،حیدرآباد ،مطبع معارف ،۱۳۱۲ھ)

ب۔ حدیث کی عام کتابوں میں یہ روایت پائی جاتی ہے کہ ایرانی علاقے کے بعض سپہ سالاروں کے نام حضرت عمر فاروقؓ کا یہ گشتی فرمان پہنچا کہ مترس (مت ڈر) کے فارسی لفظ کے کہہ دینے کے بعد کسی غیر مسلم پر اگر کوئی مسلمان سپاہی ہاتھ چھوڑے گا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ (موطا امام مالک مع شرح المنتقی ،۴/۳۴۴ ، مالک بن انس ، المکۃ المکرمۃ ، مکتبہ عباس احمد بن الباز ،۱۴۲۰ھ)

ج۔ عورتوں کو ان کی چند خصوصی نسوانی کمزوریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ایک کمزوری کی تعبیر تکثرن اللعن کے الفاظ سے رسالت مآب ﷺ نے جو فرمائی ہے ،میرا خیال ہے کہ کوسنے کی عام عادت عورتوں میں جو پائی جاتی ہے ، غالباً یہ اسی کی طرف شاید اشارہ ہے ۔ مردوں میں یہ عادت کم پائی جاتی ہے اہمیت عورتوں کی اس بری عادت میں اسی لیے پیدا ہوگئی ہے ، کہ قانونِ قدرت کو بجائے قدرت کے گویا اپنے ہاتھ میں لینا ہے ۔ مگر عصر حاضر کے رجائی دعوے یا اسی نوعیت کے دوسرے بے سروپا بڑے بولوں کا مطلب وہاں تحلیل وتجزیہ کے بعد خود سوچیے کہ اس میں اور مذکورہ بالا نسوانی کمزوری کے مآل وحاصل میں کوئی زیادہ فرق ہے؟۔

د۔ یہ ضمیر کانشس یا اخلاقی حاسہ وغیرہ جس جس کا کچھ نہ کچھ سراغ عہد حاضر کے بے بصیرتوں کو بھی انسانی فطرت میں کسی نہ کسی رنگ میں مل رہا ہے ، درحقیقت فطرت انسانی کے اسی جذبہ کی یہ ٹوٹی پھوٹی ادھوری اور ناقص تعبیر میں قرآن نے جس کا پتہ ''الامانۃ'' کے لفظ سے دیا ہے ، بتایا گیا ہے کہ آدمی کی فطرت میں ''الامانۃ'' کی کیل اگر نہ ٹھونک دی جاتی تو عملاً الانسان صرف ظالم نہیں بلکہ ظلوم (بہت بڑا ظالم) اور علماً جاہل نہیں بلکہ جھول (بہت بڑا جاہل) بن کر رہ جاتا ۔ یہ گفتگو قرآنی آیت ﴿انا عرضنا الامانة على السموت والارض والجبال فابين ان يحملنها واشفقن منها وحملها الانسان انه كان ظلوما جهولا﴾ (الاحزاب ۷۲) کے

Marfat.com

متعلق ہے (از محقق) اس الامانۃ کے جذبہ کا مطالب یہی ہے کہ جن چیزوں پر آدمی کو اقتدار بخشا گیا ہے اس اقتدار و اختیار کے استعمال میں اسے اپنی مرضی کی نہیں بلکہ اس کی مرضی کی پابندی کرنی چاہیے جس نے بہ امانت اسے یہ اقتدار عطا فرمایا ہے کہ اپنے اقتدار و اختیار کے استعمال میں اپنی مرضی کے پابند نہیں، اس کا اقرار تو یہ ضمیر والے بھی کرتے اور سمجھتے ہیں کہ جو جی میں آئے کر گذریں۔ اس قسم کا مطلق العنان اختیار ہمیں نہیں ملا ہے، مگر الامانت کے اقتضاء کی صرف منفی یافت ہے آگے سوال ہوتا ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق جب اپنے اقتدار کے استعمال میں ہم آزاد بن کر پیدا نہیں ہوئے تو پھر کس کی مرضی کی پابندی کریں اور مثبت اور ایجابی پہلو کا عصری مفکرین کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، حالانکہ فطرتِ انسانی کی یہی پیاس آدمی کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ جس کا وہ امین ہے اس کی مرضی کو دریافت کرے، اسی کے بعد نبوت اور وحی کے پانی کی تلاش پیدا ہوتی ہے ورنہ فرض کی پابندی فرض عائد کرنے والے کے بغیر مہمل بات ہے۔

ھ۔ ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ کے ساتھ اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چاہو تو غیب کا یہ نظارہ تمہارے سامنے بھی آ جائے، مومنہ خاتون نے جواب میں عرض کیا کہ آپ کے دیکھنے کے بعد اس کی ضرورت رہ جاتی ہے کہ میں بھی اس کو دیکھوں (او کما قالت)

و۔ مغربی شاعر کا تخلص ہے فرماتے ہیں کہ دوست کو دیکھنا چاہتے ہو تو مغربی سے نگاہ قرض لے لو، کیونکہ دوست کے کمالات کا مشاہدہ کامل ہی کی نگاہ سے تم کر سکتے ہو۔

ز۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ مقدمہ میں مقتول کے وارثوں کو اسلام نے اختیار دیا ہے، چاہیں تو قاتل کو قتل کر کے اپنے دل کی تسکین انتقام سے حاصل کریں اور چاہیں تو بجائے قتل کے خاندان کی ایک کرنے والی قوت کے گھٹ جانے سے جو نقصان پہنچا ہے اس کی نقصان کی تلافی دیت یعنی خون بہا لے کر کر لیں۔

ح۔ مطالب آنحضرت ﷺ کا جیسا کہ بظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے، یہ تھا کہ زمین پر وہ رہیں گے اور زمین کسی کے چلنے پھرنے سے یا اٹھنے بیٹھنے سے ناپاک نہیں ہوتی، یہ تو خدا کا بچھایا ہوا فرض ہے، سب ہی کو اس پر چلنے پھرنے کا حق ہے۔ طائف کے اس وفد سے پہلے نجران کے عیسائیوں کو بھی مسجد میں اتارا گیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی ان ہی رواداریوں میں اس کے دائرہ کی وسعت کا بڑا راز پوشیدہ تھا۔ جن ادیان و مذاہب کے ماننے والوں نے اپنے ادیان

Marfat.com

و مذاہب کو صرف اپنی بلندی اور برتری کا ذریعہ بنا رکھا ہے، قوموں کے قلوب میں بغض و عداوت کا ان کی طرف سے پیدا ہو جانا ایک قدرتی نتیجہ ہے۔ بھلا یہودیوں کی ان خرمغزیوں کو کون برداشت کر سکتا تھا، جب وہ کہتے تھے کہ ہم تو خدا کے بیٹے اور خدا کے محبوب ہیں، یا بعض دوسرے ادیان و مذاہب والوں نے اپنے ہی جیسے انسانوں کے متعلق اس قسم کے قوانین بنا رکھے تھے کہ ان کے مذہب کی کتاب کا کوئی فقرہ اس کے کان میں اگر اتفاقاً چلا جائے تو کان ہی سے نہیں بلکہ جان سے بھی ہاتھ اس کو دھونا پڑے گا۔ "پچھتر قدم کا فاصلہ کم از کم پاکوں اور ناپاکوں میں باقی رہے اس لیے مجبور کیا جاتا تھا کہ ناپاک جو سمجھے جاتے ہیں، وہ راستہ چلتے ہوئے ہاتھ سے ڈگڈگی بجاتے جائیں۔ قرآن میں اس کے برخلاف حکم دیا گیا ہے کہ غیر مذہب کا آدمی خواہ مشرک ہی کیوں ہو قرآن سننا چاہے تو اس کو خدا کا کلام سنایا جائے۔ مسجدوں میں ٹھہرانے کی غرض بھی رسول اللہ ﷺ کی یہی تھی کہ اسلام کے مشاہدے اور تجربہ کا لوگوں کو موقع ملے۔ یہی طائف والے کہاں تو اتنے سخت تھے، کہتے تھے کہ ہم اپنے سرینوں کو اس طرح اٹھا بٹھا نہیں سکتے، جیسے تم لوگ رکوع اور سجدے میں کرتے ہو، مگر مسلمانوں کی نمازوں کی دلکشی نے دیکھنے کے بعد ان پر اتنا اثر کیا کہ واپسی سے پہلے وہ مسلمان ہو گئے۔ شمس الائمہ سرخسی نے شرح کبیر میں لکھا ہے کہ غیر مسلم رعایا کے لیے اسلامی حکومت نے مساوات کا جو قانون نافذ کیا ہے، اس کا فائدہ یہ بھی ہے کہ

"وربما یرون محاسن الشریعۃ و یسلمون فکان ھذا فی معنی الدعا با رفق الطریقین"

(شرح السیر الکبیر ۳/۲۵۰، السرخسی محمد بن احمد، حیدرآباد، دائرۃ المعارف، ۱۳۳۵ھ)

''یعنی اس ذریعہ سے ان کو اسلامی شریعت کی خوبیوں کے دیکھنے کا موقع ملتا ہے اور اسلام قبول کر لیتے ہیں گویا اسلامی دعوت کی یہ ایک نرم ترین راہ ہے''۔

ابن بطال کے حوالہ سے الکتانی نے نقل کیا ہے کہ قرآن و علم و حدیث وغیرہ فقہ کی تعلیم نہ صرف اسلامی قلمرو کے مسلم باشندوں بلکہ ان کے سوا دوسرے غیر مسلموں کو دینا چاہیے، یہ ابوحنیفہ و شافعی کا مقولہ ہے۔ (التراتیب الاداریۃ ۲/۲۹۳، الکتانی، عبدالحی، بیروت، ناشر، حسن جعنا، س ن)

ط۔ غیر مسلم اقوام کے پڑوسیوں کے ساتھ مسلمانوں کے وہی تعلقات جنہیں عہد حاضر کا مسلمان پڑھتا ہے اور دل ہی دل میں دنیا کی ان ہی غیر مسلم اقوام کی موجودہ نسلوں کو خطاب کر کے کہتا ہے

Marfat.com

ہم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھالا تم کو　　تم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھلنے نہ دیا

یہی یہودی قوم جس کے ایک فرد کی عیادت کے لیے رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے، سینکڑوں سال تک ان کی پناہ گاہ مسلمانوں کے ممالک رہے جس کا کچھ ذکر آگے بھی آ رہا ہے لیکن ان کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہے، دنیا دیکھ رہی ہے، یورپ سویا ہوا تھا، ہم نے اس کو جگایا، جاگنے کے ساتھ ہمارے سینہ پر چڑھ بیٹھا اور میں کس کس کا ذکر کروں، قوموں کو سوچنا چاہیے کہ آخر شرافت کیا اسی کا نام ہے، انسانیت اسی کو سمجھتے ہو۔

ی۔　　کسی کو بلا وجہ افعال شنیعہ کے ساتھ متہم کرنا اور اس کی آبروریزی کی تعبیر ''قذف'' کے لفظ سے کی جاتی ہے، جس کی سزا اسی کوڑے مقرر ہیں اور ایسا آدمی مردود الشہادۃ عدالت سے قرار دیا جاتا ہے۔

ک۔　　تفصیل تو اس کی تو اس کی سورہ کہف کی آیت **فلعلک باخع نفسک علیٰ آثارهم (الکہف ۶/)** کے لفظ کی تفسیر میں دیکھیے، یعنی خدا کے متعلق ولدیت کا عقیدہ جن آثار کو چھوڑ کر جائے گا ان کو خوب سوچ کر آنحضرت ﷺ کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے آپ کو کیا آپ ہلاک کر دیں گے۔ خاکسار کے نزدیک مسیحی دین کی تاریخ کی طرف آثارھم کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے کلیسا کا نظام کیسے پیدا ہوا، پوپ غیر معمولی اقتدار کا مالک سارے مسیحی ممالک میں ہوگیا اور کلیسا کی طاغوتی طاقت کی پشت پناہی میں دین مسیحی کے نمائندوں نے جو مظالم ڈھائے اسی کے ردعمل نے الحاد اور بے دینی کے اس دور کو پیدا کیا۔

ل۔　　سیوطی نے بیہقی کی شعب الایمان اور ابن مردویہ کی تفسیر کے حوالہ سے روایت کو جن الفاظ میں نقل کیا ہے ان ہی میں یہ بھی ہے کہ عمرو بن عنبسہ نے کہا **سمعت رسول الله** ﷺ **يقول من كان بينه بين قوم عهد فلا يشد عقدة و لا يحلها بكل حتى ينقضى امرها أو ينبذ اليهم على سواء** یعنی جب کسی سے معاہدہ کیا جائے تو معاہدے کے بعد نہ کوئی گرہ بندھ سکتی ہے اور نہ کھل سکتی ہے جب تک کہ مدت معاہدے کی پوری نہ ہو جائے اور معاہدے کے فریق کے ساتھ منابذہ علی السواء کا معاہدہ نہ کیا جائے اسی منابذہ علی السواء کا وہ معاملہ کیا جائے جسے میں نے درج کیا ہے (دیکھیے الدر المنثور، ۳/ ۳۴۸، سیوطی، جلال الدین، عبدالرحمٰن بن ابی بکر، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۱۱ھ)

م۔ قرآنی آیت لاتزر وازرۃ وزر اخری (النجم/۳۸) کوامام اوزاعی نے مراسلہ میں نقل کیا تھا میں نے اسی کا ترجمہ کر دیا ہے۔

ن۔ آنحضرت ﷺ کے آخری الفاظ کے متعلق روایتوں میں بظاہر کچھ اختلاف پایا جاتا ہے بعضوں میں ہے کہ اللھم بالرفیق الاعلیٰ آخری الفاظ تھے، بعضوں میں الصلوۃ وما ملکت ایمانکم ان لوگوں کا خیال رکھنا جن کے تم مالک ہو یعنی غلاموں کا خیال رکھنا، اور بعض روایتوں میں وہی ہے کہ غیر مسلم کی مذکورۂ بالا ذمہ داری کی نگرانی وحفاظت کی طرف توجہ دلائی، مگر یہ ظاہراختلاف اس کو میں اس لیے قرار دیتا ہوں کہ حق تعالیٰ کے متعلق آخری بات بالرفیق الاعلیٰ کی تھی، مسلمانوں کے ساتھ خصوصی وصیت نماز اور غلاموں کی تھی اور سارے جہان کی رحمت نے غیر مسلم اقوام کے متعلق جو آخری گفتگو فرمائی وہ مذکورہ الفاظ ہیں۔ (حضور علیہ السلام کے آخری الفاظ کے لیے ملاحظہ ہو)، (طبقات ابن سعد، ۸/۲،۲۷۶ - ۲۷۷، ابن سعد، محمد بن سعد، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۱۹۹۷ء) (از محقق)

س۔ دراصل قبرص (سائپرس) کا یہ جزیرہ بحر روم کے جزائر میں کلیدی جزیرے کی حیثیت رکھتا ہے، قسطنطنیہ کی رومی حکومت ہمیشہ یہاں کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ جو عیسائی تھے، ساز باز کرنے کے لیے جوڑتوڑ کرتی رہتی تھی۔ اسی سلسلہ میں مسلمانوں کی حکومت کو اس جزیرے کے غیر مسلم باشندوں سے شکایت پیدا ہو جاتی تھی، شکایتوں کا یہ سلسلہ زمانہ تک جاری رہا، لیکن ایک دفعہ نہیں بارہا یہ صورتیں پیش آئیں کہ رومیوں کی پشت پناہی اوران کی سراغ رسانی کے جرائم کا علم جزیرے کے عیسائیوں کے متعلق مسلمانوں کی حکومت کو ہوا حکومت تشدد پر آمادہ ہوئی لیکن مسلمانوں کا دین آڑے آتا رہااوران کو بچاتا رہا، تفصیل کے لیے طبری ابن اثیر وغیرہ پڑھیے۔

ع۔ امام مالکؒ کے یہ الفاظ قابل غور ہیں'' سچ کی حمایت اس لیے کرنی چاہیے کہ وہ سچ ہے''اس قسم کے جھوٹ کے سمجھنے کی صلاحیت کم از کم مسلمانوں میں نہیں پائی جاتی۔ ہم تو سچ کی حمایت اس لیے کرتے ہیں کہ سب سے بڑی قوت والا خدا سچ کی حمایت کرنے والوں کا حامی بن جاتا ہے۔ امام مالک نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے باقی اس کے سوا جو کچھ بھی ہے صرف لفظی مغالطے اور تعبیری منہ زوریوں سے زیادہ اس کی کچھ وقعت نہیں۔ (فتوح البلدان، ص۱۵۶، البلاذری، احمد بن یحییٰ، برل، ۱۸۶۶ء)

ف۔ بنی تغلب کے عیسائیوں کی پوزیشن کی تفصیل میری کتاب امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی میں مل سکتی ہے۔

ص۔ ابراہیم نے پھر یورپ کے باشندوں کے قتل کا حکم دیا جو ترکی علاقوں میں تھے لیکن اس حکم کی تعمیل بھی نہ ہو سکی۔ آخر میں صرف یورپین حکومتوں کے سفراء گرفتار کر لیے گئے اور ان کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا کہ حکومت ترکی کی یہ رسوائی تم لوگوں نے اور تمہاری حکومتوں نے کیسے برداشت کی۔ ان میں انگلستان، ہالینڈ، وینس، وغیرہ کے سفراء سب ہی شریک تھے، سفیروں نے جواب دیا کہ مالٹا کے ان لٹیروں پر ہماری حکومتوں کو کسی قسم کا اقتدار نہیں ہے۔ البتہ فرانس کی حکومت چاہتی تو ان کو روک سکتی تھی، ابراہیم نے ان کو تو چھوڑ دیا، اور حکم دیا کہ فرانس پر چڑھائی کا انتظام کیا جائے مگر وزراء نے کریٹ کی فتح کی طرف سلطان کو متوجہ کر کے اس ارادہ کو ملتوی کرایا۔ (تعلیقات شکیب ارسلان بر مقدمہ ابن خلدون، ۲/۲۴۸، شکیب ارسلان، مصر، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۹۳۶ء)

ق۔ عیسائی سلطنتوں نے اپنی کل رعایا کو اپنا مذہب قبول کرنے پر مجبور کیا اور یوں متحد مذہب والی قومیں بنالیں۔ ڈاکٹر عبدالحکیم مرحوم نے اپنی سیرت میں ایشیاٹک کوارٹرلی ریویو سے یہ شہادت نقل کی ہے۔ دیکھوان کی کتاب النبی والاسلام۔ (مکمل شہادت کے لیے ملاحظہ ہو، النبی والاسلام، ۲۲۲۔ ۲۲۱، عبدالحکیم، ڈاکٹر، انبالہ بلالی اسٹیم پریس، ۱۹۱۵ء)۔ خود ہندوستان میں بودھ مذہب کو اسی لیے ناپید کیا گیا مگر اسی زمانہ سے ہندوستان صدیوں کی غلامی میں مبتلا ہو گیا۔

ر۔ البلاذری نے لکھا ہے کہ امیر معاویہ اور یزید پھر مروان بنی امیہ کے ان حکمرانوں کے زمانہ تک اسلامی علاقہ کے سارے سرکاری دفاتر حضرت عمرؓ کے زمانہ سے رومی زبان اور خط ہی میں رہے۔ عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں دفتر کے ایک رومی صیغہ دار کے متعلق عبدالملک تک یہ خبر پہنچائی گئی کہ دوات میں پانی ڈالنے کی ضرورت تھی۔ رومی صیغہ دار نے بجائے پانی کے اس میں پیشاب کر دیا، مقدمہ کی تحقیقات کی گئی اور مجرم کو سزا ہوئی۔ اسی کے بعد عبدالملک نے سلیمان ابن سعد کو بلا کر حکم دیا کہ دفتر کو عربی زبان میں منتقل کر دیا جائے، سال بھی پورا ہونے نہ پایا کہ رومی علاقے کے سارے دفاتر کی زبان عربی ہو گئی۔ (فتوح البلدان، ص ۱۹۳) مگر لطف یہ ہے کہ ایرانی علاقے میں دفتر کی زبان پھر بھی فارسی ہی باقی رہی۔ آخر حجاج کے زمانہ میں صالح بن

Marfat.com

عبد الرحمٰن نے اس کو بھی عربی میں منتقل کیا۔ (فتوح البلدان، ص ۳۰۸) یہی حال سکے کا بھی نظر آتا ہے۔ بظاہر باضابطہ ٹکسال بھی عبد الملک ہی کے زمانہ میں قائم ہوئی۔ قصہ جس کا طویل ہے، مصری کپڑوں پر رومی زبان میں خاص قسم کا طغرا بنتا تھا، عبد الملک نے منع کر دیا اور عربی میں طغرے کا ڑھنے کا حکم دیا۔ قسطنطنیہ کے قیصر کو جب اس کی خبر ملی تو عبد الملک کو اس نے خط لکھا کہ سکہ تو تمہارے ملک میں ہمارے ہاں کا چلتا ہے ہم ہر سکہ پر تمہارے پیغمبر کے نام گالیاں چھاپنے کا حکم دے دیں گے خط کو پڑھ کر عبد الملک بہت پریشان ہوا لکھا ہے کہ گھبراہٹ میں ٹہلتا اور کہتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو اسلام میں مجھ سے زیادہ بد بخت آدمی گویا پیدا نہ ہوا کہ پیغمبر کی اسی اہانت اس کی وجہ سے ہوئی پھر لوگوں نے مشورہ دیا کہ دار الضرب خود قائم کر دیجیے، یہی کیا گیا۔

(علم الدین، ص ۵۲۵، تلاش بسیار کے بعد بھی یہ کتاب میسر نہیں آئی، البتہ اسلامی سکے کی تاریخ کے لیے ملاحظہ ہو،

۱۔ الکامل، ۳/۴۵۳۔۴۵۲، ابن اثیر، مبارک بن محمد، بیروت، دار الکتاب العربی، ۱۴۲۰ھ

۲۔ مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۶۱، ابن خلدون، عبد الرحمٰن ابن خلدون، بیروت، موسسۃ الاعلمی، س ن

۳۔ فوات الوفیات، ۲/۴۰۳، الکتبی، محمد بن شاکر، بیروت، دار صادر، ۱۹۷۳ء،) (از محقق)

ث۔ یہ تبلیغی مکتوب مستحق ہے کہ عربی سے اردو میں اس کا ترجمہ کر دیا جائے کئی مولویوں سے کہا لیکن متوجہ نہ ہوئے۔ خدا نے فرصت دی تو انشاءاللہ خاکسار ہی اس کام کو انجام دے گا۔

یہ طویل خط ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور مسلمان حکمرانوں کی دعوت اسلام کی عمدہ مثال ہے۔ از محقق (عصر المامون، ۲/۲۳۶۔۱۸۸، رفاعی، احمد فرید، الدکتور، قاہرہ، دار الکتب المصریہ، ۱۹۲۷ء)

ت۔ دیکھو کتاب الفہرست لابن ندیم، ص ۳۳۸، ابن ندیم، مصر، المطبعۃ الرحمانیہ، ۱۳۴۸ھ) مامون عموماً اس قسم کے مسلمانوں کے متعلق جو محض دنیا کے لالچ میں مسلمان ہو گئے ہیں، شدید نفرت کا اظہار کیا کرتا تھا، کہتا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں منافقین کا جو حال تھا مجھے تو کچھ اسی قسم کا حال ان لوگوں کا بھی معلوم ہوتا ہے۔ پھر جیسے آنحضرت ﷺ نے منافقین کے معاملہ کو خدا کے سپرد کر دیا تھا میں بھی دنیا کے لالچ سے مسلمان ہونے والوں کے مقابلہ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

ث ۔ تھوڑا بہت مواد اس سلسلہ میں آپ کو آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام میں بھی مل سکتا ہے ۔ خصوصاً صلاح الدین ایوبی ، فیروز تغلق وغیرہ سلاطین کی تبلیغی دلچسپیوں کی تاریخی شہادتیں جو اس نے پیش کی ہیں لیکن مطالعہ سے چاہا جائے تو ایک کافی ضخیم کتاب اس سلسلہ میں لکھی جا سکتی ہے ۔

خ ۔ عثمان بن حنیف کا یہ بیان اگر صحیح ہے اور ان کا بیان اگر صحیح نہ ہوگا تو کس کا ہوگا ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں خلفاء کے زمانہ میں حکومت کے ذمہ دارانہ خدمات آپ کے سپرد رہے ہیں ، رسول اللہ ﷺ کے مشہور صحابی ہیں ۔ بہر حال آپ کے اس بیان کا مطلب یہی ہوا کہ پیداوار کا دو تہائی حصہ کاشتکاروں کو دے دیا گیا تھا اور ایک تہائی حصہ حکومت کے لیے لیا گیا ۔ ایک طرف اس واقعہ کو رکھیے اور اسی ارض سواد جو ایرانیوں سے منتقل ہو کر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئی تھی اسی کے متعلق شاہ ولی اللہؒ کی اس توجیہ کو بھی پیش نظر رکھیے وہ فرماتے ہیں ان کی عربی عبارت کا ترجمہ ازالۃ الخلفاء سے کر رہا ہوں ۔

''میرے نزدیک حضرت عمرؓ کے اس عمل کی توجیہ (یعنی بعض صحابیوں نے خیال ظاہر کیا تھا) کہ عراق کے اس زرعی علاقہ کو جاگیر بنا کر ان لوگوں کے حوالہ کر دیا جائے جنہوں نے اس علاقہ کو فتح کیا ہے ۔ مگر حضرت عمرؓ اور آپ کے ساتھ حضرت عثمان وعلی ، طلحہ نیز انصار کے بھی سربر آوردہ حضرات تھے ان سب کی رائے یہ تھی کہ ان مفتوحہ علاقوں کو قومی ملک بنا کر خالصہ کر لیا جائے یعنی حکومت ان پر قبضہ کر لے اور انفرادی جاگیروں کی شکل میں ان کو تقسیم نہ کیا جائے ۔ بہر حال شاہ صاحب حضرت عمر کے فعل کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایران اور روم کے لوگوں نے زمین کے حقیقی مالکوں پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا اور ان سے وہ لگان وصول کیا کرتے تھے ۔ حالانکہ یہ جاگیردار نہ زمین کے مالک تھے ، نہ اس کی کاشت کرتے تھے اور نہ اپنے آباء اجداد سے وراثت میں یہ زمین ان کو ملی تھی ۔ مسلمانوں نے ان پر زبردستی غاصبانہ قبضہ کرنے والے جاگیرداروں سے جنگ کی اور شام وعراق کی زرعی زمینوں سے ان کو مار بھگایا ، اب زمین تھی اور زمین کے حقیقی مالک یعنی کسانوں کی وہ جماعت رہ گئی تھی جو اس میں زراعت کرتی تھی اور اسی علاقہ میں توطن پذیر تھی ۔ ان کے باپ داداؤں سے یونہی وراثۃً یہ علاقہ منتقل ہوتا ہوا ان تک پہنچا تھا ۔ جب مسلمانوں نے روم وایران کے زبردستی قبضہ کرنے والے جاگیرداروں کو مار بھگایا تو

ان کسانوں کی اکثریت نے مسلمانوں سے صلح کر لی اور لگان یعنی خراج ادا کرنے پر راضی ہوگئے لیکن ان کسانوں میں کچھ لوگ روم اور ایران کا ساتھ دے کر مسلمانوں سے لڑے بھی تھے دراصل اسی چیز نے ان زرعی علاقوں کے مسئلہ میں اشتباہ پیدا کر دیا۔ عوام نے تو یہ سمجھا کہ بزور شمشیر ان زمینوں کو ہم نے فتح کیا ہے۔ لیکن خواص صحابہ جانتے تھے کہ جنگ ان کسانوں (علوج) سے نہ تھی بلکہ ان جاگیرداروں سے تھی جنہوں نے زبردستی ان زمینوں پر قبضہ کر رکھا تھا اور نہ زمین کے جو واقعی مالک اور کاشتکار تھے ان کی اکثریت نے تو مسلمانوں کی حکومت سے صلح کر لی تھی اس لیے اس کا حکم فئی کا ہوا۔ (ازالۃ الخفاء، (مترجم)، ۳/۴۸۵، شاہ ولی اللہ، احمد بن عبدالرحیم، مترجم مولانا محمد اشتیاق، کراچی قدیمی کتب خانہ، س، ن)

آگے شاہ صاحب نے فئی وغیرہ کی قانونی بحث کی ہے۔ میری غرض اس عبارت کے پیش کرنے سے یہ تھی کہ عثمان بن حنیفؓ کی رپورٹ یعنی ایک تہائی لگان میں لی گئی ہے۔ اور شاہ صاحب کا یہ خیال کہ رومی و ایرانی جاگیرداروں کو مار بھگا کر زمین کے اصل کاشتکاروں اور مالکوں کے حوالہ مسلمانوں نے ان زمینوں کو کر دیا ان دونوں باتوں سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ آج غریب کسانوں کے جن حقوق کا ماتم کیا جا رہا ہے ان حقوق کو عملاً اسلام تیرہ صدی پہلے کسانوں تک پہنچا چکا تھا۔ میں تو نہیں جانتا کہ لگان کے مسئلہ میں اتنی فیاضی کسانوں کے ساتھ کسی زمانہ میں بھی کی گئی ہو۔ اشتراکی حکومتوں کے متعلق اگرچہ دعوی یہی کیا جاتا ہے کہ کسانوں، مزدوروں کے فلاح و بہبود کے لیے قائم ہوتی ہیں لیکن کسانوں کی ساری کمائی پر قوم کے نام سے حکومت کے وہ نمائندے قبضہ کر لیتے ہیں جن کے ہاتھ میں حکومت ہوتی ہے اور غریب کسانوں کو یتیم خانوں کے یتیموں کی طرح صرف کھانا کپڑا اور لابدی ضروریات پر قناعت کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔

ذ۔ قاضی ابو یوسف ہی نے اسی عیسائی سوداگر کے متعلق یہ قصہ بھی نقل کیا ہے کہ کچھ دن بعد حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے اس نے کہا میں وہی بوڑھا عیسائی ہوں جس نے آپ کے امین کردر گیری زیاد کے متعلق رپورٹ کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں فرمایا کہ میں بھی تو وہی بوڑھا حنفی (الشیخ الحنفی) ہوں جس نے تیری ضرورت پوری کی تھی۔ (کتاب الخراج، ص ۷۹، ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، مصر، مطبع میریہ، ۱۳۱۲ھ)

الحنیفی سے مطلب حضرت عمرؓ کا وہی تھا کہ ابراہیم حنیف کی ملت کا پیرو ہوں جس کی پیروی کی قرآن میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے۔

ض۔ پرچنگ آف اسلام کے حاشیہ سے میں نے مذکورۂ بالا یادداشت نقل کی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت سے کل پانچ سال پہلے ''جس ٹی نین'' قیصر روم کی وفات ہوئی تھی۔

ظ۔ عراق کے ایک قدیم قصبہ کا یہ نام ہے۔ کہتے ہیں کہ بعد کو اسی آبادی کا نام ''عکیرا'' مشہور ہوا۔ بغداد سے تیس میل کے فاصلہ پر ہے۔

غ۔ خود کعبہ کی عبادت گاہ جو تین چار صدیوں سے مخلوقات کی پوجا پاٹ کا مرکز بن گئی تھی، اللہ کے آخری رسول ﷺ نے خالق کی عبادت کے اس پہلے گھر کا تعلق پھر خالق ہی سے قائم کر دینے میں جو کامیابی حاصل کی، تو اس وقت بھی اس کے سوا اور کیا کیا کہ مخلوقات کے پوجنے والوں کو خالق کا پرستار بنا لیا گیا، ان ہی نے بجائے مخلوقات کے کعبہ کو خالق کی عبادت کا مرکزی مقام بنا دیا۔ مسلمانوں پر بعض عبادت گاہوں کی علامتوں کی بنیاد پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ زبردستی دوسری قوموں کی عبادت گاہوں کو انہوں نے مسجد بنا لیا تھا، ممکن ہے کہ بعض ناواقف مسلمانوں نے دین کے احکام سے جہالت کی وجہ سے کبھی ایسا کیا ہو، لیکن جہاں تک میں نے تحقیق کی ہے، یہی معلوم ہوا کہ کعبہ کے ساتھ جو صورت پیش آئی یہی صورت عموماً ان عبادت گاہوں کی بھی ہے، یعنی وہی لوگ جو مخلوقات کی عبادت ان مکانوں میں کرتے تھے، خالق کی عبادت ان میں کرنے لگے۔

الف، الف۔ البلاذری نے لکھا ہے کہ قتیبہ نے سمرقند میں جن مسلمانوں کو آباد کیا تھا، ان ہی میں ضحاک بن مزاحم بھی تھے۔ (فتوح البلدان، ص ۴۲۷) اور ضحاک بن مزاحم کے متعلق اس واقعہ کا ذکر تو تقریباً اکثر مؤرخین نے کیا ہے کہ ان کے مکتب خانوں میں تعلیم پانے والے طلبہ کی تعداد تین ہزار تھی، خچر پر سوار ہو کر طلبہ میں وہ گشت کرتے تھے مگر حوالہ اس وقت محفوظ نہ رہا کسی مستند کتاب میں میں نے پڑھا ہے کہ تین ہزار طلبہ کے سوا پانچ سو طالبات یعنی تعلیم پانے والی بچیوں کی بھی تھی بہر حال پہلی صدی ہجری کے وسطانی عہد کا تھا۔

ب، ب۔ دمشق کے گرجا یوحنا یا ماریحنا کے متعلق جیسے یہ صورت پیش آئی کہ عیسائیوں کی خوامخواہ

Marfat.com

دھمکی نے ولید کو آپے سے باہر کر دیا۔ (فتوح البلدان، ص ۱۲۵) البلاذری نے لکھا ہے کہ سمرقند میں بھی لکڑی کے بنے ہوئے بتوں کے متعلق بھی قتیبہ کو یہی دھمکی دی گئی کہ جو ان کو ہاتھ لگائے گا تباہ ہو جائے گا۔ قتیبہ نے کہتے ہیں کہ ان کو جلا کر دکھا دیا، بیان کیا جاتا ہے کہ اس منظر کو دیکھ کر بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ (فتوح البلدان، ص ۴۲۸) میری غرض یہ ہے کہ دوسری قوموں کی عبادت گاہوں یا معبودوں کے متعلق جاہل مسلمانوں کی طرف سے ایسی غیر آئینی شکلیں اگر پیش آئی ہیں تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قسم کے غلط دعووں نے خواہ مخواہ کی ضد پیدا کر کے ناواقفوں کو اس پر آمادہ کیا، ورنہ برا بھلا کہنے کی ممانعت غیر اقوام کے معبودوں کی قرآن میں جب کی گئی ہے تو توڑنے پھوڑنے پر وہ کیسے راضی ہو سکتا ہے۔

ج، ج۔ حالانکہ ان بے چاروں کو یہ معلوم نہیں کہ صحابہ تک کے عہد میں کاتب کا عہدہ غیر مسلموں کو دیا جاتا تھا، ابوموسیٰ اشعریؓ کا کاتب سیکرٹری عیسائی تھا۔ حضرت معاویہ کا سیکرٹری بھی سرجون عیسائی ہی تھا۔ مجھ ہی سے آپ سن چکے کہ عبدالملک مروانی سے پہلے دفاتر کی زبان رومی وایرانی تھی، ظاہر ہے کہ بجز عیسائیوں اور پارسیوں کے بے چارے عرب ان دفاتر میں کیسے کام کر سکتے تھے۔ اگر ملازمت سے ان کو روکا گیا تو دین کی وجہ سے نہیں بلکہ رشوت کی بدعادت کی وجہ سے۔

د، د۔ قرون وسطی کی شخصی حکومت کے زمانہ میں ایک ایرانی دیسکھ حکومت کے صحیح نصب العین کی تعبیر ان الفاظ میں کرتا ہے، اسی کو کتخدائیت کا کمال قرار دیتا ہے، لیکن بیسویں صدی کی روشنی والے زمانے میں حکومت کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ پچاس آدمی جس جماعت میں شریک ہیں ان کے ساتھ (۵۱) افراد پر مشتمل جماعت جو کچھ چاہے کر سکتی ہے۔

ھ، ھ۔ اس سلسلہ میں بلا وجہ غریب عالمگیر کو زیادہ بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کا جواب مستقل مقالات اور کتابوں کے ذریعہ سے لوگ دے چکے ہیں، آرنلڈ نے بھی اپنی کتاب میں سلطان اورنگ زیب عالمگیر انار اللہ برہانہ کے متعلق ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ عالمگیر کے پاس کسی نے یہ عرض پیش کی کہ دفتر حسابات میں جو پارسی ملازم ہیں ان کو برخاست کر دیا جائے اس لیے کہ وہ آتش پرست ہیں، جواب میں عالمگیر نے سختی کے ساتھ لکھا کہ یہ درخواست بیہودہ ہے اور آخر میں بادشاہ نے ارقام فرمایا تھا کہ

Marfat.com

سلطنت کا یہی دستور العمل ہوتا تو چاہیے تھا کہ ملک کے سب راجاؤں اور ان کی رعیت کو غارت کر دیا جاتا۔ (اشاعتِ اسلام، ص ۲۵۹، آرنلڈ، ڈی ڈبلیو، مترجم، شیخ عنایت اللہ لاہور، محکمہ اوقاف پنجاب، ۱۹۷۲ء)

و، و۔ اسی پادری کی ایک تقریر کا آرنلڈ نے حاشیہ میں تذکرہ کیا ہے، ترکوں کا ذکر کرتے ہوئے وہی لکھتا ہے کہ ترک جسم کو ایذا نہیں دیتے بلکہ پرہیزگاری کے بھیس میں ظاہراً طریق پر اس کی خدمت کرتے ہیں اور اپنے شیطانی فریب سے وہ روح کو جو جسم کے اندر ہے، اس کا ایمان لے کر تلف کر دیتے ہیں۔ (اشاعتِ اسلام، (حاشیہ)، ص ۱۷۵)

ایک انگریز سیاح سلیڈن نامی نے تو مسلمانوں کی حکومت پر بھی تنقید نما طعن کیا ہے کہ

''وہ حد سے زیادہ دوسرے مذاہب کو آزادی دیتی ہے'' (النبی والاسلام، ص ۱۰۸)

یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ زمانے تک اسلام کے جبر واکراہ کا ڈھنڈورا پیٹا گیا لیکن اب لہجہ بدل کر اسلام کی غیر معمولی نرمی کو تیر ملامت کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اسی یورپ کی طرف سے مطالبہ تھا کہ مذہب کو عقلی معیار پر پورا اترنا چاہیے لیکن کچھ لوگ یورپ ہی میں اب کہنے لگے ہیں وہ مذہب ہی کیا ہوا جو عقل میں سما جائے۔

ز، ز۔ آل حمدان کی اصطلاح سے اسلامی تاریخ کے مطالعہ کرنے والے ناواقف نہ ہوں گے، خلافت بغداد کی مرکزیت جب ختم ہوئی تو اطراف و جوانب میں چھوٹے بڑے حکمرانوں نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لیں ان ہی میں ایک آل حمدان والے بھی تھے۔ سیف الدولہ جس کا نام ابوالحسن علی بن عبداللہ بن حمدان بن حمدون التغلبی الربعی تھا اس خاندان کا پہلا بادشاہ تھا۔ حلب کو اس نے دار السلطنت قرار دیا تھا۔ مصر کی اخشیدی حکومت اور قسطنطنیہ کی رومی حکومت سے برسرِ پیکار رہتا تھا، مشہور شاعر متنبی نے اس کی بھی دربار داری ایک زمانہ تک کی تھی، تفصیلات کے لیے عام تاریخی کتابیں دیکھیے۔ ۳۵۶ھ میں سیف الدولہ نے وفات پائی۔

ح، ح۔ اسی موقع پر آرنلڈ کی کتاب کے ان حواشی کا پڑھنا بھی مفید ہوگا جن میں مختلف سیاحوں اور مصنفین کی کتابوں سے اس نے نقل کیا ہے کہ ترکوں کی حکومت کا یہ وہ زمانہ تھا جس میں عیسائیوں سے زیادہ ترکی سلطنت میں مسلمان بیچارے مصیبتوں کے شکار تھے۔ لکھا ہے کہ مسلمانوں کا افلاس عیسائیوں کے افلاس سے اتنا بڑھا ہوا ہے کہ ان مسلمانوں کو دیکھ کر سیاحوں کو رحم آتا ہے۔ یہ اور

Marfat.com

اسی قسم کی باتوں کا بے دینی کے عہد میں پیدا ہو جانا تعجب خیز نہیں ہے۔ (اشاعت اسلام، ص ۱۶۷) لیکن بقول امیر شکیب ارسلان آج یورپ کی ذہنیت اسلامی حکومتوں کے متعلق یہ جان کر کہ اسلام کی دینی حکومت میں عیسائیوں کو ہر قسم کے حقوق سے استفادہ کا موقع بہ سہولت میسر آتا ہے لیکن باوجود اس کے پھر بھی مسلمانوں کی لادینی حکومت ہی پسند بھی کی جاتی ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو لادینی حکومت کے قائم کرنے پر مسلمان حکمرانوں کو آمادہ کیا جائے۔ امیر نے یہ لکھنے کے بعد خوب لکھا ہے کہ اسلام کے ساتھ تعصب اور تنگ نظری کی یہ بدترین مثال ہو سکتی ہے جسے انسانی عقل سوچ سکتی ہے۔ اسلام کو وہ ناپسند کرتے ہیں خواہ ان کا وہ محافظ ہی کیوں نہ ہو اور اسلام کے زوال کو وہ چاہتے ہیں، خواہ اسلام کے زوال میں خود ان کا زوال بھی کیوں نہ ہو رہا ہو۔ (تعلیقات، مقدمہ ابن خلدون، ۱۷۸/۲)

ط، ط۔ بجز اس ایک توجیہ کے جس کا ذکر مخدوم ومحترم مولانا عبد الباری الندوی سابق استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ فقیر سے کیا کرتے تھے کہ میں کشمیر میں تھا۔ مشہور منکر خدا مسٹر ظریف بھی کشمیر آئے ہوئے تھے۔ کانپور کی مسجد کا قصہ اسی عرصہ میں چھڑا، مسلمان شہید ہوئے۔ مسٹر ظریف کو اس واقعہ سے میں نے متأثر پایا۔ پوچھا کہ جب خدا ہی کے آپ منکر ہیں تو مسلمانوں سے ہمدردی کے کیا معنی؟ مسٹر ظریف جھنجھلا کر بولے کہ واہ کیا میری قومیت بھی مسلمانوں کی نہیں ہے؟

ی، ی۔ مگر جو نہیں جانتے ہیں انہوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ گذشتہ اسلامی سلاطین کی حکومت کا قانون اسلامی قانون نہ تھا۔ یہ عجیب وغریب مغالطہ ہے جس میں اچھے پڑھے لکھے لوگ اس وقت تک مبتلا ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک اسلامی حکومتیں مغربی دول کے سیاسی اثر سے آزاد تھیں، عموماً اسلامی فقہ سارے اسلامی ممالک کا قانون تھا۔ مشرق کی حکومتوں میں زیادہ حسن قبول اسلامی قوانین کی اس تشریح نے حاصل کیا، جو امام ابوحنیفہ اور ان کے مکتب خیال کی طرف منسوب ہے۔ اور مغرب، اندلس وافریقہ وغیرہ میں امام مالک کی فقہ عموماً مروج تھی، انشاء اللہ اس کی پوری تفصیل کتاب ''تدوین فقہ'' میں کی جائے گی۔ اگر اس کی تکمیل کا موقع ملا۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی کے نام سے خاکسار نے جو کتاب لکھی ہے، ابتدائی حالات اس میں بھی مل سکتے ہیں۔ مجلہ عثمانیہ میں ایک مقالہ بھی میرا شائع ہوا ہے۔ یہی ایک فقرہ کہ سلطان بھی اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ مفتی سے فتویٰ لے لے۔ لوگوں کی آنکھوں کے کھولنے کے لیے کافی ہے، کہ یہی

Marfat.com

حال سارے اسلامی سلاطین کا تھا۔

ک،ک۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری تصریحات سے میں اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ ہسپتالوں کا موجودہ مغربی نظام مسلمانوں سے یورپ نے سیکھا ہے۔ ہم نے چھوڑ دیا اور انہوں نے اس نظام کو ترقی دی۔ آخر اگر یورپ میں شفا خانوں کا نظام پہلے سے موجود ہوتا، تو مسلمانوں کے شفا خانوں کا ذکر کر کے اپنی قوم کو یہ مصنف عبرت کیوں دلاتا؟

ل،ل۔ اسباب کچھ بھی ہوں لیکن ہندوستان خصوصاً مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کا جو سیلاب بے خانماں ہو کر مغربی پنجاب پہنچا لوگوں کو حیرت ہے کہ اتنے بڑے طوفان کو مسلمانوں نے کیسے سنبھال لیا۔ لیکن مسلمانوں میں موروثی طور پر مواسات و ہمدردی کے عناصر جو پائے جاتے ہیں ان کا مقابلہ ان لوگوں کے جذبات سے کرنا صحیح نہ ہوگا جن میں باہم ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو نجس اور ناپاک سمجھتا ہے۔

م،م۔ یہ چین کی شخصی حکومت یا قرونِ وسطیٰ کے تاریک عہد کی ایک تاریخی یادگار ہے۔ کیا جمہوریت کے اس طلائی اور روشن عہد میں لوگ قرونِ وسطیٰ کی شخصی حکومت کے اس فرمان سے کوئی عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ کہنا بہت آسان ہے لیکن کر دکھانا واقعات ہی کی روشنی میں ممکن ہے۔ اس فرمان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے متعلق شکایتوں کے اسباب بھی پرانے ہیں اور شکایت کرنیوالے بھی نئے نہیں ہیں لیکن باوجود ان تہمتوں کے چین میں مسلمان بحمد للہ اس وقت تک موجود ہیں۔

ن،ن۔ یہ سورہ ص کی مشہور آیت ہے، اس سورہ کی ابتداء اس مضمون سے کی گئی ہے کہ بل الذی کفروا فی عزۃ و شقاق (اسلام کے نہ ماننے والے دراصل، عزت اور چیر پھاڑ کے عارضہ میں گرفتار ہیں) موجود، قومیت کا بھوت قوموں پر جو سوار ہے، حاصل اس کے اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہر قوم اپنی عزت و سربلندی و برتری کی مدعی ہے اور یوں بنی آدم کی ایک ہی نسل کو قوموں اور امتوں کی شکل میں چیر پھاڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔ اسلام جس توحید کی دعوت پیش کر رہا تھا، کہتے ہیں کہ کسی دوسری قوم میں یہ بات سنی نہیں گئی۔

س،س۔ یہ پوری روایت کسی ایک کتاب میں نہیں مل سکی۔ اس لیے دو علیحدہ علیحدہ حوالے دیئے گئے ہیں۔ (از محقق)

Marfat.com

ع،ع۔ مجاہد امام المفسرین سے اوّاب کے قرآنی لفظ کی تشریح میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ ابن عمرؓ سے اوّاب کے معنی مجاہد نے پوچھا، ابن عمرؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

''اوّاب وہ ہے جو تنہائی میں اپنے گناہوں کو یاد کر کے حق تعالیٰ سے ان کی مغفرت کی درخواست کرتا رہے''۔ (تفسیر فتح القدیر،۴/۲۶۱، الشوکانی محمد بن علی، بیروت، دار احیاء التراث العربی،۱۴۱۸ھ)

ف،ف۔ اس موقع پر مناسب ہوگا کہ سورہ کہف کی ان آیتوں کو پیش نظر رکھا جائے جن کے مضامین کی طرف ان فقروں میں اشارہ کیا گیا ہے۔ تشریحی ترجمہ ان آیتوں کا یہ ہے یعنی کہف والوں کے قصہ کو بتاتے ہوئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ

''وہ چند نوجوان تھے، جنہوں نے اپنے رب (مالک) کو مان لیا تھا اور ہم نے رہنمائی میں ان کو ترقی عطا کی۔ ان کے دلوں کو ہم نے باندھ دیا (مخلوقات کا خوف اسی لیے نکل گیا کہ خالق سے بندھ جانے کے بعد مخلوق کا وزن قدرۃً انسانی قلوب میں باقی نہیں رہتا اور دیکھو! جب نوجوانوں کی یہ ٹولی کھڑی ہوگئی اور کہنے لگی ہمارا مالک وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔ ہم اس کے سوا کسی کو نہ پکاریں گے ایسا اگر ہم نے کیا تو راہِ حق سے ہٹ جائیں گے۔ ہماری قوم نے خالق کے سوا مخلوقات کو اپنا معبود اور الٰہ بنا رکھا ہے۔ کیوں نہیں اپنے اس فعل کے جواز میں کوئی ایسی کھلی دلیل پیش کرتے جو عقل پر چھا جائے۔ اس سے بڑا ظالم کون ہے جو خدا پر جھوٹ باندھے، جب قوم کے ان لوگوں کو اور جن کو خدا کے سوا یہ پوجتے ہیں تم نے چھوڑ دیا تو آؤ چلو اس غار میں ہم پناہ لیں اپنی رحمت کو خدا وہاں پھیلائے گا اور مرفق (زندگی کی سہولتوں کو تمہارے لیے مہیا کرے گا ان کے رہنے سہنے کے اطمینان بخش نظم کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ اللہ جسے راہ دکھائے وہ ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ بھٹکائے تو اس کے لیے تم کوئی راہ دکھانے والا پشت پناہ نہیں پا سکتے ان کا کتا ان کے دروازے پر ہاتھ پھیلائے پڑا تھا ان کو تم دیکھو تو بھاگ کھڑے ہو اور رعب سے تم بھر جاؤ۔ (الکہف/۱۸۔۱۳)

Marfat.com

حوالہ جات

۱۔ الزمر / ۶۷ ۲۔ النوح / ۱۳

۳۔ کنز العمال ۲/۱۷۲، علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین، حیدر آباد، جامعہ عثمانیہ ۱۳۱۲ھ

۴۔ کتاب الخراج، ص ۱۴۴، ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، مصر، مطبع میریہ، ۱۳۲۰ھ

۵۔ محولہ بالا ۶۔ محولہ بالا

۷۔ کتاب الخراج، ص ۱۲۶

۸۔ البنایہ شرح الہدایہ، ۳۶/۷، عینی، محمود بن احمد، مکۃ المکرمۃ، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۴۱۱ھ

۹۔ بحر الرائق، ۲۱۰/۲، ابن نجیم، زین الدین، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ، س ن

۱۰۔ شرح السیر الکبیر، ۱۹۰/۳، السرخسی، احمد بن محمد، حیدر آباد، دائرۃ المعارف، ۱۳۳۵ھ

۱۱۔ ایضاً، ۲۰۰/۳ ۱۲۔ مریم / ۱۹

۱۳۔ الانفال / ۶۱ ۱۴۔ الانفال / ۶۱

۱۵۔ الانفال / ۶۲ ۱۶۔ الانفال / ۶۲

۱۷۔ السیرۃ النبویہ، ۳۴۷/۳، ابن ہشام، عبد الملک بن ہشام، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۵ھ

۱۸۔ محولہ بالا

۱۹۔ السیر الکبیر مع الشرح، ۱۸۱/۱ ۲۰۔ محولہ بالا

۲۱۔ کتاب الخراج، ص ۴۷ ۲۲۔ محولہ بالا

۲۳۔ نصب الرایہ، ۹۰/۵، زیلعی، محمد عبد اللہ بن یوسف، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۶ھ

۲۴۔ محولہ بالا ۲۵۔ نصب الرایہ، ۹۰/۵۔۸۹

۲۶۔ محولہ بالا ۲۷۔ محولہ بالا

۲۸۔ محولہ بالا ۲۹۔ نصب الرایہ، ۵۸۰/۴

۳۰۔ محولہ بالا

۳۱۔ کتاب الآثار، ص ۹۲، الشیبانی، محمد بن الحسن، کراچی، قدیمی کتب خانہ، س ن

Marfat.com

۳۲۔ محولہ بالا
۳۳۔ الطبقات الکبریٰ، ۳/۱۷۵، ابن سعد، محمد بن سعد، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۹۹۷ء
۳۴۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۲۵، ابن ابی اصیبعہ، احمد بن القاسم، مصر، مطبع الوھبیہ، ۱۲۹۹ھ
۳۵۔ محولہ بالا ۳۶۔ محولہ بالا ۳۶۔الف۔ محولہ بالا
۳۷۔ تاریخ بغداد، ۳/۳۶۸، خطیب بغدادی، احمد بن علی، مصر، مطبع السعادہ، ۱۹۳۱ء
۳۸۔ محولہ بالا ۳۹۔ محولہ بالا
۴۰۔ محولہ بالا ۴۱۔ محولہ بالا
۴۲۔ الدر منثور، ۳/۳۴۸، سیوطی، جلال الدین، عبد الرحمٰن بن ابی بکر، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۱۱ھ
۴۳۔ محولہ بالا
۴۴۔ فتوح البلدان، ص ۱۵۶، البلاذری، ابو العباس، احمد بن یحیٰ، برل، ۱۸۶۶ء
۴۵۔ محولہ بالا ۴۶۔ محولہ بالا
۴۷۔ فتوح البلدان، ص ۱۶۲ ۴۸۔ محولہ بالا
۴۹۔ الاحکام السلطانیہ، ص ۱۳۸، الماوردی، محمد بن حبیب، مصر، مطبعۃ الاتحاد المصری، ۱۳۲۸ھ
۵۰۔ فتوح البلدان، ص ۱۶۲ ۵۱۔ ایضاً، ص ۱۵۷۔۱۵۵
۵۲۔ ایضاً، ص ۱۵۵ ۵۳۔ ایضاً، ص ۱۵۶۔۱۵۵
۵۴۔ تاریخ بغداد، ۲/۱۷۴ ۵۵۔ محولہ بالا
۵۶۔ محولہ بالا ۵۷۔ محولہ بالا
۵۸۔ محولہ بالا
۵۹۔ تعلیقات مقدمہ ابن خلدون، ۲/۱۷۷، شکیب ارسلان، مصر، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۹۳۶ء
۶۰۔ محولہ بالا ۶۱۔ تعلیقات مقدمہ ابن خلدون، ۲/۲۴۸
۶۲۔ محولہ بالا
۶۳۔ تاریخ فرشتہ، ۱/۱۸۷، فرشتہ، محمد بن قاسم، لکھنؤ، نولکشور، س ن
۶۴۔ محولہ بالا ۶۵۔ محولہ بالا

Marfat.com

۶۶۔ الفہرست، ص ۳۳۸، ابن ندیم، محمد بن اسحاق، مصر، المطبعۃ الرحمانیہ، ۱۳۴۸ھ

۶۷۔ محولہ بالا ۶۸۔ محولہ بالا

۶۹۔ سروآزاد، ص ۱۶۵ (تلاش بسیار کے بعد بھی کتاب میسر نہیں آئی)

۷۰۔ حاشیہ حاضر العالم الاسلامی (مترجم عربی)، ۱۴۶/۱، Lothrop Stoddard
مترجم، عجاج نویھض، تعلیقات وحواشی، امیر شکیب ارسلان، قاہرہ، المطبعۃ السلفیہ، ۱۳۴۳ھ

۷۱۔ محولہ بالا ۷۲۔ محولہ بالا

۷۳۔ حاضر العالم الاسلامی، ۱۴۷/۱ ۷۴۔ محولہ بالا

۷۵۔ کنز العمال، ۹۹۹/۱ ۷۶۔ محولہ بالا

۷۷۔ محولہ بالا ۷۸۔ کتاب الخراج، ص ۲۱

۷۹۔ محولہ بالا ۸۰۔ محولہ بالا

۸۱۔ فتوح البلدان، ص ۱۵۷ ۸۲۔ کتاب الخراج، ص ۷۹

۸۳۔ محولہ بالا ۸۴۔ فتوح البلدان، ص ۱۳۷

۸۵۔ محولہ بالا ۸۶۔ محولہ بالا

۸۷۔ محولہ بالا ۸۸۔ فتوح البلدان، ص ۱۳۶

۸۹۔ رحمۃ للعالمین، ۱۲/۳، منصور پوری، قاضی محمد سلیمان، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن

۹۰۔ اشاعتِ اسلام، ص ۱۰۹۔۱۰۸، آرنلڈ ڈی ڈبلیو، مترجم شیخ عنایت اللہ، لاہور، محکمہ اوقاف پنجاب، ۱۹۷۲ء

(بوقت تحقیق میسر آنے والا نسخہ بجائے اشاعتِ اسلام کے دعوتِ اسلام کے نام سے موسوم ہے۔ ممکن ہے کہ مولانا کے زیرِ مطالعہ جو نسخہ ہو اس کا عنوان ''اشاعت اسلام'' ہو۔ بہر حال عنوان جو بھی ہو یہ کتاب "Preaching of Islam" ہی کا ترجمہ ہے۔ قاری کی سہولت کے لیے حوالہ جات وحواشی میں نام ''اشاعتِ اسلام'' ہی ذکر کیا گیا ہے)۔ (از محقق)

۹۱۔ The Present Stage of Egypt, p 11، بحوالہ حاشیہ اشاعتِ اسلام ص ۱۰۸،

۹۲۔ اشاعتِ اسلام، ص ۱۰۹ ۹۳۔ کتاب الخراج، ص ۷۲۔۷۱

۹۴۔ کتاب الخراج، ص ۱۲۵
۹۵۔ محولہ بالا
۹۶۔ محولہ بالا
۹۷۔ محولہ بالا
۹۸۔ فتوح البلدان، ص ۱۵۹
۹۹۔ محولہ بالا
۱۰۰۔ فتوح البلدان، ص ۱۲۵
۱۰۱۔ محولہ بالا
۱۰۲۔ فتوح البلدان، ص ۱۲۶
۱۰۳۔ فتوح البلدان، ص ۴۲۲
۱۰۴۔ محولہ بالا
۱۰۵۔ محولہ بالا
۱۰۶۔ محولہ بالا
۱۰۷۔ اشاعت اسلام، ص ۲۱۲
۱۰۸۔ المسالک والممالک، ص ۱۸۰، ابن حوقل، محمد بن حوقل، مصر، مطبع السعادہ، ۱۳۲۴ھ
۱۰۹۔ مروج الذھب، ۴/۸۶، مسعودی، علی بن حسین، مصر، مطبع احمد الحلبی، ۱۳۰۳ھ
۱۱۰۔ اشاعتِ اسلام، ص ۲۱۲
۱۱۱۔ تاریخ دمشق، ۳/۳۷، ابن عساکر، علی بن حسین، مطبع روضۃ الشام، ۱۳۳۲ھ
۱۱۲۔ الطبقات الکبریٰ، ۵/۱۹۳
۱۱۳۔ ایضاً، ۵/۱۸۹
۱۱۴۔ ایضاً، ۵/۱۷۲
۱۱۵۔ ایضاً، ۵/۱۷۲
۱۱۶۔ ایضاً، ۵/۱۶۸
۱۱۷۔ ایضاً، ۵/۲۰۳
۱۱۸۔ ایضاً، ۵/۲۰۳
۱۱۹۔ ایضاً، ۵/۱۷۴
۱۲۰۔ ایضاً، ۵/۱۶۹
۱۲۱۔ تاریخ دمشق، ۲/۲۶۰
۱۲۲۔ اشاعت اسلام، ص ۲۱۲
۱۲۳۔ ایضاً، ص ۲۶۰
۱۲۴۔ ایضاً، ص ۱۵۳
۱۲۵۔ اشاعت اسلام، ص ۱۷۸
۱۲۶۔ محولہ بالا
۱۲۷۔ المسالک والممالک، ص ۱۴۱
۱۲۸۔ اشاعتِ اسلام، ص ۱۶۰
۱۲۹۔ ایضاً، ص ۱۶۱
۱۳۰۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والفئی والامارۃ، باب فی تعشیر اھل الذمہ: ۳۰۵۲، ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، بیروت، مکتبہ دار الجیل، ۱۹۹۲ء
۱۳۱۔ الجامع الصحیح، کتاب الجزیہ، باب اثم من قتل معاھدا بغیر جرم: ۲۹۹۵، بخاری، محمد بن اسماعیل، بیروت، دار ابن کثیر، ۱۴۱۰ھ

Marfat.com

۱۳۲۔ سنن ابی داود، کتاب الخراج والامارۃ والفئی، باب فی تفسیر اھل الذمۃ: ۳۰۵۲

۱۳۳۔ سنن ابی داود، کتاب الجہاد، باب فی الامام یستجن بہ فی العہود: ۲۷۵۸

۱۳۴۔ محولہ بالا

۱۳۵۔ الدر منثور، ۴/ ۳۶۸

۱۳۶۔ القیامۃ/ ۱۵۔۱۴

۱۳۷۔ اشاعتِ اسلام، ص ۱۷۰

۱۳۸۔ محولہ بالا

۱۳۹۔ اشاعتِ اسلام، ص ۱۷۲۔۱۷۱

۱۴۰۔ ایضاً، ص ۱۷۶

۱۴۱۔ اشاعت اسلام، ۱۷۶

۱۴۲۔ محولہ بالا

۱۴۳۔ اشاعتِ اسلام، ۱۸۲۔۱۸۰

۱۴۴۔ ایضاً، ص ۱۸۰۔۱۷۹

۱۴۵۔ ایضاً، ص ۱۸۰

۱۴۶۔ اشاعتِ اسلام، ص ۳۰۳۔۳۰۲

۱۴۷۔ محولہ بالا

۱۴۸۔ اشاعت اسلام، ص ۳۰۰

۱۴۹۔ محولہ بالا

۱۵۰۔ محولہ بالا

۱۵۱۔ محولہ بالا

۱۵۲۔ محولہ بالا

۱۵۳۔ محولہ بالا

۱۵۴۔ محولہ بالا

۱۵۵۔ اشاعتِ اسلام، ص ۳۰۴

۱۵۶۔ ایضاً، ص ۳۴۶

۱۵۷۔ اشاعت اسلام، ص ۳۴۶

۱۵۸۔ اشاعتِ اسلام، ص ۳۴۷

۱۵۹۔ محولہ بالا

۱۶۰۔ محولہ بالا

۱۶۱۔ اشاعتِ اسلام، ص ۳۴۸،

۱۶۲۔ اشاعتِ اسلام، ص ۳۱۷

۱۶۳۔ محولہ بالا

۱۶۴۔ محولہ بالا

۱۶۵۔ محولہ بالا

۱۶۶۔ محولہ بالا

۱۶۷۔ اشاعتِ اسلام، ص ۳۱۲

۱۶۸۔ ایضاً، ص ۳۴۰

۱۶۹۔ ایضاً، ص ۳۴۰۔۳۴۱

۱۷۰۔ اشاعت اسلام، ص ۳۴۱

۱۷۱۔ محولہ بالا

۱۷۲۔ محولہ بالا

۱۷۳۔ اشاعت اسلام، ص ۳۴۳

۱۷۴۔ محولہ بالا

۱۷۵۔ اشاعت اسلام، ص ۳۴۴۔۳۴۳

Marfat.com

۱۷۶۔ اشاعتِ اسلام، ص ۳۵۹ ۱۷۷۔ محولہ بالا

۱۷۸۔ محولہ بالا ۱۷۹۔ محولہ بالا

۱۸۰۔ اشاعتِ اسلام، ص ۳۶۰ ۱۸۱۔ الکھف / ۱۸

۱۸۲۔ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب التیمم، باب قول اللہ ولم تجدوا ماءً فتیمموا: ۳۲۸

۱۸۳۔ اشاعتِ اسلام، ص ۳۷۲ ۱۸۴۔ محولہ بالا

۱۸۵۔ محولہ بالا ۱۸۶۔ محولہ بالا

۱۸۷۔ تذکرۃ الحفاظ، ۱/۱۴۲، ذھبی، شمس الدین محمد بن حسین، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۱۳۷۶ھ

۱۸۸۔ تاریخ دمشق، ۲۵۵/۳

۱۸۹۔ وفیات الاعیان، ۱/۶۵، ابن خلکان، شمس الدین، احمد بن محمد، ایران، منشورات الرضی، ۱۹۷۱

۱۹۰۔ النساء/۷۹

۱۹۱۔ الجامع الصحیح للترمذی، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ ص: ۳۲۳۲، ترمذی، ابوعیسیٰ، محمد ابن عیسی، مصر، مطبعۃ المصطفیٰ البابی، ۱۳۹۸ھ

مسند الامام احمد بن حنبل، مسند عبداللہ بن عباس: ۲۰۰۹، ابن حنبل، احمد بن حنبل، مکۃ المکرمہ، مکتبہ عباس احمد الباز، ۱۴۱۴ھ

۱۹۲۔ محولہ بالا ۱۹۳۔ ص/۷

۱۹۴۔ دلائل النبوۃ، ۴۲۶/۲، بیہقی، ابوبکر احمد بن الحسین، بیروت، دارالکتب العلمیہ، ۱۴۰۵ھ

۱۹۵۔ السیرۃ النبویہ، ۱۶۰/۲۔۱۵۹، ابن کثیر، ابوالفداء اسماعیل بن کثیر، بیروت، داراحیاء التراث العربی، س ن

۱۹۶۔ الکہف/۱۴

Marfat.com

مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم اقوام

اس مضمون میں بجائے اسلامی حکومت کے مسلمانوں کی حکومت کا عنوان قصداً قائم کیا گیا ہے۔ کیونکہ عام استعمال کی رو سے تو ہر وہ چیز جو مسلمانوں کی طرف کسی نہ کسی حیثیت سے منسوب ہو آج کل اس کو بھی لوگ اسلامی کہہ دیتے ہیں۔ حتی کہ اس بنیاد پر ''اسلامی پانی'' کے الفاظ آج تک کانوں میں نہ سہی لیکن حافظوں میں تو اب بھی گونج رہے ہیں۔ جب چاء بیچنے والے اپنی چاء کو بیچنے کے لیے اسلامی کے اس لفظ سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے اور اسٹیشنوں کے بھشتی اسی لفظ کی پشت پناہی میں بخشش کا مستحق اپنے آپ کو قرار دیتے تھے۔

لیکن ظاہر ہے کہ اسلام تو پیدا کرنے والے خالق تعالیٰ جل مجدہٗ کا ایک پیغام ہے، ایسا پیغام جس میں اپنے بندوں پر حق تعالیٰ نے کچھ نہ کچھ ذمہ داریاں عائد فرمائی ہیں۔ کائنات کے ماضی و مستقبل و حال کے متعلق فکری نظام عطا کیا گیا ہے۔ یعنی ہستی کا موجودہ نظام جس کا ایک جز و خود ہم انسانوں کا وجود ہے اس کی ابتداء اور اس کے آخری انجام و انتہاء اور یہ کہ اس وقت یہ نظام جو چل رہا ہے کیسے چل رہا ہے، کون چلا رہا ہے، انہیں اساسی اور بنیادی سوالوں کے جواب کے متعلق ہمیں کیا سوچنا چاہیے۔ خود اس عالم کے پیدا کرنے والے نے جو علم اس راہ میں عطا کیا ہے اس علم کو یقین و قطعیت کی قوت کے ساتھ ماننا اسی کی مذہبی تعبیر و اعتقاد ہے اور جو معلومات اس سلسلہ میں خالق کائنات کی طرف سے ہم پر کھولے گئے ہیں، ان

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں نومبر ۱۹۵۰ء، جنوری و فروری ۱۹۵۱ء کو چار اقساط میں شائع ہوا۔

Marfat.com

ہی کو عقائد کہتے ہیں ۔ پھر زندگی کو اسی فکری نظام کے تحت رکھتے ہوئے صحیح انجام تک پہنچنے کے لیے ایک عملی دستور العمل یا ضابطہ پیدا کرنے والے نے عطا کیا ۔ یہی اسلام کا عملی نظام ہے ۔ آمنوا وعملوا الصالحات کا تعلق علم وعمل کے ان ہی دو نظاموں کے ساتھ قائم ہے ۔

ظاہر ہے کہ اسٹیشنوں پر بکنے والی چائے یا تقسیم ہونے والا پانی ، مندرجہ بالا دونوں باتوں یعنی اسلام کے فکری یا عملی نظام سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتا ، نہ چاء آسمان سے اتری اور نہ پانی اور نہ چاء بنانے کا طریقہ اسلام میں بتایا گیا ہے اور نہ پانی کو کنوئیں یا تالاب سے نکالنے ، مشکوں میں بھرنے ، پشت پر اٹھا اٹھا کر پلیٹ فارم کے کنارے ٹہلنے پھرنے کا طریقہ ، بہشتیوں کو اسلام نے سکھایا ہے ۔

مگر یہ فرض کر کے کہ مسلمان اس چاء کو استعمال کریں گے ، یا اس پانی کو پئیں گے کہنے والوں نے اس چاء اور پانی کا نام اسلامی چاء اور اسلامی پانی رکھ دیا ۔ اور یہی میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ''اسلامی'' کے اس لفظ کو اتنی وسعت دیگر لوگ اگر استعمال کر رہے ہیں ، تو یہ بالکل ایک جداگانہ اور اپنی من مانی گھڑی ہوئی خود تراشیدہ اصطلاح ہے ، جو خاص خاص اغراض کے زیر اثر کسی طرح چل پڑی ہے ۔ لیکن اسلام کے اس لفظ کو صرف اس پیغام اور فکری وعملی نظام کی حد تک اگر محدود رکھا جائے جو بندوں کو پیدا کرنے والے خالق کی طرف سے پہنچایا گیا ہے اور یہی اسلام کے لفظ کا صحیح مطلب ہے بھی ۔ پیغام پہنچانے والے پر اعتماد کر کے خدا کے جن بندوں نے اس پیغام کو قبول کر لیا اور اس کے مطابق جینے ، اسی پر مرنے کا قطعی فیصلہ جو کر چکے ہیں ، ان ہی کا نام ''مسلم'' ہے ۔ اور اسی کی فارسی جمع لفظ ''مسلمان'' ہے جو مسلمانان کی فارسی اور مسلمانوں کی اردو جمع الجمع کے بعد اب خود مفرد ہو کر رہ گیا ہے ۔

Marfat.com

ظاہر ہے کہ خدا کے اس پیغام یعنی اسلام کا خطاب بندوں کے کسی خاص طبقہ کے ساتھ محدود نہیں ہے۔ اس کے مخاطب جیسے مرد ہیں، عورتیں بھی ہیں، جوان بھی ہیں اور بوڑھے بھی، مسافر بھی ہیں، اور مقیم بھی، مالدار بھی ہیں اور وہ بھی جو زائد از ضرورت آمدنی نہیں رکھتے، جو صحت مند اور چنگے ہیں، وہ بھی اور صحت کی نعمت سے جو محروم ہیں وہ بھی، باپ بھی ہیں اور بیٹے بھی، ماں بھی اور بیٹی بھی، الغرض انسانیت کے سارے "تکلیفی مظاہر" اس خطاب کے مخاطب ہیں، جن میں جیسا کہ عرض کیا گیا، ہر طرح کے لوگ مرد و عورت، جوان، بوڑھے وغیرہ شریک ہیں۔ اسی طرح حکمرانی کا اقتدار جن افراد کے ہاتھوں میں قدرت پہنچا دیتی ہے، جنہیں حاکم کہتے ہیں اور وہ بھی جنہیں اس اقتدار کا کوئی حصہ نہیں بخشا گیا ہے۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ اس پیغام کے مخاطب جیسے حاکم ہیں، اسی طرح اس کے مخاطب محکوم بھی ہیں، وہ بھی ہیں جو کسی کو ملازم اور نوکر رکھتے ہیں، اور وہ بھی ہیں جو ان نوکروں یا ملازموں سے کام لیتے ہیں۔

اسلام کے اس الٰہی پیغام کا ایک حصہ تو ایسا ہے جس کے مخاطب سارے تکلیفی مظاہر ہیں لیکن اسی کے ساتھ جیسا کہ لوگ جانتے ہیں اسی پیغام کی بعض باتیں، ایسی بھی ہیں جن کی تعمیل کی ذمہ داری خاص خاص طبقوں پر عائد ہوتی ہے۔ مثلاً بہت سے احکام ایسے ہیں جن کے مخاطب صرف مرد ہیں اور بعض باتیں ایسی بھی ہیں جو صرف عورتوں تک محدود ہیں۔ بہت سے واجبات و فرائض ہیں، جن سے بیماروں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے، یا کہنہ سال بوڑھوں سے وہ معاف ہیں۔ بہت سے مطالبات کا رخ صرف مالدار کی طرف ہے، غریبوں کم مایہ لوگوں کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ کچھ احکام ہیں جن کا پابند اسلام ان لوگوں کو بنانا چاہتا ہے جو دوسروں سے کام لیتے ہیں، کچھ ذمہ داریاں ان کی بھی ہیں، جو دوسروں کا کام کرتے ہیں، پدری منصب کے

کچھ فرائض ہیں، جو ان فرائض سے بالکل مختلف ہیں، جن کے مکلف بیٹے ہیں۔

اسی سلسلہ میں احکام وقوانین کا ایک مستقل ضابطہ اسلام (الف) نے ان لوگوں کے بھی سپرد کیا ہے جو زمین کے کسی علاقہ میں حاکمانہ اقتدار کے مالک ہیں۔ اسی کے مقابلہ میں کچھ ذمہ داریاں ان کی بھی اسلام ہی نے مقرر کی ہیں، جن کی جان ومال، عزت وآبرو، فلاح وبہبود وغیرہ جیسے امور کی نگرانی کے لیے حکومت قائم ہوئی ہے۔

ایسی صورت میں سوال ہوتا ہے کہ مثلاً مسافر بن جانے کے بعد جن اسلامی مطالبات کی تعمیل کی طرف مسافروں کو توجہ دلائی گئی ہے۔ جیسے یہی کہ نماز میں قصر کریں، روزے ماہِ رمضان سے چاہیں تو مؤخر کر سکتے ہیں یا ازیں قبیل سفر کے متعلق دوسرے مشورے جو مسافروں کو دین کی طرف سے دیئے گئے ہیں ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے سفر کو بھی دو قسموں میں تقسیم کر کے سفر کی ایک قسم کا نام اسلامی سفر اور دوسری قسم کا نام ''غیر اسلامی سفر'' رکھنے پر اصرار اور اس اصرار کو اس حد تک بڑھا دینا کہ اسلامی سفر کے ہر ہر جزو کا جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ کتاب وسنت میں اس کا ماخذ کیا ہے۔ مسافر نے بستر اجو باندھا ہے تو اس کی بندش میں اس نے قرآن کی کس آیت اور رسول اللہ ﷺ کی کس حدیث کو پیش نظر رکھا ہے، بستر اس چیز سے باندھا، رسی سے باندھا، چمڑے سے باندھا، ہولڈال میں باندھا، پھر یہ کہ کس سواری پر سوار ہوا، زادراہ میں اپنے ساتھ کیا کیا رکھا۔ یہ اسی قسم کے بے شمار سوالوں کو اٹھا کر اس پر بحث کرنا کہ مسلمان مسافر کا یہ سفر واقعی اسلامی سفر کہے جانے کا مستحق ہے بھی یا نہیں۔ خود سوچنا چاہیے کہ کس حد تک مناسب ہے؟ اور ایک سفر ہی کیا؟ ان کل قصوں میں جن میں بعض کا ذکر ابھی تمثیلاً کیا گیا، کیا ہر ایک میں اسلامی وغیر اسلامی کی اس تقسیم کو جاری کرنا اور اسلامی قرار پانے والی قسم کے متعلق

Marfat.com

تنقیحی سوالات کے اٹھانے ، اور اس کے ہر ہر پہلو کو اسلامی قوانین کے اساسی ماخذوں اور بنیادی سرچشموں پر منطبق کرنے کی ضرورت اسلام کی تیرہ سوسالہ تاریخ میں کیا کبھی محسوس کی گئی ہے۔ لباس ہی کو لیجیے ، چند ضوابط اسلام میں لباس کے متعلق بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً مردوں کو چاہیے کہ ریشم کا لباس استعمال نہ کریں ، لوگ اسبال ازار کے مرتکب نہ ہوں۔ ان چند باتوں کو دیکھ کر اسلامی و غیر اسلامی لباس کی تقسیم اور اسلام کے متعلق یہ سوالات کہ اس کی تراش کیا ہو ، سلائی کیسے کی جائے ، کیسے پہنا جائے ، کیا کسی زمانہ میں لوگوں نے ان سوالوں کو اٹھایا۔ عام طریقہ اب تک یہی ہوتا رہا ہے کہ زندگی کے جس شعبہ میں بھی مسلمانوں کو اسلام نے جن حدود میں رہنے کا حکم دیا ہے ، بس ان حدود کو تو دیکھ لیا جاتا ہے ، ان حدود کے اندر رہنے والے اپنے دین کے پابند مسلمان سمجھے جاتے ہیں اور ان حدود سے تجاوز کرنے والوں کو سمجھا جاتا ہے کہ اپنے دین کے حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

پھر فرض و واجب ، سنت و مستحب ، اولیٰ ، یا حرمت و کراہت تحریمی و تنزیہی ، خلاف اولیٰ وغیرہ ہونے کے حساب سے مطالبہ کی جو نوعیت ہوتی ہے ، اسی کے اعتبار سے خلاف ورزی کی نوعیت پر حکم لگایا جاتا ہے ، یعنی کبیرہ گناہ کا مرتکب حدود سے تجاوز کرنے والا ہے ، یا صغیرہ کا یا صرف قابل ملامت ہے۔

بہر حال اتنا دیکھ لینے کے بعد اس خاص شعبہ کے جن دوسرے پہلوؤں کے متعلق نفیاً یا اثباتاً کسی قسم کی تصریح نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ آزادی بخشی گئی ہے کہ اپنی اپنی ضرورتوں اپنے اپنے حالات اور دوسرے اقتضاؤں کی بنیادوں پر عقل و تجربہ سے عمل کی جو راہ پیش کرے ، اسے مسلمان اختیار کریں۔ اصطلاحاً انہیں کو ''مباحات'' کہتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ مثلاً سفر ہی کو لیجیے ، جب پیش آتا ہے تو چند خاص باتوں کے سوا ہر مسلمان کو اپنے سفر کے تمام پہلوؤں کے متعلق آزادی عطا کی گئی ہے

Marfat.com

کیا مصلحت کے مطابق جو کچھ اس کی سمجھ میں آئے اختیار کرے۔

ظاہر ہے کہ کسی خاص مقام مثلاً لکھنو سے دلی تک ایک ہی سفر کوئی کرے اور سفر کے سارے اسلامی مطالبات کی تکمیل اس میں کی جائے۔ پھر بھی اس مسافر کا یہ خاص سفر جن بے شمار امور پر مشتمل ہوگا ان میں ایسی چیزیں جن کو ہم اسلامی مطالبات کہہ سکتے ہیں، ان امور کے معاملہ میں جن کا ''مباحات'' سے تعلق ہے، شاید آٹے میں نمک سے زیادہ ان کی حیثیت نہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ گو سفر میں بھی آدمی کو دین کے بعض مشوروں کو شریک کرنا پڑتا ہے، مگر محض اس کی وجہ سے سفر کی ایک مستقل قسم ''اسلامی سفر'' کی اصطلاح نہیں بنائی گئی۔

ہم یہی پوچھنا چاہتے ہیں کہ حاکمانہ اقتدار رکھنے والے مسلمانوں کو بھی اس میں شک نہیں کہ اسلام نے ایک ضابطہ ضرور دیا ہے، لیکن جیسے قصر صلوۃ یا تاخیر صوم وغیر دینی مسائل کے جاننے والوں کے لیے سفر کی تمام مشکلات حل نہیں ہو جاتیں، بلکہ ابتدائے سفر سے آخر تک ہر ہر قدم پر عقل و تجربہ، ضرورت وغیرہ کے لحاظ سے ہزاروں فیصلے کرنے پڑتے ہیں اور عقل و تجربہ وغیرہ کی روشنی میں کیے ہوئے ان فیصلوں کی وجہ سے اس مسافر کا سفر جس نے ''اسلامی مطالبات'' کی تعمیل میں اپنے پورے سفر میں کوتاہی نہ کی ہو، جیسے اس مسافر کے سفر کو نہ غیر اسلامی کہا جاسکتا ہے اور محض اس لیے کہ دورانِ سفر میں وہ نماز دن میں قصر کرتا رہا، یا روزے میں تاخیر سے کام لیا، یہ یا اسی قسم کے چند گنی چنی چیزوں کی وجہ سے سفر کی ایک مستقل قسم ''اسلامی سفر'' نکالی گئی۔

اسی طرح کسی علاقہ میں حکمرانی کا اقتدار جن مسلمانوں کے ہاتھوں میں آجائے، اور جن مطالبات کی تکمیل کے ذمہ دار مسلمان حکمران ٹھہرائے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ محض ان ذمہ داریوں کی تکمیل بھی اگر حکمرانی کے لئے کافی نہ ہو، تو یقیناً یہ

اسلامی تعلیم کا نہ تو نقص ہوگا اور مکان و زمان، حالات و ماحول وغیرہ خصوصیات کی وجہ سے حکمرانی کے سلسلہ میں ان مسلمانوں کو عقل و تجربہ کی راہوں سے جن چیزوں کو اختیار کرنا پڑے، ان کی وجہ سے وہ بیچارے اس کے مستحق ہوں گے کہ ان کے طریقہ حکومت کو غیر اسلامی طریقہ حکومت قرار دیا جائے۔ اور جیسے یہ فتویٰ لگانا ان پر درست نہ ہوگا، اسی طرح میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ایسی حکومت جس میں زیادہ تر عقل و تجربہ کی روشنی میں نظر آنے والے حقائق ضرورۃً اختیار بھی کیے جاتے ہوں اور چھوڑے بھی جاتے ہوں اور انہی عقلی و تجربی عناصر سے حکومت کی مشینری بھری ہوئی ہو۔ اگر ان ہی کے ساتھ ان معدودے چند اسلامی ضوابط کو بھی اس میں شریک کرلیا جائے جن کی تعمیل کا مطالبہ مسلمان حکمرانوں سے کیا گیا ہے، جیسے مسافر اپنے سفر کے عقلی و تجربی عناصر کے ساتھ ان چند باتوں کا بھی پابند ہو، جن کا حکم دین میں مسلمان مسافروں کو دیا گیا ہے، تو مسلمان حکمرانوں کے محض اس طرزِ عمل سے یعنی حکمرانی کے ان معدودے چند ضوابط کو اپنے طریقہ حکمرانی میں شریک کرلینے کی وجہ سے ایسی حکومت کو اسلامی حکومت یا الٰہی حکومت کہنے کی وجہ بہ ظاہر ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ اور آج تک مسلمانوں کی حکومت جہاں کہیں قائم ہوئی، جہاں تک میں جانتا ہوں اس کو ''اسلامی حکومت'' یا ''الٰہی حکومت'' وغیرہ کے ناموں سے شاید کبھی موسوم نہیں کیا گیا۔ یہ نام نہ عہد خلافتِ راشدہ میں حکومت کا ہم پاتے ہیں اور نہ اس کے بعد قائم ہونے والی حکومتوں کو یہ نام کسی زمانہ میں دیا گیا، حکومت بنی امیہ، حکومتِ عباسیہ، حکومت غزنویہ، غوریہ، مغلیہ، عثمانیہ، اس قسم کے نام تو سننے میں آتے ہیں، لیکن ان مسلمان حکمرانوں نے کسی زمانہ میں اپنی حکومت کا نام ''حکومت اسلامیہ'' یا ''حکومت الٰہیہ'' رکھا ہو، کم از کم فقیر اس سے قطعاً ناواقف ہے۔

بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے کلیسا کے نام سے ''پوپ'' کے ہاتھ میں

Marfat.com

حکمرانی کا اقتدار آہستہ آہستہ جب منتقل ہوا، اور یورپ کے عام حکمرانوں پر برتری حاصل کرنے کے لیے دین کی پشت پناہی کی ضرورت پوپوں نے محسوس کی، تو شاید دنیا میں یہ پہلی بدعت انہوں نے قائم کی، کہ عام حکمرانوں کی حکومت کے مقابلہ میں ''دینی حکومت'' یا عیسائی حکومت یا کلیسائی حکومت وغیرہ نام اپنی حکومت کو دیا، پھر جب ''کلیسا'' کے خلاف یورپ میں ردعمل ہوا تو کلیسائی حکومت کے مقابلہ میں ضرورت پڑی کہ تمیز کے لیے سیکولر حکومت یا لادینی حکومت ان حکومتوں کا نام رکھا جائے جو ''پوپ'' کے سیاسی اقتدار کو توڑنے کے لیے اور ان کو توڑ کر قائم ہوئی تھیں۔

بہر حال جیسے سفر یا لباس یا اسی قسم کی ہر وہ چیز جس کے متعلق مسلمانوں کو مذہب کی طرف سے کچھ احکام وضوابط عطا کیے گئے ہیں ان کی تعمیل کی وجہ سے الٰہی سفر، غیر الٰہی سفر یا اسلامی سفر غیر اسلامی سفر، الٰہی لباس، اسلامی لباس، غیر اسلامی لباس، وغیرہ کی قسمیں کچھ ان سنی اور انجانی پائی ہیں۔ مجھے تو خیال یہی گذرتا ہے کہ الٰہی حکومت غیر الٰہی حکومت یا اسلامی حکومت، غیر اسلامی حکومت، حکومتوں کے نام رکھنے کی یہ رسم شاید نئی رسم ہے یا کچھ تعجب نہیں کہ کلیسا اور پوپیت کی تاریخ کے ساتھ اس کا رشتہ نکل آئے۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پینے والوں کی خصوصیت کی وجہ سے چاء یا پانی کا نام اسلامی چاء یا اسلامی پانی لوگوں نے جیسے رکھ دیا تھا کچھ ہی حال حکومتوں کے ان ناموں کا بھی ہو اور کیا تعجب ہے کہ آئندہ بجائے اسلامی کے چاء اور پانی کا نام بھی الٰہی چاء، اور الٰہی پانی رکھ دیا جائے اور توجیہ یہ کی جائے کہ اسلام کے ماننے والوں کے ساتھ چونکہ یہ چاء اور پانی مخصوص ہے اور اسلام الہ کا عطا کیا ہوا دین ہے، اس لیے اس چاء اور پانی کا نام الٰہی چاء اور الٰہی پانی رکھ دیا گیا۔

بہر حال بات ذرا طویل ہوگئی ورنہ کہنے کی بات صرف اسی قدر ہے کہ آئندہ جو کچھ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں، میرے لیے یہ مشکل تھا کہ ''اسلامی حکومت یا

Marfat.com

الٰہی حکومت'' وغیرہ الفاظ جن کا چرچا سیاست کے اس عہد میں پھیلا ہوا ہے اور جس قسم کی توقعات ان ناموں کے ساتھ قائم کرلی گئی ہیں، یا قائم کردی گئی ہیں، توقعات کے اس معیار پر وہ ساری حکومتیں پوری اتریں گی جن کے رقبہ حکومت میں رہنے والی غیر مسلم قوموں کا اجمالی تذکرہ یہاں مقصود ہے۔

اتنی بات میں جانتا ہوں کہ حکمرانوں کا یہ گروہ مسلمان تھا اور ان میں اگر سب نہیں تو ذاتی حقیقت سے خواہ وہ کچھ بھی ہوں لیکن حکمرانی کے سلسلہ میں ایسے کم ہی تھے، جن کے طریقہ حکومت میں ضوابط کا وہ مجموعہ شریک تھا جس کی تعمیل و نفاذ کا کام مسلمان حکمرانوں کے ذمہ اسلام کی طرف سے سپرد کیا گیا ہے۔ فقہائے اسلام نے دین اسلام کے اساسی سرچشموں سے جن اجتہادی نتائج کو پیدا کیا تھا، عموماً ان ہی کے مطابق فصل خصومات اور رفع نزاع کا کام آخر وقت تک انجام پاتا رہا ہے اور اسی کے ساتھ اپنے اپنے زمانہ اور اپنے اپنے ملک کے خصوصی حالات کی بنیاد پر ہر زمانہ میں عقل و تجربہ سے ہمیشہ کام لیا گیا۔ یہی ان کی حکمرانیوں کا عام طریقہ تھا۔ اب چاہیے کہ اسلامی یا الٰہی حکومت کے معیار پر وہ پوری اترتی ہوں یا نہ اترتی ہوں۔

اسی جھگڑے سے بچنے کے لیے میں نے بجائے اسلامی حکومت کے مسلمانوں کی حکومت کے عنوان کو قصداً اختیار کیا ہے، جیسے عام مسلمانوں میں اچھے برے مذہبی مطالبات کی تکمیل میں کامیاب و ناکامیاب سب ہی طرح کے لوگ ہیں، وہ بھی تھے۔ اس وقت میرے سامنے ان کی حکومت کا صرف ایک پہلو ہے یعنی غیر مسلم اقوام کا مقام اور ان کی عام حالت ان مسلمان حکمرانوں کی مملکتوں میں کیا تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ جنگ و جدال، لڑائی بھڑائی جس وقت تک ہوتی رہتی تھی، اس کی نوعیت اس زمانہ سے بالکل مختلف تھی، جب کسی علاقہ میں حکومت قائم ہوجاتی تھی۔

اگرچہ جنگ و جدال کے وقت کے قصوں کے متعلق بھی بہت زیادہ

Marfat.com

غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں اور کیسی غلط فہمیاں؟ عہد نبوت کی جنگی مہموں ہی کے متعلق سوچئے عوام کے تاثرات کا مقابلہ ذرا اس واقعہ سے کیجیے کہ دس سال کی طویل مدت جس میں یہ معرکے وقتاً فوقتاً پیش آتے رہے؟ ان میں قریش، عرب کے عام قبائل یہودیوں اور عیسائیوں سب ہی سے مقابلے ہوئے، مگر جانتے ہیں، ان مختلف اقوام کی دس سالہ آویزشوں کے متعلق کام آنے والوں یعنی قتل ہونے والوں کی تعداد بمشکل پانسو سے زیادہ ہزار تک پہنچ سکتی ہے۔ ان میں عرب و یہود، عیسائی اور مسلمان الغرض جنگ کے ہر فریق کے مقتولوں کی تعداد شریک ہے۔ (ب)

خیر لڑائی بھڑائی کا قصہ تو الگ ہے۔ بحث اس وقت قیام امن و امان کے بعد اس زمانہ کے متعلق ہے جب باضابطہ حکومت کسی علاقہ میں قائم ہوگئی۔ میں دنیا کے مورخوں کو چیلنج کرتا ہوں کہ ہزار سال سے زیادہ طویل مدت جس میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوتی رہی ہیں، کیا کوئی ثابت کرسکتا ہے کہ غیر قوم کے کسی فرد کو حکومت نے محض اس لیے قتل کر دیا ہو کہ وہ مسلمان نہیں ہے یا یہ کہ کسی کو مجبور کیا گیا ہو کہ وہ اپنے موروثی مذہب کو ترک کر دے۔

شاید نصف صدی سے مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کر رہا ہوں، لیکن میرے حافظہ میں ایسی کوئی شہادت محفوظ نہیں ہے جس کی روشنی میں اس سوال کا جواب اثبات میں دیا جاسکتا ہو۔ ممکن ہے کہ پہلے اس سوال کی طرف توجہ نہ ہو، مگر جب سے اس کا خیال آیا ہے کتابیں پڑھتا رہتا ہوں لیکن کوئی تائیدی شہادت کم از کم اس وقت تک تو مجھے نہیں ملی ہے، حالانکہ مسلمانوں کی یہ حکومتیں مشرق میں بھی قائم ہوئی ہیں اور مغرب میں بھی۔ اقتدار کی باگ کبھی اچھی فطرت کے لوگوں کے قبضہ میں رہی اور ان ہی میں بعض غیر معتدل دل و دماغ بھی تھے اور کیسے غیر معتدل؟

زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ میں اگر کبھی کوئی چیز ہزار ہا ہزار صفحات کے

Marfat.com

الٹ پھیر کے بعد ملتی بھی ہے تو وہی ہے کہ فوری محرکات نے غیظ وغضب کے جذبہ میں مغلوب کر کے بعض ناکردنی اقدامات کا ارادہ حکمرانوں میں سے کسی کے اندر پیدا کیا۔ مگر یہ ارادہ کبھی پورا ہوا؟ میرے مطالعہ کا نتیجہ تو یہی ہے کہ کبھی پورا نہیں ہوا۔ سب سے بڑی روک اس قسم کے فاسد ارادوں کی تکمیل میں بسا اوقات خود اسلام بن گیا۔ معارف کے ناظرین کو شاید یاد ہوگا کچھ دن پہلے مسلمانوں کی طرف سے معذرت کے وجوہ پیش کرتے ہوئے خاکسار نے ایک طویل مضمون اس مجلّہ میں شائع کرایا تھا۔ اس میں ان نہ پورے ہونے والے فاسد ارادوں کی کچھ تاریخی مثالوں کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ ترکی کے بعض سلاطین کے ساتھ ہندوستان کے بعض حکمرانوں کا بھی نام لیا گیا تھا۔ عرض کیا گیا تھا کہ اسی ہندوستان میں سکندر لودھی نے کورک شیستر کی تیرتھ گاہ کی بعض رسوم میں دخل اندازی کا ارادہ کیا تھا، لیکن دربار کے ایک عالم نے بادشاہ کو اسی وقت ٹوکتے ہوئے کہا تھا کہ آپ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔ لودھی نے غضبناک ہو کر تلوار کھینچ لی اور غریب مولوی کو دھمکاتے ہوئے کہنے لگا کہ تم کفر کی پشت پناہی کرتے ہو، مولوی نے جواب میں جو کچھ کہا تھا اس کا حاصل یہی تھا کہ میں پشت پناہی نہیں کر رہا ہوں بلکہ ان کا پشت پناہ تو خود اسلام ہے۔ اسی مقالہ میں آنحضرت ﷺ کی وفات کے وقت کی اس آخری وصیت کا بھی ذکر کیا گیا تھا، جس میں ان غیر مسلم باشندوں کی جو مسلمانوں کی حکومت میں آباد ہوں، ذمہ داری لیتے ہوئے تاکید فرمائی گئی تھی کہ ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے۔ ارشاد فرمایا گیا تھا کہ قیامت کے دن میں خلاف ورزی کرنے والوں کے مقابلہ میں حجیج بن کر کھڑا ہوں گا، یعنی نبوت کی طرف سے ان حکمرانوں پر دربارِ الٰہی میں دعویٰ دائر ہوگا، جن سے اس وصیت کی تعمیل میں کوتاہی ہوگی۔

ان ہی پیغمبرانہ شدید تاکیدوں کا نتیجہ تھا کہ صحابہ عموماً اپنے زمانہ میں اعلان

کرتے پھرتے تھے، کہ ہمیں منع کیا گیا کہ

''ان اصیب من معاهد ابرة''(۱)

''معاہد یعنی (مسلمانوں کے قلمرو کے غیر مسلم) سے ایک سوئی بھی لیں''

مسلمانوں کو صحابہ ہی کی طرف سے یہ بھی سنایا جاتا تھا کہ

''اذا احضرت الذمة ادیل العدوُ''(۲)

''ذمہ جب توڑا جائے (یعنی غیر مسلم رعایا جن کی حکومت نے ذمہ داری لی اور ان کی ذمہ داری کو پورا نہ کرے گی) تو دشمن کو پلٹا دیا جائے گا (یعنی مسلمانوں سے حکومت چھن جائے گی)''

خلاصہ یہ ہے کہ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں اور دینی وثائق نے ان حکمرانوں کا ہاتھ پکڑ لیا، جنہوں نے کسی فوری جذبہ کے تحت قانون کی حدود سے نکلنے کا کبھی ارادہ کیا۔ اس سلسلہ میں ہندوستان ہی کی تاریخ کی ایک دلچسپ مثال وہ بھی ہے، جس کا تذکرہ برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں کیا ہے۔

جلال الدین خلجی جو خلجی خاندان کا پہلا حکمران تھا، تقدیر نے اس ترک سپاہی کو موقع دیا اور دِلّی کے تخت پر قابض ہوکر سارے ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔ غوریوں سے تعلق رکھنے والے حکمرانوں کی حکومت پر سو سال سے زیادہ زمانہ گذر چکا تھا کہ جلال الدین نے خلجی خاندان میں حکومت منتقل کر دی۔ اس ایک صدی سے زیادہ مدت میں ہندوستان کے عام غیر مسلم باشندے جس قسم کی زندگی گذار رہے تھے، اسی کا ذکر کرتے ہوئے ایک دن اپنے درباریوں سے دیکھا گیا کہ جلال الدین کہہ رہا ہے:

''ہر روز ہندوان، مندل زنان و بوق زنان در زیر کوشک می گذرند، و در جون می آیند و بت پرستی می کنند و در دار الملک با ہزر نازو کرشمہ و باثروت

نعمت زیند دتلذ ذہا وتنعمہا گیرند، و در میان اہل اسلام مباہی و مفاخر باشند، و آشکارا و کشادہ بت پرستیہا می کنند، و طبل تر نان احکام کفر و شرک را رواج می دہند۔ [illegible]''

''ہندو روزانہ جھانجھ بجاتے ہوئے اور نرسنگھا پھونکتے ہوئے کوشک (شاہی محل) کے نیچے سے گذرتے ہیں اور جمنا گھاٹ پر پہنچ کر پوجاپاٹ کرتے ہیں اور دارالسلطنت میں ہزاروں ناز و کرشمہ اور دولت و ثروت کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور ان سے لذت گیر ہوتے ہوئے مزے کر رہے ہیں اور مسلمانوں کے درمیان عزت و فخر و سربلندی کیساتھ رہتے ہیں اور کھلے بندوں اعلانیہ بتوں کی پوجاپاٹ کرتے ہیں ڈھول بجاتے ہوئے کفر و شرک کی باتوں کو رواج دیتے ہیں''۔

سو سال سے زیادہ زمانہ کے اس عام دستور کے ذکر سے جلال الدین کی غرض کیا تھی، اگرچہ صراحۃً برنی نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ مگر قرینہ حال سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کا تذکرہ تو ابھی آپ سنیں گے۔ مگر قطع نظر اس سے میرے خیال میں غوریوں کے عہد کے متعلق یہ ایک شاہی شہادت ہے، جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تسلط تام اور کامل قبضہ کے بعد غوری بادشاہوں نے یعنی غوری خاندان کے غلام بادشاہوں نے اس ملک کے غیر مسلم باشندوں کو کس حال میں رکھا۔

''درمیان اہل اسلام مباہی و مفاخر باشند''

کے فارسی فقرے کا ٹھیک ترجمہ جیسا کہ چاہیے اردو میں ادا نہ ہوسکا، مطلب اس کا یہی ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں کسی قسم کی کمتری کے احساس کا موقع بھی جیسا کہ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے اس ملک کے غیر مسلم باشندوں کو نہیں دیا جاتا تھا، بلکہ ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا تھا کہ ان کے دوش بدوش فخر و مباہات کے ساتھ زندگی گذار رہے تھے۔

آج ''سیکولر حکومت'' کا دنیا میں بہت چرچا ہے، لیکن مذکورہ بالا شاہی شہادت کی رو سے غیر مسلم رعایا کے ساتھ حسن سلوک کے جس بلند معیار کو واقعہ کے قالب میں اسی ہندوستان کے آسمان اور اسی کی زمین نے دیکھا تھا، کیا ''سیکولر حکومت'' اسی معیار کو پھر اس ہندوستان میں قائم کرنے میں کامیاب ہوگی؟ توقع تو اسی کی کرنی چاہیے، خدا کرے کہ طبعی حکومت کا مطلب لوگوں کی سمجھ میں آجائے، یعنی حکومت کا وہی نظام جس میں ہر بڈھی کا بال بھی محفوظ ہو، خواہ اس کا تعلق اکثریت سے ہو، یا اقلیت سے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس ترک سپاہی کی جو ادنی درجہ کی ملازمتوں سے ترقی کرتے ہوئے ہندوستان کا بادشاہ ہوگیا تھا، اس کی غرض اپنے اس بیان سے کیا تھی؟ برنی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نئی نئی بادشاہی کے نشہ اقتدار پر غوری سلاطین کا یہ قدیم دستور اس ترک جوشیلے سپاہی کے لیے کچھ باعث گرانی ہوا اور گو برنی نے تصریح نہیں کی ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ کسی غلط اقدام کا کچھ وسوسہ بھی اس کے دل میں ابھرا ہو، لیکن حسرت ویاس کے ان الفاظ یعنی:

''خاک بر سر و خاک بر بادشاہی و دین پناہی ما''۔ (۴)

کے ساتھ ان وسوسوں پر خاک ڈالنے کے سوا اور بھی اس نے کچھ کیا یا کرسکتا تھا۔ اس کا جواب آپ کو تاریخ دے گی۔ کم از کم میں تو نہیں جانتا کہ غوریوں کے زمانہ سے ہندوستان کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ جو دستور چلا آرہا تھا، اس میں کسی قسم کا ردوبدل کسی زمانہ میں کیا گیا ہو۔ کچھ بھی نہ ہوتا، تو صرف ایک یہی شاہی شہادت ان بے بنیاد افواہوں کو یادر ہوا بنادینے کے لیے کافی ہے، جو زبانوں سے تو نکلتی ہے لیکن ان کی تائید میں کوئی شاہی بیان تو بڑی چیز ہے کسی معتبر مورخ کی ایسی کوئی شہادت بھی پیش نہیں ہوسکتی جس سے معلوم ہو کہ ہندوستان کے دور دراز

Marfat.com

مضافاتی و مفصلاتی مقامات ہی میں نہیں ، بلکہ خاص دارالسلطنت میں شاہی محل سرا کے نیچے سے روزانہ پوجاپاٹ کے لیے نرسنگھا پھونکتے ، ڈھول بجاتے ، جمنا گھاٹ پر آتے جاتے دیکھنے کا جلال الدین جو عادی تھا اور اسی دارالسلطنت کے شہر میں مسلمانوں کے دوش بدوش فخر و مباہات کے ساتھ زندگی کی تمام نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جن لوگوں کو وہ پا رہا تھا ، حکومت نے کسی جگہ کسی زمانہ میں کسی قسم کی عملی مداخلت ان کے اس طرزِ عمل میں کبھی کی ہو ، خودتراشیدہ افسانوں میں نہیں ، بلکہ تاریخی وثائق کی روشنی میں انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس سوال کا جواب تلاش کیا جائے ؟ مگر جس دنیا میں '' دیوانہ گفت ابلہ باور کرد '' کا دور دورہ ہو ، وہاں سنجیدگی کے ساتھ حقائق و واقعات کی جستجو کی توفیق لوگوں کو کیوں ہونے لگی ۔

بہر کیف درد کا یہ افسانہ تو بہت طویل ہے اور اپنے گذشتہ مقالہ میں اس مسئلہ کے متعلق فقیر کافی چیزوں کا تذکرہ کر چکا ہے ۔

اب میں اصل مقصد کی طرف متوجہ ہوتا ہوں ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مضامین کا ایک سلسلہ شروع کروں جن میں مسلمانوں کی حکومت میں رہنے والی غیر مسلم قوموں کے مختلف طبقات اور جس طرح اس حکومت کے زیر اثر علاقوں میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے ، اس کے متعلق ان تاریخی شہادتوں کو درج کروں جو کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں ۔

اس سلسلہ میں پہلی قسط ان لوگوں کے حالات پر مشتمل ہوگی ، جنہوں نے طبابت ، علاج و معالجہ کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا ۔ ان کے بعد خیال ہے کہ تجارتی کاروبار کرنے والوں کا ذکر کیا جائے ۔ اسی طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں شریک ہونے والوں کے حالات اگر وقت میں گنجائش نکلی تو آپ کے سامنے ان شاء اللہ آتے رہیں گے ۔

Marfat.com

قطع نظر ایک علمی خدمت کے ایک غرض مضمون نگار کی یہ بھی ہے کہ غیر مسلم اقوام کے ساتھ مسلمانوں کی حکومتوں اور ان کے حکمرانوں کے طرز عمل کے متعلق جو عام غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کا بھی ازالہ ان شاء اللہ ان شہادتوں سے ہوسکتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ زمین کے جن علاقوں میں سیاسی اقتدار سے آج مسلمان محروم ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اب ان کے جینے کی کیا صورت ہوگی۔ طرح طرح کے وسوسوں میں یوں بھی مبتلا ہیں اور مشرکانہ جراثیم سے جن مسلمانوں یا ان کے رہنماؤں کے دل و دماغ ماؤف ہیں وہ بھی مستقبل کی ہیبت ناک تصویریں ان کے سامنے کھینچ کھینچ کر گویا کچھ ایسا باور کرا رہے ہیں کہ سیاسی اقتدار کے بغیر نہ کوئی قوم ہی زندہ رہ سکتی ہے اور نہ کسی قوم کے افراد۔ عاف رومی نے شاید اسی قسم کی ذہنیت رکھنے والوں کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ:

تو مرا چون برہ دیدی بے شبان　　تو گمان بروی ندارم پاسبان

بے شبان دانستہ اند آن ظمی را　　رائگان دانستہ اند آن بی را

کے کم از برہ کم از بز غالہ ام　　کہ نہ باشد حارس از دنبالہ ام

پھر شرک کا غشاوہ جن کی ایمانی بصیرتوں پر چڑھا ہوا ہے، ان کو چونکاتے ہوئے فرماتے ہیں۔ (ج)

حارے دارم کہ ملکش می سزد　　اندان بادے کہ برمن می دزد

سرد بود آن باد یا گرم آن علیم　　نیست غافل نیست غائب مقیم

اور یہی مسلمانوں کو سمجھایا بھی گیا تھا، زندان مصر میں قیدیوں کو تلقین کرتے ہوئے سیدنا یوسف علیہ وعلی نبینا الصلوۃ والسلام نے فرمایا تھا کہ:

﴿ما کان لنا ان نشرک باللہ من شئی ذلک من فضل اللہ علینا وعلی الناس ولکن اکثر الناس لا یشکرون﴾ (۵)

میز ے لیے کسی طرح یہ روا نہیں رکھا گیا ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو بھی ہم شریک اور ساجھی مانیں، یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر بھی اور ملائی انسانیت پر، مگر بہت سے لوگ اس فضل اور مہربانی کا گن نہیں گاتے" جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ پیدا کر کے ہمارے پیدا کرنے والے خالق قدیر نے دوسروں کے بھروسہ پر سر ٹکرانے کے لیے ہمیں نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ ہر چھوٹی بڑی ضرورت کی کفالت ہر بندہ کی اس نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ ضرورتوں کا محتاج بنا کر اس نے ہمیں ضرور پیدا کیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس کا یہ کرم اور کیسی عظیم مہربانی ہے کہ ہماری اس محتاجی کا تعلق بجز اپنی ذات کے اور کسی کے ساتھ قطعاً نہیں رکھا ہے۔ ہم محتاج ضرور ہیں لیکن اسی ایک پیدا کرنے والے خالق کے جو ہمارا ذو القوۃ المتین رزاق ہے۔ اس ایک کے محتاج بن کر ہر ایک کی محتاجی کی ذلت و رسوائی اور در بدر مارے پھرنے کی دردسری سے آزاد ہیں۔ یہی اللہ کا وہ فضل ہے جس کا گن ناشکرا انسان بہت کم گاتا ہے، اسی ناشکری کا نتیجہ ہے کہ اس ایک کی محتاجی سے لاپروائی اختیار کرنے والے ہر ایک کی محتاجی کا طوق گلے میں ڈالے مارے مارے پھرتے ہیں۔ فضل و کرم کی مذکورہ بالا عجیب و غریب حقیقت کو واشگاف کرنے کے بعد قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ:

﴿ أ ارباب متفرقون خير ام الله الواحدا لقهار ﴾(۶)

''کیا بہت سے متفرق طرح طرح کے پروردگاروں کا ہونا بہتر ہے، یا جو ایک سب پر غالب و قاہر اللہ ہے اس کی پروردگاری بہتر ہے"۔

جس یقین اور یقین کی روشنی کو ایمانی وجدان ان قرآنی آیتوں میں پا رہا ہے، اس کے بعد خود ہی سوچیے کہ کہنے والے نے اگر یہ کہا کہ:

از خدا خواہم دو زغیرنہ خواہم

Marfat.com

کہ نیم بندہ و غیر نہ خدائے دگر ست

تو اس کے سوا اپنا احساس آخر اور کیا بتائے۔

پس مقصد یہی ہے کہ اپنے اندر کو تو چاہیے کہ قرآن کی اس بخشی ہوئی ٹھنڈی اور خنک روشنی سے مسلمان جگمگا تا رہیں۔ اضطراب بھی پیدا ہوگا، عقلی اندیشے بھیانک شکلوں میں سامنے آ کر اس روشنی سے نکال کر اندھیرے کی طرف دھکیلیں گے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کو اپنے علم و یقین کا قطعی ذریعہ ایسا قطعی ذریعہ کہ احساس و علم کے دوسرے سارے ذرائع اس کے مقابلہ میں متہم ہو سکتے ہیں، جو قرآن کی روشنی میں گھومتا اور اسی میں تہہ و بالا ہوتا رہے گا، وہ پائے گا کہ اس سے پیدا ہونے والی ٹھنڈک بھی اس کی روح اور قلب کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں پیوست ہے۔

''اندر'' کو اس حال سے معمور رکھتے ہوئے اپنے باہر کو چاہیے کہ:

﴿لیس للانسان الا ما سعی﴾ (۷)

''نہیں ہے آدمی کے لیے مگر وہی جو اس نے کوشش کی''۔

یا ﴿للرجال نصیب مما اکتسبوا و للنساء نصیب مما اکتسبن﴾ (۸)

''جو کچھ مردوں نے کمایا اس سے ان کو حصہ ملتا ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا اس سے ان کو حصہ ملتا ہے''۔

یہ یا اسی قسم کی دوسری ''قرآنی مسلمات'' کے مطابق سرگرم عمل ہو جائیں۔ جن واقعات اور سرگذشتوں کا ذکر آئندہ آپ سنیں گے ان میں آپ کو مسلسل ملتا چلا جائے گا کہ حکمرانی کے اقتدار سے محروم ہونے کے باوجود اپنی محنت، محنت سے حاصل کیے ہوئے کمالات اور اپنے اخلاص و صداقت وغیرہ صفات کی مدد سے کتنے چھوٹے مسلسل بڑے بنتے چلے گئے۔ نہ صرف عوام بلکہ حکومت میں بھی وقار و وزن کے حاصل کرنے میں وہ کبھی ناکام نہیں ہوئے۔ یہ قدرت کے مقررہ قوانین ہیں،

Marfat.com

ان قوانین کی پابندی بھی پابندی کے نتائج کو سامنے لائی ہے اور ان قوانین سے لاپروائی اختیار کرنے والوں کو بھی اپنی لاپروائیوں کا خمیازہ بہرحال بھگتنا ہی پڑتا ہے اور قرآنی حقیقت:

﴿ما ظلمنا هم ولکن کانوا انفسهم یظلمون﴾ (۹)

''اور نہیں کیا ہم نے ان پر ظلم، بلکہ اپنے آپ پر انہوں نے خود ہی ظلم کیا''

کے اقرار پر ہر اس شخص اور قوم کو مجبور ہونا پڑا ہے، جس نے اپنے آپ کو مظلومیت کا کبھی شکار پایا ہے۔

اپنی مشہور عام متداول کتاب احیاء العلوم میں مفید و مضر علوم کی تفصیل کرتے ہوئے حجۃ الاسلام امام غزالی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

''مسلمانوں کا کوئی شہر ہو یا آبادی، ہر ایک میں دیکھا جارہا ہے کہ طبابت کا کام غیر مسلم اقوام کے افراد انجام دے رہے ہیں'' (۱۰)

ہے تو یہ ایک اجمالی شہادت لیکن ہم جب یہ سوچتے ہیں کہ غزالی کی عمر کا بڑا حصہ سیر و سیاحت میں بسر ہوا، خراسان و ایران تو ان کا وطن ہی تھا، اس کے سوا عراق و شام و مصر میں وہ مدتوں گھومتے رہے ہیں، تو یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ مذکورہ بالا اطلاع غالباً ان کے ذاتی مشاہدات ہی پر مبنی ہے۔ امام غزالی چھٹی صدی ہجری کے امام ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں سارے علوم و فنون جو غیر قوموں سے منتقل ہوکر مسلمانوں میں رواج پذیر ہوئے تھے اپنے عروج و ارتقاء کے آخری نقطہ تک پہنچ چکے تھے۔ طب ہی کے سلسلہ میں بڑی بڑی نامور ہستیاں چھٹی صدی ہجری سے پہلے پیدا ہوچکی تھی۔ اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ ناواقفیت کی وجہ سے مسلمان غیر مسلم اقوام کی طبی امداد کے محتاج اور دست نگر تھے۔ گویا یہ صورتِ حال اضطرار یا مجبوری کی رہین منت تھی، یقیناً دعویٰ غلط ہوگا۔

Marfat.com

باقی یہ وسوسہ کہ مسلمانوں کے دینی احساسات میں رفتہ رفتہ اضمحلال اور سستی کی جو کیفیت پیدا ہوتی چلی جارہی تھی، سو اس کا نتیجہ بھی اس کو قرار دینا مشکل ہے۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ غزالی مانا کہ چھٹی صدی ہجری کے آدمی ہیں، لیکن میں تو دیکھتا ہوں کہ غزالی سے سینکڑوں سال پہلے یعنی اسلام کی دوسری صدی کے نصف میں پیدا ہونے والے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی کتابوں میں یہ شہادت منسوب کی گئی ہے، یعنی علم طب جسے امام شافعی علم کے تین حصوں (۱) میں سے ایک مستقل حصہ قرار دیتے تھے، اسی علم طب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ثلث العلم و کلوه الی الیهود و النصاری "(۱۱)

"علم کے تہائی حصہ کو مسلمانوں نے یہود و نصاریٰ کے سپرد کر رکھا ہے"۔

مان لیا جائے کہ چھٹی صدی ہجری تک پہنچتے ہوئے مسلمانوں میں اپنے دین کے متعلق وہ جوش و خروش باقی نہ رہا ہو جو ان میں پہلے پایا جاتا تھا، لیکن دوسری صدی ہجری میں بھی اگر اس سے وہ خالی ہی تھے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ جن دینی گرم جوشیوں کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ نرے ایک افسانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے، مالکم کیف تحکمون

اور سچی بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے جس دین کی طرف تنگ نظریوں، کوتاہ فکریوں کو منسوب کرنے والے آج منسوب کر رہے ہیں کاش واقعات کا صحیح علم ان کو ہوتا تو برعکس اس کے شاید وہ اس یقین پر مجبور ہوتے کہ غیر قوموں کے ساتھ ساری فراخ چشمیاں اور رواداریاں جن کا ذکر مسلمانوں کی تاریخ میں کیا جاتا ہے، ان کی ضمانت خود مسلمانوں کے دین اور دین کے عطا کرنے والے پیغمبر ﷺ کے وسیع طرز عمل میں پوشیدہ ہے۔

Marfat.com

اس قسم کے چھوٹے موٹے ، ناقابل توجہ واقعات مثلاً جب مشہور ایرانی بزرگ حضرت سلمان فارسیؓ ، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایرانی نژاد ہونے کی وجہ سے عربی زبان میں جیسی کہ چاہیے ، گفتگو نہیں کر سکتے تھے ، تو تاریخ خمیس وغیرہ میں لکھا ہے کہ :

''طلب النبی ﷺ ترجمانا و کان فی المدینۃ یهودی عارفا بالعربی و الفارسی'' (۱۲)

''تلاش کیا رسول اللہ ﷺ نے ایک ترجمان کو مدینہ میں ایک یہودی تھا جو عربی اور فارسی زبان سے واقف تھا'' ۔

غرض اسی یہودی کو بلایا گیا ، اور رسول اللہ ﷺ نے ترجمانی کا کام اسی یہودی سے لیا ۔ (ﮦ)

اور بھی اسی نوعیت کے غیر اہم واقعات کے سوا کون نہیں جانتا کہ آنحضرت ﷺ کے سفر مبارک کا سب سے بڑا واقعہ جس نے سچ پوچھیے تو عرب یا مشرق ہی نہیں بلکہ اپنے نتائج کے لحاظ سے انسانیت کی تاریخ کا رخ پلٹ دیا ۔ یعنی سفر ہجرت میں بھی پیغمبر ﷺ نے اس کی بالکل پروا نہ کی کہ اس اہم ترین دینی اقدام میں راستہ دکھانے کے لیے ایک غیر مسلم آدمی کی امداد کیوں حاصل کی جائے ؟ بخاری وغیرہ حدیث کی کتابوں میں ہے کہ :

''استاجر رسول اللہ ﷺ و ابو بکر رجلا من بنی الذھل ھادیا حربیا و ھو علی دین قریش'' (۱۳)

''رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق نے قبیلہ بنی الذہل کے ایک شخص کو ملازم رکھا کہ (مدینہ کا) راستہ بتائے گا اور یہ شخص قریش کے دین پر تھا (یعنی مسلمان نہ تھا)''

Marfat.com

اور بقول امام بخاری غیر مسلم آدمی کے خدمات سے استفادہ کا یہ واقعہ کوئی استثنائی یا انفرادی واقعہ نہیں ہے، بلکہ وہی لکھتے ہیں:

"عامل النبی ﷺ یھود خیبر" (۱۴)

''خیبر کے یہودیوں سے (بٹائی) کا معاملہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا''۔

ظاہر ہے کہ خیبر کے جن یہودیوں سے معاملہ کیا گیا تھا، ان کی تعداد ایک دو میں محدود نہ تھی۔ دراصل یہ اور اسی کی قوم کے نبوی نمونوں کو پیش نظر رکھ کر شارح بخاری ابن بطال کے حوالہ سے نقل کیا جاتا ہے کہ:

"الفقھاء یجیزون استیجارھم عند الضرورۃ و غیرھا" (۱۵)

''علماء اسلام نے غیر مسلم لوگوں کے خدمات سے معاوضہ دے کر کام لینے کی عام اجازت دی ہے، خواہ ضرورت ہو یا نہ ہو''۔

ضرورت ہو یا نہ ہو، اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کام کے انجام دینے کے لیے مسلمان آدمی مل رہا ہو یا نہ مل رہا ہو، ہر حال میں مسلمانوں کو اجازت ہے کہ غیر مسلم اقوام کے افراد سے اس قسم کا معاملہ کر سکتے ہیں۔

اور یہ تو خیر عام معاملات کے قصے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ غیر مسلم طبیبوں سے طبی امداد حاصل کرنے کا براہ راست نمونہ خود رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں موجود تھا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ عرب کا مشہور طبیب جس کا نام حارث بن کلدہ تھا، طائف کا رہنے والا تھا۔ ظہور اسلام سے پہلے اپنے وطن طائف سے وہ یمن پہنچا۔ جہاں اس زمانہ میں ایرانیوں کی حکومت قائم تھی۔ لکھا ہے کہ کچھ دستگاہ علم طب میں حارث نے یمن ہی میں حاصل کی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں سے ملنے جلنے کی وجہ سے اس کو خود ایرانی علاقہ کی مشہور طبی درسگاہ جندسابور میں باضابطہ علاج و معالجہ

میں حذاقت پیدا کرنے کا موقع مل گیا۔طبی معلومات اور کمالات کے ساتھ وطن واپس ہوا اور عرب ہی میں عوام وخواص کے علاج و معالجہ کا مرکز و مرجع بن گیا۔

عمر اس نے کافی طویل پائی ، رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھا۔لیکن جیسا کہ ابن ابی حاتم کے حوالہ سے حافظ ابن حجر نے اصابہ میں نقل کیا ہے:

"لا یصح اسلامہ" (۱۶)

''حارث کا مسلمان ہونا صحیح نہیں ہے''

جس کا مطلب یہی ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے عہد میں اس نے اسلام قبول نہیں کیا اور جیسا کہ طبقات الاطباء میں لکھا ہے:

''حارث رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بھی تھا ، اور آئندہ ابوبکر وعمر وعثمان وعلی ومعاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانہ تک زندہ رہا'' (۱۷)

اس نے چاروں راشدین خلفاء اور امیر معاویہ کی حکومت کا زمانہ بھی پایا مگر آزادی کے ساتھ باوجود غیر مسلم ہونے کے عرب کی مقدس سرزمین اور اس کے شہر طائف میں بلکہ ایام حج میں مکہ معظّمہ پہنچ کر علاج و معالجہ کا کام اس نے جاری رکھا اور کیوں جاری نہ رکھتا۔معمولی تاریخی کتابوں میں نہیں بلکہ حدیث کی مستند کتابوں میں ہم پڑھتے ہیں کہ فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جو فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ آئے ، اتفاقاً بیمار ہوگئے تو ایک طرف آنحضرت ﷺ نے خود سعد کو مشورہ دیا:

"ایت الحارث بن کلدہ اخا ثقیف فانہ متطبب "(۱۸)

''ثقیف قبیلہ والے حارث بن کلدہ کی طرف رجوع کرو کیونکہ وہ معالج ہے''۔

اور دوسری طرف جیسا کہ حافظ ابن حجر نے ابن مندہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ خود حارث بن کلدہ کو بھی رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ:

Marfat.com

''عالج سعدا اصابہ''(۱۹)

''سعد جس مرض میں مبتلا ہیں تم اس کا علاج کرو''

کیا اس کے بعد یہ دریافت کرنے کی چیز رہ جاتی ہے کہ غیر مسلم اطباء سے علاج و معالجہ کا جو تعلق مسلمانوں نے آئندہ مسلسل قائم رکھا، ان میں خود ان کے پیغمبر ﷺ کے اس طرز عمل کو دخل نہ تھا، جو حارث کے ساتھ قائم کر کے صحابہ کو آپ نے دکھایا تھا۔

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ اگر چاہتے تو مسلمانوں کے مقدس ترین شہر مکہ سے اس غیر مسلم طبیب کو نکل جانے کا حکم بآسانی دے سکتے تھے۔ خصوصاً جب مکہ معظمہ اس کا وطن بھی نہ تھا، بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مطب کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً عرب کے اس مرکزی شہر میں بھی وہ آتا جاتا رہتا تھا لیکن بجائے اس کے اپنے عزیز صحابی کو رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم دینا کہ حارث سے علاج کراؤ اور حارث سے فرمانا کہ تم میرے صحابی کا علاج کرو، کیا اس کے بعد اب بھی شک کی گنجائش اس مسئلہ میں باقی رہتی ہے کہ آئندہ غیر مسلم اطباء کے ساتھ مسلمانوں کے جو تعلقات قائم ہوئے ان کا منشاء خود مسلمانوں کے پیغمبر ﷺ کا براہ راست طرز عمل اور آپ کا عملی نمونہ تھا۔

پیغمبر ﷺ کے اسی طرز عمل کی بنیاد پر اسی حارث کو جو مواقع خلافت راشدہ اور حضرت امیر معاویہؓ کے عہد حکومت میں حاصل ہوئے، کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ، حارث سے بسا اوقات طبی مسائل میں گفتگو بھی فرماتے اور یہی طریقہ امیر معاویہ کا بھی تھا سوچا جا سکتا ہے کہ قدرۃً ان واقعات کا مسلمانوں پر کیا اثر مرتب ہوسکتا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ عرب سے باہر نکلنے کے بعد مصر و شام، عراق و ایران وغیرہ ممالک میں مسلمان جب پہنچے اور ان کے سامنے پیغمبر کے براہ راست صحبت یافتوں

کی طرف سے ایسے نمونے پیش ہوتے رہے کہ مثلاً کہتے ہیں کہ عمرو بن عاصؓ صحابی جب حضرت عمرؓ کی طرف سے مصر کے والی مقرر ہوئے تو مصر پہنچ کر عمرو بن عاصؓ کو خبر ملی کہ مشہور عیسائی طبیب جس کا اصلی نام اتوشیوس یا تامسطیوس تھا (و)۔ لیکن مسلمانوں میں یحیٰ نحوی کے نام سے مشہور ہوا۔ علاوہ طب و فلسفہ و ادب کے دین مسیحی میں اجتہاد کا درجہ رکھتا تھا۔ قسطنطنیہ کے عیسائی دربار میں بڑا رسوخ اسے حاصل تھا اور زمانہ تک اس مسیحی پایہ تخت میں رہا تھا۔ قیصر کے دربار جیسا کہ ابن ابی اصیبعہ نے نقل کیا ہے، اس کو فیلو نیوس کا علمی و دینی خطاب بھی ملا تھا، لکھا ہے کہ رومی زبان میں فیو ینوس مجتہد کو کہتے ہیں، فلکد ونیہ نامی مقام میں صلیبی دین کے اہم مسائل پر بحث و مباحثہ کے لیے علمائے دین مسیحی کی جو مجلسیں ہوتی رہیں، تو بیان کیا جاتا ہے کہ چوتھی مجلس جس میں (۶۳) اسقف یعنی پادریوں نے نمائندگی کی تھی، اس مجلس کا ایک ممتاز رکن اتوشیوس بھی تھا۔

مگر باوجود ان تمام باتوں کے حضرت عمرو بن عاص کے کان تک اس کے علم و فضل کی شہرت جب پہنچی تو جیسا کہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ اس کو حضرت عمرو بن عاصؓ نے بلایا:

"و اکرمه و روی له موضعاً" (۲۰)

"اور اسکی عزت کی اور خاص حیثیت اس کی، ان کی نظر میں قائم ہوگئی"۔

قفطی نے اسی واقعہ کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ۔

"فلا زمه و کان لا یکاد یفارقه" (۲۱)

"اور اس کو عمرو بن عاص نے اپنے ساتھ رکھ لیا اور مشکل ہی سے وہ اس سے الگ ہونا چاہتے تھے"

پھر دونوں کے تعلقات کی تفصیل کی ہے۔

Marfat.com

اور عمرو بن عاصؓ تو پھر بھی ایک ملک کے والی اور گورنر تھے، امیر معاویہؓ تو وقت کے سب سے بڑے حکمران اور ان کے زمانہ میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے وہی مرکز وحید تھے۔ اور اسی کے ساتھ صحابیت کا شرف بھی رکھتے تھے، ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت کے دوسرے صیغوں اور محکموں کے سوا ان کے دربار میں بھی طبی سررشتہ کا تعلق عیسائیوں یعنی غیر مسلم اطباء کے ہاتھوں میں ہے، جن میں ابن آثال اور دوسرے عیسائی طبیب جس کا اصلی نام معلوم نہیں، مگر مسلمانوں میں ابوالحکم کے نام سے مشہور ہے، ان دونوں کے تذکروں اور ان کے قصوں سے کتابیں معمور ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن آثال تو علاج و معالجہ میں مشہور تھا اور ابوالحکم دواسازی میں امتیاز رکھتا تھا، طبقات الاطباء میں ابن آثال کے متعلق لکھا ہے کہ:

''جب حضرت معاویہؓ نے اپنی حکومت کا اعلان دمشق میں کیا تو ابن اثال کو اپنا معالج خاص مقرر کیا، اس کے ساتھ وہ بہت سلوک کرتے تھے، اور اس کے بہت معتقد تھے، صبح وشام اس سے گفتگو کرتے''۔ (۲۲)

اسی طرح ابوالحکم کے متعلق یہ لکھ کر کہ کان طبیبا نصرانیا (یعنی وہ ایک عیسائی طبیب تھا) لکھا ہے کہ

''طبی امداد امیر معاویہ اس سے بھی حاصل کرتے اور دواؤں کی ترکیب میں اس پر بھروسہ کرتے تھے'' (۲۳)

جب گورنروں اور گورنروں سے بھی آگے بڑھ کر خود وقت کے حکمران کے درباروں میں غیر مسلم اطباء کی اسلام کے آغاز یعنی عہد صحابہ ہی میں یہ آؤ بھگت ہو رہی تھی تو عام مسلمانوں میں ان غیر مسلم طبیبوں کی مقبولیت کی کوئی حد ہو سکتی تھی۔

دوسری صدی کے امام، امام شافعی سے لے کر عہد غزالی تک تقریباً پانچ ساڑھے پانچ صدیوں کی اجمالی شہادت آپ کے سامنے جو گذری کہ مسلمانوں کے

Marfat.com

عام علاقے غیر مسلم طبیبوں سے بھرے ہوئے تھے، کیا مذکورہ بالا معلومات کے بعد بھی کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ دین سے بعد، یا طول امد، کی قدرتی افسردگی کا یہ نتیجہ تھا۔

میں تو کہتا ہوں کہ تاریخوں میں یہ واقعہ جو نقل کیا جاتا کہ امیر معاویہ کے دربار کا یہی عیسائی طبیب یا دوا ساز ابوالحکم ان کے حکم سے یزید کے ساتھ حج کے موسم میں مکہ معظمہ آیا، اور ساتھ ساتھ رہا، یا عباسیوں کے زمانہ میں اسی ابوالحکم کو جس نے کافی عمر پائی تھی، عباسی گورنر عبدالصمد بن علی نے اپنے علاج کے لیے مکہ بلوایا (۲۴) اور مسلمانوں کی طرف سے کوئی اعتراض اس پر نہیں ہوا، تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ خود رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں حارث بن کلدہ مکہ معظمہ میں مسلمانوں کے علاج و معالجہ کا کام پیغمبر ﷺ کے حکم سے انجام دے چکا تھا۔

اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ پہلی صدی ہجری کا وہ واقعہ ہے جس کا ذکر ابن سعد نے اپنی طبقات میں کیا ہے۔ یعنی شام کے ایک عیسائی طبیب جس کا نام عبدالرحمٰن تھا، لکھا ہے کہ کسی وجہ سے شام چھوڑ کر مکہ معظمہ پہنچا اور وہیں اس نے مطب قائم کیا، طبقات کے الفاظ یہ ہیں کہ:

''کان عبد الرحمن ابو داؤد نصرانیا و کان رجلا من اهل الشام و کان یتطبب فقدم مکة فنزلها'' (ز) (۲۵)

''عبدالرحمٰن جس کی کنیت ابوداؤد تھی ایک عیسائی تھا، شام کا باشندہ تھا اور طبابت کرتا تھا، پھر مکہ آیا اور وہیں رہ پڑا''۔

قابل توجہ اور خاص طور پر جو چیز عبدالرحمٰن الطبیب النصرانی کے تذکرہ میں اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں اپنا مطب اس عیسائی طبیب نے کہاں قائم کیا، ابن سعد کا بیان ہے کہ:

''عبد الرحمن یجلس فی اصل منارة المسجد الحرام من قبل

Marfat.com

الصفا''(۲۶)

''کوہ صفا کی طرف مسجد حرام یعنی کعبہ کا جو مینارہ تھا عبدالرحمن اسی مینارہ کے نیچے بیٹھا کرتا تھے''۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ واقعہ پہلی صدی ہجری کا ہے، ذرا اندازہ کیجیے مسلمانوں کی دینی فراخ دلی کا کہ ایک غیر مسلم طبیب ان کے اس شہر میں آ کر قیام کرتا ہے، جہاں ان کی نمازوں کا قبلہ اور بیت اللہ ہے، جس کا وہ حج کرتے ہیں اور اسی بیت اللہ کی مسجد کے مینارے کے پایہ کے پاس مطب کھولتا ہے۔ لیکن کسی کو اس پر اعتراض تو کیا ہوتا ہے، بلکہ لکھا ہے کہ شرفاء قریش میں آل جبیر کا جو ممتاز خاندان تھا، اسی خاندان کی سرپرستی اس عیسائی طبیب کو حاصل تھی۔ ابن سعد ہی میں ہے:

''و والی ال جبیر بن مطعم بن عدی''(۲۷)

''موالات کا تعلق جبیر بن مطعم بن عدی کے خاندان والوں سے عبدالرحمن نے قائم کیا تھا''۔

آج دنیا میں ایسے کتنے ممالک اور علاقے ہیں، جہاں اس لیے کہ مسلمانوں کی آبادی اتفاقاً اقلیت کے داغ سے داغدار ہوگئی ہے، اکثریت والوں نے ان کی زندگی کو دوبھر بنا رکھا ہے اور کہا جاتا کہ اپنے عہد اقتدار میں غیر قوموں کے ساتھ موجودہ مسلمانوں کے باپ دادوں نے جو سلوک کیا تھا، یہ اسی کا انتقام ہے۔

اس بے بنیاد دعوے کے مقابلے میں تاریخ کی شہادتیں کیا ہیں؟ یا جرم کی سزا ان لوگوں کو دینی، جنہوں نے خود کوئی جرم نہیں کیا ہے مگر یہ الزام لگا کر کہ تم نے نہ سہی تمہارے باپ داداؤں نے تو جرم کا ارتکاب کیا تھا، قانوناً وعقلاً کس حد تک غیر مجرموں سے بدلہ لینا درست ہوسکتا ہے۔ ان امور سے قطع نظر کرتے ہوئے میں صرف اسی ایک جزئی واقعہ کو پیش کرتا ہوا اور پوچھتا ہوں کہ مسلمانوں کے ان ہی

Marfat.com

باپ دادوں کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے جو اپنے مقدس ترین شہر میں بھی اپنی اس سب سے بڑی مرکزی مسجد کے زیر سایہ غیر مسلم آدمی کو پناہ دینے سے بھی دل میں تنگی نہیں محسوس کرتے تھے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے گذشتہ آباء واجداد جن پر تنگ نظری اور قومی وملی عصبیت کے مریض طبائع کی طرف سے طرح طرح کے الزام تراشے جاتے ہیں، کاش اپنی کوتاہ بینی کے عوارض سے پاک ہوکر مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کرتے تو ان کو شاید یہ ماننے پر مجبور ہونا پڑے گا، کہ جن گذرے ہوئے بزرگوں کو طعن وتشنیع کا آج نشانہ بنایا جارہا ہے۔ ان کے سینے اتنے کشادہ اور نگاہیں اتنی وسیع تھیں اور اسی بنا پر ایسی باتیں وہ کر گذرتے تھے کہ جن کو کرنا تو کرنا، شاید عہد جدید کے مسلمان اس کے سننے کی تاب بھی نہیں لاسکتے۔

دور کیوں جائیے، اسی طب وطبابت کے قصہ میں ابن ابی اصیبعہ نے مشہور غیر مسلم عیسائی طبیب جبیر بن بخت یشوع کے تذکرے میں یہ قصہ جو نقل کیا ہے کہ ایک دن ہارون عباسی خلیفہ دربار میں بیٹھا ہوا تھا، جبرئیل بھی حاضر تھا، ہارون نے جبرئیل کی طرف خطاب کرکے کہا:

''تم جانتے ہو، میرے دل میں تمہاری کتنی جگہ ہے'' (۲۸)

پھر خود ہی ہارون نے مسلمانوں سے بھرے ہوئے دربار میں کہنا شروع کیا:

''خدا کی قسم موقف (یعنی میدان عرفات جہاں کے قیام کے بغیر حاجی کا حج پورا نہیں ہوتا اسی میں موقف ہے)، جبرئیل میں نے تیرے لیے دعائیں کیں اور بہت زیادہ دعائیں کیں''۔ (۲۹)

موقف یعنی عرفات کے میدان کی دینی اہمیت مسلمانوں میں جتنی ہے، جو اس سے ناواقف ہیں، وہ شاید صحیح طور پر اندازہ نہیں کرسکتے کہ ہارون اس وقت کیا

Marfat.com

کہہ رہا تھا اور غیر قوموں کے ساتھ مسلمانوں کی رواداری کی کتنی غیر معمولی مثال پیش کر رہا تھا، جذبہ احسان شناسی کی یہ ایک تاریخی نظیر ہے، جس پر عمل کر کے ہارون نے دکھایا۔ مسلمانوں پر جنہوں نے احسان کیا ان کو وہ کہیں نہیں بھولتے، حرم میں جگہ دیتے ہیں، حرم کی مسجد کے نیچے اسے خود بٹھاتے ہیں اور حد یہ ہے کہ جانتے ہوئے کہ جس کے لیے دعائیں کر رہا ہوں وہ مسلمان نہیں ہے، وہ اس خاص مقام پر دعا کرتے ہیں، جس کے متعلق کم از کم ان کا یہ دینی اذعان اور ایمانی ایقان ہے کہ وہاں کی دعا نامقبول نہیں ہوتی، درباریوں سے بعضوں نے ہارون سے پوچھا بھی، جواب میں اس نے کہا تھا کہ:

''میں مسلمانوں کے حقوق کا محافظ ہوں اور جبرئیل میری جسمانی صحت کا محافظ ہے۔ اس لیے دراصل جبرئیل کا وجود مسلمانوں کا محافظ ہے''۔

راوی کا بیان ہے کہ ہارون کے اس جواب کو سن کر درباروالوں نے کہا:

"صدقت یا أمیر المومنین "(۳۰)

''آپ نے سچ فرمایا اے مسلمانوں کے امیر''۔

میں نہیں جانتا کہ اس صدقت (سچ کہا آپ نے) کی تصدیق پر اس زمانے کے مسلمان آمادہ بھی ہوں گے یا نہیں؟ مگر اتنی بات کے لیے تو کسی تلاش و جستجو کی بھی ضرورت نہیں، آپ کے سامنے زمین کے اسی کرہ پر حبشہ (ابی سینا) کی عیسائی حکومت تیرہ سو سال سے قائم ہے، اپنے جغرافی محلِ وقوع کے لحاظ سے کوئی نہیں جانتا کہ اگر چاہا جاتا تو اپنے محروسہ مقبوضہ علاقہ میں بآسانی اس علاقے کو بھی شریک کر سکتے تھے۔ مگر اسی جذبہ امتنان وتشکر کا یہ نتیجہ ہے کہ کشورکشائیوں کے سلسلے میں مسلمان دنیا کے دور دراز علاقہ میں گھستے چلے گئے لیکن حبشہ والوں نے بڑے نازک وقت پر رسول اللہ ﷺ کے صحابیوں کی مختصر تعداد کو چونکہ پناہ دی تھی، اسلیے نگاہ غلط

Marfat.com

انداز بھی ان کی حبشیوں کی اس سرزمین پر نہیں پڑی۔ حالانکہ جس وقت حبشہ والوں نے ان صحابیوں کو پناہ دی تھی اس وقت بھی ان کی اکثریت دین مسیحی ہی پر قائم ہے۔

کچھ بھی ہو، میرا ناچیز خیال یہی ہے کہ مسلمان حکمرانوں اور عام مسلمانوں نے بغیر کسی تنگ دلی کے غیر مسلم اطباء کے خدمات سے استفادہ کے سلسلہ کو آئندہ جو جاری رکھا اس کی حوصلہ افزائی عہد نبوت و خلافت راشدہ کے روایات ہی سے ہو رہی تھی۔

اور شاید یہی وجہ ہے کہ سیدنا عمر بن عبد العزیزؒ الخلیفہ نے بھی اپنے زمانہ میں اطباء کے ساتھ مروانی حکمرانوں کے جو تعلقات تھے، ان میں صرف یہی نہیں کہ کسی قسم کی ترمیم و اصلاح نہ فرمائی، بلکہ کتابوں میں لکھا ہے کہ اہرن بن اعین القس کی کتاب کناشہ (یا قرابادین) کا ترجمہ سریانی زبان سے بنی امیہ کے عہد کے یہودی طبیب ماسرجویہ نے عربی زبان میں جو کیا تھا اور علاوہ شرح کے مزید دو مقالوں کا بھی اضافہ اس کتاب میں اسکی طرف سے عمل میں آیا تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ عمر بن عبد العزیزؒ نے چالیس دن تک اس کتاب کو اپنی عبادت گاہ کے کمرہ میں رکھا اور اس کے بعد حکم دیا کہ عام مسلمانوں میں یہ کتاب پھیلا دی جائے۔ (۳۱)

زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی جس اصلاحی خدمت کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ عام طور پر اس زمانے میں یہودی اور عیسائی اطباء تریاق کے نام سے جو چیز تیار کرتے تھے، اس میں سانپ بھی نسخہ کا ایک جز تھا، ابن سعد نے طبقات میں ابن لہیعہ محدث کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے صوبہ کے عامل کو لکھا تھا کہ تریاق میں بجائے مردہ سانپ کے ذالا جائے۔ "الحیة ذکیة" (۳۲) "ذبح کیا ہوا سانپ"۔

حالانکہ سانپ خواہ میتة (مردہ) ہو یا ذکیہ (ذبح کیا ہوا) ہر حال میں حرام

Marfat.com

ہے، مگر طبی ضرورت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کا خیال بھی وہی تھا جو بہت سے دوسرے ائمہ اسلام کا ہے کہ دواءً حرام چیزوں کا استعمال بھی جائز ہوتا ہے (ح)۔ میں خود طبیب نہیں ہوں، مجھے معلوم نہیں ہے کہ تریاق میں سانپ کو لوگ کس طرح شریک کرتے تھے۔ آج کل کے اطباء کا اس کے متعلق کیا خیال ہے۔ عہد جدید کی ڈاکٹری دواؤں میں مسلمانوں کے لیے عام ابتلا کی جو صورت پیش آ گئی ہے، ارباب علم وفتویٰ چاہیں تو حضرت عمر بن عبد العزیز کے اس ''اثر'' سے سہولت کی راہ پا سکتے ہیں۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ خلافت راشدہ کے بعد جب بنی امیہ کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار آیا تو ایک طرف جیسا کہ عام طور پر لوگ جانتے ہیں، قدیم عربی حمیت کے بجھے ہوئے شعلے ان کے زمانہ میں بھڑک اٹھے تھے، جس اسلامی نظام میں ایران کا نومسلم رسول اللہ ﷺ کے گھرانے کا رکن بن جاتا تھا، خالص قریشی نژاد خلیفہ حضرت عمر فاروقؓ اپنی صاحبزادی کو اس کے عقد ازدواج میں دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں (ط)۔

حبشی بلالؓ ان ہی عمر فاروقؓ کا سیدنا بن جاتا ہے، اسی اسلامی نظام میں بنی امیہ کے فرمانرواؤں نے عربی وعجمی موالی وغیر موالی کے سوال کو اٹھایا اور جہاں تک ان کے امکان میں تھا، اس کلمہ منتنہ (بدبوبات) (ی) سے نفع اٹھانے میں کمی نہ کی۔

مگر باوجود اس کے ہم اطباء کے لباس میں ان ہی اموی فرمانرواؤں کی شاہی خوابگاہوں میں یہودی اور عیسائی طبیبوں کو پاتے ہیں، ابن ابی اصیبعہ نے نقل کیا ہے کہ پہلا مروانی حکمران عبد الملک جب مرض الموت میں مبتلا ہوا تو وہی عیسائی طبیب جس کی کنیت مسلمانوں نے ابوالحکم رکھ دی تھی (ک)، پہلے بھی اس کا ذکر آ چکا ہے کہ یزید کے ساتھ بطور اتالیق کے موسم حج میں امیر معاویہؓ نے اس کو

Marfat.com

حجاز بھیجا تھا، اسی ابوالحکم کا بیان ہے کہ عبدالملک نے اس کو اپنے زمانہ میں بلالیا، اس کی روایت کے الفاظ ہیں:

"فانی مجالس و عنده بناته" (۳۳)

"میں عبدالملک کے بستر علالت کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اور عبدالملک کی لڑکیاں بھی وہاں موجود تھیں"۔

واللہ اعلم درمیان میں کوئی پردہ تھا یا برقع اوڑھ کر باپ کے پاس عبدالملک کی یہ شہزادیاں آئی تھیں، میری غرض یہ ہے کہ قرب اور نزدیکی کا جو مقام غیر مسلم طبیبوں کو مروانی حکومت میں دیا گیا تھا، کیا اس کے بعد بھی کوئی مرتبہ سوچا جاسکتا ہے (ل)۔

حیرت ہوتی ہے کہ عربیت کے سب سے بڑے علمبردار اموی حکومت کے تاج کا جوہر تابدار اور مسلمانوں کا سب سے بڑا ظالم قہار حجاج بن یوسف ثقفی جیسے آدمی کو بھی طبی کاروبار میں ہم کافی وسیع النظر پاتے ہیں وجہ اس کی جو کچھ بھی ہو، مان بھی لیا جائے کہ پرخوری کی عادت بد سے مجبور ہو کر وہ طبیبوں کا دست نگر ہو گیا تھا، لیکن جس نے سارے ایرانی ممالک کے فارسی دفاتر کو عربی زبان میں بہ یک اشارہ چشم بدل دیا تھا، اس کے لیے کیا دشوار تھا کہ عربی النسل اطباء کو اپنے اردگرد جمع کر لیتا، خصوصاً بنی ثقیف جس سے حجاج کا خاندانی تعلق تھا، اسی قبیلہ میں پشتہا پشت سے عربی طبیبوں کا ایک سلسلہ اسلام سے پہلے بھی پایا جاتا تھا اور بعد کو بھی اس خاندان کے اطباء کا ذکر لوگوں نے کیا ہے، یعنی وہی حارث بن کلدہ جو عہد نبوت میں حجاز کا سب سے بڑا طبیب شمار ہوتا تھا اور اس کو بھی جانے دیجیے، حجاج کے لیے کیا دشوار تھا کہ اپنے علاقہ جند سابور کی طبی درس گاہ میں عرب نوجوانوں کو بھیج کر اپنے لیے عربی النسل اطباء کا اسٹاف مہیا کر لیتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حجاج کے دربار کا بھی

Marfat.com

سب زیادہ سربرآوردہ اور اس کا محبوب ترین چہیتا طبیب بھی عیسائی تھا، نام اس کا لوگ تیاذوق بتاتے ہیں، لفظ کی صورت بتاتی ہے کہ کسی غیر معمولی عربی لفظ کی یہ عربی شکل ہے، واللہ اعلم بالصواب، ابن ابی اصیبعہ جس کی نظر سے ابراہیم بن القاسم الکاتب کی کتاب ''اخبار الحجاج'' گذر چکی تھی، جس میں کافی بسط وتفصیل کے ساتھ حجاج کے حالات درج کیے گئے ہیں، اسی کتاب کے حوالہ سے بھی اور دوسری کتابوں سے بھی اخذ کر کر کے تیاذوق کے بڑے دلچسپ قصے اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں، اسی میں لکھا ہے کہ:

''کان یعتمد علیه و ثیق بمداواته و کان له من الجامکیة الوافر لا والافتقاد الکثیر ''(۳۴)

''حجاج تیاذوق پر بھروسہ کرتا تھا اور اس کے علاج پر اعتماد کرتا تھا، حجاج کے ہاں سے غیر معمولی تنخواہ بھی تیاذوق کو ملتی تھی اور یوں بھی اس کی بہت زیادہ خبر گیری کرتا تھا''۔

یہ بھی لکھا ہے کہ جب تیاذوق مرض موت میں مبتلا ہوا تو حجاج عیادت کے لیے براہِ راست اس کے گھر گیا خود کہتا تھا کہ:

''لما حضرته الوفاة دخلت علیه اعوده ''(۳۵)

''جب تیاذوق مرض الموت میں مبتلا ہوا تو میں اس کے گھر گیا عیادت کرنے کے لیے''۔

آج ان الفاظ کے وزن کو ہم محسوس نہیں کر سکتے، لیکن حجاج جو اموی حکومت کے سارے ایشیائی علاقہ کا مطلق العنان والی وحاکم تھا اور نخوت وکبر میں اس کا جو حال تھا ان امور سے جو واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنا غیر معمولی واقعہ تھا، ممکن ہے کہ اس میں تیاذوق کی غیر معمولی حذاقت کو بھی دخل ہو، حجاج اپنے

Marfat.com

لڑ کے محمد سے بیان کیا کرتا تھا کہ:

"بقائے صحت کے متعلق تیا ذوق کے طبی مشوروں کو میں نے اپنے تجربہ میں بالکل درست پایا، اور ہمیشہ ان پر عمل کرنے سے مجھے نفع پہنچا" (م)۔(۳۶)

یا تیا ذوق کی غیر معمولی حاضر جوابیوں سے حجاج کے دل میں غیر معمولی اثر اس کا جو قائم کر دیا تھا اس کا نتیجہ ہو، حجاج اپنے بے پناہ مظالم کی وجہ سے اپنے آپ کو ہمیشہ مشکلات میں گھرا پاتا تھا، تیا ذوق جب آ جاتا، تو اس کی گفتگو سے تھوڑی دیر کے لیے اس کا غم غلط ہو جاتا تھا، اس سلسلہ میں لوگوں نے تیا ذوق کے متعدد لطیفوں کا ذکر کیا ہے جن میں اس کے ذہنی انتقال کی بڑی اچھی مثال یہ ہے کہ حجاج کے سر میں درد تھا، تیا ذوق بلایا گیا، اس نے حکم دیا کہ امیر کے پاؤں پر گرم پانی ڈالا جائے، اور تیل کی مالش کی جائے ایک خواجہ سرا جو عموماً خصی ہوتے تھے، حجاج کے سامنے کھڑا تھا، بے ساختہ بول اٹھا کہ درد تو امیر کے سر میں ہے اور یہ عجیب طبیب ہے مشورہ دے رہا ہے کہ امیر کا پاؤں دھویا جائے، تیا ذوق نے کہا کہ میرے دعویٰ کی دلیل تو تیرے چہرے پر ہے، خواجہ سرا نے کہا کہ وہ کیا، بولا کہ جو چیز تمہارے اندر سے نکالی گئی، وہ کہاں تھی اور داڑھی تمہارے چہرے سے غائب ہوگئی، خواجہ سرا شرمندہ ہوگیا۔

بہر حال عبد الملک اور حجاج جو غربت کی زندگی سے امارت و دولت تک پہنچے تھے بداوت کہیے یا دہقانیت سے زیادہ دور نہیں ہوئے تھے، جب ان کے درباروں میں غیر مسلم اطباء کو عزت و جاہ کی ان بلندیوں پر ہم پا رہے ہیں، تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آئندہ ان مروانی حکمرانوں کے تعلقات کی نوعیت ان طبیبوں کے ساتھ ترقی کے کس نقطہ تک پہنچ گئی ہوگی، جنہوں نے شاہی خانوادہ میں پرورش پائی تھی اور پیدا ہونے کے ساتھ ناز و نعمت کی زندگی کے عادی تھے، ان ہی حکمرانوں میں جب اس قسم کے لوگ پیدا ہو چکے تھے جو فخر کرتے تھے کہ میں کسریٰ کا

Marfat.com

بیٹا ہوں اور مروان میرا باپ ہے، میرا نانا قیصر بھی ہے اور خاقان بھی۔ (ن)

سو چا جا سکتا ہے کہ اپنی ہم رشتہ قوموں کے افراد کے ساتھ حسن سلوک میں اگر اسے خالص عربی نژاد بزرگوں سے وہ آگے بڑھ گئے ہوں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔

افسوس ہے کہ مروانیوں کے اسی سال کے دور حکومت میں دربار سے جن جن اطباء کے تعلق رہا، لوگوں نے تفصیلی تذکرہ اپنی کتابوں میں نہیں کیا ہے مگر تیاذوق ہی کے متعلق ہم ان ہی میں پاتے ہیں کہ اس کا بیٹا بھی طبیب تھا، ابن ابی اصبیعہ نے لکھا ہے کہ اسی بیٹے کے لیے تیاذوق نے کناش کبیر بھی لکھی تھی اور کتاب الادویہ بھی جس میں بیان کیا ہے کہ:

"كيفية دقها و ايقاعها و اذ ابتها و شئ من تفسير الادوية" (۳۷)

''دواوں کے کوٹنے اوران کے ڈالنے پگھلانے وغیرہ کے طریقے بھی بیان کیے گئے تھے، اور بعض دواؤں کے نام کی بھی تشریح کی تھی''۔

نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بعد تیاذوق نے شاگردوں کی بھی معقول تعداد چھوڑی تھی، جن میں ایک یہودی طبیب فرات بن شحاثا کے متعلق طبقات الاطباء میں لکھا ہے کہ:

"كان تيا ذوق المتطبب يقدمه على جميع تلامذته" (۳۸)

''تیاذوق طبیب اس کو (یعنی فرات بن شحاثا) کو اپنے تمام دوسرے شاگردوں پر ترجیح دیتا تھا''

اسی فرات بن شحاثا یہودی کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ:

''خدم الحجاج بن يوسف و هو حدث'' (۳۹)

''اس نے حجاج بن یوسف کی بھی اس زمانہ میں خدمت کی تھی جب یہ

Marfat.com

یہودی طبیب جوان تھا''۔

فرات نے کافی عمر پائی، مروانیوں کا دور جب ختم ہوگیا اور ان کے جانشین عباسی ہوئے تو ان کے دربار میں فرات داخل ہوگیا، کوفہ کے عباسی گورنر عیسی بن موسی نے اس کو اپنا طبیب خاص مقرر کیا تھا، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، عیسی کا وہ صرف طبیب ہی نہیں تھا، بلکہ سیاسی مشیر بھی، بعض سیاسی مشورے فرات نے جو اس کو دیئے تھے، فرات کی وفات کے بعد جب واقعات اسی کی سیاسی بصیرت کے مطابق پیش آتے، تو عیسی کہا کرتا تھا کہ

''فرات! تو کتنا صائب الرائے آدمی تھا، جو بات بھی تو کہتا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقوع سے پہلے گویا بے نقاب ہو کر تیرے سامنے آجاتی تھی، جو واقعات آج میرے سامنے پیش آرہے ہیں، تو ان کو گویا دیکھ رہا تھا''(۴۰)

ابن ابی اصیبعہ نے فرات کے بعض سیاسی مشوروں کا تذکرہ بھی کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، ان کے پڑھنے سے ایک طرف جہاں اس کا پتہ چلا ہے کہ غیر مسلم اقوام کے ان طبیبوں پر کتنا غیر معمولی اعتماد مسلمانوں کے سلاطین و امراء کرتے تھے، تو دوسری طرف اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اپنے قدر شناسوں کے ساتھ ان کے تعلقات بھی کتنے مخلصانہ اور سچی بہی خواہیوں پر مبنی تھے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا مروانی حکمرانوں کے دربار کے ان طبیبوں کا تفصیلی تذکرہ کتابوں میں نہیں پایا جاتا، لیکن جب عباسیوں نے اپنے ہاتھ میں مسلمانوں کی حکومت کی باگ لی، اس وقت جو تماشا اس سلسلہ میں پیش آیا وہ دیکھنے کے قابل ہے۔

عباسیوں نے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ زیادہ تر کامیابی

Marfat.com

غیر عربی عناصر کی امداد و معاونت سے حاصل کی تھی، قدرۃ ان کا دربار عجمیوں سے بھر گیا، عموماً مالی کاروبار کا عباسیوں کے زمانہ میں یہودی جھبذوں یا موجودہ اصطلاح میں یہودی بینک کاروں سے تعلق تھا۔

عباسیوں کی تاریخ کا یہ ایک بڑا اہم باب ہے، میرے سامنے اس وقت صرف اطباء اور معالجین کا قصہ ہے، آئیے پہلے اس کو سن لیجیے، پھر اگر توفیق رفیق ہوئی تو عہد عباسی کے 'جہاندیدہ' کی داستان بھی سنائی جائے گی اگر ''اجل مسمی' نے فرصت نہ دی تو میں دوسرے احباب علم وقلم سے درخواست کرتا ہوں کہ آئندہ اس مضمون کی تکمیل فرمادیں گے۔

سچ پوچھیے تو غیر مسلم اطباء کے عروج و اقبال کا حقیقی زمانہ عباسیوں ہی کا عہد ہے، ان کے دربار میں یہودی، عیسائی، مجوسی، صابی اطباء کے سوا نیا عنصر ہندوستانی طبیبوں کا بھی داخل ہوگیا تھا کہتے ہیں کہ عباسیوں کا دوسرا خلیفہ ابوجعفر منصور ضعف معدہ میں مبتلا تھا، اچھا نہ ہوتا تھا ایک ہندوستانی طبیب نے پھکی بنا کر دی جس سے صحت حاصل ہوئی اور اس کے دل میں ہندی طریقہ علاج کا وزن پیدا ہوا، نیز خالد برمکی کو ہند اور ہندعلوم سے جو تعلق تھا، اس کو بھی عباسیوں کے دربار میں ''ہندی طب'' بلکہ دوسرے ہندی علوم وفنون کی روشناسی میں بہت دخل ہے۔ اب خواہ اسباب کچھ بھی ہوں، ہندوستانی اطباء کی کافی تعداد مختلف زمانہ میں بغداد پہنچی ہے، ہندی طب کی بے شمار کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں کیا گیا، اردو زبان میں کافی مواد اس سلسلہ میں جمع ہو چکا ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے ہندی اطباء اور ہندی طب کی جو کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں ان کی فہرست درج کی ہے جس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ منجملہ اور کتابوں کے ایک کتاب ہندوستان سے بغداد پہنچی جس کا نام ''علاجات النساء'' تھا، یا سی عنوان پر یہ کتاب لکھی گئی تھی، بہرحال دلچسپ بات یہ

Marfat.com

ہے کہ ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے کہ

"کتاب روسی الهندی فی علاجات النساء "(۴۱)

''روسی ہندی خاتون کی کتاب عورتوں کے علاج کے متعلق ہے''

میں نہیں جانتا کہ اس ہندوستانی مصنفہ کی اس خدمت کا جو اپنے جنس کی اس نے انجام دی تھی، دوسروں نے بھی تذکرہ کیا ہے یا نہیں، اور اس زمانے میں اس کے متعلق لوگوں کی تحقیق کیا ہے، کچھ بھی ہو طب جیسے اہم فن پر ہندوستان کی کسی خاتون نے کتاب لکھی ہے، اس کا پتہ تو اس تاریخی شہادت سے چلتا ہے، کاش اس فن سے تعلق رکھنے والوں کی توجہ اس کتاب کی طرف مبذول ہو اس کو مسلمانوں کی طب کی تاریخ پر کام کرنے والوں کے حوالہ کر کے میں اپنے موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

سب سے پہلے تو اس سلسلہ میں دیکھنے کی خبر یہ ہے کہ دربار خلافت کے ساتھ تعلق رکھنے والے اطباء کی تعداد کیا ہوگی، جب ہم دیکھتے ہیں کہ عباسی عہد کے امراء بھی اپنے ہاں طبیبوں کی ٹولیوں کو ملازم رکھتے تھے طبقات الاطباء میں مشہور عباسی امیر ابو دلف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"کان مجلس ابی دلف مجمعا للمتطببین "(۴۲)

''ابو دلف کی مجلس میں طبیبوں کا مجمع رہتا تھا''۔

طبیبوں کے اس مجمع میں جو لوگ شریک تھے، ان میں بعضوں کا نام بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''کان معه من المرتزقة جماعة منهم یوسف بن صلیبا و سلیمان بن داؤد بن بابان و یوسف القصیر و یونس بن حنون "(۴۳)

''امیر ابو دلف کے ساتھ تنخواہ یاب اطباء کا ایک گروہ تھا، جن میں یوسف

بن صلیبا، سلیمان بن داؤد بن بابان ابو یوسف القصیر (کوتاہ قد) اور یونس بن حنون بھی تھے''۔

نام ونسب سے ہی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ مسلمان نہیں تھے، اسی کے بعد بیان کیا ہے کہ مرتزقہ کے سوا:

"ربما اجتمعوا فی مجلسہ منھم عشرون رجلا"(۴۴)

''بسا اوقات (غیر تنخواہ دار اطباء میں سے) بیس بیس آدمی اس کی مجلس میں جمع ہو جاتے تھے''۔

افسوس ہے کہ لوگوں نے مفصل فہرست ان طبیبوں کی نہیں دی ہے جو مختلف عباسی خلفاء کے دربار سے تعلق رکھتے تھے لیکن اتفاقی طور پر دوسرے واقعات کے تذکرے کے ذیل میں ایسی چیزیں مل جاتی ہیں، مثلاً ابن ابی اصیبعہ نے مشہور عیسائی طبیب حنین بن اسحاق کے اس رسالہ کو نقل کیا ہے جس میں اس نے اپنی اور بخت یشوع طبیب کی باہمی کش مکش اور سازش کی داستان کی ہے اسی رسالہ میں حنین نے خلیفہ متوکل کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ہمارے مخالف اطباء جو ہمارے ہم مذہب یعنی عیسائی ہیں اور خلفاء کی خدمت کا شرف سب کو حاصل ہے ان کی تعداد

"ستة و خمسون رجلا جملتھم من اھل المذھب"(۴۵)

''چھپن ہے اور سب ہمارے ہم مذہب ہیں''

ظاہر ہے کہ دربار خلافت کے یہ چھپن طبیب اسی درجہ کے لوگ ہوں گے جو حنین سے ٹکر لینے کی صلاحیت رکھتے تھے، نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے مددگاروں، دواسازوں وغیرہ کی تعداد کیا ہوگی؟

یہ اور اسی قسم کی دوسری شہادتوں کی بنا پر میرا خیال ہے کہ طب اور علاج

Marfat.com

ومعالجہ کی راہ سے عباسی دور میں غیر مسلم اقوام سے تعلق رکھنے والوں نے اقتدار واثر حاصل کیا تھا، ان کی تعداد معمولی نہ ہوگی۔ ذرا ممالک محروسہ عباسیہ کی وسعت وفراخی کا تصور کیجیے اور سوچیے کہ اس وسیع علاقے کے باشندوں کی طبی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کتنے آدمیوں کی ضرورت تھی۔ چونکہ اس پیشہ کو مسلمانوں نے غیر مسلم اقوام ہی کے سپرد کر رکھا تھا۔ اس لیے اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ اگر عباسیوں کے زمانہ میں طبابت کی راہ سے معاش حاصل کرنے والوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہو، یہ خیال بھی صحیح نہ ہوگا کہ اپنی قومی اور دینی خصوصیتوں کو ترک کر کے یا ان سے لاپروائی اختیار کر کے مسلمانوں کے دلوں میں ان لوگوں نے جگہ پیدا کی تھی۔

ابو جعفر منصور عباسیوں کے دوسرے خلیفہ کا زمانہ ہے۔ جند سابور کی طبی درسگاہ کے پرنسپل جورجس کو منصور بغداد طلب کرتا ہے اور یہ پہلا عیسائی طبیب ہے جو عباسی دربار میں بلایا گیا ہے۔ منصور سے ملاقات ہوتی ہے، اس کی باتوں سے غیر معمولی طور پر منصور متاثر ہوتا ہے اور حاجب ربیع کو حکم دیتا ہے کہ:

''کسی ایسے محل کا انتخاب جورجس کے قیام کے لیے کرو جس میں اپنے خاندان کے خاص عزیزوں کو میں اتارتا ہوں''۔ (۴۶)

حکم کی تعمیل کی گئی، جورجس منصور کا علاج کرتا ہے، کامیاب ہوتا ہے، کرسمس کی عید میں جورجس خلیفہ سے ملنے آیا، مل کر جب رخصت ہونے لگا تو خلیفہ نے پوچھا تمہارے ساتھ کیا عورتیں بھی ہیں۔ جورجس نے نفی میں جواب دیا، منصور نے پوچھا کہ تمہاری خدمت کون کرتا ہے جورجس نے کہا میرے تلامذہ اور شاگرد جو ساتھ آئے ہیں، منصور نے کہا اپنی بیوی کو تم ساتھ کیوں نہیں لائے، جواب دیا کہ وہ بوڑھی ہو چکی ہے، سفر اس کے لیے دشوار تھا، جورجس یہ باتیں کر کے گرجا چلا گیا، منصور نے اسی وقت حکم دیا کہ تین نوجوان چھوکریاں جورجس کی قیام گاہ پر پہنچا دی

جائیں۔ساتھ ہی تین ہزار اشرفیاں بھی بطور عیدی کے منصور نے بھیجیں، جب جورجس گرجا سے واپس ہوا تو خلیفہ کے بھیجے ہوئے تحفوں کی خبر ملی، طبقات الاطباء میں ہے کہ لونڈیوں کا ذکر سن کر جورجس آپے سے باہر ہوگیا، اپنے شاگردوں سے کہا تم لوگوں نے اسی وقت ان کو واپس کیوں نہیں کر دیا اور حکم دیا ابھی ان کو دارالخلافت پہنچا دیا جائے لونڈیوں کی واپسی کی خبر منصور کو ملی، اسی وقت جورجس کو اس نے طلب کیا اور غصہ میں پوچھنے لگا کہ تم نے یہ اس تحفے کو رد کر دیا؟ جواب میں کسی اضطراب اور پریشانی کے بغیر سکون اطمینان کے ساتھ جورجس نے منصور سے کہا:

''جناب والا! ہم لوگ عیسائی ہیں ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ کسی مکان میں ان کے ساتھ جمع ہوں''۔(۴۷)

آگے جورجس نے نہایت آزادی کے ساتھ اپنے دینی مسلک کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''جناب والا! ہمارے مذہب میں ایک عورت سے زیادہ عورتوں سے نکاح جائز نہیں ہے، جب تک وہ عورت زندہ رہے گی، ہم لوگ دوسری عورت سے عقد نہیں کر سکتے''۔(۴۸)

جورجس کی اس صاف بیانی سے منصور بہت متاثر ہوا، اسی سلسلہ میں ایک لطیفہ وہ بھی کہ بغداد ہی میں جورجس بیمار پڑا، حالت روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی، عمر بھی کافی تھی، منصور اس کی عیادت کے لیے پیدل چل کر اس کے پاس پہنچا، جورجس سے حال پوچھا، رونے لگا، اور رو رو کر عرض کرنے لگا کہ:

''بڑی مہربانی سرکار کی ہوگی اگر زندگی کی ان آخری گھڑیوں میں مجھے اپنے بال بچوں میں پہنچادیں تاکہ ان کو ایک دفعہ تو دیکھ لوں اور میرا وقت ہی اگر آ گیا ہے تو اپنے آباؤاجداد کے ہڑاوڑ میں دفن ہونے کا موقع ملے گا''۔(۴۹)

Marfat.com

منصور جورجس کی خدمات سے زیادہ متاثر تھا، اس وقت اس سے رہا نہ گیا، کہنے لگا:

''جورجس! دیکھو تم مسلمان ہو جاؤ، میں جنت کی ضمانت تمہارے لیے لیتا ہوں''(۵۰)

یہ سننے کی بات ہے ایک مطلق العنان فرمان روا التجا کی شکل میں ایک بات پیش کرتا ہے جواب میں جورجس نے کہا:

''بندہ تو اپنے باپ داداؤں ہی کے دین پر مرنا چاہتا ہے، میرے آباء واجداد جہاں کہیں بھی ہیں وہیں میں بھی جانا چاہتا ہوں، خواہ وہ جنت میں ہوں یا جہنم میں''۔(۵۱)

کہتے ہیں کہ منصور بوڑھے جورجس کے اس جواب کو سن کر ہنسنے لگا دس ہزار اشرفیاں سفر خرچ کے لیے منظور ہوئیں، جورجس اپنے بال بچوں میں پہنچا دیا گیا۔(۵۲)

میری غرض اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ ان غیر مسلم طبیبوں کے اثر ورسوخ کی یہ توجیہ قطعاً غلط ہوگی کہ زمانہ سازی سے کام لے کر انہوں نے کامیابی حاصل کی تھی، یہ صحیح ہے کہ ان میں سب کا حال وہی نہ تھا، جس کا نمونہ جورجس کے استوار کردار میں آپ پا رہے ہیں۔ ان میں جہاں جورجس جیسے لوگ تھے، وہیں یوحنا ابن ماسویہ جیسے عیسائی بھی تھے، اس نے مامون، معتصم، واثق، متوکل ان چاروں عباسی فرمانرواؤں کی طبی خدمت انجام دی تھی، ہارون الرشید نے اسی کو ان کتابوں کے تراجم کی نگرانی کا کام سپرد کیا تھا، جو ایشیائے کوچک کے مرکزی شہروں انقرہ اور عموریہ کے کتب خانوں میں ملی تھیں۔ کہنا یہ ہے کہ اسی یوحنا بن ماسویہ کے متعلق طبقات میں لکھا ہے کہ جورجس کے برخلاف علاوہ بیوی کے اپنے پاس چند لونڈیوں کو

Marfat.com

بھی اس نے رکھ لیا تھا، بغداد کے عیسائیوں کی شماسیت کی نمائندگی بھی کرتا تھا، جو دین النصاریٰ کا ایک عہدہ ہے۔ عیسائیوں کو جب یوحنا کی اس حرکت کی خبر ملی تو انہوں نے مجبور کیا کہ یا لونڈیوں سے تعلقات منقطع کرلے، یا شماسیت کا عہدہ ترک کردے، کہتے ہیں کہ یوحنا کے سامنے جب یہ مطالبہ پیش ہوا، تو جھلا کر اس نے کہا کہ ہمیں جہاں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ایک عورت سے زیادہ عورت نہ رکھیں وہیں یہ حکم بھی موجود ہے کہ ایک جوڑے سے زیادہ جوڑے نہ رکھیں، پھر میں تو صرف شماس ہوں، ہم سے زیادہ اہم دینی عہدہ آج جس کے ہاتھ میں ہے، یعنی بغداد کا جو جاثلیق ہے، گالیاں دیتے ہوئے اس نے کہا وہ بجائے ایک کے بیس بیس جوڑے کپڑوں کے کیوں رکھتا ہے، یہ بھی بولا کہ:

''بدبخت یوحنا تو چار عورتوں کے رکھنے کی وجہ سے اس کا مستحق ہو گیا کہ شماسیت کے عہدے سے دست بردار ہو جائے تو پھر اپنے جاثلیق کو تم لوگ کیوں نہیں کہتے کہ اپنے دین کے احکام کی پابندی کرے، اگر اس کے لیے کپڑوں میں خلاف ورزی دین کی جائز ہے، تو عورتوں کے معاملہ میں ہماری خلاف ورزی بھی قابل برداشت ہونی چاہیے'' (۵۳)

اسی کتاب میں ایک لطیفہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ یہی یوحنا ایک دفعہ بیمار ہوا، مرض بڑھتے ہوئے مایوسی کی حد تک پہنچ گیا، عیسائیوں کے دستور کے مطابق چند پادری بلائے گئے، اس کے بالین علالت کے نزدیک بیٹھ کر وظائف، اوراد اور دعاؤں میں مشغول ہو گئے، یوحنا نے آنکھ کھولی تو اپنے سرہانے تماشے کو دیکھ کر بولا:

''اے بدکاروں کے بچے، میرے گھر میں یہ کیا کر رہے ہو'' (۵۴)

پادریوں نے کہا کہ خدا تم پر فضل فرمائے اس کی دعا ہم لوگ کر رہے ہیں، سنتے کے ساتھ بے ساختہ یوحنا کی زبان سے یہ الفاظ نکلنے لگے:

Marfat.com

''ابتدا سے قیامت تک سارے جہاں میں جتنے عیسائی پیدا ہوں گے، یا پیدا ہو چکے ہیں مل کر بھی دعا کریں تو ان کی دعا سے سچ کہتا ہوں گلاب کی ایک ٹکیہ زیادہ کارگر اور مفید ہے'' (س)۔ (۵۵)

کچھ بھی ہو، مجھے دوسروں سے اس وقت بحث نہیں ہے مگر مسلمان حکمرانوں کے متعلق یہ کہہ سکتا ہوں کہ کمال کی قدر افزائیوں میں صاحب کمال کے دینی رجحانات اور مذہبی رویہ کی خصوصیتوں کو انہوں نے کبھی نہیں دیکھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ جورجس جیسے کٹر عیسائی اور یوحنا جیسے رند مشرب لاابالی آدمی، دونوں کی حیثیت عباسی دربار میں برابر تھی۔ جورجس کے ساتھ ابوجعفر منصور جیسے جزرس، بلکہ شاید بخیل آدمی کی طرف سے فیاضیوں کے تھوڑے بہت قصے تو آپ سن چکے، اب سنیے یوحنا کا حال یہ تو بیان ہی کر چکا ہوں کہ ہارون کے زمانہ میں یونانی کتابوں کے تراجم کا وہ نگران تھا اور بعد کو مامون سے متوکل تک مسلسل عباسی خلفاء کا وہ شاہی طبیب رہا۔

عیسیٰ بن ماسویہ طبیب جو غالباً یوحنا کا شاگرد بھی تھا، اسی سے اپنے مرنے سے تین سال پہلے اس نے بیان کیا تھا کہ اب تک طبابت کے ذریعہ سے ایک ملین دس لاکھ درم میں کما چکا ہوں، واثق باللہ خلیفہ ایک معمولی بات پر یوحنا سے خوش ہوا، اور حکم دیا کہ ایک لاکھ درم اسی وقت اس کے پاس بھیجے جائیں، تھوڑی دیر بعد دریافت سے واثق کو معلوم ہوا کہ یہ رقم اب تک یوحنا کے گھر نہیں پہنچی ہے، حکم دیا کہ بجائے ایک لاکھ درم کے دو لاکھ بھیجے جائیں۔ یہ حکم عصر کے وقت دیا گیا تھا، مگر کسی وجہ سے تعمیل حکم کی عشاء کے وقت تک نہ ہو سکی، واثق کو جب معلوم ہوا کہ رقم اب بھی نہیں بھیجی گئی ہے، تو بجائے دو لاکھ کے انعام کی رقم تین لاکھ کردی گئی، واثق کا خادم خاص جسے حکم دیا گیا تھا، خلیفہ کے اس رجحان کو پاکر مہتمم خزانہ کے پاس پہنچا اور کہنے لگا کہ بھائی روپے فوراً یوحنا کے پاس روانہ کردو ورنہ اندیشہ ہے کہ واثق آج پورے خزانہ کو یوحنا پر نثار

کر دے گا۔ (۵۶)

اسی یوحنا بن ماسویہ کا دلچسپ لطیفہ طبقات میں نقل کیا ہے کہ متوکل خلیفہ ایک دن دجلہ میں تخت بند ہو کر مچھلی کا شکار کر رہا تھا، یوحنا اس کے داہنے جانب بیٹھا تھا، اتفاق سے دیر تک کوئی مچھلی ہاتھ نہ لگی، متوکل نے یوحنا کی طرف خطاب کر کے کہا کہ تو ہی منحوس آدمی ہے کہ آج شکار نہیں ہو رہا ہے، قصہ سننے کا اس کے بعد ہے، لکھا ہے یوحنا نے متوکل کے اس فقرے کو سن کر کہا کہ:

"جناب والا! بندہ تو کسی معنی میں بھی منحوس نہیں ہو سکتا، میرا باپ ماسویہ خوزستان کا ایک معمولی آدمی تھا اور ماں میری سسلی کی ایک لونڈی تھی جو آٹھ سو درم میں خریدی گئی تھی، پھر میرے اقبال کا دور آیا اور آج میں خلفاء کا ندیم وانیس بنا ہوا ہوں، دنیا مجھ پر رشک کر رہی ہے، بھلا ایسا آدمی کہیں منحوس ٹھہرائے جانے کے قابل ہو سکتا ہے"۔ (۵۷)

اس کے بعد اس نے کہا کہ اگر امیر المومنین کی اجازت ہو تو میں اس شخص کو بتا سکتا ہوں جو واقعی منحوس ہے، متوکل نے کہا کہ بتاؤ کون ہے، یوحنا نے جواب دیا کہ:

"منحوس آدمی وہ ہے جو چار پشتوں سے یکے بعد دیگرے خلفاء کی نسل میں منتقل ہوتا ہوا دنیا میں پیدا ہوا، اور پھر خود بھی خلیفہ بن گیا مگر (تقدیر کی خوبی دیکھیے) کہ وہی اپنے شاہانہ جاہ وجلال، ایوان ومحلات کو چھوڑ کر دجلہ کے کنارے بیس ہاتھ کی ایک چوکی پر بیٹھا ہے اور دنیا کی مفلس ترین قوم مچھیروں کی شکل اختیار کی ہے"۔ (۵۸)

آپ سمجھ رہے ہیں کہ منحوس ہونے کا طنز کون کس پر کر رہا ہے یہ طنز ایک عیسائی طبیب کر رہا ہے اور بقول اسی کے جو سسلی کی ایک لونڈی کا بچہ ہے اور جس پر طنز کر رہا ہے یہ مبالغہ نہیں ہے کہ مشرق ہی کا نہیں بلکہ شاید اپنے وقت کی سب سے بڑی طاقتور حکومت کا بادشاہ اور حکمران ہے۔ لیکن اس کے کمال نے خلیفہ کے دل میں ایسی

Marfat.com

جگہ اس کے لیے بنادی تھی کہ بے تکلفی میں وہ اس حد تک پہنچ جاتا تھا۔

اور ابن ابی اصیبعہ نے طیفوری خاندان کے ایک عیسائی طبیب کا ایک طویل قصہ نقل کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے کہ طیفوری اور عباسی دربار کے ایک امیر ابو غانم کے درمیان گفتگو میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ امیر نے طیفوری کو ایک فحش گالی دی جواب میں طیفوری نے بھی اسی گالی کو امیر کی طرف منسوب کرکے دہرایا، امیر جو بیمار تھا، اس نے غصہ میں کہا کہ تیری جسارت اس حد تک پہنچ گئی، طیفوری نے امیر کے اس سوال کے جواب میں جو بات کہی تھی، وہی سننے کے قابل ہے، اس نے کہا کہ:

تمہارا کیا ذکر ہے، خلیفہ ہادی کی خدمت میں جب رہتا تھا، تو ایک دفعہ نہیں بلکہ اس نے کہا کہ:

"لقد كان يسبنى فار دعليه مثل قوله" (۵۹)

"مجھے جب کبھی گالی انہوں نے دی ہے ٹھیک اسی گالی کو ان پر واپس کر دیا کرتا تھا"

بجائے خود گالی گفتہ، یا پھکڑ بازی کی یہ شکل جتنی بھی بیہودہ اور مستحق نفرت و ملامت ہو، اسلام ہی کیا تمام انسانی تہذیب کے لیے بھی یہ صورت حال حد سے زیادہ ناپسندیدہ ہے اور روایت اگر صحیح ہے تو دوسری عام کمزوریوں کے ساتھ سلاطین وملوک کی مجلسوں کی ایک ناقابل عفو کمزوری اس کو شمار کرنا چاہیے۔

مگر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے عہد حکومت کی غیر مسلم رعایا جن کا اصطلاحی نام ذمی ہے۔ ذمی کے اس لفظ کو بلاوجہ رسوا کرنے کی کوشش جو کی گئی ہے اور ایسے مہیب تصورات کو اس کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے کہ شاید خود مسلمانوں کو بھی اس لفظ کے استعمال میں گونہ شرمندگی سی محسوس ہونے لگی ہے، حالانکہ اس لفظ ہی میں کوئی بات ایسی نہیں جو مسلمانوں کے لیے باعث ندامت ہو۔ اردو میں بھی ذمہ کا عربی لفظ مستعمل ہے، مسلمانوں کی حکومت غیر مسلم اقوام کے جن لوگوں کی عزت جان

Marfat.com

و مال کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہے، ذمہ کے لفظ کے ساتھ نسبت کی ''ی'' کا اضافہ کر کے ذمی کا لفظ بنا لیا گیا ہے اور رعایا کے اس طبقہ کی تعبیر اس سے کی جاتی ہے، پھر آپ ہی بتائیے کہ اس میں مسلمانوں کے لیے شرمانے کی کیا بات ہے۔ باقی جو سلوک غیر مسلم اقوام کے اس طبقہ کے ساتھ مسلمانوں کی حکومت کرتی تھی، مجھے اس سے انکار نہیں ہے، کہ ''حاکم و محکوم'' میں قدرتہً مراتب کا جو فرق پیدا ہو جاتا ہے، چاہا جاتا یا نہ چاہا جاتا مگر اس فرق کا پیدا ہو جانا ایک طبعی بات تھی، مگر یہ فرق بھی عام حالات میں جہاں تک میں جانتا ہوں، اس سے زیادہ نہ تھا، جو ایک ہی خاندان کے بڑے اور چھوٹے بھائیوں میں پایا جاتا ہے، بعض لوگوں نے قرآن کے لفظ صاغرین کا ہی مطلب بیان بھی کیا ہے کہ مسلمان جن کو حاکم ہونے کی وجہ سے کبیر یا بڑے بھائی ہونے کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے، ان کے مقابلہ میں رعایا غیر مسلم طبقہ صغیر یا چھوٹے بھائی ہونے کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے، اسی صغیر کی جمع صاغرین ہے۔ خیر موقع اس مسئلہ کے بسط و تفصیل کا نہیں ہے، یہاں میں کہنا چاہتا ہوں کہ ذمیوں کی اس عام قانونی حیثیت کے برخلاف مسلمانوں کی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ مل جائے جس کی ذمہ داری زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی کسی شخصی اور انفرادی ہستی کے سر عائد ہوتی ہے۔ غصہ میں کسی مسلمان حکمران یا امیر کی طرف سے غیر مسلم رعایا کے کسی فرد کے ساتھ ظلم و زیادتی کی صورت غیظ و غضب وغیرہ جذبات کا وقتی تاثر کے ماتحت اتفاقاً پیش آ گئی ہے، اور غیر مسلموں سے زیادہ خود مسلمانوں کے ساتھ بھی آئے دن پیش آتی رہتی تھی، مگر غیر مسلم رعایا کے اس جزئی واقعہ کو کلی قالب کا دستور عطا کر کے آسمانوں کو سر پر اٹھا لیا جاتا ہے۔

میں یہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ تاریخی اقاصیص و حکایات سے نتائج اگر نکالے جاتے ہیں تو کیا انصاف کا تقاضا یہ نہ تھا کہ ناگوار حوادث و واقعات کے ساتھ

Marfat.com

ان قصوں کا بھی ذکر کرنا چاہیے تھا جس کی ایک نظیر طیفوری خاندان کے اس ذمی طبیب کی مذکورہ بالا روایت ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ غیر مسلم رعایا کے ساتھ انبساطی اور بے تکلفی کے تعلقات کی ابتدا، ہندوستان کے بعض مغل بادشاہوں کی طرف سے اس وقت ہوئی جب ہنسی مذاق کے رشتے غیر مسلم قوموں کے ساتھ اس بادشاہ نے قائم کیے، مگر آپ کے سامنے اس زمانہ کی تاریخی شہادت پیش کر رہا ہوں، جب سن ھجری کی دوسری صدی بھی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی، یہ الہادی، عباسیوں کا خلیفہ جس کا نام موسیٰ تھا اور ہارون الرشید کا بڑا بھائی، ہارون سے پہلے مسند خلافت پر متمکن ہوا تھا اس کی وفات ۱۷۰ھ میں ہوئی۔ طیفوری نے اسی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ ان کو گالیوں کے جواب میں ان ہی گالیوں کو ہادی کی طرف منسوب کر کے دہرادیا کرتا تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا مجلسی آداب کے لحاظ سے یہ جتنی بھی گندہ اور گھناؤنی بات ہو مگر ہندوستان کے مغل بادشاہ نے ہنسی مذاق کا رشتہ قائم کر کے ذمی رعایا پر اگر کوئی احسان کیا تھا، تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ تقریباً ہزار سال پہلے مسلمانوں کی تاریخ میں اس احسان کی نظیر قائم ہو چکی تھی اور رشتہ داری کے ان تعلقات کے بغیر قائم ہو چکی تھی جن کی رسم ڈالنے والے نے نہ اسلام ہی کے معاشرتی قوانین اور حدود کی پروا کی اور میرا خیال تو یہ ہے کہ اپنی رعایا کی عزت و ناموس کی حفاظت کی ذمہ داری جو اس پر مذہب و اخلاق کی طرف سے عائد ہوتی تھی، اس سے بھی وہ صحیح معنوں میں عہدہ برآ نہ ہوا۔

آپ دیکھ رہے ہیں جو قصہ سنایا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ خلیفہ ہی نہیں بلکہ لیفہ کے دربار کے امیر بھی رعایا کے ذمی طبقہ سے اس قسم کی باتوں کے برداشت کرنے کے عادی ہو چکے تھے، بلکہ ملوک اور سلاطین کے متعلق شیخ سعدی کا مشہور مثالی فقرہ یعنی:

Marfat.com

''گاہے بہ سلامے بر نجند وگاہے بدشنامے خلعت دہند''

اس کے پہلے جزء کی مثالیں مسلمان حکمرانوں کی تاریخ میں ملتی ہو، یا نہ ملتی ہو لیکن دوسرا جزء یعنی گاہے بدشنامے خلعت دہند کی عملی مثال ان ہی عباسی خلفاء کی زندگی میں نظر آتی ہے اور ان ہی ذمی طبیبوں کے متعلق نظر آئی ہے، اسی طیفوری خاندان کا ایک طبیب اسرائیل بن زکریا بھی تھا۔ خلیفہ متوکل کے وزیر اعظم فتح بن خاقان کا طبیب خاص تھا، لکھا ہے کہ تنخواہ اور انعام کی شکل میں وزیر اعظم لاکھوں روپے کا سلوک اسرائیل کے ساتھ کیا کرتا تھا، وزیر کے اشارے سے شاہی دربار میں بھی اسرائیل کی آمد و رفت شروع ہوئی، متوکل بھی اس کا حد سے زیادہ معتقد ہو گیا تھا، اسرائیل بیمار پڑتا، تو بہ نفس نفیس اس کی عیادت کے لیے خود اس کے گھر جاتا۔

طبقات ہی میں ہے کہ ایک دفعہ تو یہ صورت پیش آئی کہ اسرائیل مرض کے شدید حملہ کی وجہ سے متوکل کے سامنے بیہوش ہو گیا، اس وقت دیکھا گیا کہ اپنے اس ذمی طبیب کے سر کے نیچے بطور تکیہ متوکل اپنے ہاتھ کو ڈالے بیٹھا ہے اور اپنے وزیر فتح بن خاقان سے اپنے قلبی تعلق کا جو اس ذمی طبیب سے اسے ہو گیا تھا، اس کا اظہار ان الفاظ میں کر رہا تھا:

''اگر اسرائیل مر گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہ سکتا، میری جان اب اس کی جان کے ساتھ لٹک کر رہ گئی ہے''۔ (۶۰)

کہنا یہ ہے کہ متوکل نے ایک دفعہ اسرائیل سے مشورہ لیے بغیر پچھنا لے لیا، اسرائیل جب آیا اور اس واقعہ کی خبر ملی تو بیان کیا ہے کہ غصہ سے بھر گیا اور اس وقت تک غصہ میں تمتماتا رہا جب تک کہ متوکل نے اپنے قصور کی معافی چاہتے ہوئے تین ہزار اشرفیوں کے ساتھ ایک مسلم گاؤں کا وثیقہ اپنے دستخط کر کے اسرائیل کے آگے پیش نہ کیا، لکھا ہے کہ گاؤں جو قصور کی معافی کے سلسلہ میں اس ذمی طبیب کی جاگیر میں

Marfat.com

خلیفہ نے دیا تھا اس کی سالانہ آمدنی پچاس ہزار روپیہ تھی۔(۶۱)

لوگ پڑھتے نہیں ہیں یا پڑھتے ہیں تو سوچتے نہیں، ورنہ ذمی رعایا کے ان طبیبوں کی شان و شوکت، ثروت و دولت کے قصے کیا کوئی چھپی ڈھکی بات تھی۔ اسی طیفوری خاندان کے طبیب اسرائیل بن زکریا کے حال میں ابن ابی اصیبعہ نے بعض تاریخی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''جب اسرائیل سے متوکل مانوس ہو گیا تو اسرائیل ترقی کرتے ہوئے اس درجہ تک پہنچ گیا کہ جس وقت اسرائیل اپنے گھر سے نکلتا تھا تو اس کی سواری بغداد کے بازاروں میں اسی شان سے نکلتی تھی، جس شان سے بڑے بڑے نامور اور فوج کے ممتاز ترین افسر اور سپہ سالار نکلا کرتے تھے''۔(۶۲)

آگے بیان کیا ہے کہ

''اسرائیل کے موکب کا حال یہ تھا کہ آگے آگے ہاتھوں میں کوڑے اور تازیانے لیے ہوئے سوار اور پیادے ہوتے''۔(۶۳)

بغداد کے بعد جیسا کہ معلوم ہے، عباسیوں نے اپنا دوسرا دارالخلافہ سر من راء کو قرار دیا تھا، جسے آج کل لوگ سامرہ کہتے ہیں، اسرائیل کے لیے متوکل نے جب چاہا کہ سر من راء میں اس کے محل کے لیے کسی زمین کا انتخاب کرے، تو اپنے شاہی اسٹاف کے دو اہم ارکان صقلات اور ابن نجیری کو حکم دیا کہ اسرائیل کے ساتھ سر من راء کا دورہ کریں اور جو جگہ پسند آ جائے خواہ وہ کہیں ہو اسی کو اسرائیل کے لیے مختص کر دیں۔ اسرائیل نے جس جگہ کو پسند کیا، فوراً ان دونوں نے اس پر ستون قائم کر دیا اور تین لاکھ درم تعمیر مکان کے لیے اسی وقت اسرائیل کے سپرد کر دیئے۔(۶۴)

اب میں کیا عرض کروں، کہنے والے کہتے کہ مسلمانوں کی غیر مسلم ذمی رعایا، اسیر اور غلامی کی زندگی بسر کرتی تھی، دیکھ رہے ہیں آپ غلاموں کے ٹھاٹھ باٹھ کو،

Marfat.com

اور اسرائیل کی کیا کوئی استثنائی نظیر ہے۔ اس وقت تک میں نے بعض ... جو حالات بیان کیے ہیں کیا یہ غلاموں کے حالات ہوتے ہیں، اسی کتاب طبقات الاطباء میں چوتھی صدی ہجری کے ایک عیسائی طبیب جس کا نام ابوالخیر الحسن بن سوار بن بابا بن نہیام تھا، اور عام طور پر ابن الخمار کے نام سے مشہور تھا، ابن ابی اصیبعہ اس کی تصریح کرتے ہوئے کہ:

"کان هذا ابو الخیر الحسن نصرانیا "(۶۵)

"یہ ابوالخیر الحسن عیسائی تھا"

آگے اس کے علم و فضل کی تعریف کرتے ہوئے اور یہ لکھتے ہوئے کہ سریانی زبان سے اس نے بہت سی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں، یہ بیان کیا ہے۔

"فاذا دعاه السلطان رکب الیه فی زی الملوک و العظماء، حتی انه ربما حجبه فی هذا الحال ثلثمائة غلام ترکی بالخیول الجیاد و الهیئة البهیه "(۶۶)

"جب اس کو بادشاہ (محمود شاہ سلجوقی) بلاتا تھا، تو ملوک اور امراء کے لباس میں نکلتا، بسا اوقات دیکھا گیا کہ اس کی سواری میں تین سو ترکی غلام بہترین گھوڑوں پر بہترین لباس میں سوار آگے پیچھے سے اسے گھیرے ہوئے ہیں"۔

یہ ہیں مسلمانوں کی حکومت کے ذمی جن کی غلامی کا ڈھنڈورا پیٹا گیا ہے۔ تین تین سو غلاموں کے جھرمٹ میں جن ذمیوں کی سواریاں مسلمانوں کے شہروں میں نکلا کرتی تھیں آج باور کرایا جا رہا ہے کہ وہی غلاموں کی زندگی بسر کرتے تھے، بھلا جن کے غلام بھی بہترین ترکی گھوڑوں پر پرتکلف لباس میں باہر نکلتے تھے، ان ہی ذمیوں کے متعلق غلامی کے تصور کی بھی گنجائش ہے۔

اور مسلمانوں کی تاریخ کی کیا یہ کوئی استثنائی مثالیں ہیں جو کچھ آپ سن چکے

ہیں ، استثناء وشذوذ کے دعوی کی تردید کے لیے وہی کافی ہیں ، مگر میں تو اس سے بھی آگے بڑھنا چاہتا ہوں ، دیکھئے عباسیوں کا خلیفہ ہارون الرشید ہے ، روئے زمین کا اپنے عہد میں سب سے بڑا طاقتور حکمران اگر اسے نہ مانا جائے تو اتنی بات بہر حال تسلیم کرنی پڑے گی کہ اپنے محروسہ کا وہ مطلق العنان فرمانروا ضرور تھا۔ سنیئے تاریخ کی شہادت جبرئیل بن بخت یشوع اس کے دربار کا مشہور عیسائی طبیب ہے ، طبقات الاطباء میں ہے کہ رفتہ رفتہ ہارون الرشید نے اسی ذمی کے متعلق یہ اعلان کر رکھا تھا کہ :

''کل من کانت له الیّ حاجة فلیخاطب بها جبریل لانی افعل کل ما یسألنی فیه و یطلبه منی'' (٦٧)

''جس کسی کو مجھ سے کوئی ضرورت ہو چاہیے کہ اپنی اس ضرورت میں وہ جبرئیل سے خطاب کرے ، کیونکہ میں نے یہ طے کرلیا ہے کہ جبرئیل مجھ سے جو کچھ بھی چاہے گا ، اور مانگے گا میں وہی کر کے رہوں گا''۔

لیجیے اب تک تو آپ نے مسلمانوں کی ذمی رعایا کو اپنے غلاموں کے درمیان ان کے شہروں میں نکلتے دیکھا تھا ، لیکن ہارون الرشید کے اس شاہی فرمان نے جبرئیل کو اقتدار و اختیار کے کس مقام تک پہنچا دیا ، ابن ابی اصیبعہ کی اسی روایت کے آخر میں ہے کہ :

''فکان القواد یقصدونه فی کل امورهم'' (٦٨)

''(ہارونی فوج) کے سپہ سالار جبرئیل ہی کی طرف اپنے سارے معاملات میں رجوع کرتے تھے''۔

بڑے بڑے مسلمان سپہ سالار اور فوجی آفیسر بھی اسی ''ذمی جبرئیل'' کے دست نگر ہو گئے تھے اور قواد یعنی فوجی افسروں کا ذکر تو مثالاً کیا گیا ہے ، ورنہ ہارون نے جب طے ہی کر دیا تھا کہ جبرئیل کے توسط کے بغیر میں کسی کی کچھ سنوں ہی گا نہیں ،

Marfat.com

اور جو کچھ جبرئیل کا فیصلہ ہوگا، اسی کو نافذ کروں گا، تو مسلمانوں کے بڑے ہوں یا چھوٹے ایسا کون ان میں باقی رہا ہوگا جسے جبرئیل کی ڈیوڑھی کی حاضری پر مجبور نہ ہونا پڑا ہوگا۔ اور ممالک محروسہ عباسیہ کے مسلمانوں کی یہ دست نگری کیا ہارونی عہد تک محدود ہے۔ سنیے تاریخ کی شہادت اسی کتاب میں ہے کہ مامون الرشید جب امین اپنے بھائی کو شکست دینے کے بعد خلافت عباسی کا وارث ہوا تو ابتدا میں جبرئیل اور مامون کے تعلقات مختلف شبہات کی وجہ سے کچھ اچھے نہ تھے، لیکن غلط فہمیوں کا جب ازالہ ہوگیا تو ابن ابی اصیبعہ کے الفاظ میں:

"اکرمه زیادة علی ما کان ابوه یکرمه" (۶۹)

"جبرئیل کی عزت مامون نے اپنے باپ کے زمانہ سے بھی زیادہ بڑھا دی"

لکھا ہے کہ اس کے بعد تو مامونی عہد میں یہ دستور ہی نافذ ہوگیا کہ:

"کل من تقلد عملا لا یخرج الی عمله الا بعد ان یلقی جبرئیل" (۷۰)

"جس کسی کا تقرر بارگاہِ خلافت سے ہوتا تھا، وہ اپنے عہدہ کا جائزہ اس وقت تک نہیں لے سکتا تھا جب تک جبرئیل سے نہ مل لیتا"۔

گویا سارے تقررات جبرئیل ہی کے اشارۂ چشم وابرو کے رہینِ منت تھے۔

جنہوں نے مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ عباسیوں کے عروج واقبال کا نقطۂ کمال ہارونی و مامونی عہد ہے۔ دوسرے لفظوں میں مذکورہ بالا شہادتوں کا مطب بجز اس کے اور کیا ہوا کہ عباسیوں کے شاداب ترین عہد میں مسلمانوں کی حکومت کی باگ ان کی حکومت کے ایک ذمی رعیت ہی کے ہاتھ میں تھی۔ سیاہ وسفید کا مالک ایک حیثیت سے گویا وہی تھا بلکہ سچ یہ ہے کہ دیالمہ کے زیر اقتدار آجانے سے پہلے جبرئیل بن بختیشوع (ع) کا عباسی خلافت پر غیر معمولی اقتدار

مسلسل قائم رہا، طبقات کی اسی روایت میں ہے کہ مامون الرشید جبرئیل سے اس حد تک متاثر تھا:

''کان عند المامون مثل ابیه''(۷۱)

''مامون کے پاس جبرئیل کی حیثیت گویا مامون کے باپ کی سی ہوگئی تھی''۔

یہ جبرئیل ہی کی خصوصیت تھی کہ سارے امراء و وزراء کے مقابلہ میں اس کو بجائے نام کے مامون اسکی کنیت ابوعیسیٰ کے ساتھ مخاطب کرتا تھا، عربی دستور اور عباسیوں کے دربار کے رسم و رواج سے جو واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ کنیت کے ساتھ خلیفہ کی طرف سے خطاب کوئی معمولی بات نہ تھی۔ شاید سر اور لارڈ کے الفاظ میں بھی وہ زور اور قوت نہیں ہے جو کنیت کے ساتھ خطاب میں پایا جاتا تھا۔

ذمی رعایا کا اعزاز مسلمانوں کے دورِ حکومت میں صرف خشک نہیں تھا؟ کہ شمس العلماء کا خطاب بھی زیادہ سے زیادہ خطاب پانے والوں کو حکومت کی طرف سے ساڑھے چار آنہ روز کا مستحق بنا دیتا تھا۔

آیئے اور دیکھیے، اسی جبریل کے بیٹے بخت یشوع طبیب کا گھر ہے، متوکل کے زمانہ میں اس نے بھی وہ سب کچھ حاصل کرلیا تھا، جو اس کے آباء و اجداد کو میسر آچکے تھے، بلکہ ترقی کر کے بخت یشوع اس منزل تک پہنچ گیا تھا کہ:

''کان یضاهی المتوکل فی اللباس والفرش''(۷۲)

''خلیفہ متوکل جس قسم کا لباس پہنتا تھا اور فرش و فروش استعمال کرتا تھا، وہی لباس اور فرش بخت یشوع بھی استعمال کرتا تھا''۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ بخت یشوع کے جس محل سرا کی تکلیف اس وقت آپ کو دے رہا ہوں شاید اس کو دیکھ کر آپ فیصلہ پر اپنے آپ کو مجبور پائیں گے کہ مسلمانوں کے خلیفہ متوکل کو یہ باتیں نصیب تھیں یا نہیں۔

Marfat.com

ابن ابی اصیبعہ نے ابوالاصبع الکاتب کے حوالہ سے اس قصہ کو نقل کیا ہے،
لکھا ہے کہ ابوالاصبع کاتب بیان کرتا تھا کہ میں ایک دن بخت یشوع کے دولت خانے پر حاضر ہوا، گرمی شباب پر تھی، میں نے بخت یشوع کو ایک ایسے کمرے میں پایا جس پر خس کی متعدد ٹہنیاں چڑھی ہوئی تھیں اور اسی کمرے کے اندر قبہ میں وہ بیٹھا ہوا تھا جس پر دیبا کے پردے پڑے ہوئے تھے، جن کو عرق گلاب، کافور صندل سے بسایا گیا تھا، خود وہ ایک سعیدی جبہ پہنے ہوئے تھا، جس پر ایک بیش قیمت دوشالہ پڑا ہوا تھا۔

راوی کا بیان ہے کہ جب میں بھی اس قبہ میں داخل ہوا جس میں بخت یشوع بیٹھا ہوا تھا تو اچانک میں نے محسوس کیا کہ مجھے سخت سردی نے پکڑ لیا، میرے حال کو دیکھ کر بخت یشوع ہنسنے لگا اور غلام کو آواز دی کہ مجھ پر چادر ڈال دی جائے، اور جبہ مجھے پہنا دیا جائے، پھر اس نے غلام سے کہا کہ قبہ کے سامنے جو پردہ پڑا ہوا ہے، اسے اٹھا دو، اٹھا دیا گیا میں نے دیکھا کہ اس ایوان کے چاروں طرف غلام گردش کی عمارت برف سے اٹی ہوئی ہے اور بہت سے غلام برف کے تودے پر مسلسل پنکھے کر رہے ہیں اور ان کے اسی عمل سے سرد ہو ہو کر ہوا اس قبہ میں داخل ہو رہی ہے، جس میں بخت یشوع بیٹھا ہوا تھا، پھر بخت یشوع نے خاصہ طلب کیا، مائدہ (خوان) چن دیا گیا، مشکل ہی سے کوئی اچھی چیز ہوگی، جو اس خوان پر نہ تھی۔ اس کے ساتھ پلیٹوں پر بھنے ہوئے چوزے بھی لائے گئے جن کے گوشت کا رنگ بالکل سرخ تھا، پھر باورچی آیا اور اس نے ان مسلم چوزوں کو توڑ کر ہم لوگوں کے سامنے کر دیا۔ وہ کچھ اس طرح پکائے گئے تھے کہ ان کا ہر دھڑ دوسرے دھڑ سے بآسانی الگ ہو گیا، چوزوں کی پلیٹ کی طرف اشارہ کر کے راوی کہتا ہے کہ بخت یشوع نے کہنا شروع کیا کہ:

Marfat.com

''ان چوزوں کو بادام اسپغول کا دانہ کھلایا گیا ہے اور پانی کی جگہ ان کو انار کا افشردہ عرق پلا کر پالا گیا ہے''۔ (۷۳)

یہ داستان تو گرمی کے موسم کی تھی، سردیوں کے موسم میں بھی یہی ابوالاصبع کاتب بخت یشوع کے یہاں ایک دفعہ پہنچا، دیکھا کہ محل سرا کے ایک بالا خانہ پر بیٹھا ہوا ہے جس کے سامنے ایک پر رونق تر و تازہ باغ تھا، خود اپنے اوپر وہ سمور کا کوٹ ڈالے ہوئے تھا اور چاروں طرف بھاری بھاری ریشمی پردے اور چرمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ سامنے چاندی کی انگیٹھی دھری تھی، جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا اور ایک غلام مسلسل انگیٹھی میں عود کی لکڑی کے تراشے جھونکتا جاتا تھا۔ جب ابوالاصبع بھی بالا خانے کے اس کمرہ میں داخل ہوا تو خلاف دستور غیر معمولی گرمی اسے محسوس ہوئی، بخت یشوع نے کہا کہ اس سخت سرد موسم میں اس گرمی پر تمہیں تعجب ہو رہا ہوگا، پھر اس نے پردے کو ایک طرف سے ہٹا دیا میں نے دیکھا کہ لکڑی کے کٹ گھروں کے اندر آہنی جالی دار پنجروں میں انگیٹھیاں سلگ رہی ہیں، جن میں کچے کوئلے پڑے ہوئے ہیں اور بہت سے غلام ہیں جو ان ہی انگیٹھیوں کو بھاتیوں سے ہوا دے رہے ہیں۔ جیسے لوہاروں کی بھٹیوں میں بھاتیوں سے ہوا دی جاتی ہے۔ پھر حسب دستور بخت یشوع نے خاصہ طلب کیا، دوسرے لطیف کھانوں کے ساتھ اس دفعہ بھی پلیٹوں میں مسلم پکے ہوئے چوزے آئے مگر اب دیکھا کہ بجائے سرخی کے ان کے گوشت کا رنگ بالکل سفید ہے، راوی کا بیان ہے کہ یہ دیکھ کر مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ شاید پورے طور پر یہ پکائے بھی نہیں گئے ہیں۔ طبیعت میں بے کیفی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اتنے میں باورچی آ گیا اور مسلم چوزوں کو جیسے اس نے پہلے بھی الگ الگ کر دیا تھا اس دفعہ بھی یہی کیا، میں نے دیکھا کہ بآسانی جیسے پہلے سب الگ الگ ہو گئے تھے اب کی بھی یہی ہوا، موسم سرما کی رعایت سے ان چوزوں کی

پرورش جن خاص چیزوں سے کی گئی تھی، بخت یشوع نے ان الفاظ میں اس کو بیان کیا:

''چھلے ہوئے اخروٹ ان چوزوں کو کھلائے گئے اور بجائے پانی کے دہی ان کو پلایا گیا ہے''۔ (۷۴)

یہ ہے نقشہ مسلمانوں کی ذمی رعایا کی زندگی کا جن کے متعلق پھیلا دیا گیا ہے کہ غلامی کی رسوا کن زندگی کے سوا ان کی قسمت میں اور کچھ نہ تھا، میں تو نہیں جانتا کہ غریب متوکل کے دارالخلافہ میں بھی گرمیوں اور سردیوں کے موسم یہ ٹھاٹ ہوتا ہوگا۔

اسی ابو الاصبع کاتب کا بیان ہے کہ بخت یشوع کا دستور تھا کہ امراء کے ہاں بطور تحفہ کے بخور میں جلائی جانے والی چیزیں تقسیم کیا کرتا تھا، مگر کس شان کے ساتھ، ایک صندوق میں تو بخورات ہوتے تھے اور اسی کے ساتھ دوسرے صندوق میں کچے کوئلے بھی بھیجے جاتے تھے، جو درخت ترنج، بید اور انگور کی خش بیل کی لکڑیوں سے تیار کیے جاتے تھے، کوئلہ بنانے کے لیے خوشبودار درختوں کی خوشبودار لکڑیوں کو جلاتے تھے، تو پرانی شراب کے ساتھ عرق گلاب، مشک، کافور، عرق بید مشک کو شریک کر کے آمیزہ تیار کیا جاتا تھا اور جلنے کے وقت مسلسل اسی آمیزہ کا عرق لکڑیوں پر چھڑکا جاتا تھا۔ بخت یشوع کہا کرتا تھا کہ بغیر ان کوئلوں کے صرف بخور کی تقسیم مجھے پسند نہیں کیونکہ معمولی کوئلہ استعمال کر کے بخور کی قیمت بھی ضائع ہو جاتی ہے۔ (۷۵)

بہر حال اسی داستان کو میں کتنا طول دوں، کہنا یہی ہے کہ کوئلے جیسی معمولی چیز کی تیاریوں میں ان غیر معمولی تکلفات اور نزاکت مآبیوں سے کام لیتے تھے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دولت وثروت، عیش وعشرت میں ان کا کیا مقام ہوگا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس قسم کی تاریخی شہادتوں کے بعد کوئی وجہ نہیں معلوم

Marfat.com

ہوتی ہے کہ ان لوگوں کی روایات میں شک کیا جائے ، جن میں ان غیر مسلم اطباء کی آمدنیوں کے غیر معمولی اعداد و شمار کا تذکرہ کیا گیا ہے ۔ مثلاً فیون ترجمان کے حوالہ سے طبقات الاطباء میں جبرئیل بن بخت یشوع کی آمدنی کے سیاہہ کی جو نقل پائی جاتی ہے ، لکھا ہے کہ جبرئیل کے گھر سے یہ سیاہہ برآمد ہوا تھا اور اس پر اس کے دستخط ثبت تھے ۔

جبرئیل نے جیسا کہ معلوم ہو چکا ہارون الرشید اور مامون الرشید ، عباسیوں کے ان دونوں نامور خلفاء کی خدمت کا شرف اس کو حاصل ہوا ہے ۔ ہارون الرشید کے زمانہ میں جو آمدنی اس کو ہوئی تھی ، فقط اسی کی تفصیل اس سیاہہ میں درج تھی ، لکھا تھا کہ ۲۳ سال ہارون کی خدمت میں رہنے کا موقع مجھے ملا ۔

اس عرصہ میں مختلف مدوں سے جو آمدنی جبرئیل کو ہوئی اس کی تفصیل سیاہہ میں یہ تھی

مد	رقم
عام تنخواہ	دوملین ساٹھ ہزار چھ سو درم
انعام	ایک ملین اسی ہزار تین سو درم
نوروز کا انعام	ایک ملین پچاس ہزار ایک سو درم
لباس کے لیے	ایک ملین پچاس ہزار ایک سو درم
کرسمس کی عیدی	ایک ملین پچاس ہزار درم
شعاتین کی عیدی میں خلعت کی قیمت	دوملین تیس ہزار درم
عید الفطر کی عیدی	ایک ملین پچاس ہزار ایک سو درم
فصد جو سال میں دو دفعہ ہارون لیا کرتا تھا ، اس کا انعام	دوملین تیس ہزار درم

Marfat.com

جلاب بھی دو سال میں دو دفعہ   دو ملین تیس ہزار درم

خلیفہ لیتا تھا اس کا انعام

اس کے سوا بھی بارگاہِ خلافت کے دوسرے وابستوں سے جو رقوم ۲۳ سال کی ہارونی حکومت کے دور میں جبرئیل کی جیب میں پہنچی، ان کی تعداد اس سیاہہ کے رو سے نو (۹) ملین دو لاکھ درم ہے۔ علاوہ اس کے خاندانِ برامکہ سے جو رقمیں اس کو ملیں ان کی تعداد بیس ملین چار لاکھ درم تھی، نیز خود اس کی جائداد اور اراضی جو جندسابور، سوس، بصرہ، سواد وغیرہ میں تھی، ہارون کے زمانے تک ان کی آمدنی کی میزان اٹھارہ ملین چار لاکھ درم ہوتی ہے اور قصہ ان ہی رقوم تک محدود نہ تھا لکھا ہے کہ یہ جو کچھ ہے:

"سوی الصلات بحسام فانها لم تذکر فی هذالمدرج"(۷۶)

''خلافت ووزارت و امارت کے اقتدار رکھنے والوں کی طرف سے بیش قرار انعام واکرام کے رقوم کا ذکر اس سیاہہ میں نہیں کیا گیا ہے''۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس کی شخصی آمدنی کا یہ پیمانہ ہو، میرے لیے جس کا سمجھنا اور روپیہ کی شکل میں لا کر اس کی مجموعی تعداد کا بتانا دشوار ہے، اس کے مصارف کا کیا حال ہوگا۔ جبرئیل نے مرنے کے وقت اپنی ساری دولت اپنے لڑکے بخت یشوع کے نام وصیت کی اور خلیفہ مامون الرشید کو وصی بنایا تھا، لکھا ہے کہ:

"فسلمها الیه و لم یتعرض فی شیٔ منها"(۷۷)

''مامون نے حسب وصیت ساری دولت جبرئیل کی بخت یشوع تک پہنچا دی اور کسی چیز سے اس نے تعرض نہیں کیا''۔

بخت یشوع کی زندگی کے نقشہ کی ایک جھلک گذر چکی۔ گرمیوں میں سردیوں کی کیفیت اور سردی کے موسم میں موسم گرما کا ماحول اپنے محل سرا میں وہ جس

Marfat.com

طریقہ سے پیدا کرتا تھا، یا اس کے چوزوں کو جو خوراک دی جاتی تھی یہ اسی موروثی دولت کی گرمی کا نتیجہ تھا۔ ایک موقعہ پر اسی کتاب میں اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ بخت یشوع کو پرندوں کے پالنے کا بہت شوق تھا، اسی شوق کے تحت لکھا ہے کہ:

''کان فی دارہ طیر من الطیطویات و الحصانیات و البیضانیات وما یجری مجراھا''(۷۸)

''اس کے محل میں طوطی اور حصانیات و بیضانیات اور اسی طرح کے بہت سے پرندے تھے''۔

واللہ اعلم حصانیات اور بیضانیات اس زمانہ میں کس قسم کے پرندوں کو کہتے تھے۔

متوکل کے زمانہ میں بخت یشوع کی دولت اور اس کے گھر کے ساز و سامان کا جائزہ لیا گیا تھا۔ لکھا ہے کہ اس کے توشک خانہ سے جو کپڑے برآمد ہوئے تھے ان میں:

''دیبا کی ان شلواروں کی تعداد جو سینیزی سراویل کہلاتے تھے، چار ہزار تھی، ہر شلوار میں آرمینیہ کے بنے ہوئے ریشمی ازار بند پڑے ہوئے تھے''(۷۹)

اس کے باورچی خانہ سے لکڑیاں اور کوئلے وغیرہ جو نکلے، ان کی قیمت ہزار ہا اشرفیوں سے لگائی گئی، یہ صحیح ہے کہ عیسائی طبیبوں کے اس خاص خاندان کو عباسیوں کے عہد میں جو غیر معمولی منافع پہنچے، ان پر ہم دوسرے غیر مسلم اطباء کی آمدنیوں کو قیاس نہیں کر سکتے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ عباسیوں کے دوسرے خلیفہ ابو جعفر منصور کے زمانہ میں جورجس جو اس خاندان کا مورث اعلیٰ تھا، بلایا گیا، یعنی دوسری صدی ہجری کے نصف اول میں عباسی خلافت سے جورجس کا تعلق پیدا ہوا، اس کے بعد مسلسل اس خاندان میں ایک کے بعد ایک پانچویں صدی کا نصف ختم ہو رہا تھا، اس وقت تک کسی نہ کسی شخصیت کو ہم مسلمانوں کے ممالک میں

Marfat.com

نمایاں حیثیت کا مالک دیکھتے ہیں ۔ آخری طبیب اس عیسائی خاندان کا ابوسعید عبیداللہ تھا۔ وفات اس کی ۴۵۰ھ کے قریب قریب کسی سال میں ہوئی، نام اس کا اگرچہ بظاہر مسلمانوں کا معلوم ہوتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اپنی عیسائیت کو اس خاندان نے آخر وقت تک باقی رکھا۔ اسی آخری آدمی ابوسعید عبیداللہ کے متعلق بھی طبقات میں لکھا ہے کہ:

''کان جیدا المعرفة بعلم النصاریٰ و مذاھبھم''(۸۰)

''عیسائیوں کے علم اور ان کے مذاہب کے متعلق اس کی واقفیت بہت اچھی ہے''۔

جس سے معلوم ہوا کہ صرف عیسائی نہ تھا بلکہ عیسائی مذہب کا ممتاز عالم بھی یہ ابوسعید عبیداللہ تھا اس کا پورا نسب نامہ یہ درج کیا جاتا ہے، یعنی عبیداللہ بن جبرئیل بن عبیداللہ بن بخت یشوع بن جبرئیل ابن بخت یشوع بن جورجس، گویا ذمیوں کا یہ خاندان اپنے عباسی سرپرستوں کے اقتدار و اختیار کے آخری ایام تک عزت و ثروت کی زندگی مسلسل گذارتا رہا، بلکہ بغداد کی خلافت جب صرف لفظی خلافت سے زیادہ باقی نہ رہی تو دوسرے سربرآوردہ مسلمان خاندانوں نے اس کی کوشش کی کہ ذمیوں کا یہ گھرانا اپنے موروثی وقار کو باقی رکھے جس کی تفصیل کی گنجائش اس مختصر مقالہ میں اب نظر نہیں آتی ۔

کچھ بھی ہو، جورجس کے خاندان کی خصوصیتوں کا مجھے انکار نہیں ہے۔ مگر آپ اب تک جو کچھ پڑھ چکے ہیں کیا وہی معلومات اس کے لیے کافی نہیں ہیں کہ غیر مسلم یا ذمی اقوام کے جن طبیبوں کو مسلمانوں کی حکومت میں عیش و آرام، عزت و احترام کے ساتھ زندگی گذارنے کے وسیع مواقع حاصل ہوئے وہ یقیناً اسی خاندان کی حد تک محدود نہ تھے۔ اس سلسلے میں قبل اس کے کہ میں کچھ اور عرض کروں، بار بار دل میں ایک خیال جو آرہا ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کی طرف اشارہ کر دیا جائے، ممکن

Marfat.com

ہے کہ دوسروں کو بھی وہی خیال کچھ ستا رہا ہو۔

مطلب یہ ہے کہ مروانی وعباسی دونوں حکومتوں کے عہد میں صرف ان ذمیوں کے ساتھ جو طبابت اور علاج معالجہ کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے ان کے ساتھ مسلمانوں کی حکومت اور مسلمانوں کے برتاؤ کا سرسری تماشا تاریخی شہادتوں کی روشنی میں آپ کر چکے اور میں عرض کر چکا ہوں کہ اس طرز عمل کی حوصلہ افزائی عہد نبوت اور خلافتِ راشدہ کی ان روایات سے ہو رہی تھی، جو غیر مسلم اطباء کے متعلق مسلمانوں میں منتقل ہوتے چلے آ رہے تھے۔ اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ مسلمان حکمرانوں پر تنقید کرنے والوں کا ایک طبقہ ہر زمانہ میں پایا گیا ہے۔ محدثین، فقہاء، صوفیاء، اور اسی قسم کے مذہبی نمائندوں میں ایسے نڈر افراد مروانیوں کے دور میں اور عباسیوں کے زمانہ میں بھی ہمیں مسلسل اسلامی تاریخ میں ملتے ہیں جو کسی چیز کی پروا کیے بغیر بڑے سے بڑے باجبروت سلاطین اور خلفاء یا ان کے ولاۃ و امراء کو بے جھجک ڈانٹ دیتے تھے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ذمیوں کے متعلق بجائے کسی زجر و توبیخ کے عموماً اسی قسم کی چیزیں ہمیں ملتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ذمیوں کے حقوق کی حفاظت و حمایت ہی کا وعظ لوگوں کو سنایا جا رہا ہے۔ یہی ہارون الرشید ہے جس کے دربار کے ذمی طبیب جبرئیل کے متعلق آپ سن چکے کہ اس نے یہ اعلان کر رکھا تھا کہ جس کی جو ضرورت ہو وہ جبرئیل کے توسط سے میرے سامنے پیش کرے اور مامون الرشید تو اس کو اپنے پدر مہربان ہی کا رتبہ بخشے ہوئے تھا، لیکن بایں ہمہ قاضی ابو یوسف کو ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی کتاب الخراج میں ہارون الرشید کو نصیحت کرتے ہیں تو یہ کرتے ہیں۔ ان کے بجنسہ الفاظ یہ ہیں:

"یا امیر المؤمنین ایدک اللہ ان تتقدم فی الرفق باھل ذمۃ نبیک و ابن عمک محمد ﷺ والتفقدلھم حتی لا یظلموا و لا یوذوا و لا

یکلفوا فوق طاقتهم ولا یوخذ شی من اموالهم الا بحق یجب علیهم ''(۸۱)

''امیر المومنین! خدا آپ کی مدد کرے، آپ نے مہربانی کرنے میں ان لوگوں کی طرف پیش قدمی فرمائی جن کی ذمہ داری آپ کے پیغمبر اور آپ کے چچا کے بیٹے محمد رسول ﷺ نے لی ہے۔ چاہیے کہ ان کی خبر گیری میں سرگرمی دکھائیے تاکہ ظلم سے بھی وہ محفوظ رہیں اور کوئی ان کو دکھ بھی نہ پہنچا سکے اور برداشت سے زیادہ ان پر کوئی بار نہ ڈالے اور ان کے مال سے غیر قانونی طور پر لینے کی کوئی جرأت نہ کرے''۔

پھر ہارون کو رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث قاضی ابو یوسف نے یاد دلائی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

''جن سے ذمہ داری کا عہد قائم ہو چکا (ان ذمیوں) پر جو ظلم کرے گا، یا برداشت سے زیادہ ان پر بار ڈالے گا، میں قیامت کے دن اس کا فریق مخالف (حجیج) بنوں گا''۔ (۸۲)

انہوں نے اسی کے ساتھ ہارون کو عمر فاروقؓ کی آخری وصیت وفات کے وقت جو کی تھی، وہ بھی یاد دلائی ہے، یعنی:

''ذمی رعایا کے ساتھ جو معاہدہ کیا جائے اسے پورا کیا جائے اور ان پر کوئی قوم اگر حملہ کرے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ ان کو بچانے کے لیے حملہ کرنے والوں سے جنگ کریں اور برداشت سے زیادہ بار ان پر نہ ڈالا جائے''۔ (۸۳)

اسی آخری وصیت کو ادا کرتے ہوئے عمر فاروقؓ نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ ان ذمیوں کی ذمہ داری خود رسول اللہ ﷺ نے لی ہے، اس لیے ہر اس شخص کو جو میرے بعد میرا جانشین ہو، میں وصیت کرتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری کو

Marfat.com

پورا کرے۔

قاضی ابو یوسف نے دوسرے بزرگوں کے اقوال و اعمال کا بھی اس موقعہ پر ذکر کیا ہے جن سے ذمیوں کے حقوق کی نزاکت کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے۔

بہر حال اس وقت ان حقوق کی تفصیل میرے سامنے نہیں ہے، جو اسلام میں رعایا کے اس طبقہ کو دیئے گئے ہیں، معارف ہی میں ایک مستقل مقالہ اس عنوان پر خاکسار ہی کا لکھا ہوا پہلے شائع بھی ہو چکا ہے، بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ہارون الرشید جو ذمی اطباء کے ساتھ وہ سب کچھ کر رہا تھا، جس کی داستان آپ سن چکے، تو اس سے چشم پوشی اختیار کر کے ان ہی ذمیوں کے حقوق کی حفاظت کی طرف ہارون کو وہ کیوں للکار رہے ہیں۔ اور وہی کہا، جہاں تک اسلامیات اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ فقیر نے کیا ہے، باوجود تلاش کے آج تک کوئی چیز ایسی نہیں ملی جس سے معلوم ہوتا ہو کہ حکمرانوں پر تنقید کے سلسلہ میں کبھی اس پر بھی کسی نے اعتراض کیا ہو، جو ان ذمی اطباء کے ساتھ مسلمانوں کی رائی اور رعایا دونوں طبقوں کے لوگ قائم کیے ہوئے تھے۔ اور مسلسل ان تعلقات کو جاری رکھتے ہوئے چلے آرہے تھے، زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ میں کوئی بات اگر ملی تو دوسری صدی کے امام، امام شافعیؒ کا وہ قول ہے، جس کا ذکر آغاز مضمون میں آیا تھا۔ یعنی مسلمانوں سے امام کو شکایت تھی کہ علم کا ایک تہائی حصہ انہوں نے غیر مسلم اقوام کے سپرد کر رکھا ہے لیکن جیسا کہ ظاہر ہے کہ اس تنقید کی نوعیت بھی مذہبی تنقید کی نہیں ہے بلکہ اپنے ایک ملی احساس کا اظہار امام نے فرمایا ہے۔ ایک کمال سے اپنی قوم کو وہ خالی پا رہے تھے، چاہتے تھے کہ اس کمال میں وہ بھی حصہ لیں، حالانکہ مسلمانوں کے اس طرزِ عمل میں مذہبی مطالبہ سے لاپروائی کا کوئی شائبہ بھی پایا جاتا تو یقیناً امام جیسی صاف گو جری شخصیت اغماض اور چشم پوشی سے قطعاً کام نہ لیتی۔

اوّل سے آخر تک ذمی اطباء کے مذکور تعلقات پر اکابر اسلام کی اس طویل خاموشی یا سکوتی اجماع، بلکہ برعکس اس کے ذمیوں کے حقوق کی نگہداشت اور حفاظت پر بزرگوں کا اصرار اور مبالغہ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہ کے بعض جزئیات کا خیال آتا ہے جو ہماری کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً لباس، وضع قطع، الغرض ایسی چیزیں جن کی تعبیر اس زمانہ میں قومی کلچر سے لوگ کرتے ہیں، ان کے متعلق فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ہر قوم کو حکم دیا جائے کہ اپنے قومی یا کلچری خصوصیات کو ترک کر کے مسلمانوں کا کلچر یا وضع قطع اختیار نہ کریں۔ ہم اس مسئلہ کو فقہ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں اور ابھی کچھ دیر پہلے آپ مجھ ہی سے سن چکے کہ اور تو اور متوکل جیسے خلیفہ کے دربار میں بخت یشوع اسی لباس میں داخل ہوتا تھا جو متوکل کا لباس تھا اور متوکل کی مجلس کی آرائش فرش و فروش کے جن سامانوں سے کی جاتی تھی اسی قسم کی چیزوں سے بخت یشوع کا نگارخانہ بھی سجایا جاتا تھا متوکل کے دینی تصلب یا کم از کم اس پر بجائے عقلیت پسند معتزلہ کے اہل السنّت والجماعۃ کے علماء کا جو اثر تھا، اس سے جو واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہر قوم کی قومی خصوصیتوں کی بقاء کی کوشش کا فقہ کی کتابوں میں جو تذکرہ کیا جاتا ہے اگر اس میں کچھ بھی دینی اہمیت ہوتی تو بخت یشوع میں اولاً اس کی جرأت ہی پیدا نہ ہوتی کہ اپنے قومی لباس کو ترک کر کے وہ مسلمانوں کے خلیفہ کا لباس اختیار کرتا، نیز متوکل مانتا یا نہ مانتا لیکن اہل السنّت والجماعۃ کے جن علماء کے زیر اثر متوکل تھا کم از کم وہ بخت یشوع کی اس غیر قانونی جسارت پر ضرور توجہ دلاتے۔ میرے علم میں ایسی کوئی شہادت نہیں ہے، حالانکہ متوکل جن بزرگوں کے مشوروں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا تھا، ان میں امام احمد بن حنبل جیسے حق گو علماء بھی تھے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فقہ کے جن جزئیات کی طرف میں اشارہ

Marfat.com

کر رہا ہوں نہ قرآن کی کسی آیت سے پیدا ہوئے اور نہ رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث کو ہم ان کی بنیاد بنا سکتے ہیں۔ بلکہ اربابِ ذمہ یا ذمی رعایا کے متعلق حدیثوں کا جو ذخیرہ پایا جاتا ہے ان میں برعکس اس کے ذمیوں کے حقوق کی نزاکتوں ہی پر زیادہ اصرار پایا جاتا ہے۔ لباس، وضع وقطع، سواری و راہ روی وغیرہ کے سلسلے کے فقہی جزئیات کی تو بو بھی ان روایتوں میں نہیں پائی جاتی۔ حالانکہ اگر وہ واقعی اسلامی مطالبات ہوتے تو قرآن نہ سہی پیغمبر تو ان کی طرف کچھ اشارہ فرماتے۔ آپ کے کتنے خطوط آج بھی پائے جاتے ہیں جن میں ان ذمیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن کسی خط میں مجھے ایک حرف بھی نہیں ملتا، جس سے ان جزئیات کی ہلکی سی بھی تائید نکلتی ہو، نجران، ہجر، بحرین کے عیسائی اور مجوسی رعایا کے متعلق آنحضرت ﷺ نے ان علاقوں کے حکمرانوں کو لکھا ہے۔ لیکن نہ ان ہی میں اور خیبر کے یہود سے جو معاہدہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، نہ اس میں ان باتوں کا ذکر ملتا ہے۔

بہر حال الکتاب والسنۃ جو اسلامی قوانین کے حقیقی سرچشمے ہیں، نہ صراحۃً ان جزئیات کو ہم ان میں پاتے ہیں، اور نہ قیاسی نتائج کے لیے کوئی بنیاد ان میں ملتی ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ عہد نبوت کے بعد فتوحات کا دائرہ مسلمانوں کے ہاں جب بڑھا اور مختلف علاقوں میں مختلف قوموں نے مختلف [illegible] عمل ان کے ساتھ اختیار کیے تو اس وقت خاص خاص علاقوں یا جتھوں سے کچھ معاہدے ضرور ہوئے۔ بعض معاہدوں میں معاہدہ کرنے والوں کے خاص حالات کے لحاظ سے ان پر کچھ ذمہ داریاں ضرور عائد کی گئی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ یزید بن المہلب مروانی سپہ سالار نے جب طبرستان کو فتح کیا تو طبرستان والوں نے یزید اور یزید کی فوج کو چونکہ کافی اذیت پہنچائی تھی، عہد و پیمان کر کے موقع پاتے ہی مکر جاتے، اور مسلمانوں کو ستاتے، آخر جب پورے طور پر وہ قابو میں آگئے اور فاتح ومفتوح کے درمیان معاہدنامہ جو

Marfat.com

مرتب ہوا اس میں منجملہ عام باتوں کے ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ:

''ہر سال طبرستان کے چار سو آدمی مسلمانوں کے سامنے آئیں گے کہ ان چار سو طبرستانیوں میں سے ہر ایک کے سر پر ایک ڈھال، چاندی کا ایک جام، اور حریر کے غلاف کا ایک تکیہ ہوگا'' (۸۴)

بتایا جائے کہ معاہدہ کے اسی مسودہ کو پیش نظر رکھ کر کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مسلمان جس قوم پر غالب آئیں، ضرور ہے کہ ہر سال اس قوم کے چار سو آدمی سر پر ڈھال، جام نقرئی اور ریشمیں تکیہ لیے ہوئے سلام کو حاضر ہوں۔

بس عہد نبوت کے بعد فتوحات کے سلسلہ میں کسی خاص علاقہ کے باشندوں پر ان کے خاص حالات کے لحاظ سے فوج کے سرداروں نے ایسی ذمہ داریاں اگر عائد بھی کی ہوں، جن کا ذکر نہ الکتاب قرآن میں ہے اور نہ ان کا پتہ رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں میں چلتا ہے، تو ان کو مسلمان حکمرانوں نے بجائے عام قاعدے کے ایک مقامی اور وقتی بات خیال کر لیا ہو اور اس عہد کے صادق و مخلص علماء و صلحاء کے سکوتی اجماع کی تہ میں بھی یہی راز پوشیدہ ہو، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عہد نبوت کے بعض مقامی معاہدوں کے مسودوں کی تاریخی صحت کو اگر مان بھی لیا جائے تو خود مسلمانوں کے اس طرز عمل سے بھی سمجھ میں آتا ہے کہ انہوں نے خالص دین اسلام کا مطالبہ اس کو کبھی نہیں سمجھا۔ بلکہ ایک وقتی مقامی بات تھی، جو اپنے وقت اور مقام ہی کی حد تک محدود رہی۔

مگر کتنی عجیب بات ہے کہ عہد نبوت سے ذمی اطباء کے ساتھ مسلمانوں کے خواص و عوام کے مذکورہ بالا تعلقات کو لوگ کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ ان کا ذکر بھی مختلف حیثیتوں سے تحریراً و تقریراً کرتے رہتے ہیں۔

لیکن جب ذمیوں کا تذکرہ کہیں آجاتا ہے تو صدیوں کی ان مسلسل

Marfat.com

روایات کو بھول جاتے ہیں یا بھول جانے کی کوشش کرتے ہیں اور حافظہ کی سطح پر فقہ کی وہی چندگنی چنی جزئیات بعیدہ تیرنے لگتی ہیں، جن کی بنیاد نہ مسلمانوں کے الکتاب میں پائی جاتی ہے اور نہ السنۃ میں اور یہی فقہی جزئیات جن پر کسی زمانہ میں نہ مسلمانوں کی کسی حکومت نے عمل کیا اور نہ ان پر عمل کرنے کی طرف اسلام کے ائمہ وعلماء نے کبھی توجہ دلائی، نہ خود مسلمانوں کی طرف سے ان پر عمل کرنے کا مطالبہ کیا گیا، وہی حافظے کی سطح سے زبانوں اور قلم کی نوکوں پر پہنچ کر طوفان کی شکل میں ہوا اور کاغذ پر پھیل جاتی ہیں۔

Marfat.com

حواشی

الف ۔ ﴿فبھدا ھم اقتدہ﴾ (الانعام/۹۰)

﴿یھدیکم سنن الذین من قبلکم﴾ (النساء/۲۶)

''ان گذشتہ پیغمبروں کی پیروی کرو، تاکہ تمہاری راہ نمائی ان لوگوں کے طریقوں کی طرف خدا کرے جو تم سے پہلے تھے''

یہ اور اسی قسم کی بے شمار آیتوں میں پیغمبروں کی امتِ مسلمہ کو خطاب کر کے جیسا کہ ظاہر ہے یہی بتایا گیا ہے کہ کسی نئی راہ و رسم کی تعلیم نہیں، بلکہ اصولاً انہی باتوں کی تجدید و تر و تازگی یا جو بھلا دی گئی ہیں ان کی یاد دہانی اسلام کے جدید پیغام سے مقصود ہے، جن سے پیدا کرنے والا نسل انسانی کو ہر زمانہ اور ملک میں مطلع کر رہا ہے اور ان کی پابندی کا مطالبہ کیا ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں کے ساتھ حکمرانی کے اسلامی ضابطہ کا بھی یہی حال ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ مذہب کے نام سے نہ سہی قانون و آئین کے عنوان سے آج دنیا کی اکثر حکومتوں کی بنیاد میں وہی چیزیں نظر آتی ہیں جن کا مطالبہ مسلمان حکمرانوں سے اسلام نے کیا ہے۔ موروثی طور پر قوموں میں یہ باتیں منتقل چلی آ رہی ہیں۔ انسانی جان و مال، عزت و آبرو کے احترام کا کون منکر ہے، ظلم و تعدی استحصال، بے جا لوٹ کھسوٹ کو دنیا کی کون سی حکومت جائز رکھتی ہے، گویا غیر شعوری طور پر آج بھی حکومتوں کی اکثریت ان ہی بنیادوں پر قائم ہے جن پر اسلامی یا الٰہی حکومت کو قائم ہونا چاہیے۔ بنیادی کلیات کو مان لینے کے بعد ان کے تفریعی جزئیاتی قوالب تک لوگوں کو پہنچنا زیادہ دشوار نہیں ہے۔ اور میرا تو خیال ہے کہ اگر تلاش کیا جائے تو اسلام کے جزئیاتی قوالب بھی عموماً معلوم ہوگا کہ نئے نہیں ہیں، چوری کی سزا حد یہ ہے کہ قدیم ہندوستان میں جیسا کہ مہابھارت سے معلوم ہوتا ہے، یہ تھی کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، بلکہ ویاس جی نے یہ کہتے ہوئے کہ یہ پراچین اِتہاس (قدیم تاریخی قصہ) ہے، بیان کیا کہ جو ڈنڈ چور کو ہوتا ہے وہی ڈنڈ مجھے دو، اس درخواست پر راجہ نے حکم دیا کہ ''دونوں ہاتھ کاٹ ڈالو'' (دیکھو مہابھارت شانتی پرب ساتواں ادھیائے) جس سے

Marfat.com

معلوم ہوا کہ پراچین عہد کا یہ قدیم قانون تھا۔

ب۔ تفصیل کے لیے منجملہ اور کتابوں کے خاکسار کی کتاب النبی الخاتم دیکھی جا سکتی ہے، جس میں عہد نبوت میں کام آنے والوں کی فہرست بھی شریک ہے۔

ج۔ مثنوی شریف کے مندرجہ اشعار اگرچہ صاف اور سیدھے ہیں، مگر فارسی سے ناواقفیت بہ تدریج اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ شاید بہت سے لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں اس لیے خلاصہ ان کا درج کر دیا جاتا ہے دیکھنے والوں کو خطاب کر مولانا نے فرمایا ہے کہ

''یہ دیکھ کر کہ جیسے بکری کے بچے کا چرواہا نظر نہ آیا ہو تم نے اسی حال میں مجھے پا کر یہ خیال کر لیا ہے کہ میرا کوئی محافظ اور نگہبان نہیں ہے، ہرن کو تم دیکھ رہے ہو کہ اس کا چرواہا تو کوئی نہیں ہے، تم نے یہ سمجھ لیا کہ مفت یہ قیدی ہاتھ آ جائے گا، مگر یاد رکھو! کہ تمہیں نظر آئے یا نہ نظر آئے بہر حال، مینڈھے اور بکری کے بچوں سے ہم کم نہیں ہیں، یعنی جیسے ان جانوروں کے پیچھے پیچھے بہر حال چوہان اور رکھوالا بھی ہوتا ہے ہم بھی ایک رکھوالا اور اپنا پاسبان رکھتے ہیں، یہ پاسبان ہمارا وہی ہے جسے صحیح معنوں میں دنیا کی بادشاہت سزاوار ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے یعنی کہ اس ہوا کو بھی جو ہم پر چل رہی ہے جانتا ہے کہ وہ گرم ہے یا سرد۔ پس یاد رکھو! کہ ہمارا یہ نگہبان نہ غافل ہے اور نہ غائب، ہاں شرک کی جھلی کی وجہ سے تمہاری ایمانی بینائی کو وہ نظر نہیں آ رہا ہے، تم بیمار ہو''۔

د۔ بظاہر اس کا مطلب اس زمانہ کے مذاق کے مطابق جس میں امام شافعی تھے، یہی معلوم ہوتا ہے کہ علم الادیان، علم الابدان، علم اللسان یعنی ادب ولغت ان ہی تین علوم کو اہمیت دی جاتی تھی، خود امام شافعی نے علم کی ان تینوں قسموں میں کمال پیدا کیا تھا۔ علم الادیان اور علم اللسان میں ان کا جو پایہ تھا اس سے تو دنیا واقف ہے، لیکن طب کے ساتھ امام کے تعلق کی گویا عام شہرت نہیں ہے، مگر لکھا ہے کہ اس علم میں ان کی غیر معمولی دستگاہ کا یہ عالم تھا کہ مصر جب پہنچے تو بقراط کی کتابیں مصر کے بعض اطباء نے ان سے پڑھنے کی خواہش کی۔ (دیکھو، توالی التاسیس، ص ۶۶، ابن حجر عسقلانی، تلاش بسیار کے بعد بھی کتاب میسر نہیں آئی) (از محقق)

ھ۔ غیر قوموں کے ساتھ میل جول کے ان ہی نمونوں کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام جب عرب

Marfat.com

سے باہر نکلے تو اس علاقے کی زبانوں کو بھی انہوں نے سیکھا اور ان کے مفید رسم و رواج کو اختیار کیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ جو صحابہ میں امام المحدثین سمجھے جاتے ہیں، خطیب بغداد نے تاریخ بغداد میں مشہور محدث ابراہیم حزلی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ کان ابو هریره یکلم صبیانه و اهله بالنبطیه ابو ہریرہ اپنے بچوں اور اپنے گھر کے لوگوں سے نبطی زبان میں گفتگو کرتے تھے (تاریخ بغداد، ۳۶/۵، خطیب بغدادی، احمد بن علی، مصر، مطبع السعادۃ، ۱۹۳۱ء) عراق کے سواد یہاتی علاقہ میں جو زبان بولی جاتی تھی، وہ فارسی اور عربی کی کچھ ملی جلی شکل تھی، اس زبان کا نام نبطی تھا، اس سلسلہ میں صحابہ کے متعلق دلچسپ معلومات کتابوں میں ملتی ہیں، بلکہ تاریخ خمیس کی مندرجہ بالا روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جبرئیل نے فارسی زبان سکھلائی۔ (تاریخ خمیس، ۳۵۳/۱، الدیار بکری، حسین بن محمد، بیروت، دار صادر، س، ن)

و۔ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبا میں پہلے نام کا اور تاریخ الحکما میں قفطی نے دوسرے نام کا ذکر کیا ہے۔

ملاحظہ ہو،

۱۔ طبقات الطبا، ۱۰۴/۱، ابن ابی اصیبعہ، احمد بن القاسم، مصر، مطبع الوھبیہ، ۱۲۹۹ھ

۲۔ اخبار الحکماء، ص ۲۳۳، قفطی، جمال الدین یوسف، مصر، مطبع السعادہ، ۱۳۲۶ھ

غیر عربی ناموں کے متعلق عربوں میں اس قسم کا اختلاف پیدا ہو جانا محل تعجب نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کے نام کو آج یورپ والے کن کن شکلوں میں بگاڑ رہے ہیں اسی پر قیاس کر لیجیے

ز۔ اس بات پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ موجودہ دور میں حرمین شریفین میں غیر مسلموں کے داخلے پر سخت پابندی ہے تو اس زمانے میں اس کی اجازت کیسے دی گئی تھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حرم مکی اور مسجد الحرام میں کفار کے داخل ہونے کے بارے میں ائمہ اربعہ کی آراء مختلف ہیں۔

امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک حرم مکی کے اندر کفار کا داخلہ بالکل ممنوع ہے۔ البتہ ان کے ہاں اگر کوئی ضرورت درپیش ہو تو مسجد الحرام کے علاوہ کسی اور مسجد میں کفار داخل ہو سکتے ہیں۔ مالکیہ کا یہ کہنا ہے کہ مسجد الحرام میں تو کفار کا داخلہ ممنوع ہے البتہ حرم مکی کے

Marfat.com

اندر وہ لوگ اجازت یا امان حاصل کر کے کسی ضرورت کے تحت داخل ہو سکتے ہیں۔ (حرم اس علاقہ کو کہتے ہیں جہاں سے حجاج احرام باندھ کر داخل ہوتے ہیں۔ اس جگہ سے آگے بغیر احرام کے داخلہ ممنوع ہوتا ہے۔ یہ کافی وسیع حدود ہے۔ جبکہ مسجد الحرام خاص اس مسجد کو کہتے ہیں جہاں بیت اللہ واقع ہے)۔

حنفیہ اس معاملے میں وسیع النظر ہیں۔ ان کے ہاں کفار تمام مساجد بشمول مسجد الحرام ومسجد النبوی میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے نہ تو مسلمانوں کی اجازت ضروری ہے اور نہ ہی کسی ضرورت کا ہونا شرط ہے۔

اب اس تفصیل کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس دور میں شاید حکومت کا قانون بھی یہی ہو کہ کفار حرم مکی میں داخل ہو سکتے ہیں۔

مذاہب کی تفصیل اور ان کے دلائل کے لیے ملاحظہ ہو۔

۱۔ مغنی المحتاج، ۴/ ۲۴۶، شربینی، محمد الخطیب، مصر، مطبع مصطفیٰ البابی، ۱۹۵۸ء

۲۔ احکام القرآن، ۲/ ۷۰، ۶۹، ۴۹، ابن عربی، محمد بن عبداللہ، بیروت، دار الفکر ۱۴۰۸ھ

۳۔ المغنی، ۱۳/ ۴۸ ـ ۲۴۵، ابن قدامہ، عبداللہ بن احمد، ریاض، دار عالم الکتب، ۱۴۱۹ھ

۴۔ احکام القرآن، ۱/ ۲۸۱ ـ ۲۷۸ جصاص، احمد بن علی، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۲ھ

۵۔ شرح السیر الکبیر، ۱/ ۹۶، السرخسی، محمد بن احمد، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۷ھ

ح۔ حرام چیزوں سے دواء استفادہ یا ان کا کھانا جائز ہے یا نہیں امام ابو حنیفہؒ کا فتوی اس باب میں یہ نقل کیا جاتا ہے کہ جب تک اطباء صحت کو اسی دوا کے استعمال کے ساتھ محدود نہ کر دیں اس وقت تک ان کا استعمال جائز نہ ہوگا۔ یعنی اس حرام کا بدل حلال دوا اگر مل سکتی ہے تو اس وقت تک حرام دوا کو استعمال نہ کرنا چاہیے لیکن دوسرے ائمہ کا فتوی ہے کہ بدل ملے یا نہ ملے، دواءً حرام چیزوں کا استعمال حرام ہی نہیں ہے، تفصیل کے لیے فقہ کی مطولات کا مطالعہ کیا جائے۔ عجیب بات یہ ہے کہ امام شافعی کا نام بھی ثانی الذکر طبقہ میں لیا جاتا ہے یعنی دواءً حرام چیزوں کا استعمال جائز ہو جاتا ہے، مگر الدمیری نے حیات الحیوان میں نقل کیا ہے کہ جس تریاق میں سانپ ڈالا گیا ہو، امام شافعی اس کے کھانے کی اجازت اس وقت تک نہیں دیتے تھے، جب تک کہ اضطرار

Marfat.com

کی حالت نہ پیدا ہو جائے جس میں قرآن نے مردار کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔ (حیات الحیوان (مترجم)، ۱/۸۰۱، الدمیری، کمال الدین، مترجم، مولانا محمد عباس فتح پوری، لاہور ادارہ اسلامیات، ۱۴۱۲ھ)

ط۔ میرا اشارہ سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف ہے۔

ی۔ عہد نبوت و رسالت میں نسلی وطنی سوالات کوئی اگر اٹھاتا تو آواز بلند ہوتی تھی،

دعوه فانها كلمة منتنه (اس کو چھوڑو یہ بدبودار بات ہے)

ک۔ آگے جو قصہ ابوالحکم نے بیان کیا ہے وہ بڑا دردناک ہے، لکھا ہے کہ اسی عرصہ میں عبدالملک کا ولی عہد ولید بھی اسی کمرے میں داخل ہوا، اور باپ سے حال پوچھنے لگا، مگر جس انداز سے مزاج پرسی کر رہا تھا، عبدالملک نے تاڑ لیا، یعنی اپنی بادشاہی کا خواب اس کے مرنے کے بعد دیکھ رہا ہے۔ عبدالملک کی زبان پر بے ساختہ یہ شعر جاری ہوا، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ

''ایک شخص میرا حال دریافت کر رہا ہے اور چاہ رہا ہے کہ میں مر جاؤں، دوسری طرف کچھ عورتیں (لڑکیاں) مزاج پرسی کر رہی ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں''۔ (طبقات الاطباء، ۱/۱۱۹)

ل۔ صرف قیاس سے میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں، طبقات الاطباء ہی میں ابوسہل نوبخت ایرانی طبیب کے ذکر میں لکھا ہے کہ خلیفہ منصور کے پاس پہلی دفعہ جب ابوسہل پیش ہوا تو نام پوچھنے پر اس نے اپنا اصل ایرانی نام بتاتے ہوئے کہا کہ میرا نام خرخشاذ ماہ طیما ذاہ، ماذ ریاد، خسرو، اظمشاذ ہے اس طویل نام کو سن کر منصور مسکرایا پھر کہا کہ تمہارے باپ نے تو عجب تماشا کیا ہے اب یہی صورت ہے کہ ان تمام الفاظ میں سے طیماذاہ کے لفظ کو میں چن لیتا ہوں، اسی نام سے تم کو موسوم کیا جائے گا اور جی چاہے تو اپنی کنیت ابوسہل رکھ لو۔ ابوسہل نے دوسری صورت کو سہل قرار دیا اور بعد کو ابوسہل کے نام سے مشہور ہوا جس سے معلوم ہوا کہ عربی کنیت ان عیسائی یا یہودی طبیبوں کی مسلمانوں کی طرف سے رکھی جاتی تھی۔ (اخبار الحکماء، ص ۲۶۶-۶۷)

م۔ اگر یہ واقعہ ہے جیسا کہ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں نقل کیا ہے کہ بعضوں نے

Marfat.com

حجاج کو دستر خوان پر کھاتے ہوئے پایا، جتنے لقمے اٹھاتا تھا، انہیں وہ گن رہے تھے، بیان کرتے تھے کہ مسلم ایک روٹی میں ایک کفِ دست مکھن بھرتا اور نگلتا جاتا تھا، اس طرح (۸۴) لقمے میں نے اس کے گنے۔ غالباً تیاذوق کی دواؤں نے اس کے معدے میں ہضم کی یہ غیر معمولی قوت پیدا کر دی تھی، (دیکھو تاریخ دمشق، ۲/۵ ۷، ابن عساکر، علی بن حسین، مطبعہ روضۃ الشام، ۱۳۳۲ھ) طبقات الاطباء میں ایک لطیفہ یہ نقل کیا ہے کہ تیاذوق سے حجاج نے کچھ ضعف معدہ کی شکایت کی، اس نے مشورہ دیا کہ بھنے ہوئے پستے سامنے رکھ لیجیے اور ایک ایک دانہ توڑ توڑ کر بطور نقل کے استعمال کیجئے۔ حجاج نے درباریوں سے کہا کہ بھنے ہوئے پستوں کے استعمال کا مشورہ آج تیاذوق نے مجھے دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مختلف درباریوں کے گھر سے بھنے ہوئے پستوں کے خوان کے نازل ہونے لگے۔ حجاج نے بھی مٹھیوں میں بھر بھر کر پھانکنا شروع کیا اور اتنا کھا گیا کہ بدہضمی ہوگئی۔ تیاذوق بلایا گیا، حجاج نے کہا کہ یہ کیا ہوا؟ بولا کہ اے امیر! میں نے تو عرض کیا تھا کہ دانہ دانہ کر کے اسے چکھئے آپ نے تو پھانکنا شروع کیا۔ حجاج شرمندہ ہوگیا۔ پھر علاج معالجہ سے طبیعت درست ہوگئی۔ (طبقات الاطباء، ۱/۱۲۲)

ن۔ عام تاریخوں میں یزید بن الولید مروانی فرمانروا کی طرف عربی کا یہ شعر منسوب کیا گیا ہے کہ وہ کہا کرتا تھا

انا ابن کسری و ابی مروان　　　و قیصر جدی و جدی خاقان

(مروج الذہب، ۳/۱۷۳، مسعودی، علی بن حسین، مصر، مطبع الحلبی، ۱۳۰۳ھ)

اسی کا ترجمہ درج کیا گیا ہے، کہتے کہ یزید بن الولید کی ماں جس کا نام ساریہ بنت فیروز تھا، کہتے ہیں کہ اس میں واقعی ایران کے کسریٰ روم کے قیصر ترکوں کے خاقان کا خون شریک تھا۔

س۔ قرص کا لفظ اصل عبارت میں ہے غالباً گلاب کی پتیوں کو دوسری دواؤں کے ساتھ ملا کر قرص بنایا جاتا تھا۔

ع۔ جندسابور کا صدر بیمارستان جورجس جو ابوجعفر کے زمانہ میں بغداد جیسا کہ گذر چکا بلایا گیا تھا اسی کا بیٹا بخت یشوع تھا لکھا ہے کہ بخت یشوع کے معنی عبدالمسیح ہیں۔

Marfat.com

بخت کا ترجمہ عبد اور یشوع عیسیٰ علیہ السلام کے نام کا ایک تلفظ ہے، مسلسل نسلاً بعد نسل اس خاندان نے عباسی حکومت میں جاہ وجلال کی زندگی بسر کی۔

حوالہ جات

۱۔ اسد الغابہ، ۴/۲۹۷، ابن اثیر، مبارک بن محمد، بیروت، دار احیاء التراث العربی، س ن

۲۔ ایضاً، ۴/۲۳۳

۳۔ تاریخ فیروز شاہی، ۱/۲۱۷، برنی، ضیاء الدین، کلکتہ، ۱۸۶۲ء

۴۔ محولہ بالا — ۵۔ یوسف/۳۹

۶۔ یوسف/۳۸ — ۷۔ النجم/۳۹

۸۔ النساء/۷ — ۹۔ النحل/۱۱۸

۱۰۔ احیاء العلوم، ۱/۳۲، الغزالی، ابو حامد محمد، بیروت، دار الخیر، ۱۴۱۷ھ

۱۱۔ توالی التاسیس، ص ۶۶ (یہ کتاب میسر نہیں آئی) (از محقق)

۱۲۔ تاریخ خمیس، ۱/۳۵۳، الدیار بکری، حسین بن محمد، بیروت، دار صادر، س ن

۱۳۔ حاشیۃ الجامع الصحیح، ۱/۳۰۱، بخاری، محمد بن اسماعیل، محشی احمد علی محدث سہارنپوری، کراچی قدیمی کتب خانہ، س ن

۱۴۔ محولہ بالا — ۱۵۔ محولہ بالا

۱۶۔ الاصابہ، ۱/۲۸۸، ابن حجر، احمد بن علی، مصر، مطبع السعادہ، ۱۳۲۸ھ

۱۷۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۱۰، ابن ابی اصیبعہ، احمد بن القاسم، مصر، مطبع الوھبیہ، ۱۲۹۹ھ

۱۸۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطب، باب فی تمرۃ العجوۃ: ۳۸۷۵، ابو داؤد، سلیمان بن اشعث بیروت، دار الجیل، ۱۹۹۲ء

۱۹۔ الاصابہ، ۱/۲۸۸ — ۲۰۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۰۴

۲۱۔ طبقات الاطباء، ۱/۲۳۲ — ۲۲۔ محولہ بالا

۲۳۔ محولہ بالا — ۲۴۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۱۹

Marfat.com

۲۵۔ الطبقات الکبریٰ، ۵/۳۶۵، ابن سعد محمد بن سعد، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۹۹۷ء
۲۶۔ محولہ بالا
۲۷۔ محولہ بالا
۲۸۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۳۰
۲۹۔ محولہ بالا
۳۰۔ محولہ بالا
۳۱۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۶۳
۳۲۔ الطبقات الکبریٰ، ۵/۲۹۲
۳۳۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۱۹
۳۴۔ ایضاً، ۱/۱۲۱
۳۵۔ ایضاً، ۱/۱۲۳
۳۶۔ ایضاً، ۱/۱۲۲
۳۷۔ ایضاً، ۱/۱۲۳
۳۸۔ ایضاً، ۱/۱۶۱
۳۹۔ ایضاً، ۱/۱۶۳
۴۰۔ ایضاً، ۱/۱۶۳
۴۱۔ طبقات الاطباء ۲/۳۲
۴۲۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۶۸
۴۳۔ محولہ بالا
۴۴۔ محولہ بالا
۴۵۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۹۳
۴۶۔ ایضاً، ۱/۱۲۴
۴۷۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۲۵
۴۸۔ محولہ بالا
۴۹۔ محولہ بالا
۵۰۔ محولہ بالا
۵۱۔ محولہ بالا
۵۲۔ محولہ بالا
۵۳۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۷۷
۵۴۔ محولہ بالا
۵۵۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۷۶
۵۶۔ ایضاً، ۱/۱۷۵
۵۷۔ ایضاً، ۱/۱۷۶
۵۸۔ ایضاً، ۱/۱۷۸
۵۹۔ ایضاً، ۱/۱۷۵
۶۰۔ ایضاً، ۱/۱۵۸
۶۱۔ ایضاً، ۱/۱۵۷
۶۲۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۵۸
۶۳۔ محولہ بالا
۶۴۔ محولہ بالا
۶۵۔ طبقات الاطباء، ۱/۳۲۲
۶۶۔ محولہ بالا
۶۷۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۲۸
۶۸۔ محولہ بالا
۶۹۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۲۹
۷۰۔ محولہ بالا
۷۱۔ محولہ بالا

۷۲۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۴۴

۷۳۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۴۵

۷۴۔ محولہ بالا

۷۵۔ محولہ بالا

۷۶۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۳۷

۷۷۔ محولہ بالا

۷۸۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۴۳

۷۹۔ ایضاً، ۱/۱۴۱

۸۰۔ طبقات الاطباء، ۱/۱۴۷

۸۱۔ کتاب الخراج، ص ۱۲۵، ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، مصر، مطبعہ میریہ، ۱۳۱۲ھ

۸۲۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والفئی والامارۃ، باب فی تعشیر اهل الذمہ ۳۰۵۲، ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، بیروت، مکتبہ دار الجیل، ۱۹۹۲ء

۸۳۔ کتاب الخراج، ص ۱۲۵

۸۴۔ کتاب البلدان، ص ۳۰۸، الھمدانی، ابن الفقیہ، احمد بن محمد، لیدن، مطبع بریل، ۱۳۰۲ھ

Marfat.com

مسلمانوں کا اندلس

خود مسلمانوں کی نگاہ میں

مشہور اندلسی کہیے، یا یورپین صوفی شیخ محی الدین بن عربی پڑھے لکھے مسلمانوں میں تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ کافی سرگردانیوں کے باوجود ان کے مخالفین بھی شیخ کی علمی وسعت نظر کی دقت کے بہرحال معترف ہیں۔

ہمارے مخدوم ومحترم مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی ناظم علمی دارالمصنفین (اعظم گڑھ) ومدیر معارف کا اصرار ہے کہ شیخ ابن عربی کے متعلق معارف میں مقالات کا سلسلہ خاکسار شروع کرے، اپنے اصرار کو تیز سے تیز تر کرتے ہوئے آخر میں تو شاہ صاحب نے یہاں تک ارقام فرمادیا کہ تو نے لکھا تو لکھا ورنہ پھر کوئی دوسرا اس موضوع پر لکھنے والا نظر نہیں آتا۔ ایک حوصلہ افزا حسن ظن کے سوا ظاہر ہے کہ اس کو اور کیا قرار دیا جاسکتا ہے، فوق کل ذی علم علیم کی قرانی حقیقت کا اقتضا بھی یہی ہے اور سچی بات بھی یہی ہے کہ لکھنا چاہیں تو اب بھی اس فقیر سے کہیں بہتر طریقہ سے اس مضمون کو مرتب کر کے پیش کرنے والے پیش کر سکتے ہیں۔

مگر ایک ''صابری چشتی فقیر'' کے لیے یہ بھی تو آسان نہ تھا کہ اپنے مخدوم (۱) ہی نہیں بلکہ جو جانتے ہیں کہ ہندوستان کے طریقہ چشتیہ صابریہ کے ایک رکن رکین صاحب رودولی شریف سیدنا شیخ احمد عبدالحق قدس اللہ سرہ العزیز بھی ہیں اور ہمارے شاہ معین الدین صاحب کو اسی آستانہ رودولی شریف کی صاحبزادگی کا بجا فخر حاصل ہے۔ اس لحاظ سے مخدوم ہونے کے ساتھ ہی وہ ہماری مخدوم زادے بھی تو ہیں۔ اپنے مخدوم اور اپنے مخدوم زادے کے حکم سے سرتابی کی کوئی شکل نظر نہ آئی۔ اللہ کے نام سے قلم کو ہاتھ میں لیتا ہوں۔ شاید بزرگوں کی روحانیت سے تائید کی راہ میری یہی نیت مجھ پر کھول دے۔ وللہ الامر والتوفیق. شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کچھ

....

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں نومبر ودسمبر ۱۹۵۳ء کو تین اقساط میں شائع ہوا۔

Marfat.com

عرض کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوا کہ ان کے مولد و منشاء اندلس کی تاریخ کا وہ رخ پیش کر دیا جائے جس سے میرا خیال بھی ہے کہ شیخ اور شیخ کی خصوصیات کے سمجھنے میں کافی مدد پڑھنے والوں کو ان شاء اللہ ملے گی، اسی لیے پہلا مقالہ ''اندلس'' پر لکھ کر حاضر کیا جاتا ہے۔

والامر بیدہ سبحانہ تعالیٰ

مناظر احسن گیلانی

واقعہ یہ ہے کہ ایک اندلس اور ہسپانیہ تو وہ ہے جس سے دلچسپی ہی نہیں بلکہ شاید عشق کی کیفیت مسلمانوں کے قلوب میں انیسویں صدی سے یورپ کے مؤرخوں، اخباروں، صحافیوں اور ان کے قصاصوں افسانہ نگاروں تک نے اس زمانے کے بعد پیدا کرنا شروع کیا، جب مشرق پر اپنے تسلط کے چنگلوں کو مغرب پوری قوت کے ساتھ جما چکا تھا۔ گویا یہ ایک دستور بنا لیا گیا ہے کہ پہلے اندلس میں مسلمانوں کے جبروت و جلال، عروج و اقبال کی قصیدہ خوانی اتنے دل آویز میٹھے سروں میں کرنے والے کرتے ہیں اور ان قصوں کو اس بلند آہنگیوں کے ساتھ سناتے ہیں کہ سننے والوں پر ایک قسم کی محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ ان ہی ذرائع سے مسلمانوں کے دلوں میں اندلس کے عشق کی ایسی آگ بھڑکا دی گئی ہے کہ شاید گلبرگہ، بیجاپور، احمد نگر، گول گنڈہ، جونپور، احمد آباد، برہان پور، شادی آباد، مانڈو وغیرہ ہندوستان کے مقامی عاصمات (کیپیٹل) ہی نہیں بلکہ اندلس کے قرطبہ و غرناطہ کے مقابلہ میں، دمشق و بغداد، فسطاط، شیراز، رے اور نیشاپور، غزنی، دلی، آگرہ، قاہرہ، مراکش، فارس، تیونس، اصفہان، و اسلامبول تک کے تاریخی ارتسامات تک اندلس کی اس آگ میں ڈر ہے کہ کہیں جل کر بھسم نہ ہو جائیں۔ اسپین کے قصر الحمراء اور الزہراء کی یاد ہمارے دلوں میں جو ہوک یا ٹیس پیدا کرتی ہے، شاید لال قلعہ اور تاج محل کے

Marfat.com

الفاظ میں بھی یہ اثر ہم اپنے اندر نہیں پاتے۔ خصوصاً مسلمانوں کا طبقہ منورہ جو سب کچھ یورپ ہی کی آنکھوں سے دیکھنے اور ان ہی کے کانوں سے سننے کا عادی بنایا جا چکا ہے۔ اس کا حال تو اس باب میں قابل رحم حد تک پہنچ چکا ہے۔ خلش تبش، قلق اور سوز کی جو کیفیتیں اندلس کے ذکر سے ان کے اندر پیدا ہوتی ہیں ان کا اندازہ کچھ مشاہدہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ میرے ایک مرحوم کرم فرما بزرگ (ب) نے تو اپنی ساری عمر ہی اس علمی مہم کے سر کرنے میں صرف فرما دی کہ اندلس کا صحیح جغرافیہ کیا ہے۔ اس ملک کے شہروں، قصبوں، بلکہ دیہاتوں، دریاؤں، ندیوں، نالوں، پہاڑوں کے نام مسلمانوں کے عہد میں کیا تھے۔ ان ناموں کو کس طرح بگاڑا گیا ہے، یا بدلا گیا ہے وہ صبح و شام اسی گورکھ دھندے میں بسر فرماتے تھے۔ ان کا خیال شاید یہ تھا کہ اسلام کا نہ سہی لیکن مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ ان کا ایک قومی اور ملی فرض ہے جسے وہ ادا کر رہے ہیں۔

پہلے ایک طرف عشق کا الاؤ جوڑا جاتا ہے اس کے بعد پھر یورپ کے یہی اخبار یئے اور صحافیے، کہانیاں سنانے والے مختلف بھیسوں میں آتے ہیں اور جب مسلمانوں کو اندلس سے نکالا گیا اور اس ملک کو ان کے وجود سے جب خالی کیا گیا اس وقت وہی رو رو کر بین اور نوحہ کرتے تھے اور نکالنے والوں کو برا بھلا کہتے ہوئے داستانوں کا ایک سلسلہ مرثیہ کے رنگ میں سناتے ہیں۔ کاٹے گئے، مارے گئے، زندہ جلا دیئے گئے، سمندر میں ڈبوئے گئے اور ان مسلمانوں کی لاکھوں لاکھ کی تعداد بتائی جاتی ہے جن کیساتھ ان ہی مرثیہ خوانوں کے بھائی بندوں نے ان ہی کے قول کے مطابق وہ سب کچھ کیا جس کی توقع شاید جنگل کے خون خوار درندوں سے بھی نہیں کی جا سکتی۔ خوفناک حزن انگیز اور بھیانک لہجوں میں مسلمانوں کی بربادیوں کا افسانہ بھی سنایا جاتا ہے۔ پھر ان کے محل سراؤں پر مسجدوں پر، کتب خانوں پر جو کچھ

Marfat.com

گذری، اعداد و شمار کے طویل طویل ہندسوں کے ساتھ ان کی روداد بھی پیش کی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سارے معلومات اپنے پوری ہندسی تفصیلات کے ساتھ کن ماخذوں سے حاصل کیے گئے ہیں اور ان مسلمانوں کو اور انکی کتابوں کو کون گن رہا تھا جب ان کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا۔ اپنا حال تو یہ ہے کہ مغربی ذرائع سے پھیلائے ہوئے ان معلومات کو کتابوں میں جب کبھی میں نے پڑھا، یا سنانے والوں سے سنا تو بے ساختہ حافظ کا یہ شعر یاد آ گیا کہ

آفرین بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب　　　کشتۂ غمزہ خود را بہ نماز آمدۂ

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ اپنے اعمال و کردار کے بدترین پہلوؤں پر غلاف دوزی کی شاطرانہ مہارت رکھتے ہوئے بھی یہی یورپ کے مؤرخین اپنی قوم کا سارا کچا چٹھا مسلمانوں کو پڑھ پڑھ کر اپنی عام روش اور عادت کے برعکس کیوں سناتے رہتے ہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اندلس کے معاملہ میں اتنی صاف گوئی اور اتنے کھلے لفظوں میں اپنے جرم کا اعتراف جو کیا جاتا ہے، اس کے واقعی اسباب و وجوہ کیا ہیں اور سنانے والوں کی اندرونی نیت کیا ہے، دل کا حال تو خدا ہی جانتا ہے۔ لیکن جہاں تک دیکھنے میں آتا ہے، اس کا اثر اور کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، مگر ہر مسلمان جو آسمان کے نیچے زمین کے کسی حصہ پر کھڑا ہے اس کے لیے ''اندلس'' کا لفظ انیسویں صدی سے ایک مستقل ''ہول دل'' یا ''ہوا'' بن کر رہ گیا ہے۔ گویا اندلس کا لفظ، لفظ نہیں ایک مضراب ہے جس کی چوٹ پڑتے ہی مسلمانوں کے اعصابی نظام میں لرزہ برپا ہو جاتا ہے۔ ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں، سارے دماغی مخزونات اسی ایک ضرب سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے حافظوں سے نکل نکل کر بہے چلے جاتے ہیں ان کو کچھ یاد نہیں آتا کہ آخر انہی کی تاریخ میں تو بدر کے ساتھ ''احد''، فتح مکہ کے ساتھ ''یوم حنین'' اور اوطاس ''یرموک'' کے ساتھ عمواس (ج) ''میدان قادسیہ''

Marfat.com

کے قریب ''وادی کربلا'' وغیرہ کے حوادث مسلسل یکے بعد دیگرے گذرتے رہے ہیں۔خود ان کے پیغمبر ﷺ دنیا میں تشریف فرما ہی اس شان کے ساتھ ہوئے تھے کہ آپ کے پاس کچھ نہ تھا، پدری شفقتوں کا سایہ پیدا ہونے سے پہلے ہی سر مبارک سے اٹھ چکا تھا، ماں کی مامتا سے بھی استفادہ کا موقع جیسا کہ چاہیے، میسر نہ آیا، دادا کی سرپرستی کا قصہ بھی شروع ہونے کے ساتھ ہی ختم ہوگیا، آٹھ سال کی عمر سے پچیس سال کی عمر تک کا زمانہ جو سیکھنے سکھانے کا ہوتا ہے، بکریوں، بھیڑوں اونٹوں کی رفاقت میں گذرا۔نبوت کے ۲۳ سال کا بھی بڑا حصہ تقریباً تیرہ سال اسی مکہ میں بسر ہوئے، جہاں مسلمانوں کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے بدترین دشمنوں کا سیاسی اقتدار قائم تھا اور باقی دس سال مدینہ منورہ کے سو وہ بھی اس حال میں گذرے کہ مٹھی بھر مسلمانوں کو سارا جاہلی عرب ایک کمان بن کر اپنا ہدف بنائے ہوئے تھا۔یہ کمان ابھی پورے طور پر اتری نہ تھی کہ مدینہ کے یہ دس سال بھی اس طور پر ختم ہوگئے کہ اس زمانہ کی روئے زمین کی سب سے بڑی مرکزی قوتیں رومن امپائر اور پرشین امپائر چاروں طرف سے مسلمانوں کو اپنے گھیرے میں لے کر دھمکا رہی تھیں اور یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ عرب ہی کے صحراء میں ان مسلمانوں کا سرکچل کر رکھ دیا جائے۔یہ وہ تاریخی واقعات ہیں جن کا ظہور قرآنی دعووں کے عملی تجربے کے لیے ہوا تھا اور ہوتا رہتا ہے۔مگر اندلس کے لفظ کا جادو یہ سوچنے کی گنجائش بھی مسلمانون کے دل ودماغ میں باقی نہیں چھوڑتا کہ آخر ان قرآنی حقائق کا اقتضاء کیا ہے، کچھ نہیں، تو قرآن کی آیات له الملك، له ملك السموات والارض، بيده ملكوت كل شىء، وغیرہ میں بیسیوں پیرایہ میں اسی حقیقت کو واشگاف کیا گیا ہے کہ آسمان ہو یا زمین کا کوئی حصہ یا خطہ کسی میں خدا کے راج کے سوا نہ پہلے کبھی کسی کی حکومت قائم ہوئی۔اور نہ آئندہ کسی زمانہ میں قائم ہوسکتی تھی۔قطعاً غیر مشتبہ الفاظ میں اس دینی

عقیدے پر مسلمانوں کو اصرار کرنے پر حکم دیا گیا کہ:

﴿لم یکن له شریک فی الملک﴾(۱)

''خدا کے راج میں اس کا کوئی ساجھی اور شریک نہیں ہے''۔

مگر واہ رے ''اندلس'' کا انجھر کہ جیسے ڈائنامیٹ چیزوں کو اڑا دیتا ہے، ٹھیک اسی طرح اس کے نام' سے مسلمانوں کے دماغ سے بہت کچھ اڑ جاتا ہے۔ خواہ وہ قرآن کے بینات و محکمات ہی کیوں نہ ہوں۔ خدا کے حقیقی صفات سات یا آٹھ ہیں جو ذات حق کے عین ہیں یا غیر یا نہ عین ہیں یا نہ غیر۔ ان مسائل کے کسی ایک پہلو کو متعین کر کے اپنے دینی عقیدوں پر جمنے والی یہ قوم ''اندلس'' کے لفظ کو سن کر قرآن کی ایسی آیتوں کو بھی بھول جاتی ہے جن کے متعلق نہ سلف ہی میں کسی قسم کا اختلاف پیدا ہوا اور نہ خلف میں ایک پہلو کے سوا آج تک کسی دوسرے پہلو میں ان آیتوں کی تفسیر و تشریح میں کوئی گنجائش ہی پیدا نہ ہوئی۔ حالانکہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے کم از کم قرآن کے ان ''بینات'' کی روشنی میں حقیقت اور واقعہ کی جو نوعیت متعین ہوتی ہے، اس کی لاج تو رکھنی چاہیے تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن کی ایسی روشن حقیقتوں سے بھی بے اعتنائی کے بعد ہم مسلمان بھی باقی رہتے ہیں یا نہیں۔ یہ نہ تو فقہ کا کوئی قیاسی مسئلہ تھا، نہ کسی ایسی حدیث کا یہ مفاد ہے جس کی سند کے راویوں پر تنقید کا امکان ہے۔

بہر حال ''اندلس'' سے مسلمانوں کا ناپید ہو جانا تو ایک واقعہ ہے لیکن یہ واقعہ کس طرح پیش آیا، جن حوادث و فاجعات اور ان کے طلسمی اعداد و شمار کے بھالوں، برچھوں، تیروں اور تلواروں سے سج سجا کر پیش کرنے والے اس واقعہ کو مسلمانوں کے آگے پیش کرتے رہتے ہیں کہ آج ان کی بدولت ''اندلس'' کا لفظ ہم مسلمانوں کے لیے ہوا بنا ہوا ہے اور سننے کے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تمام

Marfat.com

وسعتوں کے باوجود خدا کی زمین ہم پر تنگ ہوگئی۔ ہم اس کے متعلق غالب کی زبان میں اگرچہ یہ پوچھنے کا بجا حق رکھتے ہیں کہ

آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

لیکن سوال و جواب کے اس قصہ کو مختصر کرتے ہوئے اس وقت ہم آپ کے علم میں صرف مسلمانوں کے ان معلومات اور احساسات کو لانا چاہتے ہیں جو خود ان ہی کی کتابوں میں اس اندلس کے متعلق پائے جاتے ہیں جس میں وہ کچھ دن رہے اور اب جہاں اسلام کا کوئی نام لیوا نہیں پایا جاتا، ان کی روشنی میں آپ صحیح طور پر شیخ ابن عربی کے اندلس کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کسی ملک میں آباد ہونے کے بعد وہاں سے کلیتہً اس طرح مسلمانوں کا ناپید ہو جانا جو صورت حال اندلس میں پیش آئی، مسلمانوں کی ملی تاریخ کے لحاظ سے بجائے خود ایک عجیب وغریب واقعہ ہے۔ کیونکہ ایشیا و افریقہ کی وسیع سرزمین کا شاید ہی کوئی ایسا بد قسمت حصہ ہوگا جہاں مسلمان آباد نہ ہوئے ہوں اور آج تک کسی حال میں موجود نہ ہوں۔ وہ اپنے ان ہی آبائی اوطان میں اچھے برے ہر حال میں جیسا کہ دنیا کا قاعدہ ہے، پڑے رہے اور آج تک پڑے ہوئے ہیں، وطن بنا لینے کے بعد ان ملکوں میں ان کو بھی وقتاً فوقتاً کبھی خشک سالیوں سے بھی دو چار ہونا اور آئینی زندگی کے ساتھ ساتھ مزاج اور بے آئینی کے حالات کا بھی شکار ہونا پڑا۔ جہاں حاکمیت کے لطف اٹھانے کا موقع ملا، وہاں حاکم بنکر بھی رہے اور محکوم بن کر بھی رہے اور محکوم بننے پر جہاں مجبور ہونا پڑا، وہاں محکومیت کی زندگی پر بھی صبر کیے بیٹھے رہے۔ ایسے ممالک بھی ہیں، جہاں حکومت کی باگ مسلمانوں کے ہاتھوں میں کبھی نہیں آئی۔ مگر آج تک وہاں وہ آباد ہیں اور اسی کو اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ اور شاید کبھی ہلکا سا خطرہ بھی ان علاقوں سے نکل جانے کا ان کے دلوں میں

Marfat.com

پیدا نہیں ہوا۔ لیکن ایک یہی بد بخت اندلس اور اسی کے ملحقہ چند بد نصیب یورپین جزائر ہیں، جہاں سے وہ آباد ہونے کے بعد ناپید ہو گئے۔ یہ عجیب و غریب اتفاقی اور استثنائی صورت جو مسلمانوں کے ملی مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی، کیوں اور کیسے پیش آئی؟

مغربی مؤرخین اس سوال کے جواب میں جو کچھ بھی فرماتے ہوں، لیکن مسلمانوں کی تاریخ سے مجھ پر جو کچھ واضح ہوا ہے وہ یہی ہے کہ فتح کرنے کی حد تک تو پہلی صدی ہجری ہی میں اندلس کو مسلمانوں نے فتح کر لیا تھا۔ یہ ولید بن عبد الملک مروانی حکومت کے دوسرے حکمران کا عہد تھا۔ اتفاق کی بات کہ ولید بھی فتح اندلس کے بعد مر گیا اور ولید کی جگہ سلیمان بن عبد الملک گدی پر بیٹھا اور سات سال بھی گذرے نہ تھے کہ مرکزی حکومت کے دو فرمانرواؤں کی مسلسل موت کی وجہ سے افراتفری کی حالت قدرۃً کچھ ایسی پیدا ہوئی اور ایسا انتشار حکومت میں رونما ہوا کہ اندلس جیسے دور دست علاقہ کے تفصیلی حالات سے واقفیت کا موقعہ جیسا کہ چاہیے تھا نہ مل سکا۔ فوجی حکام کسی نہ کسی طرح اس ملک پر قبضہ جمائے بیٹھے رہے۔ سلیمان کے بعد جب بقیۃ الخلفاء الراشدین حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سریر آرائے حکومت ہوئے تو یہ پہلا موقع تھا کہ ''اندلس'' کے خصوصیات و حالات سے آگاہ ہونے کے لیے اطمینانی وقت ملا۔ تاریخ کی یہ شہادت ہے کہ اس نئے مفتوحہ علاقے سے صحیح واقفیت کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جو فیصلہ کیا تھا وہ کامل ابن اثیر میں بایں الفاظ میں منقول ہے:

''کان رأیہ اقفال اھلھا منھا ''(۲)

''عمر بن عبد العزیزؒ کی رائے تھی کہ اندلس سے مسلمانوں کو واپس بلا لیا جائے''۔

یہ رائے صرف رائے ہی کی حد تک محدود ہو کر نہ رہ گئی تھی بلکہ آگے اسی

Marfat.com

کتاب میں یہ بھی ہے:

"وکان قد بدء العمر فی نقل اهلها عنها"(۳)

''عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانہ میں مسلمانوں کی اندلس سے واپسی کا سلسلہ شروع بھی ہوگیا تھا''۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ سات سو سال بعد اندلس میں جو صورت پیش آئی، خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ کے روشن ضمیر پر اس کا انکشاف فتح اندلس کے سات سال بعد ہی ہو چکا تھا۔ اور یہ کوئی ایسا واقعہ نہ تھا جو اتفاقاً پیش آ گیا تھا، بلکہ عمری بصیرت جس کا اندازہ شروع ہی میں لگا چکی تھی، توقع کے مطابق وہی واقعہ بن کر سامنے آیا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ کہنے کی حد تک اندلس کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے اور جو کچھ کہا جاتا ہے، قطعاً بے بنیاد بھی نہیں ہے، جسے ہم آئندہ بیان کریں گے۔ لیکن علاوہ دوسرے اسباب ووجوہ کے ایک سبب یہ بھی تھا کہ انتہائی اقبال وعروج کے زمانہ میں ''اندلس'' کی خراجی آمدنی خود اسی ملک کے مؤرخ ابن خلدون کے بیان کے مطابق اسی قدر تھی، جس قدر آمدنی عباسیوں کو بن کھیتی والے بیابان یعنی حجاز سے ہوتی تھی۔ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مشہور مقدمہ میں عباسیوں کے زرخیز و سیر حاصل صوبوں کی آمدنیوں کو سرکاری کاغذات کے حوالہ سے درج کرتے ہوئے حجاز کی آمدنی کے بارے میں لکھا ہے:

"الحجاز ثلاثمائة الف دینار "(۴)

''حجاز کی آمدنی تین کروڑ دینار تھی''۔

آگے بیان کیا ہے کہ اس آمدنی کا ایک ثلث یا تہائی حصہ تو فوج پر صرف ہوتا تھا، ایک ثلث حکومت کے مصارف کے لیے مختص تھا، تیسرے ثلث کو اتفاقی حوادث ونوائب کے لیے محفوظ کر دیا جاتا تھا۔

مجھے خرچ سے بحث نہیں بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ خود اندلس میں مستقل حکومت قائم کر لینے کے بعد جیسا کہ کتابوں سے معلوم بھی ہوتا ہے، اس ملک کو آباد اور زرخیز بنانے کے لیے حکومت نے بھی اور عام آباد کار مسلمانوں نے بھی کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا، مگر ان بلیغ کوششوں اور غیر معمولی محنت وسعی کے باوجود اندلس کی خراجی آمدنی حجاز جیسے خشک کوہستانی علاقہ کی آمدنی سے بھی آگے نہ بڑھ سکی (د) تو حضرت عمر بن عبد العزیز نے جس زمانہ میں مسلمانوں کی اس ملک سے واپسی کا فیصلہ کیا تھا، اس وقت اس کی آمدنی اس سے بھی بہت کم رہی ہوگی۔

یہ صحیح ہے کہ اندلس کے جو حالات ہمیں سنائے گئے اور وہاں کے حجازی امیروں کے جن درباروں کا افسانہ آج زبان زد عام ہے۔ بلکہ اب بھی اس ملک میں اندلس کے مسلمانوں کے بچے کھچے جو آثار باقی رہ گئے ہیں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اندلس کی آمدنی کا یہ حجازی بجٹ (ثلثمایة الف دینار) کچھ عجیب وغریب سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جنہوں نے صحیح معنوں میں اندلس کے جغرافیہ کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ زیادہ حصہ اس ملک کا کوہستانوں اور سنگلاخ پتھریلی زمینوں سے بھرا ہوا ہے۔ مسلمانوں کو اس ملک میں زراعت اور باغبانی وغیرہ کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت اسی لیے ہوئی تھی کہ قدرتی طور پر اس ملک کی اراضی میں پیداوار کی بہت کم صلاحیت تھی، اگر مصنوعی ذرائع سے کام نہ لیا جاتا تو مسلمانوں کے لیے اس ملک میں زندگی گذارنی مشکل ہو جاتی۔

موسم کے لحاظ سے اندلس کی حالت اگر چہ وہی ہے، جو اس کے آس پاس کے دوسرے یورپین ممالک کی ہے، تاہم ہوا کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن آب کا تذکرہ کرتے ہوئے ہمارے مؤرخین یہ لکھتے ہیں کہ پایہ تخت قرطبہ میں بھی آب شیریں میسر نہ آتا تھا اور فتح اندلس پر ایک صدی سے زیادہ مدت گذرنے کے

Marfat.com

بعد بنی امیہ کے حکمرانوں میں سے عبدالرحمٰن اوسط نے اپنے دور میں:

"اجلب الماء العذب الی قرطبة و ادخله الیها"(۵)

"قرطبہ تک شیریں پانی کھینچ کر لایا"۔

اور جب دارالسلطنت تک میں پانی کی یہ کیفیت تھی، تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا کہ دوسرے شہروں کا اس باب میں کیا حال ہوگا۔

کچھ اسی قسم کے اسباب تھے جن کا نتیجہ تھا کہ رہنے کی حد تک تو مسلمان اندلس میں مقیم ضرور ہو گئے تھے لیکن ان کا دل اس ملک میں شاید کبھی نہ لگا۔ اور تو اور بنی امیہ کے پہلے اندلسی حکمران عبدالرحمٰن الداخل تک کے متعلق جو خدا ہی جانتا ہے مصائب و آلام کی کتنی کڑیوں کو جھیلتے ہوئے اندلس پہنچ کر اس ملک کا فرمان روا بن چکا تھا۔ تاریخوں میں یہ لطیفہ نقل کیا جاتا کہ زمین کے کسی خاص حصہ کو گھیر کر الرصافہ کے نام سے موسوم کیا تھا، خلاف توقع اس احاطہ میں اتفاقاً کھجور کا ایک پودا دیکھا گیا، عبدالرحمٰن اس پودے کو دیکھ کر بے قرار ہو گیا۔

ایک نظم ہی عبدالرحمٰن کی طرف منسوب کر کے کتابوں میں نقل کی گئی ہے۔

کھجور کے اس اکیلے پودے کو دیکھ کر اس کے دل میں جو جذبات پیدا ہوئے تھے وہ یہ تھے۔

"اے کھجور کے پودے تو بھی اپنے نخلستانی وطن سے اسی طرح جلاوطن ہوا جیسے اندلس کی سرزمین میں جلاوطن ہو کر میں پہنچا ہوں۔ جلاوطنی اور بال بچوں سے جدائی میں ہم دونوں ایک دوسرے کے رفیق و شبیہ ہیں (ھ)"۔(۶)

اور عبدالرحمٰن بے چارے کے لیے تو واقعی اندلس اجنبی ملک تھا، مصر کی بادشاہی کے تخت پر بھی یوسف کو کنعان کے گدائی کے دن یاد آتے ہوں تو اس پر چنداں حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ پانچویں صدی ہجری

Marfat.com

کے مشہور اندلسی محدث و متکلم علامہ ابن حزم جن کی خدا جانے کتنی پشتیں اندلس میں گذر چکی تھیں اور جن کا خاندان وزارت سے تعلق تھا اور جنہوں نے مشرق یا مشرق کے کسی شہر یا مقام کو کبھی نہیں دیکھا تھا اپنی ایک نظم میں جن خیالات کا اظہار اندلس کے متعلق کیا ہے، اس کا پتہ ان کے اس شعر سے چلتا ہے کہ:

انا الشمس فی جو العلوم منیرة　　ولکن عیبی ان مطلعی الغرب (۷)

''یعنی علمی حلقہ کا اگر چہ میں آفتاب ہوں لیکن عیب میرا یہ ہے کہ (بجائے مشرق کے) مغرب کے افق میں سے طلوع ہوا''

گویا اندلس میں پیدا ہونے ہی کو اپنی بدقسمتی خیال کرتے تھے، اس نظم میں تمنا بھی کی ہے:

''ولو اننی من جانب الشرق طالع ''(۷ الف)

''یعنی کاش! مشرق کے افق سے میں طلوع ہوتا''

ان کی پوری نظم معجب میں مراکشی نے نقل کی ہے۔ (۷ ب)

اندلس میں مسلمانوں کی تاریخ کی ابتدا اور انتہا کی ان دونوں شہادتوں کی روشنی میں اس کے سوا اور کیا سمجھ میں آتا ہے کہ اندلس سے دلی لگاؤ کسی زمانہ میں بھی مسلمانوں کو پیدا نہ ہوا۔ حالانکہ اندلس کی قبضہ گیر فوج جو عموماً شام کی فوجی چھاؤنیوں سے یہاں آتی ہے اس کو مانوس بنانے کے لیے لکھا ہے:

''دمشق کے فوجیوں کو بیرہ نامی مقام میں جگہ دی گئی اور نام بیرہ کا دمشق رکھا گیا تھا، اسی طرح حمص کے فوجیوں کو اشبیلیہ میں رہنے کا حکم دیا گیا، اور اسبیلیہ کا نام حمص ہی رکھا گیا تھا، جیان میں قنسرین کی چھاؤنی کے لوگ چونکہ تھے اس لیے اس کا نام قنسرین اور اردن والے جہاں رکھے گئے اس کا نام اردن فلسطین والوں کی جگہ جس کا نام شذونہ تھا، فلسطین ہی رکھ دیا گیا تھا۔ (۸)

Marfat.com

لیکن باوجود ان تدبیروں کے پانچویں صدی تک کے اندلسی مسلمان اسی آرزو میں تڑپتا رہا کہ کاش! میں مشرق کے افق سے طلوع ہوتا۔

آخر یہ بھی تو سوچنے کی بات ہے کہ عباسیوں نے اپنے کو بنی امیہ کے سارے مقبوضات کا جائز وارث کو قرار دیتے ہوئے، صرف ایک اندلس کو کیوں چھوڑ دیا۔ اگر کشش کے اسباب اس ملک میں ہوتے تو عباسیوں کی قوت قاہرہ کا مقابلہ اندلس کے بنی امیہ بھلا کیا کر سکتے تھے۔ جب دمشق کی حکومت ان کی ضرب کی تاب نہ لاسکی۔ بنی امیہ کا جو خانوادہ اندلس میں آکر پناہ گزیں ہو گیا تھا، خود اس کا خیال بھی اندلس کے متعلق بس اس قدر تھا، جس کا اندازہ اسی خاندان کے ایک رکن عبدالملک بن عمرو کے اس قول سے ہوتا ہے جو اس نے کہا تھا:

"طردن من المشرق الی اقصی هذا الصقع و نحسد علی لقمه تبتغی الرمق"(۹)

"ہم مشرق سے کھدیڑے گئے اور اس دور دراز علاقہ میں آکر ہم نے دم لیا ہے مگر لوگ اس لقمہ پر بھی ہم سے حسد کرتے ہیں جس سے صرف سد رمق کا کام لیا جا سکتا ہے"۔

لیکن یہ تو اندلس کا ایک رخ تھا۔ قطع نظر ان امور کے جن کے چرچوں سے کانوں کو بھر دیا گیا ہے۔ خود ہمارے مؤرخین کی کتابوں میں بھی تو یہ سب کچھ لکھا ہوا ہے اور تو اور وہی ابن خلدون جس نے اندلس کے خراج کی آمدنی اسی قدر بتائی ہے جو حجاز کے صوبہ سے عباسیوں کو وصول ہوتی تھی، یعنی وہی ثلاثمائة الف دینار. ابن خلدون ہی نے تاریخ کے مقدمہ میں اس کی تصریح کرتے ہوئے کہ ثقات مؤرخین کی کتابوں میں میں نے یہ پڑھا ہے، بیان کیا ہے کہ بنی امیہ کے اندلسی حکمران عبدالرحمٰن الناصر کا جب انتقال ہوا تو:

Marfat.com

"خلف فی بیوته امواله خمسة الآف الف الف دینا ر مکررة ثلاث مرات یکون جملتها بالقناطیر خمسائة الف قنطار"(۱۰)

''تو خزانہ عامرہ میں عبد الرحمٰن نے اپنے بعد پانچ ہزار ملین کی تین گنی مقدار دینار کی چھوڑی تھی ،قنطار کے حساب سے جو پانچ ہزار قنطار کے قریب رقم ہوئی ہے''

جس کا حاصل یہ ہے کہ پندرہ ہزار ملین دینار یا پونڈ عبد الرحمٰن دولت چھوڑ کر مرا تھا (و)، حالانکہ اسی عبد الرحمٰن الناصر کے مصارف کی تفصیل کرتے ہوئے مؤرخین لکھتے ہیں:

"اخترع قصورا و متنزهات کثیرة وبنی الطرق وزاد فی الجامع بقرطبه رواقین .....و بنی جوامع کثیرة بالاندلس"(۱۱)

''بہت سے محلات اور سیر گاہیں ،سڑکیں اس نے بنوائیں اور قرطبہ کی جامع مسجد میں دو رواقوں کا اضافہ کیا اور ان کے سوا بھی اندلس کے علاقہ میں اس نے جامع مسجدیں تعمیر کرائیں''

ابن خلدون نے بھی اسی الناصر کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ:

''جیسے الناصر کے باپ اور دادا وغیرہ نے اندلس میں بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں قصور تعمیر کیے ،جن میں ''المجلس الزھر''، ''البہو الکامل''،''القصر المنیف''، خاص طور پر مشہور ہیں اسی طرح الناصر نے المجلس الزہر کے بازو میں ایک عالیشان ایوان جس کا نام ''دار الروضۃ'' رکھا تھا، تعمیر کیا، ان محل سراؤں تک پہاڑوں سے پانی پہنچانے کا بندوبست کیا اس نے بڑے بڑے انجینئر دنیا سے طلب کیے اور بغداد سے اور قسطنطنیہ سے بھی لوگ آئے ۔اس نے بہترین سیر گاہیں بنوائیں ۔اسی نے ''الزھرا'' نامی شہر بھی بسایا اور اسی کو

Marfat.com

اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ جس میں بڑے بڑے ایوان، قصور، باغات جو گذشتہ حکمرانوں کے تعمیرات سے بڑھ چڑھ کر تھے، تیار کرائے، ان مین اس نے جنگلی جانوروں کے پالنے کے لیے بڑے بڑے وسیع علاقوں کا احاطہ کیا، طرح طرح کے پرندوں کے لیے جالی دار پرندخانے بھی بنوائے گئے''(۱۲)

اس سلسلہ میں اگر کوئی لکھنا چاہے تو بہت کچھ لکھ سکتا ہے، لکھنے والوں نے اس باب میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے، ان ہی بیانات اور ملک کی ان حیرت انگیز رودادوں ہی کی وجہ سے اندلس کا سودا مسلمانوں کے سر پر سوار ہے۔

ان حالات میں سوال ہوتا ہے کہ عروج واقبال کے آخری دنوں میں جس ملک کی خراجی آمدنی حجاز کی آمدنی کے برابر تھی، اس ملک میں ان شاہ خرچیوں کے بعد بھی حکومت کے خزانہ کو اتنی بڑی بڑی رقموں سے معمور ہونے کا موقعہ کیسے ملا اور اس آمدنی میں اتنے محیر العقول اور مہیب کارنامے کیسے انجام پائے۔ سلاطین وخلفاء کی حد تک نہیں، بلکہ اندلس کے عام مسلمان امراء کے جو حالت کتابوں میں درج ہیں ان کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آخر یہ سب کچھ ان کے یہاں کس راستہ سے آرہا تھا۔

اس سوال کے جواب میں ممکن ہے، اختلاف کیا جائے، لیکن سالہا سال کے مطالعہ اور فکر ونظر نے جس نتیجہ تک مجھے پہنچا دیا ہے، اسے عرض کرتا ہوں۔

نسل انسانی کی زندگی کا قدرتی آئین جس کا نام دین اور مذہب ہے۔ جب اپنی آخری مکمل ترین شکل میں اس لیے پیش ہوا کہ بنی آدم کے بکھرے ہوئے گھرانے اور بچھڑی ہوئی آبادیاں ایک ہی دین اور ایک ہی آئین پر سمٹ کر متحد ہو جائیں، تو رحمۃ اللعالمین ﷺ کا انتخاب قدرت نے اس کام کے لیے کیا اور ایک ایسے مرکزی مقام سے پکارنے کے لیے آپ کو کھڑا کیا گیا، جہاں سے مشرق اور مغرب مساوی طور پر متاثر ہو سکتے تھے۔ اور ایک صدی بھی گذرنے نہ پائی تھی کہ

مشرق بھی اس پیغام سے متاثر ہوا اور مغرب میں بھی وحدت انسانی کی یہ آواز دور دور تک گونجتی چلی گئی ۔ چونکہ اس آخری پیغام کے بعد بندوں کے پاس ان کے پیدا کرنے والے خالق کا کوئی پیغام آنے والا نہ تھا، اسی لیے اس آخری پیغام کی بقاء و حفاظت کے لیے جہاں بہت سے قدرتی اسباب پہلے مہیا ہوتے رہے اور آئندہ بھی برابر ہوتے رہیں گے، وہیں اس سلسلہ میں یہ بھی کہا گیا کہ سیاسی قوت جس کی پشت پناہی عموماً دنیا کے عام ادیان و مذہب کو شروع میں میسر نہ آئی، وہ اس دینی دعوت کے ساتھ ساتھ نشو ونما پانے لگی، جو اس کی خصوصیت ہے۔ دعوت کا آغاز بھی عرب ہی کی سرزمین سے ہوا تھا اور اس کی سیاسی قوت کا سرچشمہ بھی عرب ہی کا خطہ تھا۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ بیس پچیس سال کے اندر اندر عہد فاروقی ہی میں مشرق کی سب سے بڑی سیاسی قوت (پرشین امپائر) اور مغرب کا سب سے بڑا سیاسی مرکز (رومن امپائر) دونوں اس کے سامنے چت ہو گئے، اس طرح ساری دنیا کی سب سے بڑی سیاسی قوت کا قالب جس حکومت نے اختیار کر لیا تھا اس کی پشت پناہیوں سے استفادہ کا موقع قدرت ہی کی طرف سے دین کی اس آخری دعوت کے لیے فراہم ہو گیا، اس لیے شروع ہی میں اس دینی دعوت کی جوہری بنیادوں میں استواری و استحکام کی لازوال قوت بھر گئی، اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ آئندہ کچھ بھی ہوتا رہے لیکن اس دین کے بنیادی حقائق پر اشتباہ و ارتیاب کی ساری راہیں بند ہیں، آج دنیا کے جس حصہ میں بھی اس دینی دعوت کو اس کے حقیقی خدوخال کے ساتھ تر و تازہ حالت میں جو بھی پاتا ہے بغیر کسی شک و شبہہ کے اسی طرح پا سکتا ہے جسے براہِ راست اس دین کے حاصل کرنیوالے پا رہے تھے۔ تواریخ کے مختلف ادوار میں بے شمار طوفانوں سے دین کی اس آخری دعوت کو دوچار ہونا پڑا۔ خود اس دین کے نمایندوں میں بھی دنیا کے مختلف حصوں میں انحرافی طغیانیاں پیدا ہوئیں لیکن

Marfat.com

اس دینی دعوت کی جوہری بنیاد اس کی آسمانی کتاب القرآن الحکیم اور اس کتاب کے پیش کرنے والے النبی الروف الرحیم ﷺ کی سیرت وکردار کا ہر ہر پہلو آج بھی اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ نمایاں ودرخشاں ہے۔ ہر توجہ کرنیوالے کی ہلکی سی توجہ اس حقیقت کو ثابت اور واضح کرتی چلی جائے گی کہ

گوہر مخزن اصرار ہماں ست کہ بود　　　حقہ مہر بداں مہر ونشاں ست کہ بود

بہر حال یہ نئی حکومت جس نے اچانک دنیا کی سب سے بڑی سیاسی قوت کا قالب اختیار کرلیا تھا۔ کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا، بلکہ پہلے سے جانی پہچانی بات اور خدا کا وعدہ تھا، قرآن میں ''استخلاف''، یعنی مسلمانوں کو زمین کی حکومت عطا کی جائے گی کا وعدہ کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا گیا تھا:

﴿لیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم﴾ (۱۳)

''تاکہ جگہ بنائے اس دین کے لیے جسے خدا نے ان کے لیے پسند فرمالیا ہے''

اسی دینی دعوت کے لیے جگہ بنانا، اور ممکنہ حد تک اس کے لیے انسانی برادری میں گنجائش پیدا کرتے چلے جانا بھی اس موعودہ حکومت و خلافت کا نصب العین قرآن نے قرار دیا تھا۔

خلافت راشدہ کو خلافت راشدہ اسی لیے کہتے ہیں کہ اس عہد حکومت کا یہ قرآنی نصب العین پوری قوت کے ساتھ قائم رکھا گیا، اور مسلمانوں کی حکومت اس زمانہ میں ٹھیک اپنے نصب العین تک پہنچی ہوئی تھی اور ہر طرف سے یکسو ہوکر اسی راہ پر جارہی تھی، جس مقصد کے لیے وہ عطا ہوئی تھی۔ باوجودیکہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تھا، قرآن کے پیغمبر ﷺ خود عربی تھے، جن لوگوں کا انتخاب اس آخری دینی دعوت کو عالمگیر بنانے کے لیے کیا گیا تھا، سب سے پہلے اس گروہ میں وہی لوگ داخل ہوئے تھے، جن کا وطن عرب تھا۔

اسی دینی دعوت کی عرب میں تو دھوم مچی ہی ہوئی تھی۔ عرب سے باہر روم وایران، حبشہ اور اس کے سوا بھی بیرونی عرب کے دوسرے حصوں میں قاصدوں کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری ہوگیا تھا اور مدینہ جیسی دور دست آبادی میں جب ایران سے آنے والا آتا تھا تو سلمان من اہل البیت (سلمان ہمارے گھرانے کے آدمی ہیں) کی پیغمبرانہ آواز سے مدینہ کی فضا گونج اٹھتی ہے، حبشی بھی آتے ہیں اور پیغمبر ﷺ کے سارے کاروبار کا چارج ان ہی بلال حبشیؓ کو مل جاتا ہے۔ اس طرح عرب وعجم کے قصے ختم ہو رہے تھے، خود عرب بھی احرار وموالی یعنی آزاد و شرفاء اور غلام خاندان کے رذیل کمینے، دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ مگر ان ہی موالی میں سے ایک مولی زید پیغمبر کے فرزند دلبند کے نام سے پکارے گئے، شرافت مآب قریش کے خانوادہ گرامی کی خاتون سے ان کا عقد جس وقت ہوتا ہے تو سارا عرب کانپ اٹھتا ہے اور وہی زید بن حارثہ افسر بن کر اپنی ماتحتی میں اس فوج کو لے کر عرب کے شمال وجنوب، مشرق ومغرب میں جاتے ہیں جس فوج کے زیادہ ارکان عرب کے شریف آزاد خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور اس سلسلہ کی جس آخری مہم کو رومیوں کے مقابلہ میں روانہ کر کے پیغمبر وفات کے بستر پر آرام فرما ہوئے تھے اس فوج کے سپہ سالار بھی ان ہی مولی زید کے صاحبزادے اسامہ تھے۔

ان واقعات کی کہاں تک تفصیل کی جائے، یہ واقعہ ہے کہ قومی عصبیت خواہ کسی راہ سے پیدا کی جائے نسل کی راہ سے، زبان کی راہ سے، ملک کی راہ سے، وطن کی راہ سے سب ہی کی حیثیت وہی ہوگئی تھی جو اسلام کے مقابلہ میں کفر کی تھی (ز)۔

نبوت کے بعد خلافت راشدہ کے عہد میں بھی ''سیدنا بلال'' کہتے کہتے حضرت عمر فاروقؓ کی زبان خشک ہو رہی تھی۔ سالمؓ مولیٰ حذیفہ کی وفات پر فرمایا جارہا ہے کہ مسلمانوں کی خلافت کا حقدار میرے بعد یہی مولی سالم تھا۔ وفات ہو رہی ہے،

Marfat.com

سانس اکھڑ رہی ہے لیکن اس وقت بھی عمر فاروق کہے جاتے ہیں جب تک خلیفہ کا انتخاب نہ ہو لے، رومی صہیبؓ میری جگہ مسلمانوں کو نماز پڑھاتے رہیں، چنانچہ وہی پڑھاتے رہے اور سارے مہاجرین وانصار اور عرب کے اشراف واحرار ان ہی کی امامت میں نماز ادا کرتے رہے۔

مسلمانوں ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اگر ایک طرف خود پیغمبر ﷺ عیسائیوں کو اپنی پاک مسجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت عطا فرماتے ہیں تو دوسری طرف بیت المقدس کے گرجے کا پادری حضرت عمرؓ سے عرض کر رہا ہے کہ کچھ حرج نہیں، آپ گرجے کے اندر نماز ادا فرما سکتے ہیں۔ مگر حضرت عمرؓ یہ فرماتے ہوئے کہ:

"لو صليت داخل الكنيسة اخذها المسلمون بعدى و قالوا هنا صلى عمر" (۱۴)

"اگر گرجے کے اندر آج میں نماز پڑھ لوں گا تو میرے بعد مسلمان اس گرجے کو یہ دعویٰ پیش کر کے کہ عمرؓ نے اس میں نماز پڑھی، تم سے چھین لیں گے"

پھر جس نماز کا وقت آ گیا تھا، اس کو گرجے سے باہر سیڑھیوں پر ادا کر کے ایک تحریری وثیقہ لکھ کر پادری کے حوالہ کرتے ہیں، جس میں لکھا تھا:

"اس سیڑھی پر کوئی نہ نماز ہی ادا کرے اور نہ اذان دے" (۱۵)

اپنے نصرانی غلام اُستق کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں لیکن ان کے جیتے جی استق اس کے قبول کرنے سے انکار کرتا رہا۔ وفات جب ہو رہی تھی تو اسی کا بیان ہے کہ عمر نے مجھ کو آزاد کر دیا۔ (۱۶)

نصرانی غلام کے ساتھ اس سلوک نے استق کے دل میں حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد اسلام کے لیے جگہ بنالی۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے، روم وایران کے مقبوضات عہدِ فاروقی ہی میں اسلامی مفتوحات میں شامل ہو چکے تھے۔ لیکن خلافتِ

Marfat.com

راشدہ کا پورا دور گذر گیا، لیکن کسی کے دل میں خیال تک نہ آیا کہ دفاتر کی زبان ایرانی علاقوں میں فارسی اور رومی علاقوں میں رومی کیوں ہے؟ البلاذری نے لکھا ہے:

"کان دیوان خراج السواد وسائر العراق بالفارسیة. (۱۷)

"سواد اور سارے عراق (ایرانی مقبوضات) کی مال گذاری کا دفتر فارسی میں

ولم یزل دیوان الشام بالرومیة" (۱۸)

اور شام کی مال گذاری کا دفتر رومی میں تھا"۔

اس کی وجہ یہی تھی کہ دین یا انسانی زندگی کا قدرتی آئین جو دنیا کی ساری قوموں کا مشترک موروثی سرمایہ تھا۔ اس کو آخری مکمل ترین شکل میں ممکنہ حد تک تمام قوموں تک پہنچانے اور بنی آدم کے گھرانوں میں اس کی گنجائش پیدا کرنے کی ہی کوششوں پر اس استخلافی حکومت کی توجہ مرتکز تھی، جو مسلمانوں کے سپرد ہوئی تھی۔ اس تمکین فی الارض کے نصب العین کی تکمیل کے لیے کسی خاص زبان یا کسی خاص قوم کے کلچر یا تہذیب وتمدن کے لیے زمین میں جگہ اور گنجائش پیدا کرنا اس حکومت کا مقصود ہی نہ تھا۔

اس بلند نصب العین کے مقابلہ میں قوموں پر زبردستی کسی زبان، یا کلچر، یا تہذیب وتمدن کو تھوپنے اور اس کو خواہ مخواہ ان کے سروں پر منڈھنے کی تنگ نظری کی خلافت راشدہ میں گنجائش ہی نہیں تھی۔ اسی خلافت کا ایک خلیفہ (ح) مسلمان کو قصاص کے لیے بٹھاتا ہے اور غیر مسلم کے ہاتھ میں تلوار دے کر حکم دیتا ہے کہ:

"اپنے مقتول رشتہ دار کے بدلہ میں مسلمان کی گردن اڑا دو" (۱۹)

اس حکم کے بعد مسلمانوں کی طرف مخاطب ہو کر سمجھاتا ہے کہ:

"یہ میں نے اس لیے کیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہماری حکومت کے

Marfat.com

غیر مسلم باشندوں کا خون بھی مسلمانوں کے خون کے برابر ہے۔ اور دونوں کا معاوضہ بھی مساوی ہے''۔

خود پیغمبر ﷺ غیر مسلم مقتول کے معاوضہ میں مسلمان قاتل کو قتل کراتے ہوئے فرماتے جاتے ہیں:

''انا احق من وفی بذمته ''(۲۰)

''اپنی ذمہ داری پوری کرنے کا میں سب سے زیادہ حق دار ہوں''

مگر اس استخلافی حکومت کے مذکورہ بالا قرآنی نصب العین یعنی دین کے لیے تمکین فی الارض کا رشد اور اس کی سوجھ بوجھ کا جوش دھیما پڑتے پڑتے بالآخر انحطاط کے اس نقطہ تک پہنچ گیا کہ ایک حال جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے یہ تھا:

''کان سالم مولیٰ ابی حذیفه یوم المهاجرین والانصار فی مسجدقباء فیهم ابو بکر و عمر ''(۲۱)

''ابو حذیفہ کے مولیٰ (غلام) سالم قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے، مہاجرین اور انصار کی جن میں ابوبکر وعمر بھی ہوتے تھے''۔

مگر پھر ان ہی بے چارے موالی کے ساتھ اسی عرب میں یہ معاملہ بھی کیا جارہا تھا کہ اتفاقاً ان ہی موالی میں سے کسی مولی کے پیچھے کوئی شریف عرب نماز پڑھ لیتا تو پوچھنے والے حیرت سے پوچھتے کہ تم نے اس کے پیچھے نماز پڑھی؟

''انما اردت ان اتواضع لله بالصلوة خلفه''(۲۲)

''اس شخص کے پیچھے نماز پڑھنے کی غرض یہ ہے کہ خدا کے سامنے اپنی فروتنی اور تواضع کا اظہار کروں''۔

گویا مولیٰ کے پیچھے نماز ایک قسم کا مجاہدہ تھا اور یہاں تک تو پھر بھی غنیمت ہے اسی العقد الفرید میں موالی اور غیر عربی مسلمانوں کے متعلق بدلے ہوئے نقطہ نظر

Marfat.com

کے جن نتائج کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کو پڑھ کر حیرت ہو جاتی ہے کہ شرفائے عرب کے مقابلہ میں ان کے ساتھ جو امتیازی برتاؤ کیا جاتا تھا، اس کی فہرست صاحب عقد الفرید نے نقل کی ہے

۱۔ ان موالی کو نہ کنیت سے پکارا جاتا تھا، اور نہ نام کے سوا اور کسی دوسرے لفظ سے خطاب کا استحقاق ان کو حاصل تھا۔

۲۔ صف میں شرفائے عرب کے برابر چلنے کا حق موالی کو نہ تھا۔

۳۔ اور نہ کسی جلسہ جلوس میں موالی آگے رہ سکتے تھے۔

۴۔ دعوت میں قاعدہ مقرر تھا کہ جب تک شرفائے عرب کھانا کھاتے رہیں، موالی اور غیر عربی مسلمان کھڑے رہیں۔

۵۔ کسی وجہ سے عرب کے شرفا اپنی دعوتوں میں علم یا فضل کی عام شہرت کی وجہ سے کسی مولیٰ (یعنی غیر عرب مسلمان) کو مدعو بھی کرتے تو ان کو ایسی جگہ بٹھا کر کھانا کھلایا جاتا، جو شرفا کے دسترخوان سے الگ ہوتی، تاکہ ہر شخص پر یہ واضح ہو جائے کہ وہ عربی نہیں ہے۔

۶۔ جس جنازہ میں کوئی عربی شریک ہوتا تو اس میں موالی کو نماز پڑھنے کے لیے نہیں بلایا جاتا تھا۔ یہ اور اس سے بھی زیادہ عرب اور غیر عربی مسلمانوں میں ترجیحی سلوک کی ابتدا خلافتِ راشدہ کے ختم ہوتے ہی شروع ہو گئی تھی۔ ایک قریشی صاحب کا یہ لطیفہ العقد الفرید ہی میں نقل کیا گیا ہے کہ ان کا دستور تھا کہ جب ان کے سامنے کوئی جنازہ گذرتا تو پوچھتے کہ کس کا جنازہ ہے اگر کہا جاتا کہ قریش کا ہے تو واقوماہ (ہائے میری قوم) کہتے ہوئے چیخ اٹھتے اور اگر سنتے کہ کسی غیر عربی کا جنازہ ہے تو کہتے وابلدتاہ (ہائے رے میرا ملک) اور اگر معلوم ہوتا کہ کسی غیر عربی مسلمان کا ہے تو کہتے:

Marfat.com

''اللہ کا مال تھا، جس مال کو چاہے لے لے اور جسے چاہے، چھوڑ دے''(۲۳)

کچھ دن تک تو افراد میں مذکورۂ بالا انحرافی میلانات کی پرورش ہوتی رہی، تا آنکہ جب حکومت کی باگ مروانی خاندان والوں کے ہاتھ میں آئی تو اس کے پہلے خلیفہ عبدالملک بن مروان کے جو جذبات اس باب میں تھے اس کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ سیدنا امام زین العابدین نے کسی غیر عربی خاتون کو جو مولاۃ (لونڈی) تھیں، آزاد کر کے بیوی کا مرتبہ عطا کیا، عبدالملک کو خبر ہوئی تو آپے سے باہر ہوگیا اور غصہ میں ایک خط حضرت والا کے نام لکھ کر مدینہ روانہ کیا جس کا حاصل تھا کہ قریش کے دامن شرافت کو اپنی اس حرکت سے تم نے داغدار کر دیا۔ اہل بیت نبوت کے چشم و چراغ سے جس جواب کی توقع تھی، وہی جواب عبدالملک کو ملا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاک نمونہ کی میں نے پیروی کی اور نبوت کا جو منشاء تھا اسی کی تعمیل کی سعادت میں نے حاصل کی ہے۔

بہرحال عوام کے ہاتھ میں تو اختیار تھا نہیں اس لیے حکومت کا اقتدار جب عبدالملک کے ہاتھ میں آیا تو پہلا انقلابی قدم اس نے یہ اٹھایا کہ فارسی اور رومی زبانوں میں (خراج) مالگذاری کے جو دفاتر خلافتِ راشدہ میں بھی اپنے حال میں چھوڑ دیئے گئے تھے، لاکھوں لاکھ روپے کے صرف سے ان کی زبان عربی کر دی گئی، رومی دفتر کے انچارج آفیسر سرجون نامی عیسائی کو جب عبدالملک نے یہ فرمان سنایا تو اس کا خون خشک ہوگیا، اور اس نے دفتر کے کام کرنے والے عملہ کو جن کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی، بلا کر یہ الفاظ کہے:

''دفتری نوشت و خواند تمہاری روزی کا جو ذریعہ تھا، اس سے تم محروم کر دیئے گئے''۔(۲۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی آخری دعوت کے لیے جگہ بنانے یا تمکین

Marfat.com

فی الارض کے لیے جن امور کی ضرورت تھی ،حکومت کی نگاہوں میں اس کی کوئی اہمیت باقی نہ رہ گئی تھی۔ سوچنے کی بات ہے کہ دفاتر کی زبان کی اس تبدیلی سے اسلامی مقبوضات میں رہنے والے باشندوں کی کتنی بڑی تعداد روزی کے ذرائع سے محروم ہوگئی ہوگی۔ اگر ان غریبوں کی معاش کے نئے ذرائع حکومت کھول دیتی تو جو جی میں آتا کرسکتی تھی۔ مگر اس سے پہلے عبدالملک کے اس اقدام سے خدا ہی جانتا ہے کہ ملک کے کتنے باشندے متاثر ہوئے ہوں گے اور ان کے قلوب میں اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے جس قسم کے جذبات پیدا ہوئے ہوں گے، ان کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے۔ اس سے عربی زبان کی تمکین اور اس کے لیے نئی جگہ ضرور پیدا کی گئی لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس خلافت کا وعدہ قرآن میں مسلمانوں سے کیا گیا اس کا نصب العین خود قرآن ہی نے کیا متعین کیا تھا۔ اسی سے یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ خلافت جب تک اپنے نصب العین کے لحاظ سے کامل رشد اور سوجھ بوجھ کی حالت میں رہی اس وقت تک دفاتر کی زبان بدلنے کی طرف توجہ نہ کی گئی۔

اور اس قصہ میں تو حکومت کی غیر مسلم رعایا ہی کے ساتھ بے رحمی کا برتاؤ کیا گیا تھا، لیکن مروانیوں کی اسی حکومت میں غیر عربی مسلمانوں تک کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک روا رکھا گیا۔ یعنی ابتداء حکومت سے آخر تک حکومت میں ملازمت کا سوال تو الگ رہا، امام ابوحنیفہؒ کی شہادت ہے کہ غیر عربی مسلمان علماء سے جن میں خود امام صاحبؒ بھی تھے، کبھی کوئی قانونی اور فقہی سوال تک نہ پوچھا جاتا تھا، کوفہ کا آخری مروانی گورنر ابن ھبیرہ پہلا شخص ہے، جس نے مجبور ہوکر امام ابوحنیفہؒ سے بعض مسائل میں مشورہ لیا تھا۔ غیر عربی مسلمانوں کے ساتھ حکومت کا تو یہ برتاؤ تھا، لیکن یہی طرزِ عمل غیر عربی مسلمانوں کے ایمان واخلاص کے امتحان کا ذریعہ بن گیا۔

اور ان ساری بے اعتنائیوں کے باوجود سارے اسلامی ممالک کے مرکزی مقامات

میں دین اور دینی علوم کی خدمت و نشر و اشاعت میں زیادہ تر غیر عربی مسلمان مصروف تھے۔

عام مسلمانوں کے قلوب ان غیر عربی مسلمانوں کے اخلاص و صداقت سے قدرۃً متاثر ہوتے تھے مگر مروانیوں پر یہ بھی شاق تھا۔ چنانچہ عبدالملک کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے شہاب زہری سے ہر ہر شہر اور قابل ذکر آبادیوں کے نام لے لے کر پوچھنا شروع کیا کہ وہاں کا دینی مقتدا کون ہے، زہری ہر سوال کے جواب میں مسلسل غیر عربی النسل مسلمانوں ہی کے نام بتلائے چلے جاتے تھے۔ اور عبدالملک کا چہرہ سیاہ پڑتا جاتا تھا۔

آخر میں جب کوفہ کے متعلق زہری نے بیان کیا کہ آج کل وہاں کے دینی پیشوا ابراہیم نخعی ہیں، جو نسلاً عربی ہیں۔ اس وقت اس کے دل کی دھڑکن کچھ کم ہوئی اور بے ساختہ بول اٹھا:

"ویلک یا زھری فرجت عنی" (۲۵)

"برا ہو تمہارا زہری، اب جا کر تم نے مجھے شگفتہ ہونے کا موقع دیا"۔

ظاہر ہے کہ خلافت کا جو "خط راشدہ" تھا اس سے جب انحراف شروع ہوا تو کسی حد پر اس کے ٹھہرنے کی صورت ہی کیا تھی۔ مسلمانوں کو کہیے یا محمد رسول اللہ ﷺ کی امت کو عربی و غیر عربی دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے مروانی حکومت آخر میں انحراف کے اس نقطہ پر پہنچ گئی کہ آج بھی ہم جب اس کا تصور کرتے ہیں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، علامہ ابو بکر جصاصؒ نے اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھا ہے:

"قد کان آل مروان یاخذون الجزیة ممن اسلم من اھل الذمة" (۲۶)

"مروان کے خاندان والے حکمران ان مسلمانوں سے بھی جزیہ وصول کرتے تھے، جو پہلے غیر مسلم ذمی تھے، اور بعد کو اسلام قبول کر لیا تھا"۔

Marfat.com

اور یہ سزا ان مسلمانوں کو صرف اس لیے بھگتنی پڑی کہ بجائے عرب کے وہ بے چارے اس ارضِ بسیط کے ان حصوں میں پیدا ہو گئے تھے جن پر عرب کے لفظ کا اطلاق نہیں کیا جاتا تھا، اس کے سوا ان میں اور عربی نژاد مسلمان میں کوئی فرق نہ تھا۔

مروانی حکومت کی اسی حیرت انگیز ایمان آزما، دین گداز، جاہلی جسارت کا ذکر کرتے ہوئے ابن اثیر نے کامل میں لکھا ہے کہ ان مسلمانوں کو کوفہ اور بصرہ کی چھاؤنیوں سے صرف اس قصور میں جس وقت نکالا جارہا تھا کہ انہوں نے اپنے آپ کو زمین کے اس خطہ میں کیوں نہ پیدا کیا جس کا نام عرب ہے تو وہ بے چارے روتے جاتے تھے اور:

یا محمداہ یا محمداہ (٢٧)

کے الفاظ بے ساختہ ان کی زبانوں پر جاری تھے، وہ اپنے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ کو ڈھونڈ رہے تھے۔ اور حیران تھے کہ اپنے پرانے غیر اسلامی قبائل سے وہ منقطع ہو چکے تھے اور عربی مسلمان بھی ان کو عربی چھاؤنیوں سے باہر نکلنے پر مجبور کر رہے تھے، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا:

"این یذھبون" (٢٨) "آخر وہ کہاں جائیں"

اس وقت بصرہ اور کوفہ کے جو علماء تھے، وہ بھی ان نکالے جانے والے علماء کے ساتھ ساتھ روتے جاتے تھے۔

اس طرح اس مسئلہ میں علماء فقہاء کے متفقہ فیصلہ کو مسترد کر کے مسلمانوں کی کافی خون ریزی کی گئی (ط)۔ اس اصرار کی انتہا یہ تھی کہ عمر بن عبد العزیز نے اپنے زمانۂ خلافت میں کلنک کے اس ٹیکہ کو مروانی حکومت کی پیشانی سے حالانکہ مٹا دیا تھا لیکن بقول جصاص:

"لما ولی ھشام بن عبدالملک اعادھا علی المسلمین"

Marfat.com

''جب عبدالملک کا بیٹا تخت نشین ہوا تو مسلمانوں پر پھر جزیہ کے ٹیکس کو اس نے لگا دیا'' (۲۹)

گویا عربی اور غیر عربی تقسیم پر ہشام کی حکومت نے مہر لگا دی۔ اور اعلان کر دیا گیا کہ حکومت مسلمانوں کی حکومت نہیں، بلکہ عربی مسلمانوں کی ہے اور عربوں کی راہ کے سارے کانٹے ہٹا دیئے گئے لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات پر بیس سال سے زیادہ مدت گذرنے نہ پائی تھی کہ مروانیوں نے عربی مسلمانوں کی جو حکومت قائم کر لی تھی، اس کا خاتمہ ہو گیا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی تقسیم کے بعد جیسا کہ چاہیے تھا یہ تقسیم عربی و غیر عربی دو ہی قسموں میں منحصر نہیں رہی، بلکہ مروانی حکومت کے آخری زمانہ میں عربی مسلمان بھی نزاریہ اور یمانیہ (ی) دو حصوں میں بٹ گئے، اور حکومت کا اقتدار چونکہ نزاری نسل کے ہاتھ میں تھا اس لیے مروانی حکومت کا آخری خلیفہ مروان بن محمد جیسا کہ المسعودی نے لکھا ہے کھلے بندوں

''تعصب لقومه من نزار علی الیمن'' (۳۰)

''یمنی عربی مسلمانوں کے مقابلہ میں نزاری عربی مسلمانوں کی پاسداری کرنے لگا''۔

اور اس طرح بجائے عربی کے مروانیوں کی حکومت ''نزاری حکومت'' بن کر ختم ہوئی۔ عربی مسلمانوں کی تقسیم کا یہ فتنہ جو مروانیوں کے آخری دور میں اٹھ کھڑا ہوا تھا، صدیوں تک اس کا اثر باقی رہا، اور خدا ہی جانتا ہے کہ فتنے کی اس آگ میں کتنی لاکھ جانیں ضائع ہوئیں اور کتنے شدید نقصانات پہنچے۔ ہماری تاریخیں ان خونی داستانوں کے ذکر سے لالہ زار بنی ہوئی ہیں۔ الغرض ایک طرف تو خود عرب تقسیم کے اس عمل جراحی کا تختہ مشق بنا ہوا تھا اور دوسری طرف عربی زبان کے ساتھ نادانوں کی اس دوستی کا آخری انجام اسی مروانی حکومت کے آخری دور میں جو کچھ

ہوا اس کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے ہو سکتا کہ خراسان میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد پہلا گشتی فرمان جو خراسان میں عباسیوں کی طرف سے بانٹا جا رہا تھا وہ یہ تھا:

"لا یدع بخراسان متکلما بالعربیة الاقتله" (۳۱)

"خراسان میں عربی زبان بولنے والا جو بھی ملے، اسے قتل کر دیا جائے"۔

حالانکہ اگر مروانی حکومت اسلام کی تمکین اور اس کے لیے جگہ بنانے کے قرآنی نصب العین کو اپنے سامنے رکھتی تو عربی مسلمانوں میں جراحی کے عمل کی بھی گنجائش نہ پیدا ہوتی، اور اسلام کے طفیل میں عربی زبان بھی قدرتی طور پر آگے بڑھتی چلی جاتی، لیکن قرآن کے بینات سے چشم پوشی اختیار کی گئی، قرآنی دعوت کے پیش کرنے والے پیغمبر ﷺ کے نمونوں سے اعراض کیا گیا اور الٹے انہی لوگوں کو جو اسلام اور پیغمبر اسلام کو ساری انسانیت کا مشترکہ سرمایہ قرار دینے پر اصرار کرتے تھے، شعوبیہ (ک) کے نام سے رسوا اور بدنام کیا گیا اور ان کے مقابلہ میں مستقل محاذ بنالیا گیا۔

کچھ بھی ہو، اپنی بھڑکائی ہوئی آگ میں مروانیوں کی یہ حکومت خود ہی جل بھن کر ختم ہوگئی، بچے کھچے لوگوں میں ہشام بن عبدالملک کا پوتا گرتے پڑتے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو اندلس تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا، مروانیوں کی قبضہ گیر فوج اندلس پر اپنے اقتدار کو اب تک قائم کیے ہوئے تھی، کہتے ہیں کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے اندلس سے واپسی کا جو حکم مسلمانوں کو دیا تھا اور واپسی کا کام شروع بھی ہوگیا تھا لیکن ان ہی فوجیوں کے عرض و معروض پر اپنے حکم کو آپ نے ملتوی فرمادیا اور یوں ان فوجیوں کو یہاں ٹھہر جانے کا موقع مل گیا تھا، یہ قبضہ گیر فوج شام کی چھاؤنیوں سے اندلس بھیجی گئی تھی۔ اس لیے اس کو سرزمین اندلس سے مانوس کرنے کے لیے وہی نام ان آبادیوں کے ان کی رعایت سے اندلس میں رکھ دیئے تھے، جو شامی چھاؤنیوں کے تھے۔ مروانی حکومت کے سارے زہریلے جراثیم ان

فوجیوں میں پھیلے ہوئے تھے اور مروانیوں کے آخری دور میں عربیت بھی نزاریت، اور یمنیت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ اندلس کی قبضہ گیر فوج اس تقسیم کے اثر سے بھی متاثر ہوئی اور بری طور پر متاثر ہوئی۔ کامل ابن اثیر میں لکھا ہے کہ نزاری اور یمنی عربوں میں جھگڑے اندلس میں آئے دن ہوتے رہتے تھے بعض دفعہ ان کی کشمکش اس نوبت کو پہنچ جاتی تھی:

"اقتلوا بالرماح حتی تقطعت و بالسیوف حتی تکسرت ثم تجاذبوا بالشعور" (۳۲)

"(نزاری عرب اور یمنی عرب) پہلے تو نیزوں سے لڑے تا آنکہ سب ٹوٹ پھوٹ گئے، تلواریں چلیں اور وہ ٹوٹ کر ختم ہوگئیں، آخر میں ایک دوسرے کے بالوں کو پکڑ کر کھینچتے تھے"۔

خانہ جنگی کی اتنی بدترین شکل کے باوجود بھی اندلس کی کوہستانی اور پتھریلی زمین کو چھوڑنے پر یہ فوج آمادہ نہ ہوئی، وہ جانتی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن اس جزیرہ نما سے نکلنا نہ چاہیے۔ ان جھگڑوں کے چکانے کی آخر میں یہ عجیب وغریب صورت ان فوجیوں نے یہ اختیار کی:

"ایک سال نزاری عرب کی پارٹی کا آدمی اندلس کی مسلمان فوجوں کا امیر رہا اور دوسرے سال امارت کا یہ عہدہ یمنی عربوں کے کسی آدمی کے سپرد بخوشی ورضامندی کر دیا جائے" (۳۳)

گویا اندلس میں قیام کی خواہش اور حد سے گذرے ہوئے شوق نے ایک خاص قسم کی جمہوریت پر ان کو راضی کر دیا تھا۔

ان فوجیوں کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس عرصہ میں مروانی حکومت کا ایک شاہزادہ یعنی ھشام کا پوتا عبدالرحمن اندلس پہنچا۔ سالانہ امارت کے ایر پھیر کے

Marfat.com

قصوں سے لوگوں کو یہ زیادہ آسان نظر آیا کہ عبدالرحمن ہی کو اپنا امیر بنا لیا جائے۔ اس میں کچھ اختلاف بھی ہوئے، لیکن فوجیوں کی اکثریت عبدالرحمن کے ساتھ تھی۔ اس لیے اختلاف ختم ہو گئے، اور عبدالرحمن جو بعد کو الداخل کے لقب سے تاریخ میں مشہور ہوا اندلس کا باضابطہ حکمران بن گیا، ظاہر ہے کہ اس بے چارے کی پرورش ہی مروانی ماحول میں ہوئی تھی اس لیے اپنے خاندانی روایات اور موروثی خیالات وجذبات سے الگ ہونے کی اس کے لیے شکل ہی کیا تھی۔ قرطبہ میں داخل ہوتے ہوئے جو شعر اس نے پڑھا تھا، اب بھی تاریخوں میں نقل کیا جاتا ہے (ل) جس کا حاصل یہ ہے کہ عباسیہ جو عجمی نہیں عربی تھے ان کی حکومت بھی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ گویا تنگ ہوتے ہوتے اس غریب کا حوصلہ اتنا مختصر ہو کر رہ گیا تھا کہ مروانیوں کے سوا کسی دوسرے عربی خاندان کی حکومت کی بھی گنجائش اس کے اندر باقی نہ رہی تھی، اور انسانیت سے ہٹ کر جو تعمیر بھی کی جائے گی اس کا آخری انجام بہرحال یہی ہو کر رہے گا۔

عبدالرحمن کو مرکز بنا کر جزیرہ نما کے منتشر مسلمانوں کو منظم ہونے کا موقعہ جب ملا تو اندلس ان لوگوں کی پناہ گاہ بن گیا، جو عباسیوں کی حکومت کے زیر اثر نہیں رہنا چاہتے تھے۔ یہ نئے پناہ گزین جن کی ٹولیاں وقتاً فوقتاً عبدالرحمن کے پاس پناہ لینے کے لیے اندلس آتی رہتی تھیں، ان کے نفسیات، جذبات وعواطف کا اندازہ اس مشہور اندلسی پناہ گزین سے ہوتا ہے، جو نسلاً مروانی خاندان کا تھا، نام اس کا عبدالملک بن عمر تھا۔ کہتے ہیں کہ عبدالرحمن نے شروع میں امیر ہو جانے کے بعد بھی رسمی طور پر خطبہ میں عباسیوں کے خلیفہ کے نام کو باقی رکھا تھا، لیکن عبدالملک جب اندلس پہنچا تو اس نے اصرار شروع کیا کہ خطبہ سے عباسی خلیفہ کا نام نکال دیا جائے:

"**والاقتلت نفسی**" (۳۴) "ورنہ میں اپنے آپ کو قتل کر دوں گا"

Marfat.com

عبد الملک، عبد الرحمن کے خاص عزیزوں میں تھا، اس لیے عبد الرحمن اس قتل کی دھمکی سے متاثر ہو گیا اور رسمی نام بھی خطبہ سے عباسیوں کا نکال دیا گیا، دنیا طلبی کا جو بھوت اس عبد الملک پر سوار تھا، اس کی گندگی اور سیاہی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک موقعہ پر جب اس کو خطرہ محسوس ہوا کہ اس کا بیٹا اس کی راہ کا کانٹا نہ بن جائے تو بغیر کسی وجہ کے:

''بیٹے کی گردن بھی اڑا دی، اس کی بھی اس کے سارے گھر کے لوگوں کی بھی اور اس کے تمام خانگی ملازموں کی بھی'' (۳۵)

الغرض عبد الرحمن الداخل سے پہلے اندلس میں جو قبضہ گیر فوج تھی، اس کا اور خود عبد الرحمن کا اور عبد الرحمن کی امارت قائم ہونے کے بعد ادھر ادھر سے اس کے پاس جو مسلمان عباسیوں کی حکومت سے نکل نکل کر پناہ گزیں ہو رہے تھے، ان سب کی نفسیاتی کیفیت کے اندازے کے لیے غالباً تاریخ کی مذکورہ بالا شہادتیں کافی ہیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اندلس کے اس جزیرہ نما میں مسلمانوں نے اچھے اور برے حالات کے ساتھ تقریباً آٹھ صدیاں گزاریں۔ یعنی ۹۲ھ میں اندلس فتح ہوا اور کامل تخلیہ اس ملک کا مسلمانوں نے ۸۹۷ھ میں کیا ان آٹھ صدیوں میں مروانیوں کی یہ حکومت جو عبد الرحمن الداخل کے زمانہ میں قائم ہوئی، مرکزی حیثیت سے سارے اندلس پر اس کا اقتدار کم و بیش دو سو سال سے زیادہ صحیح معنوں میں قائم نہیں رہا، اس خانوادہ کا آخری واقعی حکمران حکم بن ہشام تھا۔ جس کا انتقال ۳۶۳ھ میں ہوا۔ اسی کے بعد حکم کا بیٹا ہشام المؤید باللہ کے نام سے تخت نشین تو ضرور ہوا لیکن اس بیچارے کی ساری عمر حرم سرا کے اندر بطور ایک اسیر یا قیدی کے گذری، تفصیلات کے لیے تاریخ کی مبسوط کتابوں کا مطالعہ کیجیے۔

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اندلس کی اس مروانی حکومت کے

Marfat.com

حکمرانوں کے جو حالات ہماری کتابوں میں لکھے گئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی چال ڈھال سیرت و کردار میں ان کی کیفیت بھی تقریباً وہی تھی، جو دمشق کے مروانی حکمرانوں کی تھی، یعنی سیاسی اغراض کے سامنے اسلامی مطالبات کی پروا جیسے دمشق کے مروانی خلفاء نہیں کرتے تھے، اور مسلمانوں سے جزیہ کے ٹیکس کے وصول کرنے پر ان کا اصرار اس حد تک بڑھا ہوا تھا، کہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی ممانعت کے باوجود پھر اسی مردہ جاہلی رسم کو زندہ کیا گیا، کچھ یہی نقطۂ نظر انہوں بھی محض سیاسی مصالح کی بنیاد پر حج جیسے اسلامی رکن کے ادا کرنے سے اندلس کے مسلمانوں کو محروم کر رکھا تھا، خصوصاً جن بے چاروں کا حکومت سے کوئی تعلق ہوتا، ابن خلدون کے الفاظ ہیں:

"کان بنو امیة بالاندلس یمنعون اھل دولتھم من السفر لفریضة الحج "(۳۶)

''بنی امیہ کے اندلسی حکمران اپنی حکومت کے لوگوں کو فریضہ حج کے ادا کرنے سے روکتے تھے''۔

یہ بھی لکھا ہے:

"فلم یحج لسائر ایا مھم احد من اھل دولتھم "(۳۷)

''جب مروانیوں کی حکومت اندلس میں رہی ان کی حکومت سے تعلق رکھنے والوں میں سے کسی نے حج نہیں کیا''۔

مگر اسی کے ساتھ جوامع اور مساجد کے بنانے کا شوق و ذوق بھی ان پر اسی طرح غالب تھا، جیسا کہ دمشق کے مروانی خلفاء کا تھا۔ جامع اموی اس وقت تک دمشق میں ان کی یادگار باقی ہے، جسے لوگ دنیا کے چند خاص عجائبات میں شمار کرتے ہیں، لیکن اس تعمیری ذوق کی تہ میں جو جذبہ کارفرما تھا، اس کا اندازہ اس قسم

کے واقعات سے ہوتا ہے۔

دمشق کے مروانی خلفاء میں خلیفہ ہشام بن عبدالملک بڑے کلے جبڑے کا حکمران گذرا ہے، ابن عساکر نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ، مکہ معظمہ، کوفہ اور بصرہ کے لوگ اس کے پاس آئے تھے، اس نے حکم دیا کہ دمشق کے باہر قصور و محلات اور جو عمارتیں بنوائی گئی ہیں اور نہروں کو پہنچا کر جو باغات ان عمارتوں میں تیار کیے گئے ہیں ان کو آراستہ پیراستہ کیا جائے پھر اپنے ساتھ مذکورہ بالا مقامات پر مسلمانوں کو لے کر پہنچا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ اے مکہ والو! کیا تمہارے یہاں ایسی عمارتیں ایسی سیر گاہیں، ایسے سرسبز اور شاداب باغات ہیں، جب وہ بےچارے کہتے کہ نہیں امیر المومنین ہمارے یہاں یہ چیزیں کہاں ہیں، تو دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ (۳۸)

بجنسہ یہی رنگ اندلس کے مروانی حکمرانوں کا بھی نظر آتا ہے۔ مشہور ہے کہ اندلس کا تاریخی قصر الزہرا جو عبدالرحمٰن الناصر کے حکم سے تیار ہوا تھا۔ جب وہ پہلی مرتبہ اپنے حواشی موالی کے ساتھ اس قصر میں داخل ہوا تو لوگوں سے خطاب کر کے پوچھا:

"هل بلغكم ان احدابنى مثل هذا البناء "(۳۹)

"کیا تم جانتے ہو کہ کسی نے ایسا محل کبھی بنایا تھا"

درباریوں نے عرض کیا:

"نہیں سرکار! نہ ایسی عمارت دیکھنے ہی میں آئی اور نہ سننے میں" (۴۰)

عبدالرحمٰن اس جواب کو سن کر بہت مسرور ہوا (م)۔ (۴۱)

اور یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں اندلس کی ساری علمی سرگرمیاں جن کی بدولت دینی علوم میں ابن حزم و ابن عبدالبر جیسے ارباب تحقیق پیدا ہوئے اور ابن باجہ، ابن رشد، ابن طفیل، ابن زہر وغیرہ جیسی غیر معمولی ہستیاں عقلی

Marfat.com

علوم میں پیدا ہوئیں ۔ ان بزرگوں کے حالات اور سنین ولادت ووفات کو اٹھا کر دیکھیے تو واضح ہوگا کہ عموماً اس قسم کے افراد اندلس میں مروانیوں کی مرکزی حکومت کے ختم ہونے کے بعد ہی پیدا ہوئے ۔ مروانی حکمرانوں کے زمانہ میں دین کی حد تک بجز معدودے چند حضرات کے جو لوگ پیدا ہوئے تھے اندلس میں لیکن ان کی تعلیم وتربیت بالکلیہ اسلام کے مشرقی شہروں میں ہوئی تھی ۔ مثلاً بقی بن مخلد وغیرہ ورنہ ان کے سوا زیادہ تر وہی الواضحہ اور العتبیہ مالکی فقہ کے متون کے مصنفین ہمیں مروانی عہد میں نظر آتے ہیں ، کیونکہ حکومت کی عدالت کا محکمہ مالکی مذہب کے مولویوں کے ہاتھ میں تھا اور علاج معالجہ کے سلسلہ میں کچھ ایسے اطباء بھی ملتے ہیں جو عقلی علوم وفنون سے بھی تعلق رکھتے تھے ۔ لیکن قدرومنزلت ان کی صرف طبیب ہی ہونے کی وجہ سے تھی ۔ الغرض فقہ مالکی اور قدرے طبی علوم کے سوا سارا زور وہی عرب کے جاہلی دور کے قصوں کہانیوں پر مرکوز تھا ۔

ہماری تاریخوں میں بھی اور غیروں نے بھی اندلس کے اس کتب خانے کا بڑے شاندار الفاظ میں تذکرہ کیا ہے جو حکم ثانی نے قائم کیا تھا ۔ یورپ کے مؤرخین تو حسب عادت طلسمی اعداد و شمار کے ساتھ اس کتب خانے کا ذکر کرتے ہیں ، ہمارے مؤرخین بھی یہ خبر دیتے ہوئے :

''کان محبا للعلم مشغوفاً بجمع الکتب و النظر فیھا''(۴۲)

''حکم علم کا رسیا تھا اور اس کو کتابوں کے جمع کرنے اور ان کو مطالعہ کا شوق حد سے بڑھا ہوا تھا'' ۔

ان الفاظ میں اس کے اس مشہور کتب خانے کا ذکر کرتے ہیں :

''انہ جمع منھا مالم یجمعہ احد قبلہ ولا جمعہ احد بعدہ حتی ضاقت ، خزائنہ''(۴۳)

''اس نے اتنی کتابیں جمع کی تھیں کہ نہ اس سے پہلے کسی نے اتنی کتابیں اکٹھی کی تھیں، نہ اس کے بعد، کتابوں کی اتنی بڑی مقدار اس کے پاس جمع ہوگئی کہ کتب خانے اس کے لیے کافی نہ تھے''

ابن اثیر نے تو ''جماع للکتب'' کے لقب ہی سے اس کو ملقب کیا ہے۔
لیکن ان ہی مؤرخین کی زبانی ہم جب یہ سنتے ہیں:

''کان بصیرا بالادب، و الشعر و ایام الناس وانساب العرب'' (۴۴)

''الحکم ادب عربی کا ماہر تھا، عربی شعر اور ایام جاہلیت کی تاریخ عرب کے قبائلی رشتوں کا بڑا واقف کار تھا''۔

تو اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے کتب خانہ میں کن علوم وفنون کی کتابیں زیادہ جمع ہوئی ہوں گی۔ گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ عقد الفرید ابن عبدربہ کی کتاب کے معلومات اس زمانہ کے مروجہ علوم وفنون کی فہرست میں ہیں۔ یعنی اپنے دمشقی مورثوں سے جو چیزیں اندلس کے مروانی حکمرانوں تک پہنچی تھیں، ان ہی کو آگے بڑھانے اور چمکانے میں وہ زیادہ مشغول رہے۔ ان عربی مسلمانوں کو اپنی عربیت پر ناز تھا، اور اسی کو انہوں نے دمشق میں بھی نمایاں کیا تھا۔ اس لیے اندلس پر جب تک ان کا اقتدار قائم رہا تو عربیت ہی کے لیے جگہ پیدا کرنے اور اسی کی تمکین فی الارض میں وہ کوشش کرتے رہے تھے۔

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ اندلس کے عربی النسل مسلمان تو خیر عربی النسل ہی تھے۔ بعض لوگ جو خالص عربی النسل نہیں تھے، بلکہ اندلس کی یورپین نسلوں سے جن کا تعلق تھا، انہوں نے بھی اسلام قبول کرنے کے بعد بجائے اسلام کے دینی علوم کے ان ہی علوم میں کمال اور امتیاز مروانی عہد میں پیدا کیا جن کا تعلق خالص عربیت

Marfat.com

سے تھا۔ ابن القوطیہ اندلس کے مشہور ادیب اور عربی لغت کے محققین میں شمار ہوتے ہیں۔ شذور میں ان کے امتیازی کمالات کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے:

''کان راساً فی اللغة و النحو حافظاً للاخبار و ایام الناس ''(۴۵)

''لغت ونحو کے امام، عرب جاہلی کے حالات اور ایام عرب کے حافظ تھے''

بہر حال ابن القوطیہ ادبِ عربی کے اندلسی ائمہ میں شمار ہوتے ہیں، ان کے نسب نامہ کو بیان کرتے ہوئے مؤرخین نے لکھا ہے کہ ان کے خاندان کا تعلق:

''من ملوک القوط بالاندلس''(۴۶)

''اندلس کے اس شاہی خانوادہ سے تھا جو قوط کے نام سے موسوم تھے''(ن)

تھا اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ نسلاً بھی یہ شخص یورپین ہی تھا۔ ایک طرف وہ عربیت کے امام تھے اور دوسری طرف لکھا ہے:

''ولم یکن بالضابط لروایته فی الحدیث و الفقه''(۴۷)

''مگر حدیث وفقہ کی روایت میں وہ محتاط نہ تھے''۔

ابن خلکان کا بیان ہے کہ درازی عمر کی وجہ سے صرف سند کے عالی کرنے کے لیے فقہ وحدیث کی زوایات بھی ابن قوطیہ سے لوگ سن لیا کرتے تھے۔(۴۸)

کچھ بھی ہو اس سے اس کا تو پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں سے پہلے اندلس میں جو لوگ آباد تھے اور رہن سہن اور خورش و پوشش کے طریقوں میں مسلمانوں سے کافی متاثر ہوئے تھے۔ لیکن جس دین کی تمکین کے لیے مسلمانوں کو حکومت ملی تھی کیا اس کو بھی اپنے دائرہ کے وسیع کرنے کا موقعہ اندلس یا اندلس کے سوا آس پاس کے دوسرے سرحدی یورپین علاقوں میں ملا تھا؟ واقعات و مشاہدات کے سوا تاریخی شہادتوں کی زبانیں بھی اس سوال کے جواب میں خاموش ہیں۔ لے دے کر کچھ ابن قوطیہ وغیرہ ناموں سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ کچھ لوگوں نے اسلام ضرور قبول کرلیا

تھا لیکن ان میں بھی اسلام سے زیادہ عربی کلچر ہی کا ذوق غالب تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دوسروں کا خیال اس باب میں کیا ہے؟ لیکن میرے نزدیک مسلمان دنیا میں خاص وضع قطع کے لباسوں، نشست و برخاست کے طریقوں، تعمیری خصوصیتوں گانے بجانے اور رقص و سرود کی خاص خاص ڈھنگوں، شادی و غمی کی مخصوص رسوم، وغیرہ کی تبلیغ کے لیے قطعاً اٹھائے نہ گئے تھے۔ قدرت نے ان کو ان لازوال ابدی صداقتوں پر انسانیت کو اکٹھا کرنے کے لیے کھڑا کیا تھا، جو قوموں میں پہلے سے جانی پہچانی جاتی تھیں۔ قرآن کی اصطلاح میں جن کی تعبیر ''المعروف'' اور ''المنکر'' کے الفاظ سے کی گئی ہے اور جن میں حالات و واقعات نے اشتباہ پیدا کر دیا تھا اور جن پر شک اور ریب کے بادل چھا گئے تھے، ان ہی اشتباہی کیفیتوں کا ازالہ کر کے ''ایمان راسخ'' پر بنی آدم کو کھڑا کر دینا، یہی کام مسلمانوں کا پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

میں ذکر کر رہا تھا اندلس کے مروانی حکمرانوں کے رجحانات و میلانات کا، یعنی عربی النسل مسلمانوں پر عربیت ہی کا مذاق اندلس میں بھی غالب رہا، اسی سے اندازہ کیجیے کہ الحکم الثانی کا وہ مشہور کتب خانہ جس کی کتابوں کی نہ حد تھی نہ شمار، ابن خلدون نے مستند ذریعہ سے نقل کیا ہے:

''۲۴ جلدوں میں صرف عربی کے شعراء کے دیوانوں کی فہرست تھی'' (۴۹)

ان دیوانوں میں شعرائے عرب کے چند محدود خیالات کی شاعرانہ تعبیروں کے سوا ظاہر ہے اور کسی دوسری چیز کی بھلا کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ الحکم کے علمی مذاق کو دیکھتے ہوئے غالب خیال یہی ہوتا ہے کہ عرب کے ایام جاہلیت ہی کی یادگاروں سے زیادہ تر حکم کا یہ کتب خانہ معمور ہوگا۔ اندلس کے اس مروانی حکمران الحکم پر یہ ذوق کس حد تک غالب تھا، اس کا پتہ اس مشہور واقعہ سے

Marfat.com

بھی چلتا ہے کہ جب ابو الفرج اصفہانی اپنی مشہور اور ضخیم کتاب ''الاغانی'' مرتب کر رہا تھا، تو ابھی کتاب مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اندلس سے الحکم کا قاصد اصفہانی کے پاس خطیر رقم کے ساتھ پہنچ گیا اور عباسیوں کے دار السلطنت بغداد سے پہلے ''الاغانی'' قرطبہ کے کتب خانہ میں داخل ہوگئی۔ یہ ''الاغانی'' کیا چیز ہے۔ ابن خلدون کے الفاظ میں اس کا جواب یہ ہے:

''فیہ اخبار العرب و اشعارھم و انسابھم و ایامھم و دولھم'' (۵۰)

''عرب کے ایام جاہلیت کے حالات و اشعار اور ان کے باہمی رشتے ان کے تاریخی ایام، ان کی حکومتوں کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے''۔

الاغانی کی ضخامت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ تیس اونٹوں پر جن معلومات کے لیے صاحب بن عباد اپنے ساتھ سفر میں کتابیں لے جایا کرتے تھے۔ الاغانی کی تصنیف کے بعد تیس اونٹوں کی ضرورت ختم ہوگئی کیونکہ الاغانی میں وہ سب کچھ موجود تھا جو تیس اونٹوں پر لدی ہوئی کتابوں میں تھا۔

ان مروانی حکمرانوں کے علمی مذاق سے اندلس کے عام مسلمان کس حد تک متاثر تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ قرآن و حدیث کے حفاظ تو خیر ہر اسلامی علاقہ میں اس زمانہ میں پائے جاتے تھے لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ''الاغانی'' کے مجلدات ضخیمہ کے حفاظ بھی اندلس میں پائے جاتے تھے، المراکشی نے معجب میں ''الاغانی'' کے ایک حافظ کا ذکر جن لفظوں میں کیا ہے عام حالات میں مشکل ہی سے اس کو صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے (۵۱) اور ایک الاغانی کیا اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اندلس میں ''سیبویہ'' کی مشہور نحو کی اساسی کتاب کے حفاظ بھی تھے۔ دواوینِ عرب کے حافظوں کی تو نہ حد تھی، نہ حساب، اس سلسلہ کا ایک دلچسپ لطیفہ اسی کتاب میں یہ نقل کیا ہے کہ عربی زبان میں شعر کہنے والوں کو صلہ

Marfat.com

اور انعام دینے کے لیے اندلس کے بعض امیروں نے اپنی زمین وقف کر رکھی تھی۔ مساجد و مدارس و شفاخانے وغیرہ جیسے نیکی کے کاموں کے متعلق اوقاف تو خیر مسلمانوں کے یہاں ایک عام طریقہ تھا۔ لیکن شعراء کے لیے وقف یہ صرف اندلس ہی کی سرزمین کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔(۵۲) میرے سامنے تفصیل نہیں ہے، بلکہ مروانی حکمرانوں کی بدولت اندلس کے مسلمانوں پر جو ذہنیت غالب تھی، تاریخ اندلس کی چند عام چلتی پھرتی مثالوں سے اسی کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ خود اسی اندلس سے وطنی تعلق رکھنے والے مؤرخ ابن خلدون نے بھی اقرار کیا ہے:

''و اما اهل الاندلس فا فادهم التفنن فی التعلیم و کثرة روایة الشعر و الترسل و مدارسة العربیة من اول العمر حصول ملکة، صاروا بها اعرف فی اللسان العربی و قصروا فی سائر العلوم لبعد هم عن مدارسة القران و الحدیث الذی هو اصل العلوم و اساسها''۔(۵۳)

''رہے اندلس والے سو تعلیم میں چونکہ وہ تنوع پسند واقع ہوئے ہیں، شعر اور انشا پردازی، عربیت (یعنی ادب عربی) میں ابتداءِ عمر سے اپنے اوقات صرف کرتے ہیں، اسی لیے عربی زبان کا تو ان کو کافی ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر ان کے سوا دوسرے علوم میں کوتاہی رہ جاتی ہے کہ قرآن و حدیث جو سارے علوم و فنون کی بنیاد ہے ان کے درس و تدریس سے وہ بے تعلق رہتے ہیں''۔

اور عربیت کا یہ رنگ گہرا ہوتے ہوتے اندلس کے ان ہی مروانی حکمرانوں میں یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ ان کے بعض حالات و واقعات کو پڑھ کر آدمی بھونچکا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور سوچنے لگتا ہے کہ کیا اسلام کے بعد بھی جاہلیت کی باتیں

Marfat.com

اندلس میں زندہ ہوگئی تھیں ۔ المراکشی نے المغرب میں الحکم کے ذکر میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ اپنے دشمنوں کے درمیان جب وہ گھرا ہوا تھا اور اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ لوگ اس کو قتل کر دیں گے، تو اپنے ایک غلام کو اس نے شاہی عطر پیش کرنے کا حکم دیا، غلام کچھ پس و پیش کرنے لگا کہ ایسی حالت میں عطر کی بھلا کیا ضرورت ہے، تو ڈانٹتے ہوئے غلام سے کہا:

''دیکھ! جب میرا سر کاٹا جائے گا، تب شاہی عطر ہی سے لوگ پہچان سکیں گے کہ یہ کسی عام کا نہیں بلکہ بادشاہ کا سر ہے'' (۵۴)

ایام اسلام کے اس الحکم کے اس قول کو پڑھ کر ایامِ جاہلیت کے ابوجہل یا (ابوالحکم) کی وہ فرمائش یاد آ جاتی ہے جو اپنے سر کاٹنے والے سے اس نے ان الفاظ میں کی تھی:

''دیکھ سردار کا سر ہے، ذرا نیچے سے اس کو تراشنا، تاکہ مقتولوں کے درمیان جب میرا سر رکھا جائے تو عامیوں کے سروں سے وہ کچھ اونچا نظر آئے''

اور سچ تو یہ ہے کہ دنیاوی منافع کے لیے اپنے بیٹے اور بیٹے کے بال بچوں کو بھی قتل کرنے سے نہ جھجکنا جس ملک میں اس کے نمونے پیش ہو رہے ہوں، وہاں عربیت جس رنگ میں پہنچی تھی، اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے۔

بہرحال بات بہت طویل ہوگئی، میری غرض صرف یہ ہے کہ مروانی حکومت اندلس میں جن خصوصیتوں کے ساتھ قائم رہی اور اس حکومت کے زیرِ اثر مسلمانوں میں جن جذبات و عواطف کا نشوونما ہوتا رہا، پڑھنے والوں کو اس کا کچھ اندازہ ہو سکے اور ان معلومات سے جو نتائج بھی پیدا ہو سکتے ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر اب میں اس سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں کہ اندلس جیسے کوہستانی ملک اور سنگستانی خطہ میں دولت کا یہ طوفان جس کا تماشا اندلس کے مروانی حکمرانوں کے زمانہ میں کیا گیا تھا،

Marfat.com

کہاں سے امنڈ رہا تھا، خود اس ملک کی خراجی آمدنی ابن خلدون کے بیان سے آپ سن چکے ہیں کہ وہ اسی قدر تھی جتنی آمدنی عباسیوں کو بن کھیتی والے بیابان حجاز سے وصول ہوتی تھی، مگر یہی مؤرخ اس کی خبر بھی دیتا ہے کہ الزہرا کا بانی عبد الرحمٰن الناصر اپنی شاہ خرچیوں کے باوجود خزانہ میں پندرہ ہزار ملین پونڈ (دینار) چھوڑ کر مرا تھا، بلکہ المقری نے اسی قصر الزہرا کے تعمیری منتظمین کے حوالہ سے اس کی تعمیر کے مصارف کا تخمینہ بتاتے ہوئے لکھا ہے:

''قدر النفقة فيها في كل يوم بثلثمائة الف دينار مدة خمسة و عشرين عاما''۔(۵۵)

''یعنی پچیس سال تک تین کروڑ پونڈ (دینار) روزانہ اس قصر کی تعمیر میں صرف ہوتے رہے''۔

واللہ اعلم بالصواب، یہ روایت کہاں تک درست ہے لیکن اگر کچھ بھی اس میں واقعیت ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اندلس کے خراج کی جس قدر سالانہ آمدنی تھی، یعنی ''ثلاثمائة الف دينار'' اسی قدر رقم یومیہ قصر الزاہراء کی تعمیر میں پچیس سال تک صرف ہوتی رہی۔

ممکن ہے کہ ان اعداد و شمار میں مبالغہ اور اغراق کے عناصر بھی شریک ہوں لیکن یہ تو تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ اس مبالغہ میں حقیقت کا بھی کچھ حصہ کسی نہ کسی حد تک ضرور شریک ہوتا ہے اور اندلس کے مروانی امیروں اور دولت مندوں کے جو آثار آج بھی کسی نہ کسی حد تک اس سرزمین میں موجود ہیں وہ اس کی شہادت کے لیے کافی ہیں کہ ان اولوالعزمیوں کی مصارف اندلس جیسے ملک کی خراجی آمدنی سے کسی طرح پورے نہیں ہو سکتے تھے۔

پھر آمدنی کے ان لامحدود ذرائع کا سرچشمہ آخر کیا تھا اور کہاں تھا؟

اس سوال کا تاریخ کی روشنی میں جو جواب مجھے ملا ہے، اس نے اندلس کے متعلق میرے نقطہ نظر ہی کو بدل دیا۔ یعنی اس زمانہ میں اندلس کے لفظ کو خوف و ہراس، دہشت و وحشت کے بھیانک خطرات کا جو مجمسہ مسلمانانِ عالم کے لیے بنا دیا گیا ہے بالکل اس کے برعکس اندلس کا یہی لفظ مجھے تو رجائیت اور امید کا مطلع نظر آتا ہے اور اندلس کی تاریخ کے اس رخ کو مسلمانوں میں مرونی اور افسردگی پیدا کرنے کے بجائے امید و شگفتگی اور زندگی پیدا کرنا چاہیے۔

واقعہ یہ ہے کہ اندلس پہنچنے کے ساتھ ہی مسلمانوں کے قدم جزیرہ نما تک محدود نہ رہے، بلکہ فاتح اندلس طارق کا آقا موسیٰ بن نصیر، طارق کی فتح اندلس کے بعد اندلس کے راستہ سے پائیرینز کے دروں تک پہنچ چکا تھا۔ جس کے بعد یورپ کا سرسبز و شاداب وسیع علاقہ تھا جس میں فرانس اور اس کے ملحقہ تمام ممالک شامل تھے۔ اس لیے پائیرینز کے اس پار کے ملکوں سے مسلمان ابتدا ہی میں واقف ہو چکے تھے۔

آج یورپ جس حال میں بھی ہو، لیکن ان عربی مسلمانوں کے گھوڑوں کے پاؤں جس وقت پائیرینز کے دروں تک پہنچے ہیں اس وقت یورپ کا یہ وسیع علاقہ بجز معدودے چند سلطنتوں کے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا اور کلیسا اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ریاستوں اور امارتوں کے اس انتشار اور اس کی باہمی رقابت کو باقی رکھنا چاہتا تھا، اسی توازنِ قوت میں کلیسا کی بھلائی کا راز مضمر تھا۔

ان منتشر، پراگندہ اور ایک دوسرے سے ٹکرا دینے والی یورپین ریاستوں کی حکومت کا دارومدار لوٹ کھسوٹ پر تھا۔ غریب رعایا جو کچھ بھی اپنی محنت سے پیدا کرتی اور کماتی تھی اس کو محصولات اور ٹیکسوں وغیرہ کے حیلوں اور بہانوں سے حکومت اور اس کے چند مخصوص کارندے سمیٹ کر اکٹھا کر لیتے تھے۔ الغرض باشندے تو اس ملک کے بکھرے ہوئے تھے، مگر اس کی آمدنی چند خاص مرکزوں میں

Marfat.com

سمٹ کر ہر سال جمع ہو جاتی تھی۔ یورپ کی تاریخ کا یہی دور ''قرون مظلمہ'' یا عہد تاریک کے نام سے موسوم ہے۔ اور یورپ کی تاریخ کے انہی تیرہ و تار دنوں میں پائیر نیز کے دروں تک اندلس کے عرب مسلمان پہنچے۔ چنانچہ اندلس اور اس کے اطراف و جوانب کی ریاستوں سے بھی ان مسلمانوں کی کشمکش شروع ہی سے جاری تھی۔ اور پائیر نیز کے دروں سے گذر کر ان فراخ میدانوں کی امارتوں سے بھی دست و گریبان رہتے تھے۔ ۹۲ھ/ ۷۱۱ء سے جو فتحِ اندلس کا سال ہے، ۸۹۷ھ/۱۴۹۱ء تک جب فرڈی نینڈ کے محاصرہ کے بعد غرناطہ کا سقوط یعنی کم و بیش آٹھ صدیوں تک اندلس کے مسلمانوں اور یورپ والوں سے مسلسل معرکوں کے بعد معرکے ہوتے رہے۔ اگر ان سب کی فہرست بنائی جائے تو شاید کئی ہزار تک ان کی تعداد پہنچ جائے گی۔

اس کا اجمالی اندازہ کرنے کے لیے یہ تاریخی مثال کافی ہو سکتی ہے کہ مروانیوں کی مرکزی حکومت کے آخری دور اور نام نہاد مروانی خلیفہ المؤید یا بعد کے عہد میں قاضی ابن عامر کے ہاتھوں حکومت کی باگ تھی۔ اس ابن عامر کے متعلق ہمارے مؤرخین نے لکھا ہے:

''اپنے ۲۶ سال کے دورِ حکومت میں صرف ابن عامر کو ۵۲ معرکے یورپین قوموں سے سر کرنے پڑے''۔ (۵۶)

یعنی سال میں دو حملے کے اوسط سے قاضی ابن عامر اور ان کی فوج یورپین علاقوں کو اپنا تختہ مشق بنائے ہوئی تھی۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ جس زمانہ میں مروانیوں کی مرکزی حکومت عروج و شباب کے آخری نقطوں تک قوت و دولت کے اعتبار سے پہنچی ہوئی تھی اس زمانہ میں عرب فاتحوں کی تاخت و تاراج کا کیا حال ہوگا۔ ۲۶ سال کی حکومت میں ایک آدمی جب ۵۲ چھاپے مار سکتا تھا، تو اندلس کے

Marfat.com

ان متعدد اولوالعزم مروانی فرمانرواؤں اور کشور کشاؤں کے زمانہ میں جو کچھ بھی ہوا ہوگا آج ہم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔

تاہم اندلس کی مبسوط اور مفصل تاریخوں سے کوئی چاہے تو ان جنگی مہموں کی فہرست بنا سکتا ہے کہ کئی صدیوں کی بے شمار لڑائیوں میں ''الحرب سجال'' کے قاعدے سے ہمیشہ میدان مسلمانوں ہی کے ہاتھ نہیں رہتا تھا لیکن اندلس کی تفصیلی تاریخ کا مطالعہ جن لوگوں نے کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ مروانیوں کی مرکزی حکومت جب تک قائم رہی اور اس کے کچھ دن بعد تک بھی ننانوے فیصد مہموں میں میدان عموماً مسلمانوں ہی کے ہاتھ رہا۔

اسی یورپ پر جس کا حال آج جو کچھ ہے اسے ہم سب دیکھ رہے ہیں وہ زمانہ بھی گذرا ہے جب مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کے مقتولوں کی تعداد تین تین لاکھ تک پہنچ جاتی تھی اس کی کثرت کو بتاتے ہوئے ہمارے مؤرخین بھی لکھتے ہیں کہ:

''جمع الرؤس اکدا ساحتی کأن الفارس لا یری من یقابله'' (۵۷)

''مقتولوں کے سروں کو بطور ڈھیر کے جمع کر دیا گیا تھا کہ اتنی اونچی دیوار ان سے تیار ہوگئی کہ گھوڑے کا سوار بھی ڈھیر کے اس پار والے سوار کو نہیں دیکھ سکتا تھا''۔

اور لاشوں کے پشتوں پر اذان دینے کے واقعہ کا اعادہ تو ان تاریخوں میں اتنی دفعہ کیا گیا ہے کہ گویا اندلس کے مسلمانوں کی یہ ایک عام عادت ہوگئی تھی۔

مقتولوں کے ساتھ قیدیوں کی تعداد بھی ہزاروں سے کم نہیں بتلائی جاتی۔ قاضی ابن عامر ہی کے زمانہ میں جو بڑا معرکہ فرانسیسیوں سے پیش آیا تھا لکھا ہے:

''اجتمع من السبی ثلاثون الفاً'' (۵۸)

''تیس ہزار قیدی اکٹھے ہوگئے''

Marfat.com

یہی یورپ جو آج ساری دنیا کو اپنے جال میں پھنسائے ہوئے ہے، اس کا ایک زمانہ تو یہ تھا، اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی یہ حالت تھی:

''مروانی حکمران ہشام بن عبدالرحمٰن کی حکومت کے زمانہ میں ایک صاحب نے مرتے وقت یہ وصیت کی کہ میرے متروکہ مال کے ایک حصہ سے فدیہ دے کر مسلمان قیدیوں کو چھڑایا جائے۔ اس کی موت کے بعد قاضی نے وصیت کے مطابق حکومت سے درخواست کی کہ دشمنوں کے پاس اگر کوئی مسلمان قیدی ہو، تو اس کا پتہ چلایا جائے، تاکہ فدیہ کا روپیہ مالِ متروکہ سے الگ کر کے داخل کیا جائے''۔ (۵۹)

حکومت نے اس سلسلہ ممکنہ کی کاروائی جو وہ کرسکتی تھی کرتی رہی، لیکن تحقیق سے ثابت ہوا:

''لم یوجد فی دار الکفار اسیریشتری و یفک لضعف العدوّ قوة المسلمین''(۶۰)

''غیر اسلامی حکومتوں میں کوئی ایسا مسلمان قیدی نہ ملا جسے فدیہ دے کر چھڑایا جائے یہ دشمن کی کمزوری اور مسلمانوں کی قوت کا حال تھا''

میرا مقصود مؤرخ کے آخری الفاظ یعنی ''لضعف العدوّ قوة المسلمین'' کا ایک اجمالی نقشہ ان سرسری معلومات کی روشنی میں پیش کرنا ہے۔

ذرا خیال کیجیے ایک ایک جنگ میں مسلمانوں نے تیس تیس ہزار یورپین قید کیے ہیں اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ حکومت اپنے سارے ذرائع سے کام لینے کے بعد بھی کسی ایسے مسلمان کا پتہ نہ چلاسکی جو یورپ کی لڑنے والی قوموں کی قید میں ہو۔

اختتام جنگ کے بعد بسا اوقات یورپ کی شکست خوردہ حکومتیں اپنے قیدیوں کو بڑی سے بڑی رقمیں پیش کر کے قید سے چھڑایا کرتی تھیں، ابن اثیر نے

ایک موقع پر لکھا ہے کہ ایک یورپین امیر جو مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہو گیا تھا:

"افتدی نفسہ منھم بتسعین الف دینار" (۶۱)

"نوے ہزار اشرفیاں دے کر اپنی گلوخلاصی اس نے کرائی"

یہ واضح رہے کہ طلائی سکہ یعنی نوے ہزار دینار کی رقم روپیہ کی شکل میں کئی لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ ایک قیدی کے زرفدیہ میں کبھی کبھی ایسی خطیر رقمیں بھی وصول ہوتی رہتی تھیں۔ اور یہ رقم غنیمت کے ان اموال کے سوا تھی جن کا ذکر کرتے ہوئے عموماً مؤرخین:

"لا یعلمه الا الله"

"نہیں جانتا ہے ان کی مقدار اور تعداد کو مگر صرف اللہ تعالیٰ"، لکھا کرتے ہیں جس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یورپ کے ان سپاہیوں کے ضعف، جبن، بزدلی اور کم ہمتی کی کیفیت یہ تھی کہ ایک دفعہ شمالی افریقہ کے صحرائی بربری مسلمانوں کی ایک ٹولی وہاں کی مقامی حکومت سے خفا ہو کر اندلس چلی گئی، قاضی ابن عامر نائب السلطنتِ مروانیہ کا زمانہ تھا، اس کی صحیح تعداد تو معلوم نہ ہو سکی لیکن ایک ٹولی سے زیادہ حیثیت ان بربری مسلمانوں کی نہ تھی۔ قاضی ابن عامر نے لوگوں کو اپنے یہاں ٹھہرالیا کچھ دن گذرنے کے بعد ان لوگوں نے قاضی صاحب سے عرض کیا کہ ہم لوگ اندلس میں بے کار بیٹھے بیٹھے کب تک دن گذاریں اور اندلسی مسلمانوں کی اس چراگاہ کی طرف اشارہ کیا، جو پرنیز کے دروں سے گذرنے کے بعد ملتی تھی۔ قاضی نے ان کی مرضی کے مطابق اندلس کی حکومت کے فوجیوں کو بھی ان لوگوں کے ساتھ کر دینا چاہا لیکن ان بربری مسلمانوں نے انکار کیا اور عرض کیا کہ ہم جتنے کچھ بھی ہوں، دشمنوں کے لیے کافی ہیں، البتہ کچھ ساز و سامان سے مدد کر دیجیے، چنانچہ گھوڑے اور اسلحہ کا انتظام ان

Marfat.com

کے لیے کر دیا گیا اور یہ لوگ دروں سے گذرتے ہوئے اس علاقہ میں پہنچ گئے جہاں گال قوموں کا دار السلطنت تھا۔ رات کو ایک باغ پر حملہ کیا لوگ شہر سے نکل پڑے بربری کسی ٹیلے کی آڑ میں چھپ گئے اور جب شہر والے اس ٹیلے کے آگے نکل گئے تو پیچھے سے تکبیر کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ان پر جا پڑے، دشمن کے آدمیوں نے خیال کیا کہ کوئی بڑی فوج ان کے ساتھ ہے، اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور بربریوں کی یہ ٹولی مظفر و منصور مالِ غنیمت کے ساتھ قاضی ابن عامر کی خدمت میں پہنچ کر شاباشی کی مستحق قرار پائی۔ (۶۲)

بعض واقعات ان ہی قاضی ابن عامر ہی کے سلسلہ میں ایسے بیان کیے جاتے ہیں کہ بے ساختہ آدمی کو ہنسی آ جاتی ہے اور خدا کی شان نظر آتی ہے، یہی یورپ ایک زمانہ میں کیا تھا اور آج وہ کیا ہو گیا ہے۔ ایک دفعہ خود قاضی ابن عامر جو یرنیز کے دروں سے اپنی فوج لے کر فرانس میں داخل ہوئے اور تاخت و تاراج کرتے ہوئے اندرونِ ملک میں دور تک گھستے ہی چلے گئے، فرانسیسیوں نے ان قبائلی ریاستوں کے آدمیوں کو ملا لیا جو برنیز کے ان دروں کے آس پاس آباد تھے اور ان ہی کے ذریعہ جو یرنیز کے پہاڑی درے اس طریقہ سے بند کر دیئے گئے کہ مسلمانوں کے لیے واپسی ناممکن ہو گئی۔ قاضی صاحب کو وقت پر خوب سوجھی اپنی فوج کے آدمیوں کو حکم دیا کہ جس کو جہاں موقع ملے مکانات کی تعمیر اور کھیتی شروع کر دے اور دوکانیں قائم کر دے۔

غرض ایسے حالات پیدا کیے گئے، جن سے یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ مسلمانوں نے دروں سے باہر جانے کا خیال ہی چھوڑ دیا اور یہاں مستقل طور پر توطن پذیر ہو جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ فرانسیسیوں نے یہ رنگ دیکھا تو ان کے ہوش اڑ گئے وہ مسلمان جو دروں سے گذرنے کے بعد ان کے ملک پر ہر سال مصیبتیں توڑا کرتے

Marfat.com

تھے اگر ان کے ملک ہی میں آباد ہو جائیں گے تو کیا قیامت ڈھائیں گے یہی سوچ کر اسی وقت ان کے سفراء قاضی صاحب کے پاس پہنچے کہ درے کھول دیئے جاتے ہیں آپ لوگ واپس تشریف لے جائیں۔ لیکن ہمارے ملک کی کوئی چیز آپ کے ساتھ نہ جا سکے گی۔ یعنی غنیمت کے اموال واپس کر دیئے جائیں۔ قاضی صاحب نے یہ سن کر کہا کہ خواہ درے کھولے جائیں یا نہ کھولے جائیں ہم لوگوں نے تو اب اسی پار مستقل توطن کا ارادہ کر لیا ہے۔ تب سفراء نے کہا کہ اچھا مال غنیمت بھی ساتھ لے جائیں اور کسی طرح ہمارے علاقہ سے نکل کر آپ دروں کے پار چلے جائیں۔ قاضی نے پھر بھی قیام پر اصرار کیا۔ بالآخر یورپین سفیروں نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

> ''اموال غنیمت بھی اپنے ساتھ لے جائیں، اس کے سوا ہم لوگ اور بھی اتنی رقم پیش کریں گے، آپ کے اموال غنیمت کی بار برداری کے لیے سواریاں بھی مہیا کرتے ہیں''۔ (۶۳)

اس وقت قاضی صاحب نے قیام کے مصنوعی ارادہ کے فسخ کا اعلان کیا اور حسب شرائط جوپرینیز کے دروں سے سب کچھ لیے ہوئے اندلس صحیح و سالم و غانم واپس پہنچ گئے۔ (۶۴)

بہر حال مسلمانان اندلس کی ضخیم و طویل تاریخ سے چند جستہ جستہ شہادتوں کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ اس لیے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اندلس کی مروانی حکومت کی دولت و ثروت جس کے بل پر وہ آخری زمانہ میں عباسی خلفاء کے ساتھ ہم چشمی اور ہمسری کی مدعی بن بیٹھی تھی اور اس کی ساری اولوالعزمیوں کا سرچشمہ اندلس کی سرزمین نہ تھی، جسے مسلمانوں نے چھوڑ دیا۔ بلکہ اندلس کی حیثیت تو گویا ایک اڈے کی تھی اور دولت و ثروت کا طوفان جو اس ملک میں امنڈ آیا تھا اس کا دہانہ اندلس سے باہر آس پاس کی ریاستیں اور جوپرینیز

Marfat.com

کے دروں کے پار والے وسیع میدانوں والی یورپین حکومتیں تھیں ۔ یورپ کی یہ حکومتیں ان کے امراء ، اہل کار اور کلیسا کے پادری ، یورپ کے عوام کو لوٹ لوٹ کر اپنے گھر بھرتے تھے اور ان بھرے ہوئے گھروں سے اندلس کے مسلمان جو کچھ جب جی چاہتا تھا لے آتے تھے وہ ان کے لیے تو ایک نوالہ اور نہ ختم ہونے والا دفینہ تھا جو اندلس کی راہ سے ان پر منکشف ہوا تھا ۔

اس میں شک نہیں کہ یہ جو کچھ کیا جاتا تھا وہ اسلام اور کفر ہی کے نام سے کیا جاتا تھا لیکن کیا واقعی اسلام ہی کے لیے یہ جدو جہد تھی اور اس کا انجام اندلس کے مسلمانوں کے سامنے کیا اسی شکل میں آ سکتا تھا جیسا کہ بعد کو آیا ۔ اس مسئلہ کے اس پہلو پر ہم آئندہ بحث کریں گے ۔ سردست صرف دو ہی نتیجوں کی طرف پڑھنے والوں کا ذہن منتقل کرنا چاہتے ہیں ایک تو وہی کہ جزیرہ نمائے اندلس کی جو اہمیت وہاں کے مروانی حکمرانوں کی دولت وثروت و وقار و عظمت کی داستانوں کو سنا کر پیدا کر دی گئی ہے ان کے بچے کھچے آثار کے دیکھنے والے اندلس کے متعلق جن غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں ان کا ازالہ ہو جائے کہ یہ جو کچھ تھا اندلس کی بدولت نہ تھا اس لیے اندلس کو ہم نے اگر کھویا تو کوئی ایسی چیز نہیں کھوئی ہے جس پر اتنا ماتم کیا جائے اور خواہ مخواہ اس کے عشق کا آزار دلوں میں پیدا کیا جائے بلکہ سچ تو یہ ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ ہمارے لیے شاید وہی اندلس زیادہ مفید ثابت ہوتا جس میں یہ سب نہ ہوتا ، نہ الحمراء ہوتا ، نہ الزہراء ، نہ ہمارا قرطبہ ، اور غرناطہ ، مگر جو فرض آخر الامم ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں پر عائد کیا گیا ہے اگر اس کو پیشِ نظر رکھ کر کام کیا جاتا تو آج سیاسی مصائب و آفات کے جن گردابوں میں ہم تہ و بالا ہو رہے ہیں شاید یہ صورتِ حال پیش نہ آتی ۔

یورپین اقوام کے ساتھ اندلسی مسلمانوں کی کش مکش کے سلسلے میں جن

Marfat.com

واقعات کا تذکرہ میں نے کیا ہے سلطانی کو اپنے پدری حقوق سمجھنے والوں کے لیے خواہ ان کی نوعیت جو کچھ بھی ہو لیکن دین ہی کے سامنے نہیں بلکہ عقل اور انسانیت کے سامنے بھی کم از کم میری گردن تو جھک جاتی ہے درد کی اس داستان کو ہم آئندہ بیان کریں گے۔ اس کے سوا دوسری بات جس کی طرف توجہ دلانا ہے وہ یہ ہے کہ وہی یورپ جسے اندلسی مسلمانوں کے مقابلہ میں آپ دیکھ چکے، ایک زمانہ میں کیا بنا ہوا تھا اگر وہ جدوجہد، سعی وکوشش کی سرگرمیوں کی بدولت عزت واقتدار کی ان بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے تو مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالیوں کو دیکھ کر یہ کتنا غلط اور حد سے زیادہ قنوطی بلکہ شاید ابلیسی فیصلہ ہے کہ مسلمانوں کی یہ پستیاں بلندیوں سے نہیں بدل سکتی ہیں۔

سچ پوچھیے تو اندلس کی تاریخ کا یہی وہ پہلو ہے جس کو پیش نظر رکھتے ہوئے خوف اور دہشت کی جگہ جو اندلس کے لفظ کے سننے کے ساتھ ہی ہم میں پیدا ہو جاتی ہے، یا ان کیفیات کے پانے کے ہم عادی بنا دیئے گئے ہیں۔ قطعاً ان کے برعکس ہم تو اپنے اندر امید اور رجاہی کی روشنی پاتے ہیں، یقیناً اس گئی گذری حالت میں بھی دنیا کے مسلمان قرونِ مظلمہ کے یورپین باشندوں سے بہر حال بہتر ہیں، ان بدترین حالات سے نکل کر جب موجودہ بہترین حالات تک یورپ والے پہنچ سکتے ہیں تو مسلمانوں کو روح اللہ سے اپنے آپ کو بلا وجہ مایوس بنا لینے کی کوئی وجہ نہیں۔

Marfat.com

حواشی

الف۔ حضرت مولانا نے اس فقیر کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ محض ان کی خورد نوازی اور ان کے خلق و شرافت کا نتیجہ ہے جس کا یہ ننگ اسلاف مستحق نہیں، مگر ان کی تحریر میں تصرف کی جرأت بھی نہیں تھی، اس لیے ایک برگزیدہ عالم دین و آلِ رسول کے ان کلماتِ خیر کو اس کے ایک خادم کے حق میں دعا اور باعثِ خیر و برکت سمجھ کر بجنسہ شائع کر دیا گیا۔

ب۔ یہ مولوی عنایت اللہ صاحب مرحوم سابق ناظم دار الترجمۃ حیدر آباد اور ان کی کتاب جغرافیہ اندلس کی طرف اشارہ ہے۔

ج۔ عمواس شام کی ایک وادی کا نام ہے جہاں پچیس ہزار مسلمان جن میں صحابہ کرام کی بھی کافی تعداد تھی، طاعون میں شہید ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ نصف دنیا کی فتح کرنے کے لیے یہ پچیس ہزار مسلمان فوجی کافی تھے باقی ناموں سے لوگ عام طور پر واقف ہیں، یا کتابوں میں ان واقعات کی تفصیل پڑھنی چاہیے۔

د۔ حجاز کی خراجی آمدنی میں غالب قرینہ ہے کہ عرب کے دوسرے علاقے مثلاً یمن، بحرین، عمان کی آمدنی بھی اسی قسم میں شریک ہوگی۔

ھ۔ کامل میں ابن اثیر نے پوری نظم نقل کی ہے جس میں ایک شعر یہ بھی تھا۔

فقلت شبیھی فی التغرب و النوی — وطول التنائی عن بنی و عن اھلی

(الکامل، ۳۸/۶، ابن اثیر، مبارک بن محمد، مصر، مطبع احمد الحلبی، ۱۳۰۲ھ)

و۔ نقرئی سکہ سے طلائی سکے کے اس ذخیرہ کو بدل دینے کے بعد حساب کر کے بعضوں نے دعویٰ کیا ہے کہ کئی ارب روپے تک عبد الرحمٰن کا متروکہ پہنچ جاتا ہے۔

ز۔ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں نقل کیا ہے کہ ضرار بن الخطاب ایک قریشی عربی تھے انہوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے قبیلہ مضر کے کسی آدمی کو کبھی قتل نہ کروں گا، احد کی جنگ میں قریش کی طرف سے مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ بھی آئے تھے۔ گھمسان کا رن جب پڑا تو عبد اللہ بن جحش صحابی جو قبیلہ مضر ہی کے تھے ضرار کی تلوار کے سامنے آ گئے، یہ دیکھ کر چلانے لگے۔ ابن جحش میرے سامنے سے ہٹ جاؤ تم مضری ہو، اس لیے میں تم کو مار نہیں سکتا، عبد اللہ بن

Marfat.com

جحش نے یہ سن کر کہا کہ اے خدا کے دشمن کفر کے ساتھ تیری اس عصبیت (نیشنلٹی) نے تو تیرے قتل کو میرے لیے زیادہ محبوب بنا دیا ہے۔ گویا کفر اور عصبیت دونوں کی حیثیت ان کی نظر میں برابر تھی۔ (تاریخ دمشق، ۲۴/۷، ابن عساکر، علی بن حسین، مطبع روضۃ الشام، ۱۳۳۲ھ)

ح۔ یہ فیصلہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں دیا تھا۔

ط۔ تفصیل کے لیے: الکامل، ۱۷۹/۴

ی۔ حجاز کے عربوں کی اکثریت نزار بن معد بن عدنان کی نسل سے تھی، اسی لیے ان کو نزاری بھی کہتے تھے اور یمن کے باشندے قحطانی عرب تھے، اس فتنہ کی تعبیر کبھی مضر و یہ قیسیہ سے بھی کی جاتی تھی، تفصیل کے لیے بڑی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔

ک۔ قرآن کی مشہور آیت ﴿یا ایھا الناس انا جعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا﴾ (الحجرات/۱۳) میں ''شعوب'' کا لفظ جو آیا ہے، جس میں اقوام و قبائل کی تقسیم کے متعلق یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ باہمی تعارف کے لیے اس کا استعمال اس تقسیم کا قدرتی استعمال ہے۔ لیکن اس کو قومی نخوت، قبائلی برتری اور دوسروں کی پستی اور ہیچ مبرزی کا ذریعہ بنالینا اس کا غیر فطری استعمال ہے۔

اقوام و امم کی باہمی خونریزیوں کے اسباب میں بڑا تاریخی سبب یہی غلط استعمال بن گیا ہے آگے قرآن مجید میں یہ فرما کر کہ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (الحجرات/۱۳) (خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہے) حاصل جس کا وہی ہے کہ برتری و فضیلت کا معیار ذات نہیں، بلکہ صفات ہیں۔ ذات کچھ بھی ہو، عربی ہو، یا عجمی لیکن خدا کے یہاں وہی شریف ٹھہرایا جائے گا جو اپنی سیرت و کردار میں خدا کے نشان زدہ حدود پر ٹھہرا ہوا ہے اور تقوی کی زندگی گذارتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے استدلال کرنے والوں کا نام ''شعوب'' کے لفظ کی وجہ سے شعوبیہ رکھ دیا گیا تھا، اگر یہی واقعہ ہے تو ان مسلمانوں کی یہ بری دیدہ دلیری تھی۔ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شعوبیہ کے مقابلہ میں عربوں کی نسلی برتری ثابت کرنے کے لیے کتابیں بھی لکھی جاتی تھیں، العقد الفرید میں ابن قتیبہ مشہور مصنف کی ایک کتاب کا اسی سلسلہ میں تذکرہ کرتے ہوئے یہ عجیب لطیفہ لکھا ہے کہ نقص فی اخرہ کل ما بنی فی اولہ (العقد الفرید، ۶۳/۲، ابن عبدربہ، احمد بن محمد، مصر، مطبع الجمالیہ، ۱۳۳۱ھ) یعنی سارے انسانوں کے مقابلہ میں عربی نسل کی برتری کو جن دلائل سے ابن قتیبہ نے اپنی کتاب

Marfat.com

میں ثابت کیا تھا، آخر میں خود ہی سب کی تردید کر دی اور یہ نہ کرتے تو اور کرتے کیا؟۔

ل۔ اصل شعر یہ ہے:

کنا نسوس الناس والا أمر امرنا   إذ نحن فیهم سوقة ننتصف

یعنی ہم ہی لوگوں پر حکومت کرتے تھے، اور حکم صرف ہمارا حکم تھا، اچانک ہم ان لوگوں میں شریک ہو گئے جن پر دوسرے حکومت کرتے ہیں اور دوسروں سے اپنا انصاف کراتے ہیں۔(الکامل، ۱۸۵/۵)

م۔ مشہور ہے کہ درباریوں میں صرف ایک قاضی منذر البلوطی تھے، جنہوں نے اس چھچھورے پن اور کوتاہ نظری پر عبدالرحمٰن کو ڈانٹتے ہوئے کہا تھا کہ تمہارے ساتھ شیطان بازی گری کر رہا ہے۔ پھر قرآن کی مشہور آیت یاد دلائی جس کا حاصل یہی ہے کہ ''ناعاقبت اندیشی کی عام کمزوری جو انسانی فطرت میں پائی جاتی ہے، قدرت صرف اس کی رعایت کر رہی ہے ورنہ اپنے ظاہر و باطن کے لحاظ سے دنیا اور دنیا کی زندگی اتنی بے قیمت ہے کہ اللہ اور رسول کے منکروں کے مکانات، ان کی چھتیں، ان کے زینے، سب ہی چاندی سونے کے بنا دیئے جاتے، دیکھیے قرآن کی سورۂ زخرف کی آیت ۳۳ ﴿لو لا ان یکون الناس امة واحدة﴾۔ اس موقعہ پر اس دلچسپ لطیفہ کا خیال آتا ہے کہ یہی عبدالرحمٰن ناصر قصر الزہراء کا بانی و معمار جس میں بقول مقری پندرہ ہزار سے زیادہ بڑے اور چھوٹے کیواڑ استعمال کیے گئے تھے، ستونوں کی تعداد چار ہزار سے زیادہ تھی، کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن کی ایک ڈائری مرنے کے بعد ملی تھی، جس میں لکھا تھا کہ اپنی حکمرانی کی پوری مدت (پچاس سال) میں صرف چودہ دن مجھ پر ایسے گذرے ہیں جن میں کہہ سکتا ہوں کہ غم و الم فکر و تردد کے کانٹوں سے پاک تھے۔ (شذرات الذہب، ۵/۳، ابن العماد الحنبلی، عبدالحی بن العماد، بیروت، دار المسیرة، ۱۳۹۹ھ) یہی خود اعترافی شہادت قاضی البلوطی کی تنبیہ کے لیے کافی ہے۔

ن۔ قوط دراصل گاتھ کے لفظ کی معرب شکل ہے مسلمانوں سے پہلے گاتھ قوم ہی کے لوگ اندلس پر مسلط تھے، الدیباج الذہب میں ابن فرحون نے بیان کیا ہے کہ قوطیہ درحقیقت اندلس کے گاتھ بادشاہ رازدق کے نواسے کی لڑکی تھی۔ اسلام قبول کر کے اندلس سے فریادی بن کر ہشام بن عبدالملک وقت کے حکمران کے پاس پہنچی، اس شاہزادی سے عیسٰی بن مزاحم نے نکاح کر

Marfat.com

لیا۔ (الدیباج المذھب، ص ۲۶۲، ابن فرحون، ابراہیم ابن علی بن محمد، مصر، مطبعۃ السعادہ،
۱۳۲۹ھ)

حوالہ جات

۱۔ الکھف/۱۱۱

۲۔ الکامل، ۱۸۲/۵، ابن اثیر، مبارک بن محمد، مصر، مطبع احمد الحلبی، ۱۳۰۳ھ

۳۔ محولہ بالا

۴۔ مقدمہ، ص ۱۵۱، ابن خلدون، عبدالرحمن، مصر، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۹۳۶ء

۵۔ الکامل، ۲۲/۷ ۶۔ ایضا، ۳۸/۶

۷۔ المعجب، ص ۳۱، مراکشی، ابو محمد، عبدالواحد بن علی، مصر، مطبع السعادۃ، س۔ن

۷۔(ب) محولہ بالا ۷۔(ج) المعجب، ص ۳۲، ۳۱

۸۔ الکامل، ۱۸۳/۵ ۹۔ الکامل، ۳۰/۵

۱۰۔ مقدمہ ابن خلدون، ص ۱۵۱ ۱۱۔ الکامل، ۲۲/۷

۱۲۔ تاریخ ابن خلدون، ۱۴۴/۴، ابن خلدون، عبدالرحمن، مصر، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۹۳۶ء

۱۳۔ النور/۵۵ ۱۴۔ تاریخ ابن خلدون، ۲۲۵/۲

۱۵۔ محولہ بالا

۱۶۔ الطبقات الکبریٰ، ۴۴۲/۶، ابن سعد، محمد ابن سعد، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۱۹۹۷ء

۱۷۔ فتوح البلدان، ص ۳۰۰، البلاذری، احمد بن یحیٰ، برل، ۱۸۶۶ء

۱۸۔ ایضا، ص ۱۹۳

۱۹۔ احکام القرآن، ۱۷۵/۱۔۱۷۴، الجصاص، ابوبکر، احمد بن علی، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۱۴۱۲ھ

۲۰۔ ایضا، ۱۷۵/۱

۲۱۔ الجامع الصحیح، کتاب الاحکام، باب استقضاء الموالی واستعمالھم: ۶۷۵۴، بخاری۔

Marfat.com

محمد بن اسماعیل، دمشق، دار ابن کثیر، ۱۴۱۰ھ

۲۲۔ العقد الفرید، ۲/۲۶۰، ابن عبد ربہ، احمد بن محمد، مصر، مطبع الجمالیہ، ۱۳۳۱ھ

۲۳۔ محولہ بالا

۲۴۔ فتوح البلدان، ص ۲۰۱

۲۵۔ معرفۃ علوم الحدیث، ص ۱۹۹، حاکم، ابو عبداللہ، محمد بن عبداللہ، المدینۃ المنورہ، المکتبۃ العلمیہ، ۱۳۹۷ھ

۲۶۔ احکام القرآن، ۴/۲۹۶ ۲۷۔ الکامل، ۴/۱۷۹

۲۸۔ محولہ بالا ۲۹۔ احکام القرآن، ۴/۲۹۷

۳۰۔ مروج الذہب، ۷/۱۸۲، مسعودی، علی بن حسین، مصر، مطبع احمد الحلبی، ۱۳۰۳ھ

۳۱۔ الکامل، ۵/۱۳۷ ۳۲۔ الکامل، ۵/۱۸۳

۳۳۔ محولہ بالا ۳۴۔ الکامل، ۶/۴

۳۵۔ ایضاً، ۶/۳ ۳۶۔ مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۲۸

۳۷۔ ایضاً، ص ۲۲۸

۳۸۔ تاریخ دمشق، ۵/۵۶، ابن عساکر، علی بن حسین، مطبع روضۃ الشام، ۱۳۳۲ھ

۳۹۔ الکامل، ۸/۲۲۳ ۴۰۔ محولہ بالا

۴۱۔ محولہ بالا ۴۲۔ محولہ بالا

۴۳۔ شذرات الذہب، ۳/۵۶، ابن العماد الحنبلی، عبدالحی بن العماد، بیروت، دار المسیرۃ، ۱۳۹۹ھ ۴۴۔ الکامل، ۳/۵۶

۴۵۔ شذرات الذہب، ۳/۶۲ ۴۶۔ محولہ بالا

۴۷۔ محولہ بالا

۴۸۔ وفیات الاعیان، ۴/۳۶۸، ابن خلکان، شمس الدین، احمد بن محمد، ایران، منشورات الرضی، ۱۹۷۱ء ۴۹۔ تاریخ ابن خلدون، ۴/۱۴۶

۵۰۔ مقدمہ ابن خلدون، ۱/۱۸۶ ۵۱۔ المعجب، ص ۵۴

۵۲۔ ایضاً، ۵۵۔۵۳ ۵۳۔ مقدمہ ابن خلدون، ۱/۴۷

Marfat.com

۵۴۔ المعجب، ص ۱۳
۵۵۔ شذرات الذہب، ۳/۴
۵۶۔ الکامل، ۲۲۵/۶
۵۷۔ ایضاً، ۱۷۲/۶
۵۸۔ ایضاً، ۱۲/۹
۵۹۔ ایضاً، ۱۹/۶
۶۰۔ الکامل، ۱۹/۶
۶۱۔ ایضاً، ۲۱۸/۷
۶۲۔ الکامل، ۱۱/۹
۶۳۔ ایضاً، ۲۲۵/۸
۶۴۔ محولہ بالا

Marfat.com

شیخ اکبر محی الدینؒ ابن عربی کا نظریہ علم (الف)

نظریہ علم (Theory of knowledge)

مشہور اسلامی عارف حضرت شیخ محی الدین ابن عربی جو عموماً مسلمانوں میں شیخ اکبر کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ خاکسار نے مجلس دائرۃ المعارف کی ایک علمی بزم میں جو غالباً ۱۹۳۷ء میں حیدرآباد ہی میں منعقد ہوئی تھی۔ شیخ ہی کے متعلق ایک مقالہ عربی زبان میں سنایا تھا۔ اس مقالہ میں حضرت شیخ کے علمی نقاطِ نظر پر ایک اجمالی تبصرہ کیا گیا تھا، جو طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ منجملہ اور باتوں کے ان کے متعلق میں نے یہ بھی لکھا تھا:

''منجملہ ان امور کے جن کی طرف شیخ نے خاص توجہ مبذول کی ہے، جہاں تک میرا خیال ہے وہ انسانی فکر ونظر کی حد پرواز کا مسئلہ ہے''

میں نے اس سلسلہ میں اس پر بھی تنبیہ کی تھی کہ:

''جس چیز کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور آدمی مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ یورپ والے اور جوان یورپ والوں کے طفیلی یا ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے ہیں ان سبھوں نے اس مسئلہ کی ایجاد و تنقیح کا سہرا جرمنی کے حکیم کانٹ کے سر باندھا ہے۔ اپنی اور اپنی قوم کے لیے اس چیز کو یہ مایہ فخر وفضل بنائے ہوئے ہیں''۔(۱)

پھر عرض کیا گیا تھا کہ اس سلسلہ میں شیخ اکبر کے نظریات اور افکار پر غور کیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ حکیم کانٹ المانی سے وہ کم اہمیت نہیں رکھتے۔

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ، دہلی (فروری و مارچ، ۱۹۴۵ء) کو دو اقساط میں شائع ہوا۔

مجھ سے خواہش کی گئی کہ آج کی مجلس مستشرقین کے شعبہ اسلامیات میں شیخ اکبر کے اسی نظریہ کے متعلق بعض چیزیں آپ کے سامنے پیش کروں۔ امتثالاً للامر اپنی محدود فہم کے مشورہ سے اس مجلس میں شیخ اکبر کے کلام سے جن اجزاء کا انتخاب میں نے کیا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ علماء قدیم کے حلقوں میں اگرچہ شیخ اکبر کی ذات والا صفات کسی تعریف سے یقیناً مستغنی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ آپ کی مجلس میں قدیم عناصر کے ساتھ جدید اسطقسات بھی ملے جلے ہیں، ہوسکتا ہے کہ ان میں بعض حضرات کے لیے ان کا نام نیا ہو، اس لیے کام سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نام کا تعارف کرا لیا جائے اور اب تو جدید کے ساتھ علماء کا قدیم طبقہ بھی جہاں تک میں جانتا ہوں شیخ اور ان کے کارناموں سے تقریباً نامانوس ہو چکا ہے، اس تعارف کی ضرورت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

شیخ اکبر کا اجمالی تعارف

مرسیہ جو اندلس کے مشرقی علاقہ کا ایک مشہور شہر ہے۔ حضرت شیخ کی ولادت اس شہر میں ۵۶۰ھ میں ہوئی۔ اندلس کا یہ وہ زمانہ ہے جب اسلامی دولت اس سرزمین میں اپنے بچے کھچے وقار و اقتدار کو بھی ختم کر رہی تھی۔ ملک میں عام طور سے طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ تھوڑے تھوڑے دن کے بعد مختلف علاقوں میں مختلف خاندانوں کی حکومتیں قائم ہو ہو کر ختم ہوتی رہتی تھیں۔ بدامنی فتنہ وفساد کا ہر طرف بازار گرم تھا۔ چاہیے تو یہی کہ بے اطمینانی کے ایسے دور میں علم و کمال کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے۔ لیکن قدرت کا شاید یہ بھی قانون ہے کہ سحر کا چراغ دم توڑنے کے لیے جب آخری دفعہ بھڑکتا ہے تو اس کی اسی روشنی میں بسا اوقات بعض عجیب وغریب ہستیاں نمایاں ہوئی ہیں۔

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ، مغرب میں ابن خلدون اس نظریہ کی بہترین

Marfat.com

مثالیں ہیں۔

شیخ اکبرؒ کو بھی ملتِ موت کے اسی افاقہ کا ایک عجیب و غریب مظہر سمجھتا ہوں۔ یہ واقعہ ہے کہ جس جامعیت کو ہم شیخ اکبر میں پاتے ہیں، اسلامی علماء وصوفیا کی طویل الذیل تاریخ میں اس کی نظیر صرف مشکل ہی نہیں بلکہ غالباً ناممکن ہے۔ اس زمانہ کے مروجہ علوم خواہ عقلی ہوں یا نقلی، ادبی ہوں یا دینی، شیخ کی کتابیں بتاسکتی ہیں کہ مشکل ہی سے کوئی ایسا علم یا فن اس زمانہ میں پایا جاتا ہوگا جس سے صرف معمولی لگاؤ نہیں بلکہ تحقیقی رشتہ قائم نہ تھا۔

شیخ کی تصنیفات کی تعداد

یوں تو ان کی کتابیں حد و شمار سے باہر ہیں لیکن حروب صلیبیہ کے بطل اعظم سلطان صلاح الدین انار اللہ برہانہ کے صاحبزادے جن کا ذکر شیخ نے خود اپنی کتاب ''فتوحات مکیہ'' میں بایں الفاظ کیا ہے:

''بعض بادشاہوں کے پاس میری بات سنی جاتی تھی اور حلب کے بادشاہ ملک ظاہر غازی ہیں، خدا کی ان پر رحمت ہو، الناصر الدین اللہ سلطان صلاح الدین ابن ایوب کے یہ صاحبزادے ہیں''۔ (۲)

شیخ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ میں نے سلطان سے ایک سو اٹھارہ سفارشیں مختلف معاملات میں کیں۔ **فقضاها کلها** (۳) یعنی ہر بات منظور کی، آگے ایک طویل قصہ ہے، جس کے ذکر کی حاجت نہیں، مجھے کہنا یہ ہے کہ اسی سلطان غازی کو شیخ نے ایک علمی سند دی تھی، جسے مشہور لغوی عالم مجد الدین فیروز آبادی صاحب قاموس نے خود دیکھا تھا، صاحب قاموس کا بیان ہے کہ اپنی تصنیفات کی اجازت کے سلسلہ میں کتابوں کے نام درج کرتے ہوئے:

"عد نيفاو ار بعمائة مصنف "(۴)

Marfat.com

''شیخ نے چار سو سے اوپر کتابیں شمار کی ہیں''

ان میں بعض ایسی کتابیں بھی ہیں مثلاً فتوحات مکیہ جو مصر و قسطنطنیہ میں متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔ چار جلدوں میں یہ کتاب ابتداء کی دو جلدیں تقریباً ہزار ہزار صفحات پر ختم ہوئی ہیں اور آخر کی دو جلدیں سات سات سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ گویا چار سو سے اوپر کتابوں میں صرف یہی ایک کتاب تین ساڑھے تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے اسی سے ان کی دوسری کتابوں کا اندازہ کیجیے۔ صاحب قاموس نے ان کی ایک تفسیر کا بھی ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''جن میں ان کی کبیر تفسیر ہے، جو سورہ کہف کی آیت **وعلمناہ من لدنا علما** تک پہنچ کر رہ گئی کہ شیخ کی وفات ہوگئی اس وجہ سے پوری نہ کر سکے، یہ ایک ایسی تفسیر ہے جس کا ہر حصہ اور اس کی ہر جلد ایک ایسے دریا کی شکل رکھتی ہے، جس کا کنارہ نہ ہو''۔ (۵)

اور غالباً یہی تفسیر شیخ کی ہے جس کا ذکر البطل الغازی المجاہد صاحب السیف والقلم، الامیر عبد القادر الجزائریؒ نے اپنی کتاب ''المواقف'' میں بایں الفاظ کیا ہے:

''معلوم ہو کہ ایک تفسیر شیخ محی الدین ابن عربی کی پائی گئی ہے جس کا نام ''**کتاب الجمع والتفصیل فی اسرار التنزیل** '' ہے اور مقدار اس کتاب کی (٦٦٠) چھ سو ساٹھ جلدیں ہیں''۔ (٦)

الجزائری نے یہ بھی لکھا ہے کہ مصر میں سورہ کہف تک اس تفسیر کے اجزاء ملے ہیں۔ ''واللہ اعلم بالصواب'' جس شخص کے لکھنے کا یہ حال ہو، کہ فتوحات مکیہ جب لکھ رہے تھے تو:

''جہاں کہیں ہوتے (غالباً سفر و حضر ہر جگہ) روزانہ تین کراسہ (جز) لکھا لیا

Marfat.com

کرتے تھے''۔(۷)

اور اس کا اعتراف تو انہوں نے خود کیا ہے کہ:

''اپنی تصنیفوں میں کسی تصنیف کا میں نے مسودہ نہیں لکھا یعنی بس جو مسودہ ہوتا تھا، وہی مبیضہ بھی تھا''۔(۸)

جس کے یہی معنی ہوئے کہ ان کی کتابیں عموماً برداشتہ قلم لکھی گئی ہیں اور اس کا پتہ خود ان کی کتابوں سے بھی کچھ چلتا ہے، جس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں ہے۔

بہر حال ان کی اسی ایک کتاب فتوحات مکیہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے زمانہ کے کسی علم میں ان کا پایہ معمولی نہ تھا۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ ان پر اصلی مذاق جس علم کا غالب تھا وہ تصوف ہی کا فن ہے اور دنیا میں عام طور پر ان کی شہرت ایک صوفی عالم ہی کی حیثیت سے ہے بھی۔ شیخ کے ان سارے علمی اور قلمی مجاہدات کے پیچھے کیا چیز عمل کر رہی تھی۔ میں نے اس کا کچھ ذکر اپنے اس عربی مقالہ میں بھی کیا ہے ان کے دل میں جس چیز کی آگ لگی ہوئی تھی اور اسی سوزش کو ان عجیب وغریب کتابوں کا میں سبب قرار دیتا ہوں، کچھ اس کا اندازہ ان کے منظوم خط سے بھی ہوتا ہے جو روم (ایشیائے کوچک) کے سلطان عزالدین کیکاؤس کے ایک مکتوب کے جواب میں انہوں نے لکھا ہے شیخ نے اس خط کو فتوحات میں درج فرمایا ہے۔ خط منظوم ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں:

کتبت کتابی والدموع تسیل   ومالی الی ما ارتضیه سبیل

''میں اپنا خط لکھ رہا ہوں اور آنسو بہہ رہے ہیں اور میرے بس میں نہیں ہے کہ ان کو راضی کروں''۔

ارید اری دین النبی محمداً   یقام و دین المبطلین یزول

''چاہتا ہوں کہ میں محمد ﷺ کے دین کو دیکھوں کہ وہ بلند کیا جائے اور جھوٹوں کا

Marfat.com

دین مٹ جائے''۔

فلم ارالا الزور یعلو و اھلہ   یعزون و الدین القویم ذلیل

''مگر بجز بناوٹی سخن سازیوں کے اور اس کے کاروبار کرنے والوں کے سوا کسی کو معزز ہوتے ہوئے نہیں پا رہا ہوں''۔

فیا عز دین اللہ سمعا لناصح   شفیقاً فنصاح الملوک قلیل

''اے اللہ کی دین کی عزت ایک بہی خواہ کی نصیحت سن، جو تجھ پر مہربان ہے یاد رکھ کہ بادشاہوں کو نصیحت کرنے والے کم ہیں''۔

و حاذر بتائید الا لہ بطانۃ   یشیر بامر ما علیہ دلیل

''اور بچو اللہ کی مدد سے ایسوں کو راز دار بنانے سے جو اشارے ایسی باتوں کی طرف کرتا ہو، جس کی دلیل نہ ہو''۔ (۹)

ان اشعار سے شیخ کے باطنی محرکات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان کے مولد یعنی اندلس پر کفر کا تسلط دن بہ دن بڑھتا جا رہا تھا اور جیسا کہ ان کا خیال تھا جس کا ذکر مختلف مقامات میں انہوں نے کیا بھی ہے۔ یعنی ان ساری تباہیوں کی ذمہ داری اسلام کے سلاطین اور علماء کے سر عائد ہوتی ہے۔ مختلف مضامین لکھتے لکھتے کہیں ان کے قلم سے ان پوشیدہ جذبات کا اظہار ہو جاتا ہے۔ خود اپنے وطن اندلس کو خیرباد کہہ کے جب وہ مشرقی ممالک کی طرف چلے آئے اور اس طرح آئے جیسا کہ سوانح نگار نے لکھا ہے:

''اپنے وطن مرسیہ سے شیخ ۵۶۸ ھ میں اشبیلیہ روانہ ہوئے اور ۵۹۸ ھ تک وہیں رہے۔ پھر اس کے بعد مشرق کی طرف روانہ ہوئے۔ حج کے ارادے سے جس کے بعد پھر اندلس واپس نہ ہوئے''۔ (۱۰)

اندلس سے روانہ ہو کر جب جبل الطارق کی آبنائے کے پاس آئے ہیں تو

سبتہ نامی شہر میں ان کی ملاقات ایک درویش سے ہوئی۔ اس ملاقات میں شیخ کا ان سے جو مکالمہ ہوا ہے، اس کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے:

''سمندر کے آبنائے کے پاس سبتہ میں بعض صالحین کے یہاں حاضر ہوا، مجھ میں اور حکومت میں بعض ایسی باتیں ہوئیں تھیں جن کا نتیجہ قلب کی تنگی تھی اور قدر و منزلت جس سے گرتی تھی، ان بزرگ کو اس کی خبر ملی تھی مجھ پر ان کی جب نظر پڑی تو بولے کہ بھائی ایسا آدمی ذلیل ہو جاتا ہے، جس کی اعانت کوئی ظالم نہ کرے، میں نے عرض کیا کہ جی ہاں ایسا بادشاہ بھی گمراہ ہو جاتا ہے، جس کی رہنمائی کوئی عالم نہ کرے، بزرگ نے فرمایا کہ نرمی نرمی (یعنی ذرا نرمی اختیار کرنا چاہیے) میں نے عرض کیا کہ جی ہاں جب تک اصل پونجی پر آنچ نہ آئے یعنی دین محفوظ ہو، بزرگ نے یہ سن کر فرمایا کہ سچ کہتے ہو اور خاموش ہو گئے''۔ (۱۱)

جہاں تک میرا خیال ہے شیخ کی ان ہی تلخ نوائیوں اور اندرونی بے چینیوں نے ان کو اندلس چھوڑنے پر مجبور کیا اور مشرق کو انہوں نے اپنا وطن بنا لیا۔ کیونکہ یہاں ان کو بعض ایسے سلاطین مل گئے جو ان کی باتوں پر کان دھرتے تھے۔ شیخ ہمیشہ ان سلاطین کو اس طرف متوجہ کراتے تھے، کہ علماء سوء کی اصلاح کرو، دین ان ہی کی وجہ سے برباد ہو رہا ہے۔ فتوحات ہی میں ایک جگہ انہوں نے علماء سوء کے متعلق ایک واقعہ درج کیا ہے، اس واقعہ سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سلاطین سے ان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔

''وہی صلاح الدین ایوبی کے بیٹے ملک الظاہر غازی نے ایک دن مجھے خبر دی، یعنی مجھ سے اور ان سے بعض معاملات کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ اس وقت انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے ملک اور میری حکومت میں جو قابل

Marfat.com

اعتراض باتیں ہیں اور جو مظالم ہورہے ان کے متعلق آپ مجھے منع فرماتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ جو کچھ اس باب میں آپ کا خیال ہے وہی میرا بھی ہے کہ یقیناً یہ ساری باتیں غلط ہیں۔ لیکن سیدی! خدا کی قسم یہ جتنی بری باتیں ہیں، ان سب کے متعلق فقیہ کا فتویٰ موجود ہے۔ یعنی ان کی صحت و جواز کا فقیہ (مولوی) نے فتویٰ دے رکھا ہے، ان کے دستخط میرے پاس موجود ہیں، تو خدا کی ان ہی پر لعنت ہو''۔ (۱۲)

شیخ نے الملک الظاہر کے اس بیان کو نقل کر کے پھر اس نیک دل بادشاہ کا یہ بیان نقل کیا ہے:

''خود ایک مولوی جو فلاں صاحب ہیں انہوں نے مجھے فتویٰ دیا ہے، سلطان نے اس مولوی کی شخصیت بھی متعین کی، یہ اس شہر کے بڑے نامی گرامی فاضل ہیں۔ دین اور مذہب میں سختی ان کا بھی خاص امتیاز ہے۔ ان مولوی صاحب نے (بادشاہ نے کہا کہ) مجھے یہ بتایا ہے کہ مجھ پر خاص رمضان کا روزہ فرض نہیں ہے۔ بلکہ سال کے کسی ایک مہینہ میں جس میں بھی چاہوں، روزہ رکھ سکتا ہوں (غالباً مولوی کی تاویل یہ ہو کہ بادشاہوں کو خصوصاً اس زمانہ میں جنگی مہموں میں مشغول رہنا پڑتا تھا اس وجہ سے آج یہاں کل وہاں مارے مارے پھرتے تھے۔ یہ سفر کی حالت ہے اور مسافر روزوں کو ماہِ رمضان سے مؤخر کر سکتا ہے''۔ (۱۳) واللہ اعلم

شیخ فرماتے ہیں کہ اس فقیہ کے اس فتویٰ کا ذکر کر کے الملک الظاہر نے کہا:

''میں نے دل ہی دل میں اس مولوی پر لعنت کی اور اس پر اس کو ظاہر نہ کیا، مولوی کا بادشاہ نے نام بھی بتایا، خدا ان لوگوں پر رحم کرے''۔ (۱۴)

یہی بے دینیاں تھیں جو عوام ہی نہیں بلکہ خواص امت میں انہیں محسوس

Marfat.com

ہو رہی تھیں۔ ملک کیکاؤس کے نام ایک اور طویل خط بھی شیخ نے لکھا تھا، جس کو بجنسہ انہوں نے فتوحات میں نقل کر دیا ہے۔ شروع میں اس کے لکھتے ہیں:

''۶۰۹ھ میں یونان کے شمالی حصہ کا بادشاہ جس کا نام الغالب لامر اللہ کیکاؤس ہے۔ اس نے مجھے خط لکھا (یونان کے شمالی حصہ سے ایشیائے کوچک کا حصہ مراد ہے جہاں آج ترکوں کا پایہ تخت ہے اسی کو روم بھی کہتے تھے(۱۵)، مولانا روم اسی علاقہ کی طرف منسوب ہیں''۔

خط بہت طویل ہے، فتوحات کے تقریباً ڈیڑھ صفحہ میں آیا ہے۔ اس خط کے آخر میں بھی چند اشعار ہیں جن میں سے بعض شعر یہ ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ملک کیکاؤس نے اپنا سلطانی نام عز الدین رکھا تھا۔

اذا انت اعززت الهدی و تبعته　　فانت لهذا الدین عز کما تدعی

''اگر دینی ہدایت کو تم سے عزت نصیب ہو، اور اس کی خود بھی تم پیروی کرو تو بیشک تم دین کی عزت ہو جیسا کہ تم پکارے جاتے ہو''۔

وان انت لم تحفل به و اهنته　　فانت تذل الدین تخفضه و ضعا

''اور اگر تم نے دین کو نہیں سمیٹا اور اسے ذلیل کیا تو پھر دین کے تم خوار کرنے والے، اور اسے تم نے پست کر دیا''

فلا تاخذ الا لقاب زوراً فانه　　لتسئل عنها یوم یجمعکم جمعا

''پس جھوٹ موٹ کے القاب نہ اختیار کیا کرو کیونکہ جس دن تم لوگ (قیامت میں) جمع کیے جاؤ گے، اس کے متعلق پوچھے جاؤ گے''

ان اشعار میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ یہ خطاب تم پر اسی وقت ہوگا، جب دین کے اعزاز کا کام کرو گے ورنہ

وان قال دین لله کنت بملکه　　ذلیلاً و اهلی فی میادینه صرعی

Marfat.com

''اللہ سے دین نے اگر کہا کہ میں اس شخص کی حکومت میں ذلیل تھا اور دین دار لوگ اس ملک میں پچھڑے پڑے تھے تو قیامت کے دن تمہارا کیا جواب ہوگا''۔

اور آخر میں اسی بادشاہ کے کسی نائب السلطنت کی طرف ایما فرماتے ہوئے متنبہ کرتے ہیں:

لکم نائب فی الامر اصبح ملحداً   واضحی لا ھل الدین یقطعھم قطعا

''تمہاری حکومت میں تمہارا جو نائب ہے وہ بے دین ہوگیا ہے۔ اربابِ دین کو اس نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا ہے پھر اسی بادشاہ کا جو دوسرا خطاب الغالب الامر اللہ ہے، اس سے نفع اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں:

فما لک لن تغلبه واسمک غالباً   و مالک لم تعز له اذا اثر النقعا

''آخر تم اس پر غالب کیوں نہیں ہوتے حالانکہ نام تو تمہارا غالب ہے اس کو معزول کیوں نہیں کرتے وہ گرد تو اڑا چکا تھا ہے''۔(۱۶)

الغرض یہ اور اسی قسم کی مختلف شہادتوں سے جن کا ذکر اس مختصر مقالہ میں موجب طوالت ہوگا میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شیخ کا عہد جس میں اسلام کے مغربی ممالک پر یورپ سے اور مشرقی ممالک پر تاتار سے کفر کا بادل امنڈ امنڈ کر آ گ برسا رہے تھے اور اسلام کی جو وقعت قلوب میں تھی، دن بدن اس کی دیوار کمزور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ نہ صرف عوام بلکہ مسلمانوں کے خواص جن میں علماء وسلاطین و امراء سب ہی شریک تھے۔ اپنی ایمانی قوتوں کو کھوتے چلے جا رہے تھے۔ قرآن اور پیغمبر ﷺ سے ان کا تعلق کمزور ہوتا چلا جاتا تھا، اور اسی کے یہ نتائج تھے جن کا ذکر شیخ نے اپنے مذکورہ بالا بیانات میں فرمایا ہے۔

حضرت شیخ نے جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ

Marfat.com

فکر و غور کے بعد ان امراض کا سراغ لگا لیا تھا جو مسلمانوں کو دین سے دور کرنے کے اسباب تھے اور بجائے جدل یا مولویوں کے عام مناظرانہ عقیم طریقوں کے انہوں نے ان امراض کے علاج کے متعلق کلی تدبیریں سوچ کر اختیار فرمائی تھیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، ان کی عام کتابوں کی تعداد تو چار سو سے بھی متجاوز ہے اور تفسیر کی چھ سو ساٹھ جلدوں کو اگر ان کے ساتھ ملا لیا جائے تو ظاہر ہے کہ یہ تعداد دونی سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے، مگر تفسیر پر تو میری نظر نہیں پڑی۔ ان کے سوا سچی بات تو یہ ہے کہ بجز ایک دو کے عموماً ان کی کتابوں کے مضامین ایک ہی قسم کے ہیں۔ اجمالاً و تفصیلاً مختلف پیرایوں میں وہ انہی مجوزہ علاجی تدبیروں کو دہرا دہرا کر بیان فرماتے ہیں۔

منجملہ ان کلی امور کے جن پر شیخ نے اپنی کتابوں میں سیر حاصل بحثیں فرمائی ہیں، علم کا مسئلہ بھی ہے۔ وہی جس کی تعبیر موجودہ اصطلاح میں تھیوری آف نالج (Theory of Knowledge) کے الفاظ سے کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دین سے بغاوت کا وہ حصہ جو علم کے جھوٹے ادعاء پر مبنی ہے، شیخ نے چاہا ہے لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ خود اس ''علم'' اور ''دانش'' کی حقیت کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں، وہ جانتے ہیں اور اپنے اسی جاننے کی بنیاد پر نہ سوچنے والوں کے قلوب میں دین کا جو احتقار پیدا ہوتا ہے، شیخ نے سمجھانا چاہا ہے کہ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ خود یہ جاننا کیا چیز ہے اور تمہارے اس ''جاننے'' کی رسائی کا آخری نقطہ کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ آدمی پر جب اپنی ''دانش'' کی اصلی حقیقت کھل جاتی ہے تو وہ سارا نشہ کرکرا اور پھٹ کر ہوا ہو جاتا ہے، جس کے شکار عموماً وہی لوگ ہو جاتے ہیں جو تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے کے بعد ہر چیز کی تنقید اپنے علم کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن علم و جہل کے سلسلہ میں آدمی کا جو صحیح مقام ہے جب وہ اس پر واضح ہو جاتا ہے تب سمجھ میں آتا ہے: معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

Marfat.com

اس مسئلہ کو شیخ نے فتوحاتِ مکیہ وفصوص الحکم وغیرہ میں مختلف اسالیب میں ادا کیا ہے سب کو اگر جمع کیا جائے اور ان شاء اللہ جب وقت آئے گا تو وہ جمع کیے جائیں گے، تو میں شاید مبالغہ نہیں کر رہا ہوں کہ محض اس ایک مسئلہ کے متعلق ان کے خیالات ونظریات ہزار ڈیڑھ ہزار صفحات کی گنجائش سے کم کے متقاضی نہ ہوں گے۔ خصوصاً شیخ کا جو ایک خاص طریقہ ہے۔ یعنی وہ اپنے مسودہ پر نظر ثانی نہیں کرتے اور قلم اٹھا کر لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اس لیے کہیں کہیں اس کا شبہہ بھی ہوتا کہ ان کے کلام میں تضاد ہے۔ کامل بحث کرنے والے کو ضرورت ہوگی کہ سلسلہ کے ساتھ ان کے کلام کے مختلف اجزاء کو ایک خاص ترتیب کی شکل میں سمیٹے۔ جہاں تک میرا تجربہ ہے اس تدبیر سے ان کے کلام میں بظاہر جو تناقض جو محسوس ہوتا ہے، عموماً وہ اٹھ جاتا ہے۔ ماسوا اس کے ایک بات یہ بھی ہے کہ شیخ بھی بہر حال آدمی ہیں اور آدمی کے خیالات میں کچھ ردوبدل اتار چڑھاؤ تو ہوتا ہی رہتا ہے، ہوسکتا ہے کہ اپنی کسی کتاب میں انہوں نے ایک خیال ظاہر کیا ہو۔ لیکن بعد کو ان کا خیال بدل گیا ہو۔ فتوحات میں اپنے خیال کی اس تبدیلی کا ایک دلچسپ قصہ خود ہی انہوں نے نقل فرمایا ہے ان کے اس خیالی انقلاب کی نوعیت پر چونکہ روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے تذکرہ کرتا ہوں فرماتے ہیں:

> ''میں ان لوگوں میں تھا جو عورتوں کو سخت ناپسند کرتے تھے اور پھر اسی اصول پر اٹھارہ سال تک قائم رہا۔ اس طریقہ (یعنی طریقہ صوفیاء) میں جب ابتداءً داخل ہوا تو میرا بھی یہی خیال تھا''۔ (۱۷)

گویا اٹھارہ سال تک ایک خاص خیال کا ان پر تسلط رہا اس کے بعد ایک طویل بحث کے بعد اپنے اس خیال میں تبدیلی کے اسباب ووجوہ کا تذکرہ کرنے کے بعد ارقام فرماتے ہیں:

Marfat.com

''مگراب بحمد للہ عورتوں کی یہ نفرت مجھ سے نکل گئی ہے اور خدا نے عورتوں کو میرے لیے محبوب بنا دیا ہے اور اب میں ان لوگوں میں ہوں جو عورتوں پر سب سے زیادہ مہربان ہیں اور ان کے حقوق کی سب سے زیادہ نگہداشت کرتے ہیں میں اب اس معاملہ میں بصیرت پر ہوں۔ یہ بات خدا کی طرف سے ہے۔ یعنی اسی نے عورتوں کو میرے لیے محبوب بنا دیا ہے۔ یہ بات کوئی طبیعت کا اقتضا نہیں ہے''۔ (۱۸)

جہاں تک میرا خیال ہے، شیخ جب تک یورپ (اندلس) میں رہے اور اندلس کے صوفیاء پر قرب مکانی کی وجہ سے کچھ نہ کچھ عیسائی رہبان اور تارک الدنیا فقراء کا اثر پڑتا ہی ہوگا، اور ظاہر ہے کہ عیسائی مذہب میں عورت ہی پر ان سارے مصائب کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے، جن میں آدم اور اولاد آدم اس خاکدانِ اراضی میں مبتلا ہے۔ اربابِ کلیسا کا فتویٰ ہی یہ تھا کہ عورت صرف گندگی اور نجاست ہے، وہ شیطان ہے، اس میں روح نہیں ہے، بلکہ باوجود ان حالات کے جن کا مظاہرہ یورپ اس وقت نسائیت کے مسئلہ میں کر رہا ہے، پھر بھی مذہبی طور پر محض یورپ کے عام باشندوں ہی پر نہیں بلکہ جن بیچاروں کے نفس نے شعوری یا غیر شعوری طور پر مغربی اثرات کو اپنے اندر جذب کیا، یا چرالیا ہے، دنیا میں عورتوں کے ساتھ وہ خواہ کسی قسم کا بھی تعلق رکھتے ہوں۔ لیکن دیکھا یہی جارہا ہے کہ آنے والی آخرت کی زندگی میں عورتوں کا تخیل ان کے لیے نا قابل برداشت بنا ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآنی جنت کے سلسلے میں دوسری چیزوں کے ساتھ جوں ہی عورتوں کا ذکر آتا ہے ان کی پیشانیوں پر شکن پڑ جاتی ہے۔ بجز اس نفسیاتی سبب کے کہ عیسائی ذہنیت جنت میں عورت کے تخیل کو برداشت نہیں کرسکتی۔ گویا عورت کے ذکر کے ساتھ ہی خدا کی پاک بہشت ان کی نگاہوں میں حیوانی جنت کی قالب میں ڈھل جاتی ہے۔

Marfat.com

سوچنے والوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ اس کی وجہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ کیا جنت اور دوزخ کے مسائل بھی سائنس اور کیمسٹری کے حدود میں آتے ہیں یا آ سکتے ہیں۔

خیر یہ تو ایک ذیلی مسئلہ ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ شیخ کے خیالات میں تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں۔ اس سے بڑھ کر اس کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اٹھارہ سال تک ایک خیال پر شیخ جمے رہے۔ لیکن مشرق کی زندگی نے ان پر ثابت کیا کہ جنت تو عورتوں ہی کے قدموں کے نیچے ہے۔ پھر ان کی رائے اس باب میں بدل گئی۔ شیخ نے اس مسئلہ پر اپنی کتاب کے مختلف مقامات پر بڑی دلچسپ بحثیں فرمائی ہیں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ شیخ کے متعلق ایک اور بات کا ذکر بھی ضروری خیال کرتا ہوں۔ ان کا ایک خاص طرز یہ ہے کہ اپنے مختلف مضامین کا مخاطب انہوں نے مختلف طبقے کے لوگوں کو قرار دیا ہے ان کا نظریہ ہی یہ ہے جیسا کہ حدیثوں میں بھی آیا ہے کہ **کلم الناس علی قدر عقولھم** ایک یہ وجہ بھی ہے جو ان کے کلام سے بعض دفعہ لوگوں میں الجھن پیدا ہونے لگتی ہے۔ وسوسہ ہوتا ہے کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ شیخ نے ایک مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے فتوحات ہی میں لکھا ہے کہ مکہ معظمہ کے مفتی جن کا نام انہوں نے ابو عبداللہ محمد بن ابی الصیف الیمنی نزیل مکہ بتایا ہے۔ ان مفتی صاحب کے سامنے ان کی کتاب جس کا نام ''مشاہد قدسیہ'' ہے اس کی ایک ایسی عبارت پیش کی گئی جو اپنے عنوان اور تعبیر میں کچھ وحشت رکھتی تھی۔ شیخ کو مفتی نے بلا کر دریافت کیا آپ نے اس کی ایک لطیف توجیہ کی لکھتے ہیں کہ سننے کے ساتھ:

''وہ بڑا خوش اور مسرور ہوا، خدا اس پر رحم کرے''۔ (۱۹)

مفتی کو انہوں نے گو مطمئن فرما دیا لیکن اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اس عبارت کا ایک اور دقیق پہلو بھی تھا میں نے اس پہلو کا ذکر اس لیے اس مجلس میں نہیں

کیا کہ وہ نہ اس کو برداشت کرسکتا تھا اور نہ اس کا انکار کرسکتا تھا۔ اس لیے اندیشہ تھا کہ جھنجھلا کر خواہ مخواہ بگڑ نہ بیٹھے۔ شیخ نے اس کے بعد ارقام فرمایا ہے کہ:

''اس کے پاس نہ تو قوی ایمان ہی تھا اور نہ علم اور سلامت نظر تھی۔ وہ حیران ہوکر رہ جاتا اسی لیے میں نے اس کے سامنے ایسی بات کی جو اس کے عقلی مزاج کے مطابق تھی''۔ (۲۰)

بہر حال اگر ان اجمالی نکات کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے تو شیخ اکبر کے کلام میں اس قسم کی پیچیدگیاں جو محسوس ہوتی ہیں وہ انشاء اللہ بآسانی زائل ہوسکتی ہیں۔ اور سچی بات تو یہی ہے کہ ان کے کلام کے سمجھنے اور اس سے استفادہ کے لیے جیسا کہ شیخ نے خود بھی لکھا ہے، ایمان قوی اور نظر سلیم کے ساتھ ضرورت ہے کہ علم میں ذرا وسعت ہو، محدود معلومات والے تنگ نظر لوگوں کے لیے بسا اوقات ان کی باتیں نقصان رساں ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ ان کے کلام کا نہیں پڑھنے والوں کا نقص ہے۔

اب ان تمہیدی باتوں کے بعد جو باوجود ارادۂ اختصار کے کافی طویل ہو گئیں۔ اصل مسئلہ کا ذکر حتی الوسع اجمال کو پیش نظر رکھ کر کرنا چاہتا ہوں کہ اجمال سے زیادہ کا یہ موقع بھی نہیں ہے۔ خدا کرے میری کتاب وہ مکمل ہو جائے جسے شیخ کے متعلق لکھنا چاہتا ہوں کہ تفصیل و بسط کا صحیح مقام وہی کتاب ہوسکتی ہے۔

واللہ یوفق لما یحب و یرضاہ

شیخ اکبر اور نظریہ علم

بات یہ ہے کہ پچھلی چند صدیوں میں یورپ کے چند حکماء کی بدولت اب تو یہ مسئلہ اہل علم کے لیے نامانوس نہیں رہا ہے کہ فلسفہ کے جس اسکول کی تعبیر ''مادیت'' سے کی جاتی ہے، یعنی بجائے خدا کے مادہ ہی کو عالم کے تمام شئون و صفات کا سرچشمہ فرض کیا جاتا ہے۔ خواہ ایسی صفات ہوں جنہیں ہم زندگی اور حیات کے بغیر

Marfat.com

تصور کر سکتے ہوں یا ایسے نہ ہوں ۔ ہر ایک کے متعلق اس طریقہ فکر میں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہاں جو کچھ بھی ہے صرف مادہ ہی کی ارتقائی تجلیاں ہیں ، یا بقول بعض مادہ ہی کے رحم سے یہ سارے بچے پیدا ہو رہے ہیں ، جو جمادات و نباتات و حیوانات کی شکل میں نظر آتے ہیں ۔ یورپ کے ارتیابیوں اور تصوریوں دونوں نے یہ پوچھ کر کہ ''مادہ'' کا وہ لفظ جس پر مادیت کی ساری تعمیر کھڑی کی گئی ہے ، خود اس کا ترجمہ کیا ہے یا یوں پوچھیے کہ ہم اپنے معلومات میں سے کس معلوم کی تعبیر مادہ کے لفظ سے کرتے ہیں ؟ جونہی یہ سوال اٹھایا جاتا ہے ، چند معمولی سوال و جواب کے بعد بآسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مادہ صرف ایک لفظ ہے جس کے مصداق اور معنی کا کوئی تخیل نہ بولنے والے ہی کے سامنے ہے ، نہ سننے والے کے ۔ برکلے نے اس مسئلہ کو نارنگی کی مشہور مثال سے سمجھایا ہے ، کہ ان ساری صفات کو جو نارنگی میں پائے جاتے ہیں ، اگر اس سے الگ کر لی جائیں تو صفات کی تحلیل کے بعد بتایا جائے کہ کون سی چیز نارنگی میں ایسی باقی رہ جاتی ہے ، جس کی تعبیر ذات یا ''مادہ'' سے کی جاتی ہے ۔ ایک صاحب نے مشہور ہے کہ پتھر پر پاؤں پٹک کر برکلے سے کہا تھا کہ یہ مادہ نہیں تو اور کیا ہے ، جواب میں اس نے کہا کہ میں سختی کا منکر نہیں ہوں ، جو آپ کی ٹانگ توڑ دے ۔ البتہ اس سختی کی صفت کے پیچھے جس ذات کا دعویٰ کیا جاتا ہے مجھے اس سے انکار ہے ، اور اس کے ثبوت کا کوئی ذریعہ کسی کے پاس کچھ نہیں ، قطعاً کچھ نہیں ہے ۔ بہر حال قریب قریب یہ مسئلہ اب مسلمہ ہے کہ مادہ ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جس کا علم نہ اس شخص کو تھا جس نے اس نام کو شروع شروع میں تراشا تھا اور نہ اس وقت تک کوئی خاص خیال کسی دماغ میں موجود ہے ۔ اور نہ آئندہ کوئی اس کا صحیح تخیل پیدا کر سکتا ہے ۔ ہکسلے کا یہ مشہور فقرہ زبان زد اہل علم ہے کہ

''آج کی سائنس اس سے زیادہ کسی بات کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی ، کہ

Marfat.com

میٹریلزم کا انتساب اس کی طرف ہو، اس لیے کہ بہر حال میٹریلزم کی وقعت
ایک فلسفیانہ ڈاگما (ادعا) سے زیادہ نہیں''

مگر خیر اس زمانہ میں تو کافی تدقیق وتحقیق کے بعد فلسفہ نے اس نقطہ پر آکر دم توڑا ہے، لیکن آپ کو سن کر تعجب اور مسرت دونوں چیزیں حاصل ہوں گی کہ شیخ اکبر نے بھی جب اسلام کی نصرت کا علم اپنے ہاتھ میں لیا تو منجملہ اور چند کلی امور کے ان کی نظر بھی ادعائی حقیقت یعنی مادہ پر پڑی کہ دین کی بنیاد کو جس زمانہ میں بھی کھوکھلی کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس وقت بے دینوں کے ہاتھ میں سب سے زیادہ کارگر حربہ یہی مادہ کا ہوائی لفظ ثابت ہوا ہے۔

شیخ نے بھی اسی لیے اپنی کتاب میں اس مسئلہ کی طرف خاص توجہ فرمائی ہے اور اسی لیے تاکہ مادہ کی حقیقت لوگوں پر ظاہر ہو جائے۔ انہوں نے بھی پہلے ان ہی ذرائع کا جائزہ لینا چاہا ہے جن کے ذریعہ سے آدمی معلومات حاصل کرتا ہے۔

شیخ نے اس سلسلہ میں پہلا دعویٰ یہ کیا ہے کہ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ آدمی میں علم یعنی جاننے کے دو مستقل ذرائع ہیں، ایک حواس اور دوسری عقل اوز اسی لیے سمجھا جاتا ہے کہ جن چیزوں تک حواس کی رسائی نہیں ہوتی، عقل سے آدمی ان کو اپنا معلوم بنا سکتا ہے، شیخ نے مختلف الفاظ میں اس دعویٰ کا شدت سے انکار کیا ہے، کبھی فرماتے ہیں:

''عقل بالکل سادہ پیدا کی گئی ہے، اس کے سامنے نظری علوم میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہے''۔ (۲۱)

کبھی اس دعویٰ کو ان الفاظ میں ادا فرماتے ہیں

''ان العقل ما عنده من حيث نفسه علم'' (۲۲)

''بذات خود عقل کے اندر کسی قسم کا کوئی علم نہیں ہے''

اپنے ان دعاوی کو سمجھاتے ہوئے شیخ نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیز جو ہمیں معلوم نہ ہو، اس کا علم عقل کے ذریعہ سے حاصل کرنا ناممکن ہے، مگر سوال ہوتا ہے کہ پھر علم اور دانش کے معاملہ میں عقل کا کام کیا ہے، اسی کو ان الفاظ میں سمجھاتے ہیں:

''عقل جن باتوں کے علم کو حاصل کرتی ہے، یہ اس کے قبول کرنے اور مان لینے کی صلاحیت کا نتیجہ ہے''۔ (۲۳)

مطلب یہ ہے کہ خود براہ راست کسی چیز کے دریافت کرنے کی تو عقل میں صلاحیت نہیں ہے، البتہ دریافت کی ہوئی چیزوں کو قبول کرنے کی اس میں صلاحیت رکھی گئی ہے، رہ گئی یہ بات کہ پھر علم یعنی ایسے معلومات جو پہلے سے معلوم نہ تھے، ان کو آخر آدمی کس ذریعہ سے حاصل کرتا ہے، شیخ نے اس کا جواب یہ دیا ہے:

''عقل ان علوم کو فکر کی قوت سے قبول کرتی ہے اور فکری قوت خیال کی مقلد ہے، خیال حواس کا مقلد ہے''۔ (۲۴)

مطلب یہ ہے کہ عقل میں صرف معلومات کے ماننے اور قبول کرنے کی صلاحیت ہے اور یہ معلومات عقل کو آدمی کی ایک اور قوت دیتی ہے، جس کا نام فکر ہے، شیخ فرماتے ہیں کہ فکر کا کام یہ ہے کہ عقل گویا اس سے کہتی ہے:

میز الحق و الباطل — حق کو باطل سے جدا کر

یعنی معلومات جن میں حق و باطل دونوں ملے ہوئے ہیں ان میں سے جو حق ہے، اس کو باطل معلومات سے جدا کر دے۔ پھر یہ سوال اٹھا کر کہ آدمی کی فکری قوت جن معلومات پر عمل کرتی ہے، ان کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ شیخ نے اس کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے:

''یعنی فکری قوت کی جولانگاہ بھی وہی میدان ہے، جسے خیالی قوت تیار کرتی

ہے''۔(۲۵)

رہ گئی یہ بات کہ خیالی قوت میں معلومات کہاں سے حاصل ہوتی ہیں، شیخ نے اس کام کو دو قوتوں کی طرف منسوب کیا ہے، فرماتے ہیں:

''اور خیالی قوت میں وہی باتیں حاصل ہوتی ہیں جنہیں حواس عطا کرتے ہیں یا قوت مصورہ دیتی ہے''۔(۲۶)

یعنی خیالی قوت کو معلومات حواس سے ملتی ہیں، یا اس قوت سے ملتی ہیں جسے قوت مصورہ کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حواس سے مراد تو یہی باصرہ سامعہ وغیرہ کی حسی قوتیں ہیں، باقی قوت مصورہ تو اس کے متعلق خود فرماتے ہیں:

''قوت مصورہ کا مادہ محسوسات ہی سے حاصل ہوتا ہے، ایسی صورتیں جن کا وجود ذہن سے باہر واقع میں نہیں ہے، ترکیب دے کر قوتِ مصورہ اسے بناتی ہے۔ لیکن ان ترکیب یافتہ صورتوں کے سارے اجزاء انہی چیزوں سے حاصل کیے جاتے ہیں جو حواس کے فراہم کردہ ہوتے ہیں یعنی محسوسات سے (ب)''(۲۷)

جس کا مطلب یہ ہوا کہ مصورہ کے معلومات کی بھی انتہا محسوسات ہی پر ہو جاتی ہے، یعنی براہِ راست معلومات کے حاصل کرنے کا حقیقی کام نہ عقل کا ہے، نہ فکر کا، نہ خیال کا نہ مصورہ کا، بلکہ یہ فرض صرف حواس کے سپرد ہے۔

پھر حواس میں بھی ہر حاسہ کا تعلق خاص خاص معلومات سے ہے، مثلاً سامعہ صوتی معلومات (آواز) باصرہ رنگ و روشنی، ذائقہ، مزہ، شامہ، خوشبو، بدبو وغیرہ کے علم حاصل کرنے کے مخصوص ذرائع ہیں۔ پس یہی حواس اپنے مقررہ معلومات کو ابتداءً حاصل کرتے ہیں اور بیچاری عقل ان ہی کی حاصل کردہ معلومات کو ہضم کرتی ہے اور اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ ایک مثال سے اس مسئلہ کو شیخ نے ان الفاظ میں سمجھایا ہے:

Marfat.com

قدرت نے ایک خاص قسم کی آفرینش، قوت شنوائی کو عطا کی ہے، اسی لیے اس کی پرواز اپنی حد سے تجاوز نہیں کر سکتی اور عقل کو اسی قوت شنوائی کا خدا نے محتاج کر دیا ہے۔ اسی قوت کے ذریعہ سے عقل آواز اور حروف، لفظوں کے مختلف انقلابی تغیرات اور مختلف زبانوں میں جو فرق ہے، ان سب کا علم حاصل کرتی ہے، اسی کے ذریعہ سے وہ پرندوں کے چہچہاہٹ، آندھیوں کے شور، دروازوں کی کھٹ کھٹ، پانی کے شور، آدمی کی آواز، بکریوں، مینڈھوں، بیل، اونٹ کی آوازوں میں اور بھی جو اس قسم کی آوازیں ہیں، ان تمام آوازوں میں فرق عقل اسی قوت شنوائی کی راہ سے حاصل کرتی ہے''۔ (۲۸)

اس کے بعد فرماتے ہیں:

''عقل کے بس میں نہیں ہے کہ بذاتِ خود ان امور کا علم حاصل کرے، جب تک کہ شنوائی اس علم کو عقل تک نہ پہنچائے''۔ (۲۹)

اسی طرح پھر باصرہ کی معلومات کو گنوانے کے بعد فرماتے ہیں:

''یہی حال بینائی کی قوت کا ہے، کہ تمام وہ چیزیں جو دیکھی جاتی ہیں، اللہ نے عقل کو ان امور کے علم میں اسی بینائی کی قوت کا فقیر بنا دیا ہے، اسی لیے سبزی، زردی، نیلگونی، سفیدی، سیاہی اور تمام رنگ جو سیاہی، سفیدی کے درمیان ہیں ان کا علم عقل کو مل ہی نہیں سکتا، جب تک کہ قوت بینائی اس نعمت کو ان کے لیے فراہم نہ کرے''۔ (۳۰)

شیخ نے اس کے بعد لکھا ہے:

''و هكذا جميع القوى المعروفة بالحواس ''(۳۱)

''وہ ساری قوتیں جن کی تعبیر حواس سے کی جاتی ہے ان سب کا یہی حال ہے''

Marfat.com

مطلب یہ ہے کہ اگر ہر قسم کے حواس سے کوئی محروم پیدا ہوا۔ عقل اس کی خواہ کتنی بھی تیز ہو لیکن وہ اپنے اندر کسی بیرونی معلوم کے علم کو حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ اصل کام معلومات کی فراہمی کا تو حواس ہی انجام دیتے ہیں۔

''پھر خیال وقوتِ خیالیہ حواس کی فقیر ہے۔ اسی لیے آدمی کسی چیز کا خیال کر ہی نہیں سکتا، جب تک کہ حواس اس چیز کا علم اسے عطا نہ کریں''۔ (۳۲)

شیخ نے اس مسئلہ کو خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے مختلف پیرایوں میں اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے، میں نے بطور مثال کے اس کلام سے چند فقرے منتخب کر کے پیش کیے ہیں:

پس جب یہ طے ہو گیا کہ معلومات کے حاصل کرنے کا حقیقی ذریعہ حواس ہی ہیں، ان کے سوا اور جن جن قوتوں کا علم سے تعلق سمجھا جاتا ہے اس کے تعلق کی حیثیت بالکل ثانوی درجہ کی ہے یعنی یہ ناممکن ہے کہ حواس کو جو چیز معلوم نہ ہو اس کا علم براہِ راست یہ ثانوی قوتیں حاصل کر لیں۔

اب اس کے بعد شیخ ادھر توجہ دلاتے ہیں کہ وجود کا یہ مظہر جسے ہم عالم اور کون کہتے ہیں ان کے متعلق ہمارا حقیقی علم کیا ہو سکتا ہے۔ شیخ نے دعویٰ کیا ہے مثلاً فصوص میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ان العالم کله مجموع اعراض ''(۳۳)

''سارا عالم اعراض (صفات) کا مجموعہ ہے''

پھر اس کو پہلے ایک منطقی طریقہ سے سمجھاتے ہیں:

''اشیاء کی تعریف جب کی جاتی ہے، اس وقت یہ بات کھل جاتی ہے، کیونکہ چیزوں کی تعریف یہ لوگ جب کرتے ہیں، تو ان تعریفوں سے ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ ساری چیزیں صرف اعراض یعنی صفات ہیں''۔ (۳۴)

Marfat.com

مطلب یہ ہے کہ مثلاً جسم ہی کی تعریف کیجیے، یہی کہا جائے گا کہ طول و عرض وعمق کو جو قبول کرتا ہو، اب ظاہر ہے کہ طول بھی ایک عرض اور صفت ہے، عرض یعنی چوڑائی بھی ایک عرض اور صفت ہی ہے، عمق یعنی گہرائی بھی ایک صفت اور عرض ہی ہے۔ اس طرح نباتات کی تعریف میں علاوہ ان صفات کے یہ بھی اضافہ کیا جاتا ہے کہ جس میں نشو ونما کی قوت ہو، ظاہر ہے کہ یہ نشو ونما کی صفات بھی عرض اور صفات ہی ہیں۔ آگے حیوان کی تعریف میں کہتے ہیں جس میں زندگی اور حیات ہو، ظاہر ہے کہ زندگی، حیات یہ بھی اعراض اور صفات ہی ہیں۔

اب یہ دعویٰ کہ ان صفات کے لیے موصوف کا ہونا یا ان اعراض کے لیے محل کا ہونا ضروری ہے، بس شیخ کو اسی سے اختلاف ہے۔ کیونکہ ان صفات کا علم تو آدمی کو حواس سے ہو رہا ہے۔ اور جو صفات نہیں ہیں، انہیں انسانی حواس جان ہی نہیں سکتے۔ گذر چکا کہ جتنے حواس ہیں سب کا تعلق صفات ہی سے ہے۔ مثلاً بینائی کا تعلق رنگ سے ہے روشنی سے ہے، اور یہ صفات ہیں۔ شنوائی کا آواز اور ہوائی ارتعاشات سے ہے۔ ارتعاشات بھی صفات ہی ہیں، شامہ کا خوشبو سے بدبو سے، بو بھی صفت ہے۔ لامسہ یعنی چھونے کی قوت کا تعلق حرارت، برودت، نرمی سختی سے ہے اور یہ سارے امور صفات ہیں۔ اب ان صفات کی آڑ میں جو مدعی ہے کہ کوئی ذات پوشیدہ ہے، اس کو یہ بتانا چاہیے کہ اس ذات کا علم کس ذریعہ سے اس کو حاصل ہو رہا ہے۔ عقل، خیال، فکر، ساری ادا کی قوتیں بتایا جاچکا کہ حواس ہی کی فقیر ہیں۔ حواس ہی کے حاصل کردہ معلومات کو یہ اپنا معلوم بناتے ہیں اور ان ہی پر اپنے اپنے دائرہ اثر کے حساب سے عمل کرتے ہیں۔ لیکن جو چیز حواس ہی کی گرفت میں نہیں آرہی ہے اس تک غریب حواس کی محتاج قوتوں کی رسائی کیسے ہوسکتی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ مادہ اسی ذات کا نام رکھا گیا تھا جو ان صفات کا حامل اور

Marfat.com

موصوف یا ان اعراض کی ذات ومحل ہے۔ شیخ نے لکھا ہے کہ ان صفات کے لیے موصوف کی ضرورت اس لیے جو محسوس ہو رہی ہے کہ کسی صفت مثلاً سیاہی کا قیام کپڑے کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے، اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہ ضرورت ہی بے ضرورت ہے۔

''جو چیزیں بذاتِ خود قائم نہیں رہ سکتیں ان ہی کے مجموعہ سے ایسی چیز حاصل ہو رہی ہے جو بذاتِ خود قائم ہے''۔

شیخ کا خیال ہے کہ ان صفات کے پیچھے محض حواس اور عقل کے زور سے کسی ذات کا ثابت کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ وہ مدعی ہیں کہ مادہ ہی نہیں بلکہ ان صفات کے پیچھے جس کا مشاہدہ ہمارے حواس عالم کی شکل میں کر رہے ہیں کسی خدا کی ذات کو بھی محض حواس وعقل کے زور سے ثابت کرنے کی کوشش ایک ایسی کوشش ہے جو کبھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتی ان کا مشہور فقرہ ہے:

''خدا کو عقل یعنی فکر ونظر کی راہ سے جس نے ڈھونڈھا وہ سرگشتہ اور سراسیمہ ہو کر رہ گیا''۔

دوسرے الفاظ میں اسی خیال کو یوں ادا کرتے ہیں:

''عقل اس حیثیت سے کہ وہ نظر وفکر، بحث وتلاش کا کام کرتی ہے خدا کو جان نہیں سکتی''۔

تیسری جگہ اس خیال کو یوں تعبیر کرتے ہیں:

''باری تعالیٰ محسوس تو ہیں نہیں، یعنی ان کا ادراک حواس سے تو ہوتا نہیں۔ ظاہر ہے کہ حواس کے ذریعہ سے اس بنیاد پر ہم ان کو جان نہیں سکتے، رہی خیالی قوت تو اس کی گرفت میں وہی چیزیں آ سکتی ہیں جنہیں حواس عطا کرتے ہیں۔ اب خواہ وہ بجنسہٖ وہی صورت ہو جس کا حواس نے ادراک کیا

تھا یا محسوسات کے بعض اجزاء کو دوسرے اجزاء کے ساتھ جوڑ کر فکر جو پیش کرتی ہے وہ ہو''۔

بالآخر ان تمام مباحث کا آخری نتیجہ پیدا کرتے ہیں:

''توحید کے مغز تک جو پہنچنا چاہتے ہیں، تو اسے ان آیتوں میں غور کرنا چاہیے جو کتاب عزیز میں وارد ہیں، یعنی حق تعالیٰ نے بذاتِ خود جو اپنی توحید بیان فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنی ذات سے زیادہ خود اپنی ذات کا عالم اور کون ہو سکتا ہے تو چاہیے کہ تم ان باتوں میں غور کرو جنہیں خود خدا تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اور خدا سے دعا کرو کہ توحید کا صحیح علم تمہیں عطا کرے، ان شاء اللہ تم اس سے واقف ہو جاؤ گے، لیکن فکر کی راہ سے عقل ابدالآباد تک اس سے واقف نہیں ہو سکتی''۔ (۳۵)

کسی جگہ فرماتے ہیں کہ عقل انسانی بہر حال اپنے علم میں حواس کی فقیری ہی پر جب مضطر ہے تو پھر:

''عجیب باتوں میں ایک بڑے اچنبھے کی بات میرے خیال میں یہ ہے کہ آدمی اپنی فکر اپنی نظر کی تو تقلید کرے، حالانکہ یہ قوتیں بھی اسی طرح نو پیدا اور حادث ہیں، جیسے آدمی کی دوسری قوتیں جو انسان میں خدا نے پیدا کی ہیں مگر اپنے رب کی تقلید آدمی نہیں کرنا چاہتا، یعنی خود اپنے متعلق حق تعالیٰ جو باتیں کتاب میں اپنے رسولوں کی زبان پر بیان کی ہیں ان کی تقلید نہیں کرتا''۔ (۳۶)

اس قسم کی قرآنی آیتیں جن میں تدبر و تفکر کا حکم دیا گیا ہے اور شیخ کے زمانے کے اسلامی فلاسفہ (ج) ان ہی آیتوں سے استدلال کر کے لوگوں کو دین میں بھی حواس کی اس محتاج عقل کا دست نگر بنا رہے تھے ان کو متنبہ کرتے ہوئے شیخ فرماتے ہیں:

Marfat.com

''خدا نے جو ارادہ کیا تھا، عقل نے اسے الٹا سمجھا۔ یعنی تم کیوں نہیں سوچتے یا ''سوچنے'' والوں کے لیے یہ بات ہے''۔

قرآن کی ان آیتوں سے سمجھ لیا گیا کہ عقل ہی پر ٹیک لگا لیا جائے اور اس کو پیشوا بنا کر اس کی تقلید کی جائے، اور اس سے غفلت برتی گئی کہ فکر کا حکم جو دیا گیا ہے، اس سے خدا کا مقصد تو یہ ہے کہ اللہ کے علم اور اس کے جاننے کی راہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ بذات خود حق تعالیٰ ہی اس کو بتائیں، اسی راہ سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ کی اصل حقیقت جیسا کہ وہ ہے کیا ہے، بجز اللہ کے خاص بندوں کے یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی، یعنی انبیاء اور اولیاء کے سوا اور کوئی نہ سمجھا کہ تفکر و تدبر کا صحیح مطلب یہی ہے۔

بہر کیف علم کے متعلق تو شیخ کے چند نظریات میں سے ایک نظریہ یہ تھا، انہوں نے اسی کے ساتھ انسان کی علمی قوتوں کے دوسرے آثار ولوازم بھی بتائے ہیں، جن میں سے ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جو چیزیں اس کے پاس پیدا ہوتی ہیں اور جو کام کیے جاتے ہیں ان میں ایک ابعاثی مفعول بھی ہے جو عقل سے اسی طرح ابھرتی ہے، جیسے جبرئیل حقیقت سے دحیہ صورت ابھرتی تھی''(۱)۔

اس مسئلہ کو ذرا زیادہ تفصیل کیساتھ واضح کرتے ہوئے فصوص میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اپنی خیالی قوت سے ہر آدمی اس چیز کو پیدا کرتا ہے جس کا وجود خیال کے سوا اور کہیں نہیں ہوتا، اور یہ تو خیر ایک عام بات ہے لیکن عارف اپنی ہمت سے ایسی چیز بھی پیدا کرتا ہے جو ہمت کے محل سے باہر ہو کر پائی جاتی ہے لیکن وہ یعنی عارف کی ہمت سے پیدا شدہ شے اسی وقت تک باقی رہتی ہے

Marfat.com

جب تک عارف کی ہمت اس کی حفاظت کرتی رہے اور ہمت سے پیدا کی ہوئی اس چیز کی حفاظت عارف پر کوئی بار بھی نہیں ڈالتی البتہ جب عارف پر غفلت طاری ہو جاتی ہے، یعنی جس چیز کو اس، نے پیدا کیا تھا اس کی حفاظت سے وہ غافل ہو جاتا ہے تو اسی وقت (ہمت سے یہ پیدا شدہ شئے) معدوم ہو جاتی ہے''۔ (۳۷)

اور اسی سے تخلیق عالم کے مسئلہ کو انہوں نے حل کیا ہے، گویا عالم کی آفرینش کیسے ہوئی ؟ اس سوال کا جواب مخلوقات کی اسی تخلیق ابعاثی کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حواس سے جن معلومات کو آدمی حاصل کر لیتا ہے اور ان کی صورتوں کو جب چاہتا ہے توجہ کے ساتھ یکے بعد دیگرے اپنے آگے حاضر پاتا ہے۔ یہ انسان کی قوت مصورہ ہی کی کاریگری ہے۔ عام اربابِ فلسفہ کا یہ خیال کہ اشیاء کی صورتیں آدمی کے دماغ میں چھپ جاتی ہیں اور التفات کے بعد وہی چھپی ہوئی صورتیں سامنے آجاتی ہیں، شیخ کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے بلکہ اپنی معلومات کی صورتوں میں توجہ اور التفات کے بعد شیخ کا خیال ہے کہ عالم تجلی کرتا رہتا ہے، فرماتے ہیں:

''اگر ہماری نگاہوں سے پردہ ہٹا دیا جائے اور قوتِ مصورہ جن صورتوں کو پیدا کرتی رہتی ہے ہم انہیں دیکھنے لگیں ۔ یعنی خیال میں قوتِ خیالی جن صورتوں کو پیدا کرتی رہتی ہے، اس کی پیدا کی ہوئی صورتوں کو دیکھنے لگیں تو ہم پائیں گے کہ آدمی ہی ان مختلف صورتوں میں لحہ بہ لحہ تجلی کرتا رہتا ہے۔ یعنی ان صورتوں میں جن میں کوئی صورت دوسری صورت سے ملتی جلتی نہیں ہے (مثلاً ابھی درخت کی شکل میں ابھی سمندر کی شکل میں ابھی کلکتہ کی صورت میں تو اسی کے بعد بمبئی کی شکل میں، یعنی ان تمام شکلوں میں جنہیں

Marfat.com

آدمی سوچتا رہتا ہے)''۔

علم اور معلوم کا تعلق

علم ہی کے متعلق ایک اور پہلو پر شیخ نے اپنی کتابوں میں بکثرت اصرار فرمایا ہے۔ مثلاً اسی مسئلہ کو بیان فرماتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''علم ایک ایسی نسبت ہے، جو ہمیشہ معلوم کے تابع ہوتی ہے، معلوم تو تم اور تمہارے احوال ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ معلومات پر علم کا اثر نہیں پڑتا، بلکہ معلومات ہی کا اثر علم پر پڑتا ہے، معلومات اپنی ذات سے علم میں اسی اثر کو قائم کرتی ہیں جو واقعی ان معلومات کے آثار ہیں''

اسی مسئلہ کو مثال سے سمجھاتے ہیں:

''تم مثلاً کسی ایسی بات کو جو ناممکن ہے، جانتے ہو یعنی یہ جانتے ہو کہ وہ محال اور ناممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ تمہارے علم کا اس کے محال ہونے پر کوئی اثر نہیں۔ بلکہ خود اسی ناممکن امر نے تم میں علم عطا کیا ہے کہ وہ ناممکن ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علم کا اثر معلوم پر نہیں پڑتا۔

مسئلہ علم اور تقدیر

اور علم کی اسی خصوصیت کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے تقدیر کی گتھی کو سلجھانا چاہا ہے، فرماتے ہیں:

''بہر حال خود تمہارا ہی حکم ہے جو تم پر عائد ہوا ہے، اس لیے تعریف بھی اگر کرو تو خود اپنی کرو، اور مذمت بھی کرو تو اپنی کرو''۔ (۳۸)

بات ارادہ اختصار کے باوجود کافی طویل ہوگئی اب اس بحث کو جو الہیاتی مباحث و مسائل میں سب سے زیادہ پیچیدہ عقدہ ہے ان ہی چند اشارات کے تذکرہ پر ختم کر کے اپنے اس مقالہ کو بھی ختم کرتا ہوں۔

Marfat.com

''اگر در خانہ کس است ہمیں یک حرفے بس است''

جیسا کہ میں نے کسی دوسری جگہ بھی اشارہ کیا ہے ان مسائل کا زیادہ تفصیل کے ساتھ مطالعہ مقصود ہو تو خاکسار کی کتاب الدین القیم (حصہ اولیٰ) کا مطالعہ کیا جائے۔

واللہ یقول الحق و ھو یھدی السبیل

Marfat.com

حواشی

الف۔ انڈین اوری انٹل کانفرنس کا سالانہ اجلاس حیدرآباد ہی میں جامعہ عثمانیہ کی زیرنگرانی منعقد ہوا تھا۔ خاکسار نے بھی اس کانفرنس میں ایک مختصر مقالہ پڑھا تھا۔ اسی کا مسودہ پڑا ہوا تھا، آج خیال آیا کہ معارف میں بھیج دوں شاید کسی کے لیے سیذکر اور یحدث لہ ذکری کا کام دے۔

ب۔ شیخ کا اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جس کا تجربہ ہر شخص کو ہوتا ہے یعنی ایسی بہت سی چیزوں کو بظاہر آدمی سوچتا اور خیال کرتا ہے جن کا وجود خیال سے باہر نہیں ہوتا۔ مثلاً پچاس ہاتھوں کا آدمی یا ایسا جانور جس کا سر ہاتھی کا پیٹ کسی بیے کا بلکہ انہی خیالی تصورات کی تصویر اور مورتی بھی لوگ بناتے ہیں۔ لیکن کیا واقعی یہ ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کا انسانی خیال سے باہر وجود نہیں ہوتا، بادنی تامل واضح ہوسکتا ہے کہ اس قسم کے فرضی خیالات بھی دراصل خارج سے حاصل شدہ معلومات ہی کی ترکیب وتحلیل سے بنتے ہیں۔ بجائے دو ہاتھوں کے آپ ان ہی ہاتھوں کو دس بیس فرض کر سکتے ہیں، یہ کام جس قوت کے سپرد ہے اس کا نام قوت مصورہ ہے۔

ج۔ میرا اشارہ خصوصیت کے ساتھ ابن رشد کی طرف ہے اپنی کتابوں میں ان آیتوں سے ناجائز نفع اس شخص نے جو کچھ اٹھایا ہے وہ اس کے کلام کے پڑھنے والوں پر مخفی نہیں فصل المقال ہی میں مسلسل اسی قسم کی قرآنی آیتوں کو پیش کرتا چلا گیا ہے۔ فتوحات میں شیخ نے ایک موقع پر ابن رشد سے اپنی تفصیلی ملاقات کا جو خصوصی خلوت میں اس کی خواہش پر ہوئی تھی، ذکر فرمایا ہے۔ شیخ نے لکھا ہے کہ ابن رشد اس زمانہ میں بڈھا ہو چکا تھا، اور میں جوان تھا، میرے والد سے اس نے خواہش کی کہ تمہارے لڑکے کی میں نے تعریف سنی ہے، مجھ سے بھی ملنے کیلئے بھیج دو۔ والد کے حکم سے میں ابن رشد کے پاس گیا، دیر تک باتیں ہوتی رہیں، شیخ نے اس مجلس کے آخری نتیجہ کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے یعنی وجدتہ شیخا متحیرا (میں نے ابن رشد کو ایک متحیر آدمی پایا) (الفتوحات المکیۃ، ۱۰۵/۶، ابن عربی، محی الدین ابوبکر، مصر، مطبع میریہ، س، ن) اس ملاقات کا تفصیلی تذکرہ ان شاء اللہ اپنی مستقل کتاب میں کروں گا۔

د۔ شیخ کا اشارہ جبرئیل علیہ السلام کے اس تمثل کی طرف ہے جو وحیہ کلبی صحابیؓ کی

صورت میں فرمایا کرتے تھے، یعنی دحیہ کلبیؓ کی صورت معلومہ کی صورت میں جبرئیل تجلی کرتے تھے، پھر یونہی اپنے معلومات کی شکل میں اگر حق تعالیٰ نے تجلی فرما کر عالم کے موجودہ نظام کو ظاہر اور پیدا فرمایا ہے تو اس میں کیا دشواری پیش آتی ہے۔ آخر دحیہ کی صورت میں جبرئیل جب تجلی کرتے تھے، متمثل ہوتے تھے تو ظاہر ہے کہ نہ جبرئیل ہی دحیہ کلبی بن جاتے تھے، نہ دحیہ جبرئیل۔ پس اپنے معلومات کی صورتوں میں حق تعالیٰ کو تجلی کرنے سے یہ یہ لازم آتا ہے کہ خدا عالم بن گیا اور نہ یہ کہ عالم خدا بن گیا (ان مسائل کی تفصیل کے لیے میری کتاب (الدین القیم) کا مطالعہ کرنا چاہیے، جو حال ہی میں ادارۃ الفرقان بریلی سے شائع ہوئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مقالۃ الشیخ الاکبر وطریقۃ، مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد، دکن، (تلاش بسیار کے بعد بھی مقالہ میسر نہیں آیا)

۲۔ الفتوحات المکیہ، ۵۳۹/۴، ابن عربی، محی الدین ابوبکر، مصر مطبع میریہ، س۔ن

۳۔ ایضاً

۴۔ الفتوحات المکیہ (خاتمۃ الکتاب)، ۵۸۴/۴

۵۔ محولہ بالا

۶۔ مواقف، ص ۲۲۶ (عبدالقادر الجزائری کی یہ کتاب میسر نہیں آئی، از محقق)

۷۔ محولہ بالا

۸۔ الفتوحات المکیہ ۱۸/۴، مطبوعہ مصر، بولاق، س۔ن

۹۔ الفتوحات المکیہ، ۵۳۳/۴، مطبوعہ میریہ،

۱۰۔ الفتوحات المکیہ، ۵۵۵/۴

۱۱۔ ایضاً، ۵۴۰/۴

۱۲۔ الفتوحات المکیہ، ۹۱/۳، مطبوعہ بولاق

۱۳۔ محولہ بالا

۱۴۔ محولہ بالا

۱۵۔ الفتوحات المکیہ، ۵۴۷/۴، مطبوعہ میریہ

۱۶۔ ایضاً، ۵۴۸/۴۔۵۴۷

Marfat.com

۱۷۔ ایضاً،۴/۱۰۶

۱۸۔ الفتوحات المکیہ،۴/۱۰۶

۱۹۔ الفتوحات المکیہ،۲/۲۹۵

۲۰۔ محولہ بالا

۲۱۔ الفتوحات المکیہ،۱/۳۷۷

۲۲۔ محولہ بالا

۲۳۔ محولہ بالا

۲۴۔ محولہ بالا

۲۵۔ محولہ بالا

۲۶۔ محولہ بالا

۲۷۔ محولہ بالا

۲۸۔ الفتوحات المکیہ،۳/۲۵۵

۲۹۔ محولہ بالا

۳۰۔ محولہ بالا

۳۱۔ محولہ بالا

۳۲۔ محولہ بالا

۳۳۔ فصوص الحکم،ص۱۲۵،ابن عربی،محی الدین ابوبکر،مصر،داراحیاء الکتب العربیة،۱۳۵۶ھ

۳۴۔ فصوص الحکم،ص۱۲۶

۳۵۔ محولہ بالا

۳۶۔ الفتوحات المکیہ،۱/۳۷۶،مطبوعہ میریہ

۳۷۔ فصوص الحکم،ص۸۹۔۸۸

۳۸۔ ایضاً،ص۶۰

Marfat.com

علامہ سید مرتضیٰ زبیدی

بلگرام (الف) کا ایک یمنی محدث مصری صوفی

اور

اس کی ایک کتاب

دستور ہے کہ تعارف وبصیرت کے لیے عموماً کتابوں کی ابتداء میں اس کے مؤلف کا حال اور اس کی کتاب کے اہم خصوصیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس مقدمہ کے درج کرنے کی معمولی وجہ تو یہی ہے لیکن اسی کے ساتھ مجھے مسلمانانِ ہند کے سامنے ان کے ایک ہم وطن، فاضل جلیل کا تذکرہ پیش کرنا ہے، جسے سب جانتے ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جس حیثیت سے جاننا چاہیے ہندوستان کے مسلمان اس نقطۂ نظر سے بہت کم جانتے ہیں۔ نواب صدیق حسن خان مرحوم نے ابجد العلوم میں مؤلف کتاب کے تذکرہ کو درج کرنے کے بعد بالکل سچ لکھا ہے کہ:

> ''میں نے اس بزرگ کے حالات میں ذرا بسط سے اس لیے کام لیا ہے کہ نہ صرف عوام الناس بلکہ اہلِ علم بھی اس شخص کے حالات سے بالکل ناواقف ہیں''۔ (۱)

حالانکہ ہندوستان کا یہ وہی فرد وحید ہے جس کے متعلق جدید طبقہ کے ایک ممتاز رکن مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو وصدر کلیہ عثمانیہ اورنگ آباد نے حسب ذیل الفاظ مآثر الکرام کے مقدمہ میں لکھے ہیں:

> ''علماءِ ہند کے حالات میں کوئی کتاب اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتی، جب

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں جنوری وجون، ۱۹۲۷ء کو دو اقساط میں شائع ہوا۔

Marfat.com

تک اس میں علامہ سید مرتضیٰ صاحب تاج العروس کا ترجمہ نہ ہو''۔(۲)

مولوی صاحب نے اس کے بعد وعدہ کیا ہے کہ کتاب کے آخر میں ان کے حالات کا اضافہ کیا جائے گا لیکن اس وقت تک مآثر الکرام کے جتنے نسخے میری نظر سے گذرے، کسی میں یہ اضافہ نہ پایا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص وجہ سے ایفاءِ وعدہ کا موقع نہ مل سکا۔ واللہ اعلم

بدقسمتی تو دیکھو! کہ خود مآثر الکرام میں سید علامہ کا جہاں تذکرہ ہے، کاتب اور مصحح کی مہربانی سے وہاں نام غلط درج ہوگیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد کی کامل کتاب مولوی عبدالحق صاحب کو ناقص نظر آئی۔

واقعہ یہ ہے کہ علامہ سید مرتضیٰ آزاد بلگرامی، مؤلف مآثر الکرام کے زمانہ میں نوعمر تھے۔ اس لیے آزاد نے آپ کا کوئی مستقل ذکر تو نہیں کیا ہے لیکن آپ کے جد امجد، سید قادری کے حالات میں انہوں نے اتنا لکھا تھا کہ

''واز ابنائے او سید مرتضیٰ بن سید محمد بن سید قادری مسطور کتب عربی تحصیل کردہ دور حداثتِ سن توفیق زیارتِ حرمین شریفین یافتہ، دور ۱۱۶۴ھ باین سعادت فائز گشتہ، و در اماکن متبرکہ علم حدیث تحصیل نمود، درین ایام در زبید یمن اقامت دارد، ونزد شیخ عبدالخالق زبیدی فن حدیث سند می کند، حق تعالیٰ او را عمر بہ افزاید، وترقیات ذہنی کرامت نمائد''۔(۳)

کاتب نے بجائے ''مرتضیٰ'' کے ''مقتدیٰ'' لکھ دیا، اور صرف اس ایک غلطی نے ہماری نگاہوں سے اس یگانہءِ عصر فاضل کو چھپالیا۔ ورنہ آزاد مرحوم نے اپنے مختصر ومفید جملوں میں ان کے متعلق سب کچھ لکھ دیا تھا۔

بہرحال حق سبحانہ' وتعالیٰ کا شکر ہے کہ مصر کے اس ہندوستانی علامہ صوفی کے حالات قلم بند کرنے کی توفیق اس نے مجھے عنایت فرمائی۔ موقع ومحل کے لحاظ

Marfat.com

سے اس وقت اختصار سے کام لیا جائے گا۔ لیکن اگر اعانت ایزدی نے مدد فرمائی تو ان شاء اللہ تعالیٰ کبھی سید علامہ کا مفصل تذکرہ ان کے علوم وسوانح، خواطر وتفردات کو ایک مستقل تالیف کی شکل میں مرتب کرنے کی سعادت حاصل کی جائے گی۔

والامر بیدہ سبحانہٗ وتعالیٰ

مؤلف کتاب کا نسب ووطن

کتاب نفحات قدسیہ فی الطریقۃ العیدروسیہ جس کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے مؤلف کا نام سید محمد مرتضیٰ اور کنیت ابو الفیض ہے۔ نسبی تعلق مشہور بلگرامی واسطی سادات (ب) سے ہے۔ شجرہ طیبہ مآثر الکرام سے آپ کا کامل نسب نامہ اس طرح مرتب ہوتا ہے۔

سید مرتضیٰ بن سید محمد بن سید قادری بن سید ضیاء اللہ بن سید خان محمد بن سید عبد الغفار بن سید تاج الدین بن سید دولارہ بن سید حسین بن سید محمد بن سید محمد بن سید بدہن بن سید جمال الدین بن سید ابراہیم بن سید ناصر بن سید سالار بن سید محمد صغریٰ ابن سید حسین بن سید ابو الفرح ثانی بن سید زید بن سید عمر بن سید حسن بن سید علی عراقی ابن سید حسین بن سید علی بن سید محمد بن محمد عیسیٰ موتم الاشال بن امام زید شہید بن امام ہمام سیدنا وسید المسلمین امام زین العابدین بن شہید کربلا امام حسین علیہ السلام بن اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب، وسیدۃ فاطمۃ الزہراء بضعۃ رحمۃ للعلمین امام المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم۔

سید مرتضیٰ اگرچہ عام طور پر زبیدی کی نسبت سے مشہور ہیں۔ لیکن آپ کی ولادت باسعادت شیراز دیار ہند کے مشہور مردم خیز قصبہ بلگرام میں ہوئی۔ بلگرام کی اسلامی آبادی اس زمانہ میں دو حصوں میں منقسم تھی۔ ایک حصہ کو سید واڑہ اور دوسرے حصہ کو سیدان پورہ کہتے تھے۔

Marfat.com

میر غلام علی آزاد بلگرامی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید مرتضٰی کے آباء واجداد کا موروثی مکان سید واڑہ میں تھا۔ لیکن سسرالی تعلقات کی وجہ سے آپ کے سلسلہ کے ایک بزرگ سید عبد الغفار نامی سیدان پورہ کے محلّہ میں رہ پڑے اور اسی محلّہ میں سید مرتضٰی پیدا ہوئے۔ (۴)

ابتدائی تعلیم

تعلیم کا ابتدائی زمانہ بلگرام میں بسر ہوا۔ اگر چہ کوئی مستند تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔ تاہم قرائن کا اقتضاء یہ ہے کہ فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم سید علامہ نے بلگرام میں پائی۔ کیونکہ ابا عن جد یہ خاندان علم وفضل کی روشنی سے معمور تھا۔ آپ کے جد امجد سید قادری کا تعلق اکابرِ سلف کے ان بلند ہمت نفوس سے تھا جن کو علم وعرفان کی تلاش نے ہر قسم کی وطنی خصوصیات و مالوفات سے بالکل آزاد کر دیا تھا۔ مآثر الکرام میں ہے کہ سید قادری نے علم طب میں نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب وعجم کی باضابطہ سیر کی۔ آخر میں حما (شام) کی خانقاہ قادریہ میں، لنگر ڈال دیا، اور سید یسین حموی سے جو اس زمانہ میں سجادہ نشین تھے، مرید ہوئے، اور طریقہ قادریہ کی تعلیم حاصل کی۔ پھر بغداد میں رہے، علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کے بعد دہلی پہنچے۔ بالآخر خلوت گزینی کا جذبہ آپ پر غالب آیا اور عمر کا بقیہ حصہ بلگرام کے گوشۂ عافیت میں ختم کیا۔ سادات بلگرام پر آپ کی جلالتِ شان کا جو اثر تھا اس کا ثبوت ان تاریخی شعروں سے ملتا ہے۔

رحل القادری سیدنا صاحب الکشف والکرامات

اللھم بحق عام رحلتہ ان للمتقی لحسنات

میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ان کو خود دیکھا تھا، اُن کا بیان ہے کہ سید قادری نہ صرف سیر وسلوک، تصوف وحقائق میں شیخ کامل تھے بلکہ فقہ وحدیث وتفسیر

Marfat.com

میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ قرآن مجید کے حافظ تھے، تجوید وقرأت کے ماہر تھے۔ مشہور ہندوستانی فاضل ملا جیون ان کے ہندوستانی استاد تھے، اور بیرون ہند میں ان کے سب سے بڑے استاد مولانا سلطان بن ناصر بن احمد خاپوری تھے، صحاح ستہ اور تجوید کی سند انہیں سے حاصل کی تھی۔ (۵)

تعلیمی سفر

غالباً سید قادری کی یہی علمی الوالعزمیاں تھیں جو ان کے پوتے کی طلب علم میں مشعل راہ ثابت ہوئیں۔ دادا کا نقش قدم سامنے تھا۔ سید مرتضیٰ نے بھی وطن کو خیر باد کہا اور شروع میں وہ الہٰ آباد پہنچے۔ یہاں اس وقت ملا فاخر الہٰ آبادی المتخلص بہ زائر کی درس و تدریس کا طوطی بول رہا تھا۔ کچھ ان سے پڑھتے رہے پھر دہلی پہنچے، دِلّی اس زمانہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی دِلّی تھی۔ حکیم الہند کے درس میں تحقیق کا دریا موجیں مار رہا تھا۔ سید مرتضیٰ زانوئے تلمذ تہ کر کے بیٹھ گئے۔ اپنی ایک یادداشت میں نہایت جوش و مسرت کے ساتھ شاہ ولی اللہؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ صحیح طور پر اگر چہ یہ معلوم نہیں ہے کہ دہلی کی علمی حلقہ میں سید علامہ کب تک رہے۔ تاہم ان کی تالیفات میں جو تحقیق و جامعیت کا رنگ پایا جاتا ہے اس میں "ولی اللہی" مذاق کو بہت کچھ دخل ہے۔

سفرِ حج

ابھی عنفوان شباب تھا کہ حج کا شوق مستولی ہوا اور نوعمری میں حجاز روانہ ہو گئے۔ میر غلام علی آزاد نے لکھا ہے:

"در حداثت سن توفیق زیارت حرمین شریفین یافتہ"۔ (۶)

ایک سید جب عرب پہنچتا ہے تو اس کو اپنا آبائی وطن یاد آ جاتا ہے۔ اگرچہ عارضی وطن کی آسانیاں اسے پھر اسے اپنے ملک میں واپس لے آتی ہیں۔ مگر سید

Marfat.com

مرتضٰی جب اپنے حقیقی وطن میں پہنچ گئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کو گویا بالکل بھول گئے، اور کچھ اس طرح بھولے کہ پھر اس دیس کی طرف کبھی رخ نہیں کیا۔ عموماً غریب ہندوستان کا تذکرہ اپنی کتابوں میں کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ گویا اس سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

سفر زبید

اسلامی علوم میں سے سید مرتضٰی کا فطری میلان زیادہ تر حدیث اور ادب کی طرف تھا۔ ہندوستان میں اس وقت میر زاہد سلم مسلم کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ دہلوی خاندان اگرچہ حدیث وقرآن کا علم بردار تھا، تاہم ملک کا عام علمی ماحول معقولی تھا، جس سے غالباً سید مرتضٰی کچھ خوش نہ تھے۔ جب عرب پہنچے تو یہاں معقولات سے زیادہ ان کو اپنے مذاق کی چیزیں نظر آئیں۔ حدیث، ادب، تفسیر کے بڑے بڑے ماہرین، عرب کے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں درس دے رہے تھے۔ پھر کیا تھا، علم کا متلاشی دھونی رما کر جم گیا۔ اگرچہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ بجائے خود دارالعلوم تھے۔ لیکن سارے عرب میں یمن کو علمی حیثیت سے امتیاز حاصل تھا، اور اب بھی ہے۔ یمن کا مشہور تعلیمی شہر، زبید تھا اور سنا جاتا ہے کہ اب بھی ہے۔ سید مرتضٰی زبید کی شہرت سن کر اسی طرف روانہ ہوئے۔ یہ حسنِ اتفاق تھا کہ زبید کے مشاہیر اربابِ درس میں، اس وقت علامہ عبدالخالق بن زین مزجاجی بھی تھے۔ جنہوں نے ہندوستان کے مختلف علماء ومشائخ سے پڑھا اور فائدہ اٹھایا، جن میں علامہ حیات سندی، شیخ عبدالکریم ہندی، شیخ امراللہ ہندی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس لحاظ سے شیخ عبدالخالق پر ہندوستان کا خاص حق تھا۔ بلگرام کا نوجوان طالب علم جب زبید پہنچا تو سب سے پہلے شیخ عبدالخالق ہی کے سایہ عاطفت میں اس کو جگہ ملی۔ جس کی خبر ہندوستان بھی پہنچی تھی، اور میر غلام علی نے مآثر میں اس کا

Marfat.com

تذکرہ بھی کیا ہے۔

آخر میں زبید کا مشہور علمی قدیم خاندان اہدلیہ ان پر مہربان ہو گیا۔ اس زمانہ میں اس خاندان کی درسی و افادی ریاست شیخ احمد بن محمد شریف مقبول اہدل (ج) پر ختم ہوتی تھی جو نہ صرف علوم نقلیہ کے ماہر بصیر تھے بلکہ علوم عقلیہ مثلاً منطق، حساب ہیئت میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ پیچیدہ مسائل کے حل میں ان کو خاص کمال تھا۔ تقریباً یہ کمال ان کو تمام علوم متداولہ میں حاصل تھا۔ علامہ مرتضیٰ، شیخ عبدالخالق کے بعد انہیں کے فیوض سے مستفیض ہوتے رہے، اور زبید کی علمی دلچسپیوں میں کچھ ایسے منہمک ہوئے کہ گویا یہی ان کا وطن ہو گیا۔ تاج العروس کے خاتمہ نویس نے لکھا ہے:

"واقام بزبید مدة طویلة حتیٰ قیل له الزبیدی و اشتهر بذلک"۔(۷)

''ایک زمانہ دراز تک زبید میں رہے، یہاں تک کہ لوگوں نے زبیدی کہنا شروع کیا اور آج تک اسی نسبت سے مشہور ہیں''۔

اور خود ان پر بھی زبید کا بہت گہرا اثر تھا۔ مصر سے ایک دوست کے نام خط لکھتے ہیں اس میں جب زبید کا ذکر آیا تو قلم سے بے ساختہ یہ جملے نکل پڑے۔

''خدائے واحد منان سے یہ دعا ہے کہ کاش! مجھے پھر اس خطہ (زبید) میں پہنچا تا، تاکہ اپنے پرانے گذرے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کرتا اور اس سرزمین سے انس حاصل کرتا''۔(۸)

حج مکہ اور طریقہ قدسیہ عیدروسیہ میں بیعت

عموماً تاریخوں میں لکھا ہے کہ سید علامہ نے متعدد حج کیے ہیں۔ نہیں معلوم کہ یہ کس حج کا واقعہ ہے کہ یہ زبید سے مکہ مکرمہ بارادۂ حج آئے ہوئے تھے کہ خدا کے گھر میں، نبوت کے گھرانے کا ان کو ایک آفتاب مل گیا۔ یہی وہ روشنی تھی جس نے

Marfat.com

سید کی حقیقت میں انقلاب پیدا کر دیا، ان کے علم کو عرفان سے دانستن کو شناختن سے بدل دیا۔ یعنی عیدروسی طریقہ کے ایک ''حبیب'' سید عبدالرحمٰن بن مصطفیٰ العیدروسی کی زیارت نصیب ہوئی۔ خدا جانے سید علامہ نے ان میں کیا دیکھا کہ بلگرام، الہٰ آباد، دہلی اور زبید کی گلیوں میں گھوم گھوم کر جو سرمایہ اتنی طویل مدت میں جمع کیا تھا، اس کو اس عیدروسی درویش کے قدموں پر نثار کر دیا، تاج العروس کے خاتمہ نگار نے لکھا ہے:

''واجتمع بالسید عبدالرحمن العیدروس بمکة المشرفة ولازمه ملازمة کلیة''۔(۹)

''مکہ مکرمہ میں سید عبدالرحمٰن عیدروس سے ان کی ملاقات ہوئی اور کلی طور پر پھر انہیں کے ہو رہے''

سید علامہ خود لکھتے ہیں:

''فانه ممن ربانی و بلبن تادیبه غذانی''.(۱۰)

''انہوں نے میری پرورش فرمائی اور اپنی تادیب کے دودھ سے مجھ سیراب کیا''

سید عبدالرحمٰن بن مصطفیٰ، عیدروس نے اگرچہ باطنی اور ظاہری کمالات کا اکتساب زیادہ تر اپنے والد مرحوم اور سید عبدالرحمٰن بافقیہ سے کیا تھا۔ تاہم ان کے زمرۂ اساتذہ میں چند ہندوستانی علماء بھی تھے۔ ابجد العلوم میں لکھا ہے کہ انہوں نے شیخ حیات سندی، مولوی حیدر ہندی اور سید فضل اللہ بن احمد ہندی سے بھی پڑھا تھا۔(۱۱) ممکن ہے کہ اس ہندوستانی رابطہ نے سید عیدروسی کی خاص توجہ علامہ مرتضیٰ پر مبذول کرادی ہو۔ بہر حال کچھ بھی ہو، عیدروسیہ سلسلہ میں داخل ہو جانے کے بعد سید علامہ کا علمی ساز، روحانی سوز سے بدل گیا، آسمان کے نیچے یہ ایک عجیب تماشا تھا کہ ایک حافظ الحدیث مسند الوقت، محدث، ولغوی ایک درویش کے قدموں پر جھکا

Marfat.com

ہوا تھا، نہ اسے اپنے علم کا خیال تھا، نہ اپنے فضل کا لحاظ تھا۔ حیرت تو اس پر ہے کہ سید مرتضیٰ نے بایں ہمہ تبحر و وسعتِ نظر، سید عبد الرحمٰن عیدروس سے مختصر المعانی سبقاً سبقاً پڑھی، اور احیاء العلوم غزالی کا بھی ایک حصہ اپنے پیر ہی سے پڑھا، اسی درس سے احیاء العلوم کی اس عظیم الشان ضخیم شرح کی بنیاد پڑ گئی جو اتحاف السادۃ المتقین فی شرح احیاء علوم الدین کے نام سے مشہور ہے۔ مصر والوں نے اسے چھاپ دیا ہے اور ایک قیمتی ذخیرۂ معلومات کی حیثیت سے علمائے اسلام کے ہاتھوں میں ہے۔

سفرِ مصر

میں کہہ چکا ہوں کہ سید علامہ پر بیعت کے بعد دوسرا رنگ چڑھ گیا تھا۔ وہ اپنی مرضی اور ارادہ سے دست بردار ہو چکے تھے۔ اب ان کی ہر جنبش ان کا ہر سکون پیر کے اشارۂ چشم کے ساتھ وابستہ تھا۔ تاج العروس کے خاتمہ نگار کا بیان ہے کہ سید مرتضیٰ اپنے پیر کے حکم و ترغیب سے بجائے ہندوستان کے جو ان کا وطن تھا عرب سے سیدھے مصر کی طرف روانہ ہوئے، اور ۹ اصفر ۱۱۶۷ھ میں قاہرہ پہنچے اور ایک زمانہ تک خان الصاغہ کی سرائے ان کی قیام گاہ تھی۔ (۱۲)

مصر کے مشاغل

درویش پیر نے اپنے محدث ولغوی مرید کو مصر کس لیے بھیجا تھا۔ اس کو کون جان سکتا ہے۔ لیکن سید مرتضیٰ نے اپنے اس قیام کو غنیمت خیال کیا۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ کے مجھ پر جو احسانات ہیں، ان میں ایک بڑا احسان یہ ہے کہ میں جب مصر پہنچا تو بیکار پڑا نہ رہا۔ بلکہ فرصت نکال کر میں یہاں بھی طلب علم میں منہمک اور اس کے رموز و اسرار کے حل میں مصروف ہو گیا''۔ (۱۳)

Marfat.com

اطراف مصر کی سیاحت

سید مرتضی کو علم حدیث کی متعدد شاخوں میں سے مختلف النوعیت سند کے حصول کا بہت شوق تھا۔ زبید کے ایک عالم کے نام ایک گرامی نامہ میں لکھتے ہیں:

''وہ دن جو گذر گئے، ان میں اس کا خاص شوق تھا کہ لوگ عالی سند کی تلاش میں دور دراز ممالک کا سفر اختیار کرتے تھے۔ لیکن اب یہ ذوق معدوم ہو رہا ہے۔ وہ بساط ہی الٹ گئی، ہمتیں پست ہیں، بگڑی کے بنانے والے کوتاہیوں کے دور کرنے والے وہ بزرگانِ دین کہاں ہیں، جن پر ملت کو فخر تھا''۔ (۱۴)

پھر اپنے متعلق ایک خاص مسرت و نشاط کے ساتھ لکھتے ہیں جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ حدیث کی اس صنف کا ذوق ان پر کس قدر غالب تھا، ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

''لیکن ان گذشتہ بزرگوں کے آثار کا کچھ حصہ اب بھی باقی ہے، دنیا کے گوشوں میں وہ چیزیں اب بھی کہیں نہ کہیں مل جاتی ہیں اور یہ بندہ الحمدللہ ان لوگوں میں ہے، جس نے علم حدیث اور علم اسناد کے اساتذہ کی خدمت میں بہت کچھ تگ ودو کی ہے اور ان سے حاصل کر کے اب اس نے اپنے علمی صحن میں اپنا دستر خوان بچھایا ہے''۔ (۱۵)

سند عالی تلاش کیوں کی جاتی ہے، اس کی وجہ انہوں نے اسی کتاب میں یہ بیان کی ہے:

''حدیث کی سندوں میں سند عالی معتبر ہوتی ہے۔ یعنی جس میں وسایط کم ہوں اور یہ قاعدہ ہے کہ جہاں تک وسایط کم ہوں گے جھوٹ کا احتمال کم ہوتا جاتا ہے، اور جہاں تک واسطے زیادہ ہوں گے کذب کا احتمال قوی ہوتا جاتا ہے''۔ (۱۶)

Marfat.com

بہر حال قیامِ مصر کے زمانے میں ان کا ابتدائی مشغلہ یہی تھا کہ مشائخ حدیث کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کے پاس جو سند ہوتی اس کو حاصل کرتے۔ علمائے مصر میں ان کو ایک ایسا محدث ملا جس کی سند دیگر معاصرین کے لحاظ سے بہت عالی تھی، ایک خط میں خصوصیت کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے:

''ولم ینبه لعلو سنده الا القلیل لا شتغا لهم باحوالهم'' (۱۷)

''لیکن اس محدث کی اونچی سند پر بہت کم لوگوں کو تنبہ ہوتا ہے کیونکہ عموماً لوگ اپنے ذاتی معاملات میں منہمک ہیں''۔

اسی ذوق میں انہوں نے قاہرہ سے بھی باہر قدم نکالا اور مختلف اضلاع و بلاد میں گھومتے رہے۔ ایک یادداشت میں ان مقامات کی تفصیل بھی لکھی ہے، جہاں جہاں سند کی تلاش میں یہ پہنچے، ان میں سے، اسیوط، جرجان، فرشوط، دمیاط، محلّہ، سہنود، بوصیر و مہتور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ (۱۸)

فلسطین کا سفر

سب کچھ مل رہا تھا لیکن علم کی پیاس کسی طرح نہیں بجھتی تھی۔ آخر اسی سلسلہ میں (نیز بہ نیت زیارت) بیت المقدس کا بھی سفر کیا۔ ایک خط میں خود لکھتے ہیں:

''میں نے بیت المقدس کا بھی سفر کیا اور وہاں کے ارباب اسناد کی خدمت میں حاضر ہوا، بیت المقدس سے رملہ بھی اسی دھن میں پہنچا اور ہر جگہ میں نے حدیث کی سماعت کر کے سند حاصل کی''۔ (۱۹)

تحصیل اجازات

محدثین کا دستور تھا کہ اگر کسی استاد کے پاس خود نہیں پہنچ سکتے تھے تو خط و کتابت کے ذریعہ سے اجازت نامے منگوایا کرتے تھے۔ سید علامہ نے یہ بھی کیا،

Marfat.com

خود لکھتے ہیں:

''مجھے حلب، فاس، تونس، سولا، تلمسان کے محدثین نے بھی اجازت نامے لکھ کر بھیجے، ماسوا اس کے مصر میں بھی مغرب اقصیٰ کے چند صاحب اسناد محدثین کی ملاقات سے شرف اندوز ہوا، اور اجازت حاصل کی''۔(۲۰)

مصر کا مستقل قیام اور نکاح

جس نے کسب کمال میں اتنی جان فرسا محنت کی ہو، اس کی علمی وسعت کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔ سید علامہ میں اس کے بعد جس قسم کی جامعیت پیدا ہوگئی تھی، وہ اپنے زمانہ میں اپنی آپ نظیر تھی۔ وہ ادیب تھے، مفسر تھے، محدث تھے، لغوی تھے، منطقی تھے، فلسفی تھے، آپ کو فقہ اربعہ کی اجازت حاصل تھی، اور ان کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ اسی عرصہ میں ایک شیخ کامل کی نظر توجہ ان کو نصیب ہوئی، جس نے ان کے سارے علمی کمالات کو مرکز انابت پر گردش دے دیا تھا۔ نہ صرف علوم بلکہ اس سیر و سیاحت میں ان کو مختلف اسلامی زبانوں پر بھی عبور حاصل ہوگیا تھا۔ خصوصاً فارسی، ترکی، نہایت آسانی کے ساتھ بولتے اور لکھتے تھے، اور عربی تو ان کی گویا مادری زبان ہوگئی تھی۔ اگرچہ تاریخوں میں اس کا ذکر نہیں ہے لیکن بارھویں صدی ہجری کے ہندوستانی کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ اردو نہ جانتے تھے بالکل بعید از عقل ہے۔ اس لیے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ چینی اور پشتو کے سواد نیائے اسلام کی ہر ایک زبان سے وہ واقف تھے اور اس مختلف زباندانی نے آئندہ زندگی میں ان کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا۔

بہرحال اب سید علامہ نے کسی خاص مقام پر جم کر کام کرنے کا ارادہ کیا۔ پیر کا حکم مصر میں رہنے کا تھا۔ پھر مصر کے سوا کہاں جاتے۔ محلہ عطفۃ الغسال میں آپ نے ایک مستقل مکان لیا اور دمیاط کے ایک بزرگ ذوالفقار دمیاطی جو غالباً

Marfat.com

ان کے عقیدت مند تھے، ان کی دختر نیک اختر سے جن کا نام زبیدہ تھا، آپ نے نکاح کرلیا اور تالیف وتصنیف کو اپنا خاص موزوں شغل قرار دیا۔

تاج العروس کی تالیف

قاموس فن لغت میں گویا متن متین ہے کیونکہ فیروز آبادی نے نہایت مختصر لفظوں میں زیادہ مطالب کے سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ سید علامہ کی غالباً سب سے پہلی نگاہ انتخاب اس پر پڑی اور کامل چودہ سال گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر آپ نے اس ٹھوس اور جامع کتاب کی ایک ضخیم شرح نو جلدوں میں لکھی، اور تقریباً ہر جلد کے صفحات پانچ سو صفحات سے کم نہیں ہیں۔ حالانکہ اس کتاب کا طول وعرض بہت غیر معمولی ہے۔ اگر چھوٹی تقطیع پر شائع کی جائے تو میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اس کی ضخامت بجائے ۹ جلدوں کے اٹھارہ جلدوں تک پہنچ جائے گی۔

تاج العروس کی ختم کی تقریب

سید علامہ چودہ سال تک نہایت خاموشی کے ساتھ اس مہم کے سر کرنے میں مسلسل مصروف رہے، جب کام ختم ہوگیا تو آپ نے قدیم دستور کے مطابق مصر کے تمام اعیان واشراف کی دھوم دھام سے ایک دعوت کی، جس میں علماء، صلحاء، مشائخ، الغرض ہر طبقہ کے لوگ شریک تھے۔ دعوت کے بعد آپ نے سب کو ایک مجلس میں جمع کیا اور اپنی محنت ان کے سامنے پیش کی۔ لوگ انگشت بدنداں تھے۔ حیرت تھی کہ ہندوستان کے غریب الوطن مسافر نے یہ کیا کیا اور بالاتفاق سبھوں نے ان کی جلالت قدر کا اعتراف کیا۔ مصر کے مسلم الثبوت اساتذہ وسر برآوردہ علماء نے نہایت فراخدلی کے ساتھ اس پر اپنی تقریظیں ثبت کیں۔ ان میں اپنے زمانہ کے شیخ الکل شیخ علی صعیدی، شیخ احمد دردیر، شیخ ابوالاتوار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

Marfat.com

تاج العروس کی شہرت عامہ اور اس کی شاہانہ قدر ومنزلت

مصر میں جس وقت اس کتاب کا غلغلہ بلند ہوا تو اطراف و جوانب سے جوق در جوق لوگ اس ندرت انگیز حیرت خیز چیز کے دیکھنے کے لیے امنڈ پڑے۔ رفتہ رفتہ اس کی جلالتِ شان، علوِ مرتبت کا شہرہ دوسرے اسلامی ممالک تک پہنچا۔ قسطنطنیہ سے خلیفۃ المسلمین کا فرمان آیا کہ اس کا ایک نسخہ سلطانی کتب خانہ کے لیے فوراً بھیجا جائے۔ مراکش کے سلطان نے بھی اس کا ایک نسخہ طلب کیا۔ دارفور کے امیر نے بھی ایک نسخہ اپنے لیے لکھوایا، حالانکہ اگر بکفایت بھی لکھوایا جاتا تو ہر نسخہ کی لکھائی پر کم از کم ایک ہزار ریال خرچ ہوتا تھا۔ اس سے مسلمانوں کے علمی ذوق اور اسلامی امراء کی علم دوستی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ کل کی بات ہے لیکن زمانہ کی اس نیرنگی کا کچھ ٹھکانہ ہے کہ آج اگر کسی اسلامی کتاب کی قیمت بدقسمتی سے دس یا بیس تک پہنچ جاتی ہے تو اس کے مصنفین صرف کیڑوں اور دیمک کے نگران کار بن کر رہ جاتے ہیں۔

شغل درس حدیث

تاج العروس نے مصریوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اب انہوں نے پہچانا کہ ان میں کس گھرانے کا کس ملک کا کون آدمی ہے نہ صرف عوام الناس بلکہ ممتاز افاضل مصر بھی سید علامہ کی خدمت میں عقیدت کے ساتھ آنے لگے۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، سید ممدوح کو اسناد و اجازات کا ذاتی شوق تھا۔ آنے جانے والوں پر بھی یہ ذوق غالب ہوا اور انہوں نے سید سے سند کا مطالبہ شروع کیا۔ حتی کہ آخر میں مصر بلکہ دنیائے اسلام کے سب سے بڑے علمی مرکز میں بھی جنبش ہوئی اور ازہر کے شیوخ و اساتذہ بھی حصول سند کی غرض سے آپ کی خدمت میں آنے لگے۔ اس وقت آپ نے فرمایا کہ جب تک میرے سامنے حدیث سنی یا سنائی نہ جائے گی، سند

Marfat.com

نہیں دے سکتا۔ آخر یہ طے ہوا کہ شیخوں کی جامع مسجد میں جو صلیبیہ میں ہے، ہر پیر اور جمعرات کو سید علامہ حدیث کا درس دیں گے حلقہ میں جو شریک ہوں گے ان کو سند دی جائے گی اور اسی کے بعد تالیف کے سوا تدریس کا بھی سلسلہ جاری ہوا۔

سید علامہ اس زمانہ میں محلّہ اعطفہ الغسال سے سویقۃ اللالاء منتقل ہو گئے تھے، یہیں سے آپ شیخون کی جامع مسجد میں جاتے اور درس دیتے۔

آغاز درس

سب سے پہلی کتاب جو سید علامہ نے شروع کرائی وہ صحیح بخاری تھی، سید حسن شیخونی قاری تھے اور دوسرے حضرات سنتے تھے، دنیا یہ سن کر تعجب کرے گی، اس درس میں جامع ازہر کے مشہور اساتذہ و معلمین بھی ہوتے تھے، جن میں شیخ احمد سجاعی اور شیخ مصطفیٰ طائی بہت زیادہ ممتاز تھے۔

طریقِ درس

مصر میں بھی اس زمانہ میں درسِ حدیث کا وہی عام طریقہ تھا، جو اس وقت ہندوستان میں مروج ہے یعنی شاگرد کتاب پڑھتا جاتا ہے اور استاد سنتا رہتا ہے، جہاں پر کوئی چیز قابل ذکر ہوتی ہے اسے بتا دیتا ہے لیکن سلف کا طریقہ درس یہ نہ تھا وہ املاء کراتے تھے۔ یعنی استاد متن و سند کے ساتھ حدیث کو زبانی بیان کرتا تھا اور پھر مختلف اعتبارات سے اس پر بحث کرتا تھا، سید علامہ نے عام طریقہ کے سوا املاء کی رسم کہن کو پھر زندہ کیا اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں معمولی درس کے بعد، قدیم حفاظ کی طرح املاء بھی کراتا ہوں، جس میں متن کے ساتھ سند بھی بیان کرتا ہوں اور مطالب و معانی سے بیچ بیچ میں بحث کرتا جاتا ہوں، طلبہ میری ان تقریروں کو قلم بند کرتے ہیں جو اس وقت متعدد جلدوں کی شکل میں مرتب ہو چکی ہیں''۔(۲۱)

Marfat.com

بسط و تفصیل کی نوعیت

سید علامہ اپنے اس املائی درس میں کئی تفصیل و توضیح سے کام لیتے تھے۔ اس کا اندازہ محض اس سے ہو سکتا ہے کہ ام زرع کی مشہور حدیث جو غالباً بائیس سطروں سے زیادہ نہیں ہے، اس کے متعلق اپنے جن مضامین کا املاء کرایا صرف اس کی ضخامت سات جز تک پہنچ گئی۔ اسی خط میں لکھتے ہیں:

''ام زرع کی حدیث پر میں نے سات جزوں میں املاء کرایا ہے اس حدیث کی شرح چودہ مجلسوں میں ختم ہوئی۔ طلبہ اس کی نقلیں لے رہے ہیں اور مختلف ممالک میں پھیلا رہے ہیں''۔ (۲۲)

مصریوں پر آپ کا اثر

یوں تو جب سے تاج العروس شائع ہوئی تھی، آپ کے فضل و جلالت کا پرچم مصر میں لہرا رہا تھا لیکن حدیث شریف کے اس انوکھے طریقہ درس نے آپ کی شان و عظمت کو دوبالا کر دیا اور عام سے لے کر خواص ہر ایک آپ کا ثناء خواں اور عقیدت مند تھا۔ امراء اور اعیانِ دولت جوشِ عقیدت میں آ کر آپ کو اپنی محل سراؤں میں بلاتے اور اس تقریب سے عظیم الشان دعوتیں کرتے۔

مجلس دعوت

سید علامہ کا یہ دستور تھا کہ جب کسی امیر کے یہاں سے دعوت آتی تو اپنے طلبہ کاتب، نیز دیگر متوسلین کو لے کر اس کے مکان پر پہنچتے۔ داعی اپنے مکان کو ہر قسم کی آرائشوں سے سجاتا۔ گھر کے لوگ نئے کپڑے پہنتے، مردوں کا مجمع سامنے ہوتا، عورتیں اور بچیاں پردے کے پیچھے ہوتیں، عود، بخور اور ہر قسم کی خوشبودار چیزیں جلائی جاتیں۔ اس کے بعد سید، بخاری، دارمی یا کسی دوسری کتاب کی چند حدیثیں

Marfat.com

سند کے ساتھ سناتے پھر سب مل کر درود شریف پڑھتے اس کے بعد کاتب اٹھتا اور تمام حاضرین خواہ مرد ہوں یا عورت بلکہ بچوں کے بھی نام لکھتا، پھر اس پر تاریخ و وقت درج کر کے سید علامہ کی خدمت میں لاتا۔ سید اس پر ''صح ذلک'' لکھ دیتے اور یہ محدثین کا قدیم دستور تھا۔

بیرون مصر میں آپ کا آوازہ

میں کہہ چکا ہوں کہ تاج العروس کی شہرت اسلامی دنیا کے سلاطین تک پہنچ چکی تھی۔ اب اسی کے ساتھ سید علامہ کے درس حدیث کی خوشبو مصر کی دیواروں کو پھاند کر غیر ممالک میں پہنچی۔ اکثر اقطار و امصار سے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور جو نہیں آ سکتے تھے وہ تحریر کے ذریعہ سے سند اور اجازت نامے منگوایا کرتے تھے۔ سید علامہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''اس وقت تک میں نے غزہ، (شام) دمشق، حلب، عین تاب (موصل) آذربیجان (ایران) تونس، الجزائر، دیار بکر، مدراس (ہندوستان) میں اپنی سند اور اجازت نامے بھیجے''۔ (۲۳)

تاج العروس کے خاتمہ نگار کا بیان ہے کہ صرف انہیں ممالک سے نہیں بلکہ دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ سے روزمرہ آپ کے پاس درخواستیں پیش ہوتی تھیں اور عوام ہی نہیں بلکہ ان ممالک کے امراء و سلاطین بھی خطوط لکھتے اور نہایت نیازمندی کے ساتھ اجازت نامے یا سند طلب کرتے۔ خاتمہ نگار نے اس سند میں لکھا ہے کہ یمن، شام، ہندوستان، بصرہ، عراق، مراکش، سوڈان، قزان، الجزائر، الغرض ہر طرف سے شدید تقاضے آتے رہتے تھے۔ (۲۴)

خلیفۃ المسلمین کی درخواست

آخر میں قسطنطنیہ سے خلیفۃ المسلمین سلطان عبد الحمید اول نے آپ کو

Marfat.com

قسطنطنیہ آنے کی دعوت دی اور آپ نے منظور بھی فرمالیا تھا لیکن پھر خدا جانے کیا موانع پیش آئے کہ نہ جا سکے۔ سلطان نے اس کے بعد یہ درخواست پیش کی کہ تو پھر وہیں سے مجھے اپنی سندوں اور حدیث کی کتابوں کی اجازت لکھ بھیجئے۔ سید علامہ نے اپنے ہاتھ سے اجازت نامہ لکھ کر بارگاہ سلطانی میں بھیجا۔ سلطان کے ساتھ ترکی کے مشہور فاضل خبیر، صدر اعظم علامہ راغب پاشا نے بھی آپ سے سند اور اجازت نامہ حاصل کیا، اور دنیاوی حیثیت سے ایک مسلمان عالم کا یہ آخری نقطہ عروج تھا جو ایک غریب الوطن ہندوستانی عالم کو دوسرے ملک میں حاصل ہوا۔ (۲۵)

﴿قل اللهم مالک الملک تو تی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء و تعز من تشاء و تذل من تشاء﴾ (۲۶)

اوراد و وظائف کی اجازت

مصر میں سید علامہ کا قیام اپنے پیر کے حکم سے تھا، وہاں حدیث تفسیر یا جس چیز کا درس دیتے تھے، سب میں بجائے درس کے تلقین و ذکر کی شان زیادہ غالب تھی۔ اپنے درس میں خلافیات و جدلیات سے زیادہ حقائق و معارف فضائل اعمال کی حدیثوں پر زور دیتے تھے۔ اسی کے ساتھ اپنے شیخ سے جن اذکار اور اوراد کی آپ کو اجازت تھی، طالبین کی اس طرف بھی رہنمائی فرماتے تھے، تاج العروس کا خاتمہ نگار لکھتا ہے:

"و یجیز هم با وراد و احزاب". (۲۷)

"اور لوگوں کو وہ اوراد و وظائف کی بھی اجازت دیتے تھے"

سید علامہ کا حلیہ و سیرت

تاج العروس کے خاتمہ نگار نے آپ کی شکل وصورت کی پوری توضیح کی ہے اور میں اسی سے نقل کرتا ہوں۔ اس کا بیان ہے، سید مرتضیٰ میانہ قد، چھریرے

بدن کے تھے رنگ سنہرا تھا، اعضاء متناسب تھے، داڑھی بہت معتدل تھی لیکن اکثر حصہ سفید ہو چکا تھا، ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے، چہرہ پر ایک دائمی بشاشت رہتی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ نہایت باوقار اور بھاری بھر کم تھے، ان کی مجلس بارعب اور پُر ہیبت ہوتی تھی۔ اخلاق نہایت پاکیزہ اور لطیف تھے، گفتگو نہایت دلچسپ پر مغز، نوادر و لطائف سے معمور ہوتی تھی، حافظہ نہایت قوی تھا۔ نہایت سمجھ دار اور ذکی طبیعت تھی۔ (۲۸)

لباس ووضع

سید علامہ اچھے لباس کے شوقین تھے، بدن پر ہمیشہ صاف ستھرا جامہ ہوتا، سر پر مکہ والوں کی طرح عمامہ باندھتے جس میں جالیاں اور ریشمی مزرکش ڈورے پڑے ہوتے۔ (۲۹)

ذرائع معاش

میں نے تلاش کیا کہ سید علامہ کے گذر اوقات کی کیا صورت تھی لیکن کوئی واضح بیان نہ ملا۔ تاہم ان کی جو زندگی تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فراخی رزق سے بھی ان کو نوازا تھا۔ اپنے ایک خط میں انہوں نے لکھا ہے کہ اس وقت ہمارے یہاں دو حبشی لونڈیاں اور ایک حبشی غلام ہے۔ باندیوں کا نام سعادہ اور رحمت تھا، اور غلام کا نام بلال تھا اور عجب بات ہے کہ سید علامہ جب اپنے لیے کسی عالم سے سند یا اجازت نامہ طلب کرتے تو اس میں لکھتے کہ میری بیوی اور میری لونڈیوں اور غلام کے نام سے بھی اجازت نامہ بھیجئے گا۔ (۳۰)

بہر حال معاشی حیثیت سے سید علامہ کی حالت اچھی تھی، اس کا سامان کہاں سے ہوتا ہے۔ غالباً گمان یہ ہے کہ حکومتِ مصر یا وہاں کے ارباب خیر آپ کی

Marfat.com

مدد کرتے تھے، اور شہرت عامہ کے بعد ممکن ہے کہ خلیفۃ المسلمین یا دوسرے سلاطین کے یہاں سے آپ کو امدادیں ملتی ہوں۔

آخر عمر اور وفات

بہر حال جو بھی صورت حال ہو، سید علامہ نہایت عزت و جلال، صیت و شہرت کے ساتھ مصر میں زندگی گذار رہے تھے اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ اپنے عہد میں خدا نے ان کو وہ بلند رتبہ عطا فرمایا تھا جو نہ صرف اس زمانہ میں بلکہ اس سے پیشتر بھی کم لوگوں کو نصیب ہوا تھا۔ وہ مصر ہی کے نہیں بلکہ اپنے زمانہ میں دنیائے اسلام کے سب سے بڑے محدث، سب سے بڑے ادیب، سب سے بڑے لغوی اور آخر میں ایک مرتاض، صاحب باطن ولی اللہ تھے، تقریباً ہر اسلامی ملک کے لوگ آپ کے پاس آتے تھے اور جیسا کہ بتا چکا ہوں کہ آپ تقریباً ہر اسلامی ملک کی زبان سے واقف تھے اس لیے قدرتی طور پر جو بھی آپ کے پاس آتا تھا وہ آپ کو اپنا پاتا تھا۔ ایرانی آتے تو ان سے فارسی میں گفتگو ہوتی۔ فارسی زبان کے مؤلفین وشعراء کا کلام ان کو سناتے وہ اس سے خوش ہوتا۔ ہندی جاتا تو ہندوستانی علماء کا حال پوچھتے۔ ترکی پہنچتے تو ترک فضلاء وصوفیاء کی قیمتی باتیں ان کو سناتے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان میں سے ہر ایک آپ کو اپنا سمجھتا تھا، اور غالباً مختلف زبانوں کے علم نے آپ کی قابلیت کے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا ور پھر یہی نہیں بلکہ کچھ دنوں سے جو مسلمانوں کا ایک عام دستور ہو گیا تھا کہ جن لوگوں کو ظاہری علوم وفنون میں انہماک ہوتا ہے کہ وہ باطن سے عموماً صفر یا کم از کم ناآشنا ہوتے ہیں اور اسی طرح اربابِ باطن علومِ ظاہری کی طرف کم توجہ فرماتے ہیں۔ اگرچہ سچ یہ ہے کہ جس نے حقیقت کو پالیا وہ مجاز سے بے نیاز ہو جاتا ہے تاہم بے بصروں کے لیے نکتہ چینی کا موقع باقی رہتا ہے۔ لیکن سید علامہ کی عجیب شخصیت تھی وہ ایک ہی وقت میں، ایک ہی زمانہ میں

Marfat.com

اگر ایک طرف سیبویہ اور جوہری کے جانشین تھے تو دوسری طرف ابن حجر اور عینی کے مسند درس کو ان پر ناز تھا۔ اگر ایک حیثیت سے ابن ہمام ابن نجیم کی روح ان کی فقہی نکتہ سنجیوں سے مسرور تھی تو دوسری طرف یہ حیرت انگیز تماشا تھا کہ سیدنا غوث الثقلین، وسیدنا حبیب العیدروس الاکبرؒ کی مبارک آنکھوں کی آپ ٹھنڈک تھے اور یہی وہ جامعیت ہے جس کی ائمہ اسلام میں تمنا کی جاتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ بہت کم پوری ہوتی ہے۔ لیکن جہاں کہیں اور جب کبھی کسی میں یہ جامع حیثیتیں جمع ہوگئی ہیں، مسلمان اس کی طرف چل پڑے۔ اسلامی دنیا ایسی شخصیت کے آگے لوٹنے لگی ہے اور یہی حال سید علامہ کا بھی ہوا لوگ ہر چار طرف سے امڈے پڑتے تھے۔ مختلف آرزو مختلف سوالات، مختلف مشکلات لے کر آتے اور تشفی حاصل کر کے جاتے تھے۔ ارشاد وہدایت، درس وتدریس، وعظ وتذکیر، خط وکتابت کا دریا بہ رہا تھا اور پیاسے سیراب ہورہے تھے وفات سے کچھ دن پیشتر تک خدا کا یہ فیض عمیم اسی طرح موجیں مار رہا تھا۔ (۳۱) یکایک خدا جانے آپ نے کیا محسوس کیا کہ تاج العروس کا خاتمہ نگار لکھتا ہے کہ اچانک:

"لزم داره و احتجب عن اصحابه و اعتکف بداخل الحريم و اغلق الباب و ترک الدروس و الاقراء". (۳۲)

کیا دیکھا، یا کیا دکھایا گیا، بہر حال اثر یہ تھا کہ ایسی بلند و وسیع شخصیت یکایک سمٹ گئی اور یہ سب کچھ تھا وہ کسی کے لیے گویا کچھ نہ رہ گیا، اسی کے کچھ دن بعد قاہرہ میں طاعون پھیلا، جامع کردی جو سید علامہ کے مکان کے روبرو واقع ہے۔ وہیں نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ نماز سے فارغ ہوئے کہ طاعون کا اثر محسوس کیا۔ گھر پہنچے اور زبان بند ہوگئی۔ ہفتہ کا دن اسی خاموشی میں گذرا اور اتوار کے دن علم وعرفان کا وہ آفتاب جو گنگا کے ساحل پر طلوع ہوا تھا۔ نیل کی وادی

Marfat.com

میں غروب ہوگیا۔ فَاِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن. ۱۲۰۵ھ شعبان کا مہینہ تھا۔

شہر میں شیوعِ طاعون کی وجہ سے سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ کسی کو اس واقعہ کی خبر بھی نہیں ہوئی حتیٰ کہ جامع ازہر کے اساتذہ جن میں آپ کے شاگردوں کی ایک بڑی جماعت تھی، ان کو بھی آپ کی وفات کا اس وقت علم نہ ہوسکا۔ محلّہ میں جو چند مسلمان تھے انہوں نے آپ کی تجہیز و تکفین کی اور مصر کی مشہور درگاہ سیدہ رقیہ میں اس علمی دفینہ کو لوگوں نے محفوظ کر دیا۔ تاج العروس کے خاتمہ نگار نے لکھا ہے کہ سید علامہ نے اپنی زندگی میں ایک قبر اپنے لیے اس درگاہ میں بنوائی تھی اور اس میں مدفون ہوئے: (۳۳)

عاش حمیدا ومات شهیدا فالحیٰوة حیوته والممات مماته اللهم اغفرله واجعله من ورثة جنة النعیم، و نور قبره و قدس سره وارض عنه وعن امة محمد ﷺ اجمعین.

اولاد

میں نے لکھا ہے کہ سید علامہ نے قاہرہ میں شادی کر لی تھی لیکن کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

تالیفات

اگرچہ جسمانی طور پر مصر میں اس واسطی سید کا کوئی سلسلہ جاری نہیں ہوا لیکن اس کے ان علمی سلسلوں کو کون گن سکتا ہے۔ نہ صرف مصر بلکہ اسلامی دنیا پر چھا گئے۔ مختلف علوم وفنون میں سید علامہ کی کتابیں سو 100 سے متجاوز ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر حسب ذیل ہیں۔

۱) تاج العروس ۹ جلد

۲) اتحاف السادہ المتقین شرح احیاء علوم الدین ۸ جلد

۳) تکملۃ القاموس ۱ جلد

۴) الفیۃ السند معہ شرحہا ۱ جلد

۵) الجواہر المنیفہ فی تائید مذہب ابی حنیفہ ۱ جلد

۶) امالی حنفیۃ ۱ جلد

۷) حکمۃ الاشراق الی کتاب الآفاق ۱ جلد

۸) ترویح القلوب بذکر ملوک بنی ایوب ۱ جلد

ان کتابوں کے علاوہ سید علامہ کے چھوٹے بڑے رسالے حدیث، تفسیر، تاریخ، لغت، علم الاسناد، تخاریج فقہ، منطق، فلسفہ، ادب، الغرض ہر علم میں آتے ہیں کہ ان کو کون شمار کر سکتا ہے۔ آپ کی تالیفات میں سے تاج العروس، شرح احیاء العلوم، الجواہر المنیفہ چھپ چکی ہیں۔

کتاب النفحۃ القدوسیہ لواسطۃ البضعۃ العیدروسیہ

ان ہی کتابوں میں سے آپ کی ایک کتاب النفحۃ القدوسیہ لواسطۃ البضعۃ العیدروسیہ ہے، جس کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ سید علامہ کے پیرو شیخ سیدنا عبدالرحمٰن بن مصطفیٰ عیدروس حضرمی رحمۃ اللہ علیہ ایک مجمع السلاسل بزرگ تھے۔ تقریباً اکثر شائع و ذائع بلکہ بعض نادر طریقوں کی آپ کو اجازت تھی، سید علامہ نے ان تمام طریقوں کی اجازت وسند شیخ قدس سرہ سے حاصل کی تھی۔

خیال ہوتا ہے کہ ابتدأ سید علامہ کو یہ خیال گذرا کہ ان تمام طریقوں کو ایک جگہ جمع کردوں۔ لیکن اس کے بعد آپ نے اس خیال کو ایک مستقل تصنیف کی شکل میں بدل دیا، جو طریقے شیخ سے پہنچے تھے، ان کے سوا اور بھی کتابوں میں آپ کو جو طریقے نظر آئے، سب ہی کو لے لیا، اور حروف تہجی کی ترتیب سے ان کی فہرست تیار کی۔ درحقیقت اس کتاب کا اصلی موضوع یہی ہے، جو بجائے خود ایک اہم علمی اور

Marfat.com

دینی خدمت ہے۔ کیونکہ صوفیا کے حالات وطرق کے متعلق جو کتابیں مرتب ہوئی ہیں عموماً ان کا تعلق کسی خاص طریقہ، یا خاص ملک، خاص شہر کے اولیاء اللہ سے ہے۔ جس کا عام اثر یہ ہے کہ مصر کے مسلمان نہیں جانتے کہ ہندوستان میں کن بزرگوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے، ہندوستانی یہ نہیں جانتے کہ عرب میں ارشاد وسلوک کے کتنے طریقے مروج ہیں اور اس کی وجہ سے بسا اوقات ایک ملک کے مسلمان دوسرے ممالک کے بزرگوں سے نفع اٹھانے میں کوتاہی کرتے ہیں۔ حالانکہ اسلام ایک ہے، مقصد ایک ہے۔ پھر اس میں بھی اس قسم کی تنگ نظریوں سے اگر کام لیا گیا، تو اس کا انجام بجز محرومی کے اور کیا ہوسکتا ہے۔

سید علامہ نے بڑا کام کیا کہ چند مختصر ورقوں میں ساری دنیائے اسلام کے ارباب باطن صلحاء، اولیاء، رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریقوں کو قلم بند کر دیا ہے۔ غالباً یہ کتاب ایسی حاوی ہے کہ عرب، عجم، مصر، مراکو، تونس، ہندوستان، الغرض کسی اسلامی ملک کا کوئی ایسا مشہور ومعروف معتبر طریقہ نہیں ہے، جس کو چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس کے پڑھنے سے ارباب ذوق کے علم میں بہت کچھ اضافہ کی امید ہے اور یہ تو اصل مقصد ہے، لیکن اس کے ماسوا ضمنی اور ذیلی طور پر سید علامہ نے مختلف مقامات پر ایسی قیمتی باتیں درج کی ہیں جس کا ایک جگہ ملنا دشوار تھا اگرچہ ان باتوں کا تفصیلی علم تو کتاب کے پڑھنے سے ہوسکتا ہے۔ لیکن چونکہ اس میں زیادہ تر سندوں کا ذکر ہے، جس کے پڑھنے میں ممکن ہے کہ عام لوگوں کو دلچسپی نہ ہو، اس سے چند اہم باتوں کا ذکر اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ سید علامہ نے شروع میں ایک مقدمہ لکھا ہے، اس میں یہ بتایا ہے کہ صوفیہ کے اس کثرتِ طرق کے اسباب کیا ہیں، کیا ان کی اسناد کسی اختلاف پر ہے، لوگ اس کی کوشش کیوں کرتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو، مختلف طریقوں کی ان کو اجازت

Marfat.com

حاصل ہو۔ اس اکثار کا کیا نفع ہے اور سب سے اہم بحث ''خرقہ'' کی ہے۔ سید علامہ چونکہ صوفی ہونے کے ساتھ محدث بھی ہیں، اس لیے محدثانہ طور پر آپ نے اس پر بحث کی ہے۔ جو غالباً اس کتاب کے سوا دوسری کتاب میں نہیں مل سکتی۔ اس کے بعد تلقین ذکر کے متعلق بھی ایک مفصل محققانہ بیان درج ہے، جس سے نہ صرف صوفی کی بلکہ محدثین علماء کی بھی راہنمائی ہوتی ہے۔

۲۔ اس کتاب کے دیکھنے والوں کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ فقر وطریقت کے سلسلے علاوہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خلفاء، حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ سے بھی جاری ہوئے ہیں۔ سید علامہ نے خاص خاص طریقوں کے ذیل میں ان کا ذکر کیا ہے، بلکہ بکریہ، فاروقیہ تو عنوان میں درج ہے، ادھمیہ کے ذیل میں طریقہ فاروقیہ کا اور مداریہ کے تحت میں آپ نے عثمانی سلسلہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ بعض طریقے حضرت انس بن مالکؓ خادم سرور کائنات ﷺ اور حضرت ابو درداء، صحابیؓ تک بھی منتہی ہوتے ہیں۔ لفظ ''دردائیہ'' کے تحت میں حضرت ابوالدرداءؓ اور ابو طالب مکیؒ کے طریقہ میں حضرت انسؓ کا ذکر فرمایا ہے۔

۳۔ علمائے ظاہر کو یہ دیکھ کر بھی تعجب ہوگا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی، شیخ الاسلام زکریا انصاری، تاج الدین سبکی، شاگرد امام ذہبی، زین الدین عراقی، حافظ مغلطائی، جلال الدین سیوطی، کمال الدین بن ہمام، امام الحرمین جیسے علماء بھی بارگاہِ فقر کے نیاز کیشوں میں ہیں، باضابطہ بیعت، ذکر ارادت سے مشرف ہیں، فاعتبروا یا اولی الابصار، اور ان کی عبرت کے لیے تو خود سید علامہ کا وجود بہت کافی ہے۔ ان میں کون ہے جو سید کے علمی علوِ مرتبت اور محدثانہ جلالت کا منکر ہوسکتا ہے۔ پھر یہ تماشا ہے کہ ایک محدث تریم کے ایک درویش کی غلامی پر نازاں ہے،

خاتمہ میں سید علامہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھنا چاہیے۔

Marfat.com

۴۔ اس کتاب میں سید علامہ نے متفرق مقامات پر مختلف اولیاء اللہ کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے برای العین ملاقات کی اجازت حاصل کی، اسی طرح حضرت خضر و الیاس علیہما السلام کی ملاقات کا بھی ذکر ہے۔ خضر علیہ السلام کی حیات و ممات میں چونکہ علماء ظاہر کو اختلاف ہے، اس لیے طریقہ خضریہ کے ذیل میں سید نے اس پر سیر کن بحث کی جو قابل دید ہے۔

۵۔ طریقہ محمدیہ کے ذیل میں ایک لطیف بیان اس مسئلہ کے متعلق درج ہے کہ اب بھی کوئی آنحضرت ﷺ سے براہ راست نفع اٹھا سکتا ہے۔ سید نے اس کی تدبیر بتائی ہے اور وہ پڑھنے کے قابل ہے۔

۶۔ ایک عجیب بات اس کتاب میں یہ بھی ہے کہ خلفائے عباسیہ جس طرح بیعت، سمع و طاعت و خلافت لیتے تھے، اسی طرح وہ بیعت، طریقت و ارادت بھی لیتے تھے۔ لفظ ''عباسیہ'' کے تحت میں ان کی پوری سند درج ہے۔

۷۔ امام سحنون، معلم افریقہ مدون مذہب مالکیہ کے ایک شاگرد ابو عقال کی طرف ایک طریقہ منسوب ہے۔ جس کو افریقہ میں مدولیہ کہتے ہیں۔ سید علامہ نے ان کے ذکر میں ''جذب'' کی نہایت محققانہ وضاحت کی ہے۔ جس کو ''مجذوب فقراء'' کے ''فقر'' و ''وصول'' میں شبہ ہے، ان کو خاص طور پر یہ بحث پڑھنی چاہیے۔

۸۔ اس زمانہ میں ایک عام خیال یہ بھی پھیلا ہوا ہے کہ صوفیوں نے مسلمانوں کے جذبہ شجاعت کو پامال کر دیا اور اس کے بعد مسلمانوں کی سیاسی قوت برباد ہو گئی۔ ایسے حضرات کے لیے مناسب ہو گا کہ لفظ ''بکتاشیہ'' کے ذیل میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، پڑھیں، ان کو معلوم ہو گا کہ مسلمانوں کی وہ مشہور و معروف ''فوجی قوت'' جس کا نام سن کر یورپ تھرا جاتا تھا۔ یعنی ترکوں کی ''ینگچری فوج'' ایک صوفی کی مرتب کی ہوئی تھی۔ اور کیا معلوم کہ ہندوستان، ترکستان، افریقہ میں جو کچھ تھا، اس کا زیادہ تر قیام

Marfat.com

ان ہی نفوس طیبہ کے ساتھ وابستہ تھا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، ان شاء اللہ کسی مستقل تصنیف سے ان کو ظاہر کیا جائے گا۔

۹۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو جس طرح یہ سن کر خوشی ہوگی، کہ ان کا ایک ہم وطن جامع ازہر کے شیوخ کا استاد ہوگیا تھا، اسی طرح وہ یہ سن کر بھی خوش ہوں گے کہ ان ہی کے وطن کے ایک بزرگ شیخ تاج الدین زکریا ملتانی جو حضرت شیخ باقی باللہ نقشبندی کے خلیفہ تھے، انہوں نے بصرہ، یمن، احساء، نجد اور خود حجاز میں طریقہ نقشبندیہ کو پھیلایا اور ان ممالک میں ان کے مریدوں کی بڑی جماعت تھی، سید علامہ نے لفظ تاجیہ کے ذیل میں ان کا ذکر کیا ہے۔

۱۰۔ سید علامہ نے اس کتاب میں ''طریقہ قلندریہ'' کا خصوصیت کے ساتھ اور ذرا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اسی طرح ''ملامتیہ'' کے بیان میں بھی اس کا لحاظ رکھا ہے کہ ان پر جو اعتراض کیا جاتا ہے، وہ شرعاً قابل لحاظ نہیں ہے اور یہ دونوں بحثیں دیکھنے کے قابل ہیں۔

۱۱۔ ''نقشبندیہ'' طریقہ تعلیم و تربیت کے بیان میں بہ نسبت اور سلسلوں کے سید علامہ نے بسط سے کام لیا ہے اور اتنا لکھا ہے کہ محض اس کتاب کی مدد سے آدمی اس طریقہ کے مشاغل کو حاصل کر کے کامیاب ہوسکتا ہے۔

۱۲۔ ایک نئی چیز اس کتاب میں یہ بھی ہے کہ طریقہ نقشبندیہ کے ذیل میں سید علامہ نے ایک ایسے بزرگ کا تذکرہ کیا ہے جو کسریٰ نوشیرواں کے خاندان سے تھا، ان کا نام نامی ابوعلی احمد بن محمد قاسم بن منصور بن شہریار رودباری ہے اور ایسے تو متعدد بزرگوں کا ذکر ہے، جو مختلف خاندان شاہی سے تعلق رکھتے تھے۔

۱۳۔ لفظ ''غازیہ'' کے تحت میں سیدی احمد بن علی درعی سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے ''جس نے مجھے دیکھا یا میرے دیکھنے والے کو دیکھا وہ جہنم میں نہیں جاسکتا''۔

اور بعض دوسرے اہل اللہ سے بھی اس قسم کے الفاظ منقول ہیں۔ بظاہر یہ دعویٰ عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے بعد سید علامہ نے اس دعویٰ کی جو وجہ مسلسل سند سے نقل کی ہے اس سے راز واضح ہو جاتا ہے۔ سید نے اپنے پیر سے، انہوں نے حسین بن عبد الرحیم سے، انہوں نے ابو ناصر سے، انہوں نے ابو سالم فشاشی سے، وہ سیدی احمد بن علی صاحب دعوی سے راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ''نارِ جہنم اس شخص کو نہیں چھو سکتی جس نے تجھ کو دیکھا یا تیرے دیکھنے والے کو دیکھا'' سیدی احمد کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بات تین دفعہ ارشاد فرمائی اس کے بعد اگر انہوں نے دنیا کو یہ بشارت دی تو پھر اس کے سوا چارہ کیا تھا یہ تو

انچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

اور اس کے کہنے پر وہ مجبور تھے، ورنہ خود سیدی احمد کا جو حال تھا وہ اس سے ظاہر ہے کہ اس بشارت کو نقل فرماتے اور پھر کہتے کہ:

''خوف کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑ سکتا، اگر چہ میں جنت میں ہی کیوں نہ ہوں، فرض کرو کہ اس کے بعد بھی اگر مجھ سے کہا جائے کہ جنت سے نکل جا، تو میں کیا کرلوں گا، اور کیا بول سکتا ہوں''۔

کیا اس کے بعد بھی ان بزرگوں کے اظہارِ واقعہ کو کوئی دعویٰ پر محمول کر سکتا ہے۔ باقی یہ امر کہ ان کو دیکھنے والا جنت کا کیوں مستحق ہو جاتا ہے۔ سید علامہ نے اس کی خود توجیہہ کی ہے، فرماتے ہیں:

''آپ کا یہ فرمانا کہ میں جنت کا ضامن ہوں''

اس کا مطلب یہ ہے میں اس بات کا ذمہ دار ہوں کہ ایسے شخص کی موت اور اس کا خاتمہ ایمان پر ہوگا۔ اگر موسیٰ کو دیکھ کر ساحروں میں انقلاب پیدا ہو سکتا ہے، اگر سرورِ کائنات ﷺ کی نظرِ اقدس عمر کو فاروق بنا سکتی ہے۔ تو حضور ﷺ کے

اتباع و خدام کی جن پر نگاہ پڑی، ان میں کوئی ایسا ایمانی انقلاب پیدا ہو جائے کہ اس کے بعد ان سے اہل جنت کے افعال صادر ہوں تو اس پر لوگوں کو تعجب کیوں ہے

۱۴۔ ''خلوتیہ'' کے تحت میں، شعبان آفندی قسطمونی کا یہ عجیب واقعہ سید علامہ نے نقل کیا ہے کہ:

''انہوں نے جنوں کے رئیس سے یہ عہد لیا کہ ان کے طریقہ والوں میں کسی کو جن اذیت نہ پہنچائیں اور ایسی کوئی کشتی ڈوبی نہ جائے جس میں ان کے طریقہ کا کوئی آدمی سوار ہو اور ان کے سلسلہ کے کسی آدمی پر قرض کا بوجھ نہ رہے، اور خلافت محمدیہ کا خاتمہ ایسے شخص پر ہو، آپ کے طریقہ میں داخل ہو''۔

آنحضرت ﷺ نے جنوں کی بیعت لی اور ان سے بعض معاہدات کیے۔

پس اتباع نبوی کا یہ کیا عجیب ثمرہ ہے کہ انسان کامل ہو جاتا ہے، اور جو کامل ہو جاتا ہے نہ صرف نباتات و حیوانات بلکہ جن تک اس کے زیرِ فرمان ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بزرگوں کے سلسلہ میں داخل ہونے کے بعد انسان کن دینی و دنیوی سعادتوں سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے۔ کیا معلوم کہ خدا کے کس دوست نے اپنے مولی سے کیا کیا وعدے کیے ہیں۔

۱۵۔ لفظ ''قادریہ'' کے تحت میں طریقہ قادریہ کی اس نماز کا بھی ذکر کیا ہے جو عام طور پر اس سلسلہ کے حضرات پڑھتے ہیں، اور محدث علامہ نے اس پر کوئی تنقید نہیں کی ہے۔ دیکھنے والوں کو دیکھنا چاہیے۔

۱۶۔ حسین بن منصور کا ذکر بھی اس کتاب میں ہے اور ان کے نام سے ایک خاص طریقہ ''حلاجیہ'' منسوب ہے، سید علامہ نے لکھا ہے:

''خطیب بغدادی نے حسین کا وسیع تذکرہ کیا ہے''

آج خطیب کی کتاب ناپید ہے، ورنہ دیکھا جاتا کہ بغداد کے اس خطیب

Marfat.com

نے بغداد کے اس بدنام صوفی کا کیا حال لکھا ہے۔ ان لوگوں کو جو حسین بن منصور سے بہت برہم ہیں۔ خطیب کی تاریخ تلاش کرنی چاہیے، غالباً ان کو اپنے خیال میں ترمیم کرنی پڑے گی ورنہ اس سے پیشتر اگر حسن ظن سے کام لیا جاتا تو کیا یہ بہتر نہ تھا۔

۱۸۔ اس کتاب میں اور بھی بعض نادر اور عجیب باتیں ہیں، مثلاً ابو سالم ابراہیم ابن احمد زوادیؒ کی عمر ایک سو چھتیس (۱۳۶) سال لکھی ہے۔ اسی طرح لفظ وقائیہ کے تحت میں حضرت محمد وقاؒ کے حالات لکھتے ہوئے سید علامہ نے لکھا ہے:

''آپ امی تھے لیکن ادبائے قوم میں آپ بحیثیت زبان دانی کے بہت ممتاز تھے، آپ نے سات یا دس سال کی عمر میں بہت سی تالیفیں کیں''

الغرض یہ کتاب اگرچہ بظاہر اسمائے اولیاء اللہ کی ایک اجمالی فہرست ہے۔ لیکن بیچ بیچ میں ایسے عجیب وغریب معلومات، مفید بیانات درج ہیں جو بہت سی کتابوں کے پڑھنے سے بھی میسر نہیں آسکتے۔ سید علامہ نے اگرچہ التزام نہیں کیا ہے، تاہم بعض اہم طریقوں کے ذکر میں اسی طریقہ کے اصول، فوائد، دستور العمل کو نہایت جامع لفظوں میں لکھ جاتے ہیں۔ مشہور اکابر اولیاء کے سنین وفات، مقام وفات، زندگی کے کسی اہم واقعہ کا بھی ضرور ذکر کرتے ہیں۔ آخر میں خاتمہ لکھا ہے جو سلسلہ فقر وسلوک کی جان ہے اور اگر انسان اسی کو اپنا دستور العمل بنالے تو وہ بہت کچھ ہوسکتا ہے۔

''تصورِ شیخ''، پر سید علامہ کو بہت اصرار ہے اور خاتمہ میں اس مسئلہ پر خاص طور سے زور دیا ہے۔

۱۹۔ طریقہ ہمدانیہ کے ذیل میں سید علامہ نے لکھا ہے کہ اس طریقہ کے بانی سید علی ہمدانی کشمیری اپنے مریدوں سے خاص خاص اوراد کار صبح وعصر میں ذکر بالجہر کراتے تھے۔ شیخ الحدیث فی الدیار الہندیہ صدر المدرسین دار العلوم دیو بند

Marfat.com

استاذ نا و مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ سے میں نے یہ سنا ہے کہ اس طریقہ سے ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور جنہوں نے اس کو بدعت کہا ہے غلطی پر ہیں۔

نیاز مند نے ہندوستانی مسلمانوں کے نفع کے لیے، قطب العصر والزمان، سید السادات بقیہ الکرام البررہ غوث الانام البدر التمام سیدنا و سندنا مولانا الہمام سید حبیب العیدروس الحسینی التریمی الحضرمی نزیل حیدرآباد دکن، متعنا اللہ المسلمین بطول بقاؤ کے اشارہ قدسیہ سے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور میری محنت کا اگر چہ یہ کافی صلہ ہے کہ سید امام کے فرمان کی تعمیل ہوگئی۔ تاہم جن لوگوں کو اس کتاب سے نفع پہنچے ان سے توقع ہے کہ اس عاصی و سیاہ کار کی مغفرت کی دعا فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ ان تمام بزرگوں کے طفیل میں جن کے اسمائے گرامی کے لکھنے سے اس ترجمہ میں بندہ عاجز سعادت اندوز ہوا ہے، مجھ پر رحم فرمائے، توفیق خیر عنایت فرمائے اور میرا حشر ان ہی ابراء و اتقیاء کے ادنی خدام میں کرے۔

ربنا اغفرلنا ذنوبنا و کفرعنا سیئات اعمالنا و توفنا مع الابرار

Marfat.com

حواشی

الف۔ دراصل یہ مضمون کتاب ''نفحہ قدسیہ'' کے ترجمہ کا تعارفی مقدمہ ہے، ہمارے مخدوم اخونا فی اللہ مولانا عبدالباری پروفیسر عثمانیہ کالج کے اصرار سے معارف میں اشاعت کے لیے بھیج دیتا ہوں۔ اس مقدمہ سے ناظرین کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ اس کے جوابدہ مولانا عبدالباری ہیں۔ میں نے محض ان کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ تاہم برادران اودھ سے اتنا تو ضرور عرض کروں گا کہ اگر مصر ویمن کیلیے نہیں تو کیا ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کوئی مرتضی کیوں نہیں اٹھتا۔ ہندوستان کا شیراز بجائے لندن و برلن کے شیراز ہی رہتا تو اچھا تھا۔ کیا بلگرام وخیرآباد، سندیلہ وسنہالی، کاکوری اور گوپامئو دیوہ اور بانسہ کے مسلمان میری اس آرزو کو سنتے ہیں۔

ب۔ سادات بلگرام حضرت ابوالفراح واسطی کے اولاد میں ہیں۔ علامہ عبدالواحد بلگرامی کا اسی سناد پر یہ مشہور شعر ہے۔

دانی کہ خوش نویسی ما از برائے چیست ما ئیم واسطی وقلم نیز واسطی

(ماثر الکرام، ص ۱۳۵، بلگرامی، آزاد علی، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۹۱۰ء)

سید ابوالفرح واسطی امام زید شہید بن سید الساجدین امام زین العابدینؒ کے خانوادۂ شرافت و سیادت کے مشہور بزرگ ہیں۔ آپ نے خود ہندوستان کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے شرف نہیں فرمایا لیکن آپ کے تین صاحبزادے یہاں تشریف لائے اور انہیں کی اولاد ہندوستان میں پھیلی سید مبارک محدث، اور میر عبدالجلیل بلگرامی سے شجرہ طیبہ میں علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے یہ عبارت نقل کی ہے۔

''از انجملہ سید ابوالفراس کہ جد سادات بلگرام است در جاجیز رسید، وسید ابوالفضائل در جہاتر وسید داؤد در تھن پور وطن گرفتند'' (ماثر الکرام، ص ۱۳۷،)

ان ہی ابوالفراس کی نسل میں ایک بزرگ علی بن حسین تھے، جن کے چار بیٹے تھے ان میں سے ایک بلگرام میں آکر بسے، شجرۂ طیبہ میں ہے:

''محمد در بلگرام وسید جعفر در مدولی، وسید احمد در دہرسو، وسید معز الدین در جاجیز بوطن گرفتند'' (ماثر الکرام، ص ۱۳۸)

Marfat.com

جاجیزی سادات کا ایک خاندان صوبہ بہار کے بارہ گانواں میں آباد ہوا اور بحمد للہ کہ راقم الحروف کا بھی تعلق اسی خاندان سے ہے۔

ج۔ ابدل کے معنی عام طور پر اقرب (نزدیک) کے لیے جاتے ہیں لیکن بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ یہ لفظ ''علی اللہ دل'' کی مصحف شکل ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

حوالہ جات

۱۔ ابجد العلوم، ۳/۲۴، قنوجی، صدیق حسن خان، نواب، بیروت، دارالکتب العلمیہ، ۱۴۲۰ھ

۲۔ مآثر الکرام، (مقدمہ) ص ۲۰، عبدالحق، مولوی، آگرہ مطبع مفید عام، ۱۹۱۰ء

۳۔ مآثر الکرام، ۱/۱۴۹، بلگرامی، آزاد علی، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۹۱۰ء

۴۔ ایضاً، ۱/۱۳۹

۵۔ ایضاً، ۱/۱۴۹۔۱۴۴

۶۔ ایضاً، ۱/۱۴۹

۷۔ تاج العروس، (خاتمۃ الکتاب) ۱۰/۴۶۹، زبیدی، سید محمد مرتضیٰ مصر، مطبع الخیریۃ، ۱۳۰۶ھ

۸۔ ابجد العلوم، ۱/۱۸

۹۔ تاج العروس، ۱۰/۴۶۹

۱۰۔ محولہ بالا

۱۱۔ ابجد العلوم، ۳/۲۳

۱۲۔ تاج العروس، ۱۰/۴۶۹

۱۳۔ ابجد العلوم، ۳/۱۹۔۱۸

۱۴۔ ایضاً، ۳/۱۳۔۱۲

۱۵۔ ایضاً، ۳/۱۳۔۱۰

۱۶۔ ایضاً، ۳/۱۲

۱۷۔ ابجد العلوم، ۳/۱۹

۱۸۔ محولہ بالا

۱۹۔ محولہ بالا

۲۰۔ محولہ بالا

۲۱۔ ابجد العلوم، ۳/۲۰

۲۲۔ محولہ بالا

۲۳۔ محولہ بالا

۲۴۔ تاج العروس، ۱۰/۴۷۰

۲۵۔ ابجد العلوم، ۳/۲۲

۲۶۔ آل عمران/۲۶

۲۷۔ تاج العروس، ۱۰/۴۷۰

۲۸۔ محولہ بالا

Marfat.com

۲۹۔ ابجد العلوم، ۲۱/۳

۳۰۔ تاج العروس، ۴۷۰/۱۰

۳۱۔ محولہ بالا

۳۲۔ محولہ بالا

۳۳۔ محولہ بالا

Marfat.com

ہندوستان کا ایک مظلوم مولوی

یوں تو مغربی افکار و خیالات سے ہندوستان اسی زمانہ میں اثر پذیر ہونے لگا تھا، جب گوا بندر سے اکبری دربار میں دانایان فرنگ کی آمد و رفت شروع ہوئی. ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا:

''آمد و رفت فرنگیاں نیز شد بعضے اعتقاداتِ عقلی ایشان را فرا گرفتند'' (۱)

''اکبری دربار میں فرنگیوں کی آمد و رفت بھی جاری ہوئی اور ان ہی لوگوں سے بادشاہ نے بعض عقلی اعتقادات ونظریات کو حاصل کیا''۔

حاجی حبیب اللہ نامی کوئی صاحب تھے، ارغنون (پیانو، باجہ) اپنے ساتھ فرنگستان سے وہ لائے جس کے ساتھ اس کے فرنگی سازندے بھی تھے اس باجہ کی کرشمہ نوازیوں کا مظاہرہ اکبر کے دربار میں جب کیا گیا، تو ملا ہی نے لکھا ہے:

''اہل مجلس از ان عجوبہ حیران مانند'' (۲)

''مجلس والوں کو اس عجیب باجے نے ششدر و حیران بنا دیا''

ان حیران ہونے والوں میں خود ملا صاحب بھی تھے، لکھا ہے کہ اس باجے کی جیسی تعریف کی جائے میں بھی بیان نہیں کر سکتا۔

بہرحال اس مجلس میں بھی اکبر نے درباریوں سے پوچھا کہ آج دنیا کے پردے پر سب سے زیادہ عقل و دانش رکھنے والے کون لوگ ہیں؟ گو جواب دینے والوں نے بادشاہ کے سوال کو شاید نہیں سمجھا، ابوالفضل نے اپنے والد بزرگوار ملا مبارک

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں اکتوبر و نومبر ۱۹۵۱ء، جنوری ۱۹۵۲ء کو تین اقساط میں شائع ہوا۔

Marfat.com

کا نام پیش کر دیا اور حکیم ہمام نے دعویٰ کیا کہ ''اعقل ناس خود رامی دانم'' (۳)

لیکن جس مجلس میں جس خاص حال کی وجہ سے یہ سوال اکبر کے دل میں پیدا ہوا تھا، یا ہوسکتا تھا اس کی طرف لوگوں کا دھیان نہیں گیا، حالانکہ ملا عبدالقادر ہی نے اسی کتاب میں ''دانایانِ فرنگ'' کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر ان لوگوں کو ''اربابِ عقل واجتہادِ زمان'' کے نام سے موسوم کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ قصہ تو طویل ہے، حاصل یہ ہے کہ قصبہ جلیسر میں ایک مجذوب شیخ قطب نامی رہتے تھے، ان سے اور انہیں دانایانِ فرنگ سے ایک دفعہ جھڑپ پر سرِ دربار ہوگئی، مجذوب صاحب نے دعویٰ کیا کہ آگ کا الاؤ جوڑا جائے اور ان فرنگیوں کو حکم دیا جائے کہ ہمارے ساتھ اس میں پھاندیں اس موقع پر ملا نے لکھا ہے:

''ارباب عقل واجتہاد را حاضر ساختند'' (۴)

''اکبر نے اربابِ عقل واجتہاد کو حاضر ہونے کا حکم دیا''

دانایان فرنگ مجذوب کے اس رنگ کو دیکھ کر حیران ہوئے، ملا بدایونی نے لکھا ہے:

''دست در کمر فرنگی زدہ گفت ہان بسم اللہ'' (۵)

''مجذوب صاحب نے فرنگی کی کمر میں ہاتھ دے کر کہا کہ ہاں بسم اللہ''

ظاہر ہے کہ عقل والے بیچارے مجذوب کا ساتھ کیا دیتے، سب بادشاہ کا منہ دیکھنے لگے، اکبر ان فرنگیوں سے اس حد تک متاثر تھا کہ بیچارے مجذوب ہی کو جلاوطنی کی سزا دی گئی۔

اور سچ تو یہ ہے کہ اکبر کے دینِ الٰہی میں اس قسم کے دفعات جو پائے جاتے ہیں:

''از یک زن نکاح نکند مگر آنکہ نازاو باشد وگرنہ خدا یکے وزن یکے'' (۶)

Marfat.com

''بجز ایسے آدمی کے جس کی بیوی بانجھ ہو حکم دیا گیا کہ ایک ہی عورت تک ہر شخص نکاح کو محدود رکھے، آخر جب خدا بھی ایک ہے، تو عورت کو بھی چاہیے کہ ایک ہی ہو''

یا جیسا کہ ملا عبدالقادر ہی کا بیان ہے:

''توغل در استحالہ وحی، وتشکیک در نبوت و بود جن و ملک و سائر مغیبات و معجزات وکرامات انکار صریح آوروند'' (۷)

''بادشاہ کو اس قسم کے مسائل میں مثلاً وحی کا ہونا ناممکن ہے، یا نبوت میں شک اندازی میں غلو پیدا ہوگیا، اسی طرح جن، فرشتے اور دوسری غیبی ہستیوں نیز معجزے اور کرامات کا بادشاہ صراحتہً انکار کرنے لگے''

اور اس باب میں اتنا غلو کہ بقول ملا صاحب مسئلہ معراج کی عقلی تنقید فرماتے ہوئے برسرِ دربار بادشاہ سلامت ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر اہلِ مجلس کو مخاطب کر کے کہا کرتے تھے:

''ممکن نیست کہ تا پائے دیگر بر جا نماند استادہ توانیم بود'' (۸)

''جب تک میری ایک ٹانگ زمین پر ٹکی نہ رہے، میرا کھڑا رہنا ممکن نہیں''

اس عملی مشاہدے سے مطلب یہ تھا کہ نیچر کے مقرر قوانین کے خلاف کیسے ہو سکتا ہے:

''شخصے در یک لحظہ بآن گرانی جسم از خوابگاہ بآسمان رود، ونود ہزار سخن گوئی مگوئی یا خدائے تعالیٰ بکند و بسترش ہنوز گرم باشد تا باز بیاید'' (۹)

''ایک آدمی پل بھر میں اپنے بوجھل جسم کے ساتھ خوابگاہ سے آسمان پر چلا جائے، اور نوے ہزار باتیں خدا سے کر بھی لے، اور اس حال میں کہ ابھی اس کے بستر کی گرمی باقی ہی تھی وہ واپس بھی آجائے''

Marfat.com

یہ اور اسی قسم کی بیسیوں باتیں جن کا ذکر ملا نے بھی کیا ہے، اور ملا کے سوا دوسرے مصنفین کی کتابوں میں بھی جن کا کافی ذخیرہ پایا جاتا ہے (الف)، ظاہر ہے کہ ''دانایانِ فرنگ'' کی دانائیوں کے سوا اور کس چیز کا عکس ان کو قرار دیا جائے، سولہویں صدی کے نصف آخر سے سترہویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں تک ہندوستان میں اکبر کو فرمانروائی کا موقع میسر آیا تھا، اور یہی وہ زمانہ ہے جب قرونِ وسطیٰ کی تاریکیوں سے نکل کر یورپ اپنی جدید علمی نشاءت میں بلوغ کے حدود تک اگر کلیتہً نہیں پہنچ چکا تھا تو ان حدود میں داخل ہونے کے لیے بلاشبہ تیار ہو چکا تھا۔ بقول الفرڈ ریپر جس کا:

''لازمی نتیجہ وہ اصلاح فلسفہ تھی، جو پندرہویں اور سولہویں صدی کے آزاد خیالوں نے شروع کی، ۱۶۰۰ء کے قریب بعض نہایت باجرأت جدت پسندوں نے جاری رکھی، اطالیہ میں برونو، انگلستان میں بیکن، اور فرانس میں ڈیکارٹ (ب)''۔ (۱۰)

اور جیسا کہ اسی نے لکھا کہ کلیسا کی مخالفانہ کوششوں کے باوجود اسی زمانہ میں (پندرہویں سولہویں صدی میں)

''نئے نظریات پھیل گئے، کثرت سے اکتشافات وایجادات ہونے لگے، پہلے چھپائی ایجاد ہوئی، پھر پرکار بحری اور پھر دوربین''۔ (۱۱)

آگے اسی کے الفاظ میں:

''علوم نے مدرسیت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا تھا، اور آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر آگے کو قدم بڑھا چکے تھے''۔ (۱۲)

وہی رقمطراز ہے کہ اس وقت تک:

''کولمبس نے نئی دنیا دریافت کی، واسکوڈی گاما نے اس گڈھوپ کے گرد

سے ہندوستان کا بحری راستہ معلوم کیا، اور سب سے زیادہ یہ بات کہ میگیلن (Megellen) زمین کے اردگرد چکر لگانے میں کامیاب ہوا'' (۱۳)

الغرض بنی نوع انسانی کے آخری پیغمبر ﷺ کے حساب سے ہزار سال (ج) کی مدت جب پوری ہو رہی تھی، یا بقول ڈریپر:

''پندرھویں صدی کے وسط سے مغربی یورپ میں یکے بعد دیگرے متعدد حیرت انگیز واقعات ظاہر ہوئے'' (۱۴)

یہی زمانہ اکبر کی حکمرانی کا بھی تھا اور اسی زمانہ میں سیاسی رشتہ تو ابھی قائم نہیں ہوا تھا، لیکن اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علمی اور فکری دباؤ یورپ کا ہندوستان پر پڑنے لگا تھا، اور ملک کی سب سے بڑی نمائندہ شخصیت ہی اس سے متاثر ہو چکی تھی، تاریخی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ بھی اثر پذیریوں کا یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں جاری ہی رہا، دانشمند خان جن کا اصلی نام ملا شفیعائی یزدی تھا، عہد جہانگیری و شاہجہانی کے سوا عالمگیری دور میں بھی غیر معمولی عزت و اعتبار کی نظروں سے مغلی حکومت میں دیکھے جاتے تھے، بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز رہے، ان ہی کے متعلق مآثر الامراء میں روایت نقل کی گئی ہے:

''خان مزبور در انجام عمر بعلم اہل فرنگ مائل گردید، واکثرے از تحریفات آن جماعۃ تکرار می نمود'' (۱۵)

''مذکورہ بالا خان صاحب آخر عمر میں اہلِ فرنگ کے علم کی طرف مائل ہو گئے اور ان ہی فرنگیوں کی الٹی پلٹی باتوں کو دہراتے رہتے تھے''

خافی خان محمد شاہی عہد کے مشہور مؤرخ نے بھی ان ہی فرنگیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''محرر اوراق مکرر دران مکان و نبادر دار د گشتہ با علمائے آنہا صحبت داشتہ

Marfat.com

مذاکرہ نمودہ'' (۱۶)

''ان اوراق کا لکھنے والا (یعنی خود خافی خان) بار بار ان مقامات میں (جہاں فرنگیوں کے ساحلی مراکز تھے) اور ان بندرگاہوں میں جہاں وہ رہتے تھے، آتا جاتا رہا ہے اور فرنگیوں کے اہل علم کی صحبت میں رہ کر ان سے علمی مذاکروں اور مباحثوں کا بھی موقع اس کو ملتا رہا ہے''

مذاکرہا نمود کے سلسلے میں جہاں دینی بحثوں کی گنجائش ہے کون کہہ سکتا ہے کہ ان ہی کے ساتھ علمائے فرنگ اپنے ملک کے فکری رجحانات کا تذکرہ بھی نہ کرتے ہوں گے،

اور یہ قصے ان دنوں کے ہیں جب مغل دربار میں فرنگیوں کی درخواست ان الفاظ میں پیش ہو رہی تھی:

''ما از طرف شما نوکر بے علوفہ برائے دفع شر مفسدان روئے دریا ہستیم، پارچہ زمین ناکارہ کنار دریا کہ حکام وفرمان روایان سلف ایں مرز وبوم بہ بزرگان ما داوہ اند، آباد کردہ خدمت می نمائیم (د)''۔ (۱۷)

''ہم لوگ بغیر تنخواہ کے آپ کے نوکر ہیں، تاکہ سمندر میں فساد کرنے والوں کا ہم قلع قمع کرتے رہیں، اس ملک (ہندوستان) کے گذشتہ حکمرانوں نے سمندر کے کنارہ کی ناکارہ زمین ہمارے بزرگوں کو عطا کی تھی، جسے آباد کر کے ہم لوگ آپ کی خدمت انجام دیتے ہیں''

ظاہر ہے کہ ہندوستانی حکومت کے بھی ''نوکر بے علوفہ'' جن کی سب سے بڑی عزت یہی تھی کہ ''خدمت می نمائیم'' کا موقع ہندوستانیوں کے متعلق ان کو جو مل گیا تھا، اس کو باقی رکھا جائے، وہی جب ہندوستان کے حکمران ہو کر ہندوستانیوں ہی کو نوکر رکھنے لگے، اور جو خادم تھے، وہی جب مخدوم بن گئے اور ملا عبدالقادر کے

Marfat.com

یہی ''پادھری'' پادری بن کر ہندوستان کے برزن و بازار میں پتنگوں کی طرح جب پھیل گئے اور بقول سر سید احمد خان یہ رواج بھی نکلا کہ آنکھوں کے سامنے یہ تماشا دکھایا جا رہا تھا:

''پادری صاحبوں کے ساتھ تھانے کا ایک چپراسی جانے لگا، اور پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفانہیں کرتے تھے، بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی'' (۱۸)

صرف پادریوں ہی کا حال یہ نہ تھا کہ بلکہ انگریزی حکام علامہ سید صاحب کے ساتھ یہ کر رہے تھے:

''حکام انگریزی ولایت جو اس ملک میں نوکر ہیں، وہ پادری صاحبوں کو بہت سارو پیہ واسطے خرچ کے اور کتابیں بانٹنے کو دیتے ہیں، اور ہر طرح ان کے مددگار اور معاون ہیں'' (۱۹)

بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی ہو رہا تھا:

''اکثر حکام معتمد اور افسران فوج نے اپنے تابعین (ماتحتوں) سے مذہب کی گفتگو شروع کی تھی، بعض صاحب اپنے ملازموں کو حکم دیتے کہ ہماری کوٹھی پر آن کر پادری صاحب کا وعظ سنو'' (۲۰)

اور آخر میں ان ہی فرنگیوں کی دلیریاں ترقی کر کے اس نقطہ تک پہنچ گئیں کہ بقول سید صاحب مرحوم:

''پادری اے ایڈمنڈ نے دار الامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیاں بھیجیں، جن کا مطلب یہ تھا کہ اب تمام

Marfat.com

ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی، ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگئی'' (۲۱)

پس چاہیے:

''مذہب بھی ایک ہو جائے، اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ (ہندوستانی لوگ) بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ'' (۲۲)

جب نوکر بے علوفہ ہونے کے زمانہ میں یورپ ہندوستان کو اپنے افکار و خیالات سے متاثر کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا، تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مطلق العنانیوں کے ان دنوں میں ہندوستان کے باشندوں کا کیا حال ہوگا، پادری اے ایڈمنڈ کی مذکورہ بالا چھٹی، جس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ حکومت کے اشارے سے ملک میں گشت کرائی جارہی ہے، سید صاحب نے لکھا ہے:

''ان چھٹیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی، سب کو یقین ہوگیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے، وہ وقت آ گیا، اب جتنے سرکاری نوکر ہیں، اول ان کو کرستان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو''۔ (۲۳)

ان ہی کے الفاظ اس کے بعد یہ بھی ہیں:

''سب لوگ بیشک سمجھتے تھے کہ یہ چھٹیات گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں'' (۲۴)

خلاصہ یہ ہے کہ جس قصہ کی ابتداء پندرہویں صدی میں ہوئی تھی، انیسویں صدی کے نصف میں اسی کی انتہا مذکورہ بالا مہیب شکلوں میں ہندوستانیوں کے سامنے کھڑی ہو کر ان کی ملی اور قومی زندگی کو آخری فیصلہ کا جس وقت منتظر بنا کر دھمکا رہی تھی، اس نازک ترین وقت میں بعض جگر دار افراد مختلف گوشوں سے اٹھ کھڑے ہوئے، ان میں اس ملک کے مسلمان باشندے بھی تھے اور ہندو بھی۔

Marfat.com

خدا کا شکر ہے کہ ان کی کوششوں کا سلسلہ جاری رہا، اور خواہ واقعی اسباب کچھ ہی ہوں، لیکن دیکھا یہی گیا کہ پانی کے جس راستے سے فرنگی آئے تھے، اسی آبی راہ سے اپنی ایڑیوں پر وہ واپس ہو گئے، کام کرنے والوں نے اپنی اپنی بساط اور اپنے اپنے امکانات، ذہنی رجحانات کے تحت کام کیا، اج ہم ان کا ذکر تشکر و امتنان کے ساتھ کرتے ہیں، ان میں وہ بھی ہیں جنہوں نے اپنی عملی صلاحیتوں سے کام لیا، اور ایسے بھی ہیں جنہوں نے عمل سے زیادہ اس راہ میں علمی اور فکری کوششوں ہی کی حد تک اپنی خدمات کو محدود رکھا۔ کم و بیش ان میں سے اکثروں کے نام کا بھی اور کام کا بھی ہم تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، شاید ہی ان میں کوئی ایسی بدقسمت ہستی ہوگی، جسے لوگوں نے کلیتہً بھلا دیا ہو، اور اسی لیے تعجب ہوتا ہے کہ واللہ واعلم کیا صورت پیش آئی، کہ اسی میدان میں علمی و فکری حیثیت سے عین اس وقت جب گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا، ایک غریب مولوی کے قلم نے گوشہ میں بیٹھ کر جو کام کیا تھا، چرچا تو اس کے کاموں کا ہر جگہ کیا گیا، اس کے بہت سے خود آفیردہ نکات و نظریات کو لوگوں نے اپنی طرف منسوب کر کے پھیلایا، لیکن اس بدقسمت مظلوم مولوی کا نام لوگوں کے حافظہ سے خدا ہی جانتا ہے کہ کیوں نکل گیا، آج میں اسی بھولے اور بھلائے ہوئے مظلوم مولوی سے لوگوں کو کچھ روشناس کرنا چاہتا ہوں۔

یہ امروہہ کے رہنے والے نقوی خاندان کے سید تھے۔ نام ان کا مولوی حکیم محمد حسن تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ خاکسار بھی ایک مدت تک نہ ان کے نام ہی سے واقف تھا اور نہ کام سے۔ خیال آتا ہے کہ پہلی دفعہ اپنے استاد حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی زبانِ مبارک سے یہ سنا کہ بہت سے خیالات اس زمانہ میں لوگ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی اور ان کی جماعت کی طرف منسوب کرتے ہیں، ان کا بڑا حصہ ان ہی مولوی محمد حسن امروہوی کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ شاہ صاحب نے

Marfat.com

مرزائی عقائد وخیالات پر اپنی بعض عربی کتابوں میں بحث کی ہے، ان میں بھی مولوی صاحب کا ضمناً ذکر آ گیا ہے۔ ان کو ان امروہوی مولوی صاحب سے کچھ شکایت بھی تھی، فرماتے تھے کہ اچھی باتوں کے ساتھ بعض دفعہ وہی ایسی چیزوں کی تائید کرنے لگتے ہیں، جسے دیکھ کر ان کے متعلق کہنا پڑتا ہے:

''یومن بکل حق و باطل''

''ہر سچ اور جھوٹ دونوں قسم کی باتوں کو وہ مان لیتے ہیں''

حضرت الاستاذ کے گوش زدہ الفاظ ابتدائی محرک ہوئے اور ان کی کتابوں کی جستجو کرنے لگا، افسوس ہے کہ بجز ایک کتاب یعنی قرآن کی تفسیر جس کا نام ''غایۃ البرہان'' ہے، مجھے ان کی اور کوئی کتاب نہیں ملی بجز ایک خاص پہلو کے تفسیر تو ان کی چنداں اہمیت نہیں رکھتی، لیکن اس تفسیر کے ساتھ ایک ضخیم مقدمہ بھی ہے جس میں اپنی بہت سی کتابوں کا ذکر انہوں نے کیا ہے۔ باوجودیکہ سب چھپی ہوئی ہیں لیکن اب نہ کتب فروشوں ہی کے پاس ملتی ہیں اور نہ ہی کتب خانوں ہی میں، ان کا سراغ ملا۔

بہر حال مدت سے خیال تھا کہ اس مظلوم مولوی پر جو ظلم اہلِ علم و دین کی طرف سے ہوا ہے کچھ اس کی تلافی کی جائے اسی خیال کی تکمیل اپنے اس مضمون سے کر رہا ہوں۔

افسوس ہے کہ مولوی صاحب کی شخصی زندگی کے متعلق بھی باوجود تلاش کے کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی، کب پیدا ہوئے اور کس سنہ میں کہاں وفات ہوئی، اس وقت تک ان معمولی باتوں کے جاننے میں بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ ان کی تفسیر ہی کے مقدمہ سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تعلیم انیسویں صدی کے مشہور اساتذہ سے پائی تھی خود لکھتے ہیں:

''اس فقیر اضعف عباد عبد الدہر محمد، حسن امروہوی نے طفولیت سے اربابِ

تحقیق واصحاب یقین کی خدمت میں تربیت پائی''۔

اسی اجمال کی تفصیل یہ کی ہے:

''فلسفہ مشائیہ واشراقیہ وعلوم کلامی عقلیہ، خدمت یگانہ آفاق مثل افضل المحققین مولانا فضل حق صاحب مرحوم خیرآبادی سے''

اسی طرح دینی علوم کے متعلق لکھتے ہیں:

''وکتب نقلیہ مثل حدیث وتفسیر استاد زمانہ مولانا مفتی صدر الدین مرحوم دہلوی سے''(۲۵)

مولانا فضل حق خیرآبادی مرحوم اور مفتی صدر الدین صاحب مرحوم کے علمی مقام سے جو واقف ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مولوی محمد حسن مرحوم معمولی گرو کے چیلے نہ تھے، طب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی لکھا ہے:

''اور طب امام الاطباء حکیم امام الدین الدہلوی مرحوم سے''

ابتداء میں طب ہی کو معاش کا ذریعہ بنایا ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کے بھائی مولوی حکیم عبدالصمد مرحوم''اودے پور میواڑ میں خاص طبیب مہاراجہ سجن سنگھ کے تھے''

غالباً اسی تعلق سے یہ بھی اودے پور ہی کے دربار سے طبی صیغہ میں وابستہ ہوگئے تھے، بیان کیا کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اجمیر شریف حاضر ہوئے اور کچھ دن وہاں قیام کرنے کے بعد یہ بھی اودے پور پہنچ گئے۔''اور مہاراجہ سروپ سنگھ کے خاص طبیبوں میں منسلک ہوا''

مہاراجہ سروپ سنگھ کے بعد مہاراجہ شمبھو سنگھ سے بھی وہی تعلق طبی ملازمت کا قائم رہا، ان کے ہاں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ طالب العلمی کے زمانے میں جب رامپور میں مولوی صاحب کا قیام تھا ایک بزرگ جن کا نام وہی''حضرت شاہ

Marfat.com

صاحب قبلہ و کعبہ اویسی ، قادری ، مصطفیٰ آبادی ثم اندوری''

بتاتے ہیں ان ہی سے ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں مرید بھی ہوئے ، اپنے پیر طریقت سے غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے ، اسی سے اندازہ کیجیے کہ ''غایۃ البرہان'' تو اپنی تفسیر کا تاریخی نام رکھا تھا لیکن عرفی نام اس کا ''تفسیر حضرت شاہی'' تھا۔ بیان کیا ہے:

''یہ فقیر چند سال خدمت میں (شاہ صاحب کے) حاضر رہا، بندہ نوازیاں فرمائیں جو بیان میں نہ آسکیں''

اور اسی کے بعد اپنے پیر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میری طرف اشارہ کرکے فرمایا کرتے تھے:

''میں جو کچھ کرتا ہوں تیرے واسطے کرتا ہوں''

گویا دوسرے لفظوں میں مولوی صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جن معلومات ونظریات کو اس کتاب میں پیش کیا ہے ان میں شاہ صاحب کے باطنی تصرفات کو بھی دخل ہے۔

بہرحال ریاست اودے پور کی ملازمت ہی کے زمانہ میں خود ہی بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ چھٹی لے کر اجمیر پہنچے ، یہاں اس وقت تک اجمیر میں غالباً وہ کالج قائم ہو چکا تھا ، جس میں صرف والیانِ ملک اور راجے رجواڑوں کے بچے تعلیم پاتے تھے ، مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ اجمیر آنے کے بعد ''کتب خانہ اجمیر گورنمنٹ کالج کو دیکھ کر دل للچایا''

للچانے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ''جس میں ہزارہا کتب انگریزی و سنسکرت ، و عربی و فارسی زبان میں ہیں''

اوران ہی کے ساتھ ''تراجم کتب مقدسہ سابقہ اوران کے تفاسیر موجود ہیں'' (۲۶)

Marfat.com

عربی اور فارسی زبانوں کے تو خیر مولوی صاحب عالم ہی تھے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اودے پور میں قیام کا موقع جوان کو ملا تو ریاست کے پنڈتوں سے غالباً بھاشا اور سنسکرت بھی کچھ سیکھ لی تھی، تفسیر کے اسی مقدمہ میں سنسکرت زبان کی کتابوں کے بعض فقرات اسی زبان اور اسی کے حروف میں انہوں نے نقل کیے ہیں جن کا تذکرہ بھی ان شاء اللہ آئندہ کیا جائے گا۔

اور گو جدید معلومات کا کافی ذخیرہ اس مقدمہ میں پایا جاتا ہے، لیکن صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ان معلومات کو براہ راست انگریزی زبان کی کتابوں کے مطالعہ سے مولوی صاحب نے فراہم کیا تھا، یا دوسرے ذرائع سے ان نئی باتوں کا علم ان کو حاصل ہوا تھا، ایک موقع پر کوہستان یورال کے میدان میں اور ن برگ نامی مقام اور اس کے گردونواح کے خاص حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دیکھو جغرافیہ انگریزی کی بڑی بڑی کتابوں کو'' (۲۷)

اسی طرح ایک موقعہ مشہور مؤرخ ڈایوڈورس کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''دیکھو مصر کی تاریخ زولن کو'' (۲۸)

اسی طرح ان کے کلام میں اس قسم کے فقرات جو پائے جاتے ہیں مثلاً:

''کتب مقدسہ کے ترجمے سو سے زیادہ زبانوں کے قریب میں کرائے گئے ہیں، جو جا بجا بہم پہنچتے ہیں، اور ان سے ہم کو واقفیت پیدا ہوئی، اور گو ان ترجموں میں ترجمہ اپنی فہم کے مطابق مترجم کرتا ہے، لیکن عہد عتیق کی اصلی کتاب کے حصص بھی کچھ ملتے ہیں اور انجیل کا یونانی ترجمہ اسلامی زمانہ سے پہلے کا ہے، اس کی نقل بہم پہنچتی ہے'' (۲۹)

بظاہر اس سے اگر یہ سمجھا جائے کہ عبرانی اور یونانی زبانوں کی کتابوں کی

Marfat.com

بھی تھوڑی بہت استعداد وہ رکھتے تھے، تو شاید یہ بے جا نہ ہو، تاہم قطعی طور پر ہم نہیں کہہ سکتے کہ واقعی حال ان زبانوں کے جاننے کے متعلق ان کا کیا تھا؟

لیکن علوم وفنون کے متعلق صاف لفظوں میں انہوں نے یہ دعوی کیا ہے:

''فقیر کو مسائل حکمت جدید وقدیم فیثا غورثی، حکمت اہلِ فارس، ومشائیہ ویونانیہ واشراقیہ وشاکنگ ہندو وویشنو، وجین مت واہل چین کے مسائل جغرافیہ وہیئت قدیم وجدید ومسائل طب میں دخل ہے''(۳۰)

اور ان کی کتاب میں جو معلومات مختلف علوم وفنون کے متعلق پائے جاتے ہیں، شاید ان کو دیکھ کر مشکل ہی سے ان کے اس دعویٰ کی ...... تردید کی کوئی جرات کر سکتا ہے۔

ان کے علمی ذوق ہی کا نتیجہ تھا کہ جب ان کے سامنے اجمیر گورنمنٹ کالج کا کتابی ذخیرہ آیا، تو جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں، دامنِ اختیار ہاتھ سے چھوٹ گیا اور مادی منافع کی قطعاً پروا نہ کی، انہوں نے اودے پور راج کی ملازمت کو اپنے اسی علمی ذوق پر قربان کر دیا، ان کے اپنے الفاظ میں:

''کتب خانہ اجمیر گورنمنٹ کالج کا دل للچایا، تو کثیر تنخواہ ترک کر کے مدرس اول کالج اجمیر کا مقرر رہوا''۔

مدرس اول غالباً ہیڈ مولوی کا ترجمہ ہے، اس کا پتہ نہ چلا کہ تنخواہ کالج سے جو ان کو ملتی تھی، اس کی مقدار کیا تھی؟ تاہم جس زمانہ کی یہ بات ہے، عام طور پر چالیس پچاس روپے سے زیادہ نہ ہونی چاہیے، کوئی شبہ نہیں کہ جو آمدنی، جو عزت وجاہ رئیس میواڑ کے طبیب خاص ہونے کی صورت میں مولوی صاحب کو میسر ہو چکی تھی، اس سے دست بردار ہو کر اس قلیل تنخواہ کو صرف علمی ذوق کے تحت قبول کر لینا ان کی زندگی ہی کا صرف نمایاں واقعہ نہیں ہے بلکہ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیم کا

Marfat.com

قدیم نظام لوگوں میں علم کی جس پیاس کو جس قدر پیدا کرتا تھا، جدید تعلیمی نظام نے اس کو بڑھانے کے بجائے شاید اس پیاس کو بجھا ہی دیا، یا اس جذبہ کو اتنا افسردہ و پژمردہ کر دیا کہ آج ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، کہ محض کتابوں کے انبار کو دیکھ کر ایک کافی معزز عہدے پر لات مارنے کے لیے آدمی تیار ہو جائے، مگر مولوی صاحب نے یہی کیا، مالی اور جاہی منافع سے تو وہ محروم ہو گئے لیکن خود لکھتے ہیں کہ گورنمنٹ کالج کی ملازمت کا نتیجہ یہ ہوا:

''وہاں علوم جدیدہ و نیو سائنس کی تحقیقات حاصل ہوئی'' (۳۱)

اور گو مولوی صاحب نے اس کو جیسا کہ چاہیے ظاہر نہیں ہونے دیا ہے کہ علاوہ علمی ذوق یا بقول ان کے ''دل للچایا'' اس کے سوا ایک دوسرا جذبہ بھی ان پر مسلط تھا، لیکن کہیں کہیں قلم سے ان کے اس قسم کی باتیں بھی ٹپکتی چلی گئی ہیں ایک موقع پر لکھتے ہیں:

''یہ نازک وقت اہل اسلام کے اندر جو الحاد و تنفر کی اشاعت کا ہے''

فرماتے ہیں:

''ایک جہان ہے کہ برگشتہ ہوا چلا جاتا ہے اور جا بجا انگریزی و روسی علوم (ھ) کو ترقی ہے، اور طلبہ کے خیالات جو ان کے خیالوں کے مطابق اسلام کے مخالف ہوئے جاتے ہیں'' (۳۲)

ایک طرف وہ اس حال کو دیکھ رہے تھے، اور دوسری طرف ان کو یہ نظر آ رہا تھا کہ جدید شبہات اور اعتراضات غیر اقوام کی طرف نئے علوم و فنون کی روشنی میں اسلام پر جو وارد ہو رہے ہیں، ان کے مقابلہ میں جیسا کہ وہی یہ اطلاع دیتے ہوئے:

''اس پر ادھورے ناواقف ملاؤں کی طرف سے صفات لگائے جاویں جس سے بے علمی ظاہر اہل علم کے نزدیک ہو، اگر چہ جاہل خوش ہوں اور گو اصل

Marfat.com

مطلب آیات (قرآن مجید) ظاہر نہ ہو''

آگے وہی لکھتے ہیں:

''پس ناواقف اس قسم کے ملاؤں سے خوش ہوتے ہیں، جولن ترانیاں بگھاریں پر واقفین اور خاص کر مخالف بہت کچھ سبکی سے ان کو دیکھتے ہیں'' (۳۳)

اسی موقع پر انہوں نے لکھا ہے کہ:

''علم نام مکابرہ و دھاندھلی کا نہیں، بلکہ واقع کے مطابق جاننے کو علم کہتے ہیں''

پھر اس زمانہ کے اکتشافات جدیدہ، اور علمی ترقیوں کا ذکر کر کے علماء کو متوجہ کیا ہے کہ پہلے ان سے واقفیت پیدا کر کے چاہیے کہ مخالفوں کا جواب دیا جائے۔

''نہ اینکہ ایسے وقت میں بھی خیالات بیہودہ پکارتے رہیں اور مضحکہ عقلاء بنیں'' (۳۴)

ادھر قدیم تعلیم کے نمائندوں کی یہ کیفیت، اور اسی کے مقابلے میں اسکول اور کالج کے نئے تعلیم یافتوں کی پیدائش کا سلسلہ ان ہی کے زمانہ میں جو شروع ہو چکا تھا، مولوی صاحب نے اس طبقہ کے متعلق اپنے احساسات ان الفاظ میں ظاہر کئے ہیں:

''اس عرصہ میں تھوڑے سے علم جدید سے آشنا ہو کر مضامین آیات واحادیث کو اس کے مطابق جب نہیں پاتے تو نیچری ہوتے جاتے ہیں، تا آنکہ کتب حدیث کو طاق میں رکھنے کی کتابیں سمجھتے ہیں'' (۳۵)

خلاصہ یہ ہے کہ سیاسی زبوں حالیوں نے صرف مسلمان ہی کو نکبت وادبار کی ٹھوکروں کا شکار بنا کر نہیں چھوڑ دیا تھا بلکہ مسلمانوں کے ضعف وناتوانی کو دیکھ کر اسلام بھی چاروں طرف سے مخالفوں نے گھیر لیا تھا، اور بے دردی کے ساتھ توہین

Marfat.com

اعتراضوں اور تحقیری نکتہ چینیوں کے تیروں کا نشانہ اسے بنالیا تھا، مولوی صاحب مرحوم نے مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اسلام کی شوکت کے مقابلہ میں دم مارنے کی طاقت بالخصوص ممالک اسلامیہ میں دوسرے کو ہوتی نہ تھی'' (۳۶)

مگر مسلمانوں کی سیاسی بے کسی نے لوگوں کو جری بنادیا، اور انہی کی شخصی اصطلاحوں میں داریہ، ناریہ (و)، آریہ، الغرض طرح طرح کے فرقے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مولوی صاحب کا خیال ہے اور غالباً صحیح خیال ہے:

''اسلام اور قرآن ہی کے چرچے نے آریہ کو جگایا کہ منہ سے خدا کو ایک کہنے لگے'' (۳۷)

اور اسی بنیاد پر مورتی پوجا کی مخالفت میں سرگرمی دکھانے لگے، ان کے اپنے الفاظ ہیں:

''قرآن مجید سے وہ توحید جاری ہوئی کہ ایک جہان جو بت پرستی و آفتاب و ماہتاب پرستی، مسیح پرستی، بائبل پرستی، وملائکہ وجن پرستی، وبھوت پرستی، میں گرفتار تھا، ان کو کنارۂ توحید پر لگادیا اور بت پرستوں کو جگادیا'' (۳۸)

پھر اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ قرآن کی یہ برکت کسی خاص ملک اور قوم ہی کی حد تک محدود نہیں رہی ہے بلکہ ''خواہ یورپ میں خواہ افریقہ میں خواہ امریکہ میں'' جہاں کہیں جاؤ گے تم کو اس اسلامی اور قرآنی برکت کے آثار محسوس ہوں گے، حتی کہ آریہ کے ساتھ فرقہ داریہ کے متعلق فرماتے ہیں:

''قرآن کی بدولت ہے کہ جو کہ مسیح کو بیٹا خدا کا کہنے سے نصاری شرماتے ہیں'' (۳۹)

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان مین جن ایجادی نادرہ نمائیوں کا تماشہ

Marfat.com

یکے بعد دیگرے ہو رہا تھا، ان کو دیکھ دیکھ کر عوام و خاص سب ہی متاثر تھے، مولوی صاحب بھی اس تاثر میں گو دوسروں کے شریک بن کر، ایک موقع پر یہ لکھتے ہیں کہ:

''پہاڑوں پر ان کا (یورپ والوں کا) زور اور سمندر پر''

آگے بیان کرتے ہیں:

''واقف کے نزدیک کہا نہیں کہ ایک اندور سے حیدرآباد تک پیش مقام کے قریب پہاڑوں کو برما کے اندر سے ریل لے گئے ہیں کہ اوپر نیچے پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اور سمندر کو کوسوں تک پاٹ دیتی ہے'' (۴۰)

حیدرآباد کا لفظ کتاب میں چھپا ہوا ہے، غالباً بمبئی کی جگہ غلطی سے حیدر آباد کا لفظ قلم سے نکل گیا ہے، کیونکہ یہ ٹنیل جنہیں دکن والے مفیدے کہتے ہیں، بمبئی ہی کے راستے میں زیادہ بنائے گئے تھے، اور گو ان کی تعلیم کلیتہً قدیم ماحول میں ہوئی لیکن غیروں کے علمی و ذہنی کمالات کے اعتراف میں تنگ دلی سے انہوں نے کہیں کام نہیں لیا ہے۔ مثلاً جغرافیہ کے علم کی تکمیل و تحقیق میں یورپ والوں نے جو کام کیا ہے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس عرصہ میں جغرافیہ کی تحقیقات ایسے درجہ کو پہنچی ہے کہ مثل ہے کہ ''مزید بر ان متصور نہ باشد''

اور وہ اس کے بھی قائل ہیں:

''بیشک، تطبیق مسائل عقل و نقل عمدہ شے ہے، جہاں تک بہم پہنچے'' (۴۱)

مگر اسی کے ساتھ وہ اس پر بھی لوگوں کو متنبہ کرتے چلے گئے ہیں کہ نتائج ہر علم کے ضروری نہیں کہ یقینی ہی ہوں، بلکہ زیادہ تر عقلی علوم کے نظریات تخمینی ہوتے ہیں، مثلاً طب کے نتائج کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک موقع پر یہ بیان کرتے ہیں:

''طب کے تجربے جو ظنیہ ہیں ان کے خلاف کرنے میں باک نہیں، لیکن جو

Marfat.com

یقینی بات ہو اس میں مخالفت بڑی سبکی کی بات ہے''(۴۲)

آگے وہی لکھتے ہیں:

''بدین وجہ ہم نے کہا ہے کہ جیسے بہت سے قیاسات وتجربے اطباء ہنود غلط ہیں...... ویسے ہی یونانی وڈاکٹری''(۴۳)

بہر حال گو ہمارے اس مظلوم مولوی نے پرانے مذاق کے مولویوں ہی سے ان ہی علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی تھی، جن کے پڑھنے پڑھانے کا رواج مسلمانوں کی پرانی درسگاہوں میں تھا، لیکن اپنی ذاتی جدوجہد اور مطالعہ محنت سے یورپ کے جدید افکار وخیالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافی باخبر تھے۔ اسلام اور مسلمانوں پر، مسلمانوں کی تاریخ پر، اعتراضات اور تنقیدوں کا جو نیا سلسلہ یورپ کی جدید علمی نشأت میں جاری ہوا تھا، صرف انہی سے وہ واقف نظر نہیں آتے، بلکہ کائنات کے متعلق جو قدیم طریقہ تصور تھا، اور اس میں وقتاً فوقتاً ترمیم و اصلاح مغربی حکماء کی طرف سے ہوتی چلی آتی تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سمجھنے کی کوشش میں وہ سرگرم تھے۔

ان ہی باتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کی تفسیر کے اس مقدمہ میں علم کلام اور تصوف کے پرانے مباحث مثلاً اثباتِ واجب، توحید، وحدت وجود، وحدتِ شہود، مثال، حشر ونشر، جنت ونار، ملائکہ، جن، رسالت، وحی وغیرہ کے ساتھ ساتھ تعدد ازدواج، غلامی، جہاد جیسی چیزوں کا ذکر بھی ملتا ہے، حد یہ ہے کہ ان ہی جدید وقدیم مہمات کے انبار میں آپ کو اسکندریہ کے کتب خانہ کے جلانے کے اس الزام کا تذکرہ بھی ملے گا، جو مسلمانوں کی تاریخ پر یورپ والوں کی طرف سے لگایا گیا تھا، یہ لکھ کر:

''یہ امر محض غلط ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسکندریہ کا قدیم کتب خانہ

Marfat.com

جلا دیا''

اپنے خیال کی تائید کرتے ہوئے بیان کیا ہے:

''جیسے گبن وینٹ کرائی، دپلوٹارک، اس کی تصریح کرتے ہیں، بلکہ کتب خانہ مذکور سیزر قیصر کے وقت جلایا گیا'' (۴۴)

جس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا یورپین مصنفین کی کتابوں یا ان کے تراجم کے مطالعہ کا مصنف کو موقع ملا تھا، کچھ بھی ہو، انیسویں صدی کے ایک ہندوستانی مولوی کی تفسیر میں گبن اور دپوٹارک کے ناموں کا تذکرہ ہی بتاتا ہے کہ مولویوں کا جو عام ماحول اس زمانہ میں تھا اور اسی ماحول میں محدود رہنے کا جو غلط رجحان لوگوں میں پایا جاتا ہے، کم از کم ہمارے اس مظلوم مولوی کا دامن اس داغ سے پاک ہے۔

بعض دفعہ تو حیرت ہوتی ہے کہ بیسویں صدی میں جن نظریات کو یورپ نے پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے، انیسویں صدی کے اس مولوی کے کلام میں ان کی طرف بھی اشارے پائے جاتے ہیں، مثلاً یہی آواز یا صوت کا مسئلہ ہے۔ قدیم فلسفہ میں آواز کو غیر قار ٹھہرایا گیا ہے، یعنی پہلا جزء جب تک اس کا معدوم نہ ہو جائے، اس وقت تک دوسرا جزء موجود نہیں ہوسکتا۔ برعکس اس کے آج یہ مسئلہ عام ہو چکا ہے کہ ہر پیدا ہونے والی آواز فضا میں موجود ہے، چاہا جائے تو ہزار ہا ہزار سال کی تقریروں کو بھی اس زمانہ کا آدمی سن سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے بعض اربابِ کشف آج سے صدیوں پہلے اسی دعوی کا اعلان کر چکے تھے، شیخ ابن عربی اندلسیؒ جن کی وفات ۶۳۸ھ، بمطابق ۱۲۴۰ء یعنی تقریباً سات سو سال پہلے ہو چکی تھی، اپنی مشہور کتاب فتوحات مکیہ میں یہ ارقام فرماتے ہوئے:

''و هذا الحروف لا يزال فی الهواء يمسک عليها شکلها'' (۴۵)

Marfat.com

''یہ حروف (جو منہ سے نکلتے ہیں) ہمیشہ ان کی شکل ہوا میں قائم و دائم رہی ہے''۔

آگے چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

''الاشکال اللفظیة فی محل لا یقبل ذلک و لھذا کان لھا البقاء''۔(۴۶)

''الفاظ کی صورت و ہیئت جس چیز میں جا کر قائم ہو جاتی ہے، چونکہ وہ زوال پذیر نہیں ہے، اس لیے الفاظ کی صورت اور ہیئت ہمیشہ باقی رہتی ہے''۔

آخر میں اس حقیقت کا اظہار فرماتے ہیں:

''فالجو کله مملوء من کلام العالم''(۴۷)

''ساری فضا دنیا والوں کی باتوں سے بھری ہوئی ہے''

اور اسی حقیقت تک آج سائنس بھی پہنچ چکی ہے، شیخ نے لکھا ہے کہ ساری فضا کا دنیا والوں کی باتوں سے مملو اور بھرا ہوا ہونا، یہ ایک ایسا واقعہ ہے:

''یراہ صاحب الکشف صوراً قائمة''(۴۸)

''کشف کی قوت رکھنے والے، آوازوں کی صورتوں کو فضا میں قائم و دائم پاتے ہیں''۔

خیر یہ تو شیخ اکبر کا ایک کشفی نظریہ ہے، اسی فتوحات مکیہ کے دوسرے مقامات میں بھی اس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے، یہاں میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے مظلوم مولوی نے اپنے مقدمہ تفسیر میں شیخ اکبر کے اسی نظریہ کا تذکرہ کرتے ہوئے، اور یہ کہتے ہوئے کہ قرآنی آیت:

﴿ما یلفظ من قول الا لدیه رقیب عتید﴾(۴۹)

''نہیں بولتا ہے کوئی بات مگر اسکے پاس ایک نگران تیار ہوتا ہے''

سے بھی آدمی کا ذہن اس مسئلہ کی طرف منتقل ہوسکتا ہے۔

Marfat.com

آگے وہی لکھتے ہیں:

''قیام آواز موجود ہوائی کا، اس وقت میں آلہ حفاظت آواز سے ظاہر ہوا ہے''۔ (۵۰)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آواز کے اس جدید نظریہ سے یورپ والوں کے وہ واقف تھے، حالانکہ جہاں تک میرا خیال ہے کہ ان کے زمانہ میں یہ مسئلہ اپنی ابتدائی حالت میں تھا۔ نئی باتوں کے جاننے کا غیر معمولی جذبہ ان میں جو بھڑک اٹھا تھا، اس کے سوا اس قسم کی واقفیتوں میں اور کس چیز کو دخیل مانا جائے۔

اسی طرح آج کل یورپ والوں نے اپنی تنقید کے لیے اسلام کے جن مسائل کا انتخاب کر رکھا ہے، جن میں وہی تعدد ازدواج، غلامی، جہاد کے سہ شاخے کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے، اگرچہ ان میں سے کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جو اسلام کے ساتھ کسی قسم کی خصوصیت رکھتا ہو۔ دنیا کا شاید ہی کوئی مذہب یا مذہبی قوم ایسی ہوگی جس کا دامن ان دھبوں سے پاک ہو، بشرطیکہ ان کو واقعی انسانیت کے دامن کا دھبہ قرار دیا جائے، مگر اسلام ہی کو نشانہ بنا کر دو سو سال سے پلٹ پلٹ کر اعتراض کرنے والے ان ہی کو دہرا رہے ہیں، جواب دے دیا جاتا ہے مگر جب دیکھیے اسلام کے مقابلہ میں صلیبی محاذ سے اسی سہ شاخے (تعدد ازدواج، غلامی، جہاد) کو لیے ہوئے لوگ حملہ کر رہے ہیں۔ پہلے اس صلیبی ہتھیار کو پادری استعمال کرتے تھے، اور اس زمانہ میں تحقیق و ریسرچ کی نقاب ڈال ڈال کر ان ہی پادریوں کی اولاد داد تحقیق دے رہی ہے۔

بہر حال معمولی لفظی ردو بدل کے ساتھ پیش کرنے والے کا انتہائی ڈھٹائی اور دیدہ دلیری کے ساتھ اسی کو اس طرح پیش کرتے رہتے ہیں کہ گویا ان کا کوئی جواب مسلمانوں کی طرف سے کبھی دیا ہی نہیں گیا تھا۔

Marfat.com

کچھ بھی ہو جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں ہمارے مظلوم مولوی نے ان سوالوں کو بھی چھیڑا ہے، اور اس سلسلہ میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اگر تعبیری سقامت اور بیانی ژولیدگیوں سے قطع نظر کر لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کے بعد لکھنے والوں کی طرف سے شاید مشکل ہی سے کچھ اضافہ ہوا ہو، بلکہ تعدد ازدواج کے مسئلہ میں منجملہ دوسری باتوں کے اعداد و شمار والے جدید یورپین طریقہ استدلال کو استعمال کرتے ہوئے انہوں نے جو یہ لکھا ہے:

''بحساب مردم شماری ایک ارب چالیس کروڑ میں گیارہویں حصہ عورتیں زیادہ ہیں، تو قریب بارہ کروڑ عورتوں کے جو فاضل رہیں، اگر مرد کو بشرط عدالت دوسرا نکاح درست نہ ہو تو وہ بیچاری کیا کریں''۔ (۵۱)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اعداد و شمار کا طلسم قائم کر کے اس سے نتائج پیدا کرنے کا جو شوق یورپ والوں پر مسلط ہے، ہمارے اس مظلوم مولوی نے استدلال کے اس جدید طریقہ کو بھانپ بھی لیا تھا اور اس سے کام لینا بھی شروع کر دیا تھا۔

واقعہ تو یہ ہے کہ اس معاملہ میں ان کی بعض چابک دستیاں بڑی دلچسپ ہیں۔ ہیرے کے متعلق یورپ کے اربابِ سائنس نے یہ مشہور کیا تھا کہ معدن زغال کے گیس سے ہر ہیرا تیار ہوتا ہے، گویا کہ صاف و شفاف گیس کا نام ہیرا ہے، ہمارے مظلوم مولوی نے اسی کو بنیاد بنا کر سارے فلکی اجرام کی تخلیق کی جو توجیہ کی ہے، وہ سننے کے قابل ہے، اتنی بات تو لوگوں کو معلوم ہے کہ قرآن میں آسمان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

﴿ثم استوی الی السماء وھی دخان﴾ (۵۲)

''پھر خدا آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور آسمان دھواں گیس ہے''

مظلوم مولوی نے اسی قرآنی مقدمہ کو پیش کر کے لکھا ہے:

''ظاہر ہے کہ تاروں کا مادہ دخان (گیس) ہے جیسے اس عرصہ میں (بمعنی ہمارے زمانہ میں) ہیرے کا مادہ دخان (گیس) ظاہر ہوا ہے، جو شفاف ہوتا ہے''۔ (۵۳)

یہ بھی ان ہی کا دعوی ہے:

''آفتاب و ماہتاب ثوابت دخان سے بنائے گئے ہیں جیسے ہیرا دخان سے بنتا ہے''۔

پھر اس سوال کا جواب یعنی آسمان جب صرف گیس اور دخان ہے، تو قرآن میں سات طبقات میں اس کو جو تقسیم کیا گیا ہے، اس کا کیا مطلب ہے، مظلوم مولوی نے اس سلسلہ میں یورپ ہی کے فلکیوں کے ایک نظریہ کو پیش کر کے اس کا جواب دیا، انہوں نے لکھا ہے:

''حکمت جدید والے چھ درجات اس کے (یعنی آسمان) کے بہ نظر قلت و کثرت روشنی کے کرتے ہیں''۔

مطلب یہ ہے کہ فضا کا وہ حصہ جو تاروں سے بھرا ہوا ہے، فلکیات کے مغربی حکماء نے یہ دیکھ کر کہ بعض حصہ فضاء کا زیادہ روشن ہے، اور بعض میں روشنی کم ہے، الغرض روشنی کی کمی بیشی سے انہوں نے چھ درجوں میں آسمان کو بانٹا ہے، مظلوم مولوی نے تسلیم کرلیا کہ قرآن کے دخانی آسمان کے چھ طبقات تو یوں نکل آئے، باقی ساتواں طبقہ سو اس کے متعلق یہی لکھتے ہیں:

''نیچے والے میدان کے روشن تاروں کو (قرآن میں) آسمان پائیں ﴿السماء الدنیا﴾ فرمایا جس کے اندر کارخانہ سورج اور اس کے سیاروں ہے''۔ (۵۴)

عبارت میں یہاں کچھ گنجلک سے رہ گئی ہے، بظاہر ان کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ چھ طبقات جو روشنی کی کمی و بیشی سے پیدا ہوئے ہیں، وہ فضا کے اس حصہ

Marfat.com

سے الگ ہیں جس میں ہمیں تارے جگمگاتے نظر آتے ہیں، اور سورج اپنے اردگرد گردش کرنے والے سیاروں کے ساتھ اسی میں قائم ہے، گویا آسمان کے متعلق یونانیوں کا جو نظریہ تھا کہ ٹھوس قسم کے اجرام ہیں اور ستارے ان میں جڑے ہوئے ہیں۔ اس کو قرآن کے مخالف قرار دے کر قرآن کے دخانی نظریہ اور فلکیات کے مغربی حکماء کے خیال میں تطبیق کی شکل پیدا کر دی گئی ہے اور آسمان کے جرمی وجود کے متعلق ہندوستان کے مدرسوں میں جو شور وغل مغربی خیالات کی وجہ سے مچا ہوا تھا، مظلوم مولوی نے اپنے نزدیک مذکورہ طریقہ سے گویا اس کا فیصلہ کر دیا تھا۔

اسی سلسلہ میں سال و ماہ کے حساب میں قوموں کا مذاق شمسی اور قمری ہونے کے حساب سے جو مختلف ہے، ہمارے مظلوم مولوی کا یہ لطیفہ کافی دلآویز ہے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ عموماً نباتات اپنی نشو ونما میں بھی اور پھلنے پھولنے میں بھی آفتاب کی حرارت کے محتاج ہیں، لیکن اسی کے بالمقابل یہ دیکھا جاتا ہے کہ مظلوم مولوی نے لکھا ہے:

''نو ماہ قمری میں اس (آدمی) کے حمل کی تعداد اور حیض ونفاس میں ماہ قمری کا حساب ہے''۔

بظاہر ان کی غرض یہ ہے کہ انسانی وجود کی پیدائش کا سلسلہ جن قدرتی قوانین کے تحت جاری ہے، یعنی حمل حیض ونفاس وغیرہ، چونکہ بجائے شمسی حساب کے قمری حساب کا تابع ہے، اس لیے وہی لکھتے ہیں کہ جن قوموں میں ''انسانیت زیادہ ہے ان کے ہاں اب تک حساب قمری کا شمار ہے'' (۵۵)

امراض اور وباؤں کے متعلق عموماً قدیم اطباء قائل تھے کہ کہ مادی عفونت یا مادہ کی سڑاندھ کے یہ نتائج ہیں، گویا کسی زندہ وجود کی طرف ان بیماریوں کو منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جراثیم کا نظریہ جو انیسویں صدی میں شاید قطعی فیصلہ کی صورت

Marfat.com

اختیار نہ کر سکا تھا، لیکن ہمارے مظلوم مولوی تک اس کی خبر پہنچ گئی تھی، انہوں نے جراثیم کے اسی نظریہ کی پشت پناہی میں جن کے عقیدے کی تائید کا فائدہ حاصل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس وقت میں تحقیقات فرانس سے ظاہر ہوا ہے کہ بہت چھوٹے چھوٹے کیڑے جو سیر بین (خوردبین) سے بہ مشکل دریافت ہوتے ہیں، وہ دل میں گھس کر وبا کے باعث ہو کر باعث ہلاکت انسان ہوتے ہیں''۔(۵۶)

اس سلسلہ میں مظلوم مولوی نے اس قرآنی آیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے جس میں فرمایا گیا ہے:

''ہم نے جن کو نار سموم سے پیدا کیا ہے''(۵۶،الف)

ان کا خیال ہے کہ سموم کا لفظ سم سے ماخوذ ہے، جس کے معنی زہر ہیں اور یہی زہر ان ہی نادیدہ مخفی ہستیوں میں چھپا رہتا ہے، جنہیں آج کل جراثیم کہتے ہیں اور بنی آدم کو وہ تکلیف پہنچاتے ہیں۔ بہر حال بجائے مردہ مادہ کے اتنا تو بہر حال تسلیم کر ہی لیا گیا کہ ان وبائی امراض میں پوشیدہ زندہ ہستیوں کے بکھیڑے کو دخل ہے۔مولوی صاحب کا خیال ہے کہ پھر مذہبی روایات میں اگر جنی آسیب کا ذکر آتا ہے، تو لفظی فرق کے سوا واقعہ کی نوعیت میں اب اختلاف ہی کیا باقی رہا،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبح و شام وہ اسی قسم کے معلومات کی جستجو اور تلاش میں رہتے تھے۔ ان کے زمانہ میں یہ خبر اخباروں میں شائع ہوئی کہ جزیرۂ جاوا میں ایک ایسا زلزلہ آیا کہ سو میل تک زمین شق ہو گی، اسی خبر کو بنیاد بنا کر اور یہ کہ جیسے زمین نظام شمسی کا ایک سیارہ ہے، اسی طرح چاند بھی اسی نظام کا ایک سیارہ ہے، تو شق قمر کے معجزہ کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ اس میں ''کیا بعید ہے کہ سو میل تک جاوہ کی زمین پچھلے دنوں شق ہو گئی تھی''(۵۷)

ان کے زمانہ میں گنے چنے ہندوستان میں چند اخبار جو نکلتے تھے، عام مولویوں کی روش کے خلاف ان اخباروں کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ پڑھا کرتے تھے، اپنی کتاب مین اودھ اخبار، سراج الاخبار وغیرہ کا مختلف مقامات میں حوالہ بھی دیا ہے اور اپنے کام کی چیزیں ان اخباروں سے چن لیا کرتے تھے، حضرت نوح کی عمر کی غیر معمولی طوالت پر بحث کرتے ہوئے اور یہ بیان کرتے ہوئے کہ عمریں عموماً جسمانی حالت کی استواری وقوت کی تابع ہوتی تھیں، جس زمانہ میں آدمی کے بڑے پنجے، ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء آج کل کے انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ بڑے اور زیادہ مضبوط ہوتے تھے، تو عمریں بھی ان کی جسمانی قوت کے مطابق موجودہ عمروں سے زیادہ ہوتی تھیں ۔ پھر اس مقدمہ کے ثبوت میں کہ آج کل کے لحاظ سے پہلے زمانہ کے لوگوں کی جسمانی حالت مختلف تھی، یہ خبر دیتے ہوئے کہ ''اودھ اخبار، ۱۷ جون ۱۸۹۰ء لکھا میں لکھا ہے'' ۔

ہمارے مظلوم مولوی نے معلومات کا کافی ذخیرہ اس سلسلہ میں جمع کر دیا ہے ۔ مثلاً یہ کہ ایک آدمی کی ہڈی لندن بھیجی گئی ہے، جس میں ایک ڈاڑھ بیس سیر لکھی ہے اور اس عہد قیصرۂ ہند (ملکہ وکٹوریہ) میں نہر سرہند کے مابین ایک ندی سے آدمی کی کھوپڑی نکلی ہے جو ہاتھی کی کھوپڑی کے برابر ہے ۔ اسی سلسلہ میں فیروز شاہ تغلق کے زمانہ کی اس خبر کو بھی درج کیا ہے کہ ۷۷۲ھ میں سرہند ہی کے قریب ایسی ہڈیاں آدمیوں کی برآمد ہوئیں جن میں ہاتھ کی ہڈیاں تین گز کی تھیں (۵۸) اسی سلسلہ میں انہوں نے اپنے وطن امروہہ کے متصل قصبہ جس کا نام کانٹھ ہے، اسی کانٹھ کی ایک قبر کا بھی ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''میرے عزیز منشی عبدالرحمٰن جو بڑے معتمد وثقہ ہیں''

یہ خبر ان کو سنائی: ''قبر برسات میں کھلی دیکھی جن کی ساق (پنڈلی کی ہڈی)

Marfat.com

بوسیدہ تین گز کی تھی''۔

بہر حال ان معلومات کی روشنی میں دعویٰ کیا ہے:

''عمریں بقدر قد و قامت تھیں''

اسی طرح شداد والے باغ کے سلسلے میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ ریگستان میں اس قسم کے باغ کے غائب ہو جانے پر تعجب نہ کرنا چاہیے انہوں نے اجمیر شریف کے قریب کچاون نامی قصبہ کے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے:

''کچاون اجمیر شریف سے پچیس کوس کے فاصلہ پر وہاں کے ایک سیٹھ نے کنواں کھدوایا جس میں ستر پچھتر ہاتھ نیچے کوئلی اور اونٹ کی مینگنی نکلی ہے''۔(۵۹)

خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ پڑھتے دیکھتے اور سنتے تھے چاہتے تھے کہ اس سے اسلام اور اسلامیات کی تائید و نصرت کا پہلو پیدا کر لیا جائے، یہ الگ مسئلہ ہے کہ اپنی اس کوشش میں واقعی وہ کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ پہلے بھی حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی تنقید ان کے اقوال کے متعلق نقل کر چکا ہوں کہ ''حق و باطل ہر قسم کی باتوں کے سامنے جھک جانے'' کا عیب ان میں پایا جاتا تھا، لیکن نیت اس مظلوم مولوی کی بہر حال نیک ہی معلوم ہوتی ہے، بلکہ دین کی خدمت کا یہ جذبہ کہا جا سکتا ہے کہ قابلِ رشک ہے اور اس قابل ہے کہ دوسروں کے لیے عبرت و بصیرت کا سبق بن جائے۔

بعض مواقع میں وہ چھوٹی چھوٹی عام اور مشہور باتوں سے ایسے نتائج پیدا کر لیتے ہیں کہ بے ساختہ ان کے ذہنی انتقال پر دل داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کرۂ ارض کی مشہور پرانی تقسیم جس میں ریاضی کے قاعدے سے زمین کو ہفت اقلیم میں بانٹا جاتا تھا، یورپ والوں نے اس کے مقابلہ میں ایشیا، یورپ، افریقہ اور امریکہ والی تقسیم کو زیادہ شہرت دے رکھی ہے۔ اگرچہ بذاتِ خود یہ تقسیم نئی نہیں

Marfat.com

ہے بلکہ پرانی کتابوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ یورپ والوں کی مشہور کی ہوئی اسی تقسیم کا تذکرہ کرتے ہوئے ''ایشیا'' کے لفظ کو وہ ''عیشیا'' کی صورت میں لکھتے ہیں۔ مطلب ان کا یہ ہے کہ عیش یعنی زندگی گذارنے کا صحیح مقام چونکہ ایشیا ہی تھا، عموماً معتدل اقالیم جہاں آفتاب کی روشنی اور حرارت سے مستفید ہونے کے زیادہ مواقع میسر ہیں۔ اس لیے اصلی نام اس کا ''عیشیا'' تھا۔ بعد کو یہی نام ایشیا کے نام سے مشہور ہو گیا ہے تو ایک لفظی لطیفہ لیکن دلچسپ ضرور ہے۔

ان کی کتاب میں اس قسم کے چٹکلوں کی کافی تعداد پائی جاتی ہے، ایک موقع پر یہ لکھتے ہیں:

''حیوانوں کی غذا نباتات اور اشجار اور نبات کی غذا جمادات، جمادات کی غذا عناصر، عناصر کی غذا اکسوجن وہیڈروجن (و) وغیرہ ہیں کہ ہر ایک بطور طبعی مناسبت و قربت کے جیسے علم طب سے ظاہر ہے، اپنے میں محو کر لیتا ہے''

اور اسی بنیاد پر وہ کہتے ہیں:

''ان میں سے انسان ہے جس کی غذا طبعی حیوانات طیبات ہیں'' (۶۰)

یوں مسئلہ اکل لحم (گوشت خوری) کو قدرت کا ایک طبعی امر قرار دینے میں اپنے آپ کو وہ حق بجانب ثابت کرتے ہیں۔

ان کے ذہنی انتقال کی ایک دلچسپ مثال شاید وہ بات بھی ہو سکتی ہے جو آدم وحوا کے قصہ کی تفصیل میں ان کے قلم سے نکل گئی ہے، ان کا خیال ہے کہ شجرہ جس کے معنی باہم گتھ جانے کے بھی ہیں، قرآن میں ﴿فیما شجر بینھم﴾ کے الفاظ کا مطلب یہی کہ باہمی آویزش والے جھگڑوں میں ان کو چاہیے کہ پیغمبر کو حکم بنائیں۔

Marfat.com

الغرض لفظ الشجرہ کی اس لغوی تشریح سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مظلوم مولوی نے دعویٰ کیا ہے کہ مقاربت اور مجامعت یعنی ہم بستری سے دونوں کو منع کیا گیا تھا، روایتوں میں الشجرہ کے متعلق جو یہ دو مختلف باتیں آئی ہیں، یعنی بعضوں میں گیہوں اور بعضوں میں کہا گیا ہے کہ وہ انگور کا درخت تھا، ہمارے مظلوم مولوی کا خیال ہے کہ دونوں روایتیں صحیح ہیں اور مطلب یہ تھا:

''مرد کی طرف سے مشبہ بہ انگور اور عورت کی طرف سے مشبہ بہ گندم'' (۶۱)

استعارے کے رنگ میں اشارہ کیا گیا ہے: ﴿فبدت لهما سواتهما﴾ (۶۱ الف) (پس کھل گئیں دونوں کی شرمگاہیں) کی اطلاع ﴿فلما ذاقا الشجر﴾ (۶۱ ب) (جب چکھ لیا باہمی آویزش کا مزہ دونوں نے) کی خبر کے بعد جو دی گئی ہے، ہمارے مظلوم مولوی نے ان ہی قرآنی آیتوں کو اپنے خیال کا تائیدی قرینہ قرار دیا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ اہل علم کے لیے یہ خیال کس حد تک قابل قبول ہوسکتا ہے، خود خاکسار کے نزدیک تو قرآن کی ایسی باتیں جن کی تشریح نہ قرآن ہی میں کی گئی ہو اور نہ صحیح حدیث میں ان کا مطلب بیان کیا گیا ہو ان کو اجمال ہی کی حالت میں چھوڑ دینا زیادہ مناسب ہے ورنہ اپنے جی سے تو کہنے والے طرح طرح کی باتیں کہہ سکتے ہیں (ز)۔

میری غرض تو صرف یہ ہے کہ خواہ بات مانی جائے یا نہ مانی جائے لیکن گندم وانگور والی مختلف روایتوں میں تطبیق کی یہ کتنی دلچسپ مثال ہے۔ اگرچہ واقع کے رو سے گندم والی روایت ہو یا انگور والی دونوں ہی محدثین کی معیار سے گری ہوئی روایتیں ہیں۔ لیکن ان کا ذہنی انتقال قابلِ تعریف ہے اور صرف یہی دکھانا میرا مقصود ہے۔

اور یہ قصے تو ان کی علمی جستجو ذہنی رفتار کی خصوصیتوں کے متعلق تھے۔ لیکن

Marfat.com

ان کی علمی زندگی کا سب سے اہم ترین موضوع جیسا کہ میں پہلے بھی شاید کہہ چکا ہوں، درحقیقت بائبل کا گہرا مطالعہ اور قرآنی بیانات کی توضیح و تشریح میں اس سے استفادہ ہی ہمارے مظلوم مولوی کی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ علمائے اسلام میں جہاں تک خاکسار جانتا ہے اپنے زمانہ کی حد تک شاید وہ اپنی آپ نظیر تھے۔ براہِ راست تورات وانجیل دوسرے انبیائے بنی اسرائیل کی طرف منسوبہ کتابوں کے مطالعہ کرنے والے سلف میں بھی کچھ لوگ گزرے ہیں۔ لیکن اول سے آخر تک قرآن کا مطالعہ بائبل کو سامنے رکھ کر یا بائبل کا مطالعہ قرآن کو سامنے رکھ کر میں تو نہیں جانتا کہ ہمارے مظلوم مولوی سے پہلے کسی عالم نے کیا ہو، ان کے بعد اس میں شک نہیں کہ بعض دوسرے بزرگوں کو بھی اس کی توفیق ہوئی اور اس کا دعویٰ اگر کوئی کر گزرے کہ اس کی توفیق کا تحریکی نمونہ مظلوم مولوی ہی کا طرزِ عمل بنا ہو، تو مشکل ہی سے اس کی تردید ہوسکتی ہے، بلکہ کافی قرائن ایسے پائے جاتے ہیں جن سے اس دعویٰ کی گونہ تائید ہی ہوتی ہے۔ مثلاً ''والتین والزیتون'' کے قرآنی الفاظ ہی کو دیکھیے جن کی قسمیں سورہ والتین میں کھائی گئی ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ انجیر اور مشہور روغنی درخت زیتون کے ساتھ ان الفاظ کی کتابوں میں جو تفسیر کی جاتی تھی، بجائے اس کے نبوت کی تاریخ سے تعلق رکھنے والے دو مقامات کا نام ان کو قرار دینا اس زمانہ کا نیا انکشاف ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس انکشاف کے اعلان سے پہلے بے چارے اسی مظلوم مولوی نے یہ لکھتے ہوئے:

''تین و زیتون و طور سینین و بلدا مین کے باہم ربط دریافت نہیں ہوتے، اس کو کتب سابقہ (بائبل) سے دریافت کرنا چاہیے''۔ پھر اپنا بیان ان الفاظ میں درج کیا ہے:

''کوہ تین پر مسیح علیہ السلام نے ﴿مثلهم فى الانجيل﴾ کی تفسیر بکمال خوبی فرمائی ہے، جیسے فصل پنجم متی میں مراد اس پہاڑ سے جس پر مسیح حسب فصل

Marfat.com

مذکور چڑھے''۔

آگے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ یہی پہاڑ کوہ تین ہے، وہی لکھتے ہیں:

''وہ (یعنی کوہ تین) پندرہ میل بیت المقدس سے ہے''۔(۶۲)

اسی طرح کوہ زیتون کا بھی پتا بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ طور سینین کا تعلق حضرت موسیٰ سے اور البلد الارض یعنی مکہ معظمہ کا تعلق رسول اللہ ﷺ سے ظاہر ہے۔

میں اس وقت یہ نہیں کہنا چاہتا ہوں کہ کوہ تین یا کوہ زیتون کا جونشان اور پتہ مظلوم مولوی نے دیا ہے، یہ کس حد تک صحیح ہے بلکہ کہنا یہ ہے کہ بجائے نباتاتی اشیاء کے نبوت کی تاریخ سے تعلق رکھنے والے مقامات کی تعبیر ان الفاظ کو قرار دینا، اور بائبل کے حوالوں سے اس راہ میں استفادہ، یہ آواز پہلی دفعہ ان ہی کی اٹھائی ہوئی ہے۔

کچھ بھی ہو قرآن اور بائبل کے تقابلی مطالعہ میں پرانے مذاق کے اس پرانے مولوی نے غیر معمولی جانکاہیوں اور جگر کاویوں سے کام لیا ہے۔قدیم وجدید عہد ناموں کی ایک ایک کتاب کا معلوم ہوتا ہے کہ حرف حرف ان کی نظروں سے گذرا ہوا ہے اور جہاں تک ان کے امکان میں تھا،نتائج پیدا کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ان کے نکالے ہوئے بعض نتیجے تو آدمی کی آنکھیں کھول دیتے ہیں۔یہی جمعہ،اتوار،سنیچر کے احترام و تقدیس کا مسئلہ جو مسلمانوں،عیسائیوں،یہودیوں کے دین کا مشہور اختلافی جزیہ ہے، ہمارے مظلوم مولوی نے یہ تنقیح قائم کرکے کائنات کی آفرینش و تحقیق کے سلسلہ میں ''سبت'' کا یعنی فراغت کا دن کون سا ہے؟ اصلی سوال یہی ہے، پھر انہوں نے یوحنا کی انجیل کی فصل ۱۹ درس ۳۱ کے اس فقرہ کو پیش کرکے حضرت مسیح علیہ السلام کو جس دن سولی دی گئی تھی، وہ سبت کا دن تھا اور جیسا کہ ان ہی انجیلوں میں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے گرفتار ہونے سے پہلے

Marfat.com

حواریوں سے کہہ دیا تھا:

''ضرور ہے کہ ابنِ آدم گنہگاروں کے ہاتھ میں حوالہ کیا جائے اور مصلوب ہو، اور تیسرے دن جی اٹھے''۔

یہ اور اس کے سوا انجیلوں ہی کے دوسرے بیانوں کی روشنی میں ہمارے مظلوم مولوی نے دعویٰ کیا ہے کہ مسیح علیہ السلام عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق:

''شب سبت، شب شنبہ و شب اتوار قبر میں رہے اور اتوار کی آخر شب میں قبر سے نکالے گئے''۔ (۶۳)

اسی کو پیش کر کے انہوں نے لکھا ہے:

''اس حساب سے روز سبت جمعہ ہوا''۔ (۶۴)

واقعہ یہ ہے کہ اتنی کھلی ہوئی واضح بات ہے کہ کم از کم انجیل پر ایمان رکھنے والے عیسائی اس کا انکار نہیں کر سکتے کہ سبت کا دن دراصل جمعہ ہی کا دن تھا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ تک یہودی بھی جمعہ ہی کے دن کو سبت کا دن مانتے تھے، پھر خدا ہی جانتا ہے کہ بجائے جمعہ کے سنیچر کے دن کے احترام پر کس نے ان کو مجبور کیا، اور عیسائیوں کے متعلق تو معلوم ہی ہے کہ رومی بت پرستوں نے دینِ عیسوی جب قبول کیا تو اپنے آبائی اور موروثی دین کی چند خصوصیات کو عیسائی مذہب میں انہوں نے شریک کر لیا تھا جن میں ایک (Sunday) یا یوم الشمس کا یہ دن اتوار بھی ہے۔ رومی متھر یا مہر یعنی آفتاب کو پوجتے تھے اور اسی تعلق سے آفتاب کا یہ دن ان کے ہاں محترم و مقدس سمجھا جاتا تھا (ح)۔

کچھ بھی ہو، بائبل کے مطالعہ کا والہانہ ذوق اور قرآنی آیات کی بائبل کے مضامین میں سے تشریح و تفسیر کے اس شوق میں جہاں بہت سے کارآمد اور مفید نتیجوں تک وہ پہنچے ہیں وہیں افسوس کے ساتھ اس کا بھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مزاولت و ممارست

کی کثرت وشدت کی سہولت موجودہ بائبل کے مضامین ومشتملات کی بے جاوکالت وحمایت میں ان کا قدم اغراق وغلو کے حدود سے بھی جہاں تک میرا خیال ہے آگے نکل گیا ہے، یوں جب وہ محوہوش کی حالت میں رہتے ہیں، تو اقرار کرتے ہیں:

''میں یہ نہیں کہتا کہ کتب مذکورہ (یعنی بائبل کے مجموعہ میں جو کتابیں شریک ہیں) ان میں تحریف وتبدیلی نہیں ہوئی ہے''۔ (۶۵)

''حق'' کے ساتھ ''باطل'' کی تائید وحمایت کی یہی مثالیں ہیں، اس باب میں ان کا غلو یقیناً ظلم کے حدود تک پہنچا ہوا ہے اسی سلسلہ میں میں تو حیران ہوکر رہ گیا جب سینٹ پال جیسی ذات بزرگ کے متعلق پہلی دفعہ ان کی کتاب میں مدح وستائش کے یہ الفاظ پڑھے:

''پولوس مقدس درحقیقت بڑا مجتہد عظیم الشان شخص ہے''

اور یہ کہ وہ: ''بڑے زبردست عالم یہودی تھے، ان کا حال یوحنا کا سا ہے کہ پہلے سخت نصاری، مسلمانوں کے دشمن تھے، پھر ایمان لاکر کیسے کیسے امور نمایاں کیے ویسے ہی پولوس یہودی تھے اور نصاریٰ کے پہلے دشمن تھے پھر کیسے کیسے امور ان سے نمایاں ہوئے''۔

اور یہ بھی پولوس ہی کے متعلق آپ کی رائے ہے:

''ان کے نامہ (خطوط) ہر چند وحی کے طور پر نہیں .... پر بڑے باریک ہیں''۔ (۶۶)

گو اسی کے ساتھ اس کا بھی اعتراف دبے لفظوں میں کیا ہے کہ ان کے بزرگ سینٹ پال مجتہد اعظم:

''بعض مقام پر خطاء اجتہادی کے خطا بھی کرتے ہیں، لیکن متنبہ بھی ہوتے گئے ہیں''

Marfat.com

سینٹ پال کے واقعی حالات سے جو آگاہ ہیں، وہیں سمجھ سکتے کہ اس مظلوم مولوی کا یہ کتنا ظالمانہ فیصلہ ہے۔

واقعہ یہ ہے (ط) حضرت مسیح علیہ السلام کی خالص توجیہ کو تثلیث اور باپ بیٹے کا جھگڑا، نیز کفارہ کا عقیدہ پھیلا کر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کے مطالعہ کے غیر معمولی ذوق کی وجہ سے پادریوں سے ان کا میل جول زیادہ بڑھ گیا تھا اور شعوری و غیر شعوری طور پر اس قسم کے فکری جراثیم ان ہی کی صحبتوں، باہمی مکالموں میں پیدا ہو گئے۔ واللہ اعلم

میں خیال کرتا ہوں کہ مظلوم مولوی کو ان کے عیب و ہنر دونوں قسم کے صفات کے ساتھ روشناس کرنے کے لیے اتنا بیان کافی ہو سکتا ہے۔ اپنی علمی جد و جہد، تلاش و جستجو کے سلسلہ میں وہ جن جن نتیجوں تک پہنچے ہیں ان کی تفصیلی علم کے لیے مناسب ہوگا کہ ان کی تفسیر اور تفسیر کے مقدمہ کا مطالعہ کیا جائے، شاید میں نے پہلے بھی کہیں اشارہ کیا ہے کہ اصل تفسیر میں جیسا کہ چاہیے تھا ایسی کوئی خاص چیز نہیں ملتی جو ان کے بلند آہنگ دعوؤں کا اقتضا ہے۔ جہاں جہاں قرآنی آیات کی تشریح و توضیح میں بائبل کے حوالوں سے مدد مل سکتی تھی وہاں وہ رکے ضرور ہیں۔ لیکن زیادہ تر وہ ایسی باتیں ہیں کہ ان سے واقعی ان آیتوں کے سمجھنے میں کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوتا، ت۔ ۰ چھ اشارے ضرور مل جاتے ہیں اور ان اشاروں کی مدد سے کوئی آگے بڑھنا چاہے تو شاید بڑھ سکتا ہے۔

برخلاف اس کے ان کی تفسیر کا مقدمہ انصاف کی بات یہی ہے کہ پست سے پست چیزوں کے ساتھ کافی بلند نتائج پر بھی مشتمل ہے۔ ان کے خاص طریقہ بیان سے اپنے آپ کو مانوس بنا لینے کے بعد چاہا جائے تو کافی فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے، خصوصاً قرآن کی آیت: ﴿النبی الامی الذی یجد ونہ مکتوبا عندھم فی

التورات والانجیل﴾ (۶۷)

''النبی الامی جسے وہ یعنی اہل کتاب اپنے ہاں تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں''۔

یعنی رسول اللہ ﷺ کے متعلق تورات وانجیل میں جو پیشینگوئیاں درج تھیں اور کسی نہ کسی شکل میں اب بھی پائی جاتی ہیں، ان کی تحقیق وتفتیش میں کافی محنت اٹھائی ہے۔ دوسرا مسئلہ ''یاجوج وماجوج'' نامی قوموں کا ہے، جن کا ذکر قرآن میں ایک سے زائد مقامات میں پایا جاتا ہے۔

پہلی بات تو ظاہر ہے کہ کسی خاص عہد اور زمانہ سے کوئی خصوصی تعلق نہیں رکھتی لیکن دوسرا مسئلہ عہد حاضر کے مسلمانوں بلکہ چاہیے تو کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ عام انسانی نسلوں کے لیے خاص طور پر قابل توجہ ہے اور آئندہ ہم ان ہی دونوں چیزوں کے متعلق مظلوم مولوی کے افادات کو پیش کریں گے (ان شاءاللہ)

اور یہ بھی ایک حد تک درست ہے جیسا کہ وہ خود ہی لکھتے ہیں:

''بہت سے مقامات پر میں نے بتایا کہ وہاں پر تحریف وتبدیلی ہوئی ہے'' (۶۸)

جس کی ایک مثال وہی یوم السبت والی تحریف بھی ہوسکتی ہے کہ جمعہ کے دن کو سینچر اور اتوار سے بدل لیا گیا۔ وہ اس قسم کی اسرائیلی روایات جو مسلمانوں میں مشہور ہوگئی تھیں، مثلاً عوج بن عنق عملیقی فلسطین کے قریب علاقہ بسن کا جو راجہ تھا یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ عوج غیر معمولی ڈیل ڈول والا ضرور تھا لیکن یہ:

''سمندر سے مچھلی پکڑ کر سورج سے سینکتا تھا'' (۶۹)

مسلمانوں کو نصیحت کی ہے کہ اس قسم کی باتوں کا چرچا کر کے اہل عقل کی نگاہوں میں وہ سبک ہوتے ہیں مولوی صاحب نے پوچھا ہے:

''اوپر میں سردی ہوتی ہے یا گرمی؟''

اس کی بھی خبر گپ اڑانے والوں کو نہ تھی‘

لیکن با ایں ہمہ موجودہ بائبل کے عشق کے نشہ میں جب وہ سرشار ہوئے تو ان کے قلم سے سکر کی اس کیفیت میں ایسی باتیں نکل پڑی ہیں، جنہیں پڑھ کر بجائے مظلوم کے ظالم قرار پانے کے شاید وہ زیادہ مستحق ہوجاتے ہیں اور تو اور بے جاوکالت کے خبط کی یہ آخری حد ہوسکتی ہے کہ حضرت لوط علی النبی الصلوۃ والسلام کا قصہ جسے قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر دہرایا گیا ہے اور کتاب پیدائش میں بھی یہی قصہ پایا جاتا ہے لیکن اس اضافہ کے ساتھ کہ العیاذ باللہ حضرت والا کی لڑکیوں نے شراب پلا کر ان سے نسل حاصل کی، دماغ جس کے تصور کو برداشت نہیں کرسکتا، خدا ہی جانتا ہے کہ اللہ کے ایک پیغمبر برحق پر یہ الزام ایک ایسی کتاب میں کیسے منسوب کردیا گیا ہے۔ جسے ماننے والے خدا کی کتاب مانتے تھے۔ حالانکہ قرآن میں صراحتہً یا کنایۃً کسی قسم کا کوئی ہلکا سا اشارہ بھی اس حد سے زیادہ مکروہ اور گندے بہتان کی طرف نہیں کیا گیا۔ اس کے بے بنیاد ہونے کے لیے یہی بات کافی تھی۔ لیکن بے جا پاسداری کے نشہ کا زور دیکھیے کہ ہمارا مظلوم مولوی اس ظالمانہ توجیہ کے پیش کرنے میں کسی قسم کی جھجھک نہیں محسوس کرتا، اسی تہمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”درصورت فرض صحت قصہ کے جو سب نسخوں مختلفہ تورات میں پایا جاوے، ہوسکتا ہے کہ شراب ان کے ہاں جائز ہو اور حالت نشہ میں اجراء کلمہ کفر لازم نہیں آتا جو سخت کبیرہ ہے۔ پس جن کے ہاں شراب جائز ہو ان سے حالتِ نشہ میں جو فعل صادر ہو زنا نہ ہوا“ (۷۰)

آگے لکھتے ہیں:

”پس اس میں نبی پر قصور عائد نہیں ہوتا، قصور کا دارومدار عقل پر ہے اور

Marfat.com

کتاب میں (یعنی تورات میں) تصریح ہے کہ لوط نے نہ پہچانا، پس قصور اس میں لڑکیوں کا ہے، نہ کہ لوط کا''

حقیقت یہ ہے کہ اس توجیہ کو پڑھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ غلط سے غلط بات اور بد سے بدترین فعل تک کی توجیہ پر آدمی کا منطقی دماغ اگر آمادہ ہو جائے تو کوئی نہ کوئی صورت توجیہ کی نکال ہی لیتا ہے۔ حالانکہ قصہ لوط میں التزاماً قرآن اس جزء کو جو حذف کرتا چلا گیا تھا (ی)، اسی سے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ آسمانی کتابوں کی تصحیح کے لیے آخری ایڈیشن کی شکل میں جو کتاب قدرت کی طرف سے بنی آدم کو ملی ہے اس نے موجودہ تورات کے اس اضافہ کو مسترد کر دیا ہے۔

اور اب اس کتاب کے ان ہی دونوں محوری مسئلوں یعنی گذشتہ آسمانی و مذہبی نوشتوں میں آنحضرت ﷺ کی پیشینگوئیاں جو پائی جاتی ہیں، اور دنیا کے مستقبل کی تاریخ سے یاجوج و ماجوج کی قرآنی اصطلاحوں کا جو تعلق ہے، ان ہی دو باتوں کے متعلق ہم اپنے مظلوم مولوی کے خیالات و احساسات کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

پہلی بات یعنی آنحضرت ﷺ کے متعلق گذشتہ کتابوں میں جو تذکرے ملتے ہیں، عرض کر چکا ہوں کہ اس دعویٰ کا اعلان خود قرآن میں کیا گیا ہے، ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ''النبی الامی کے ذکر کو وہ اپنے ہاں تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں'' (۳۷) اسی لیے ابتدائے اسلام سے اہلِ علم کا ایک طبقہ اس قرآنی دعویٰ کے ثبوت میں تورات و انجیل میں آنحضرت ﷺ کی پیشینگوئی کو ڈھونڈھتا رہا ہے اور سچ پوچھیے تو تلاش و تحقیق کا سلسلہ اس راہ میں اب تک جاری ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو مظلوم مولوی کا یہ کوئی خاص کارنامہ نہیں ہے، البتہ چند خاص تمہیدی مقدمات کے بعد یہ کہتے ہوئے کہ ''عہدِ عتیق'' کے نام سے بائبل میں چالیس صحیفے جو انبیائے بنی اسرائیل کی طرف منسوب ہیں، ان میں سے: ''ہر ایک کتاب میں ہنوز

بہ تصریح واشارہ وکنایہ حضور ﷺ کا ذکر خیر موجود ہے''۔ (۷۲)

اوران چالیس صحیفوں ہی کی حد تک نہیں بلکہ عہد جدید کا مجموعہ جو انجیل کے نام سے موسوم ہے جن میں چھوٹی بڑی اکیس کتابیں پائی جاتی ہیں، ان میں بھی اسلام اور پیغمبر اسلام کا تذکرہ کسی نہ کسی رنگ میں آج تک موجود ہے۔ مجموعی حیثیت سے ہمارے مظلوم مولوی کا یہ دعویٰ ایک ایسا دعویٰ ہے جو شاید ان کی طرف سے پہلی دفعہ پیش کیا گیا ہے اور جیسا کہ وہی کہتے ہیں، اگر واقعہ کی یہی صورت ہے تو:

''منصف مزاج باوجود قصد حصولِ ایمان کے اس قدر پیش گوئی دیکھیے وہ مشرف باسلام بالضرور ہو'' (۷۳)

لیکن جن کتابوں کا حال یہ ہو کہ ہر جدید ایڈیشن میں ترمیم وتحریف کرنے والے ان میں مسلسل ترمیم وتحریف کے عادی ہوں، انہی کے متعلق غریب مولوی کی ہنوز کے لفظ کے ساتھ یہ توقع کہ فلاں فلاں باتیں ان میں پائی جاتی ہیں، بے جا توقع کیسا تھ اور کیا ہے۔ کنایے اور اشارے والی باتوں کو جانے دیجیے، اس قسم کی پیشینگوئیاں مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب ایک کتاب جس کا نام غزل الغزلات یا تسبیحات سلیمان بھی ہے، اسی کا ذکر کرتے ہوئے مظلوم مولوی نے لکھا ہے کہ اس کتاب کے ''درس ہشتم سے ذکر حضور ﷺ مع نام مبارک محمد وحلیہ شریف کے ساتھ ہے''۔

پھر اسی فصل کے مختلف فقروں کو نقل کرتے ہوئے آخری فقرہ درس ۱۶ کے الفاظ انہوں نے یہ درج کیے ہیں:

''اس کا منہ شیریں ہے، ہاں سراپا محمد عظیم ہے، اے یروشلم کی بیٹیو! یہ ہے مراپیارا، مراجانی''۔

اس اردو ترجمہ کے ساتھ اصل عبرانی زبان کا فقرہ جس کا مذکورہ بالا ترجمہ

اردو زبان میں کیا گیا ہے مظلوم مولوی نے اس کو بھی بایں الفاظ نقل کیا ہے یہ لکھ کر:

''چنانچہ اصل عبرانی درس ۱۶ آیہ ہے''۔

وہی نقل کرتے ہیں: ''ھکو ویکونو محمدیم''

محمد کے ساتھ یم کے حروف عبرانی عبارت میں جو پائے جاتے ہیں، اس کے متعلق وہی لکھتے ہیں: ''یم محمدیم میں گو کلمہ مفید جمعیت ہے، لیکن یہاں بے نظیر تعظیم ہے، جیسے الوہیم''

اور قرینہ یہ پیش کرتے ہیں: ''حرف ربط بعد لفظ محمدیم کے واحد ہے، پس لابد ہے کہ لفظ یم تعظیم کے لیے ہے''۔ (۷۴)

اسی طرح حضرت داؤد کی طرف زبور نامی جو کتاب بائبل کے مجموعہ میں منسوب ہے، اس کے مزبور ۹۶ کے ذکر کرتے ہوئے مظلوم مولوی نے تیسرا درس اسی مزبور کا بایں الفاظ درج کیا ہے:

''امتوں کے درمیان اس کے جلال کی، اور سارے خاندانوں کے بیچ اس کے عجائب قدرتوں کو بیان کرو کیونکہ خداوند بزرگ اور ''محمد'' ہے''۔

پھر خود لکھتے ہیں، اسی اسم گرامی ''محمد'' کا لفظی ترجمہ اردو زبان میں ''ستایش کیا گیا'' درج کر دیا گیا ہے۔

مظلوم مولوی کے زمانہ میں پھر بھی جو ترجمہ کیا گیا تھا، غنیمت تھا۔ اب تو ہم زبور میں اسی ''محمد'' کی جگہ ''نہایت ستائش کے لائق ہے'' کے الفاظ پاتے ہیں، نام یا علم کا ترجمہ کر کے حقیقت کو ظاہر ہے کہ بآسانی دبا دیا جا سکتا ہے اور یہی کرتب بائبل کے ترجموں میں پہلے بھی دکھایا گیا ہے اور آج تک دکھایا جا رہا ہے جسے دیکھ دیکھ کر بے ساختہ قرآن کی آیت: ﴿ولا تزال تطلع علی خائنة منهم﴾ (۷۵)

''اور تم ہمیشہ مطلع ہوتے رہو گے اہل کتاب کی خیانتوں پر'' کی یاد تازہ ہو

Marfat.com

جاتی ہے۔(ک)

اسی سلسلہ میں ہمارے مظلوم مولوی نے بائبل کی ان ہی کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے مولد اور ہجرت گاہ عرب کے جس قبیلہ سے آپ کا تعلق تھا، آپ کے آباؤ اجداد تک کے اسماء وصفات الغرض اسی نوعیت کے بیسیوں امور کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے، لیکن سب سے زیادہ جس چیز پر انہوں نے زور دیا ہے، وہ النبی السعتی'' کا دعویٰ ہے۔ یہ بڑا اطول طویل قصہ ہے، خلاصہ یہ ہے کہ دنیا ہی نہیں، بلکہ دنیا میں انسانی نسل کی ابتداء وانتہا کے متعلق ان کا خیال جیسا کہ خود لکھتے ہیں:

''وجود ایک لاکھ آدمیوں کا بقول شیخ محی الدین شیخ اکبر ثابت ہے''(۷۶)

اسی لیے ان کے نزدیک:

''بست لکھ سالہ سے اہل اسلام و اہل کتاب پر اعتراض نہیں ہوتا جو علم بیالوجی سے حکماء حال ظاہر کرتے ہیں''

مطلب اس کا وہی ہے جس کا ذکر شیخ اکبر نے اپنی کتاب فتوحات میں مختلف مقامات میں کیا ہے مثلاً اسی کتاب کی پہلی جلد میں ایک موقعہ پر فرماتے ہیں:

"ولم يتحقق مبدء آدم و كم له من السنين و كم بقى الى انقضاء الدنيا و فناء البشر عن ظهرها و انقلابهم الى الدارا لآخرة و ليس هذا بمذهب الراسخين من العلماء الحكماء و انما قال به شر ذمة لايعتد بقولها" (۷۷)

''آدم کی ابتداء کب سے ہوئی، آج تک نہ یہی متعین ہوا، اور نہ کوئی یہی کہہ سکتا ہے کہ کتنی مدت نسل انسانی پر گذری اور دنیا کب فنا ہوگی اور زمین کے کرے سے منتقل ہو کر نسل انسانی دوسرے عالم (یعنی عالم آخرت) میں کب منتقل ہوگی، علماء جو حکما ہیں اور علم میں جن کے قدم راسخ ہیں، ان کے

Marfat.com

نزدیک کوئی معین جواب ان سوالوں کا نہیں ہے، خاص مدت ان امور کی صرف ایک مختصر گروہ کے نزدیک ہے جن کا خیال قابل توجہ نہیں ہے''

الغرض عام نسلِ انسانی کے متعلق شیخ اکبر کے اس نظریہ کو تسلیم کرتے ہوئے مظلوم مولوی نے یہودیوں کے اس خیال کو مان لیا ہے کہ آخری آدم جسے خدا نے زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا تھا، ان کی پیدائش اس زمانہ میں ہوئی، جس کے حساب سے رسول اللہ ﷺ کا ظہور ساتویں ہزارے یا ہزار ہفتم میں ہوا۔ اس مسئلہ پر انہوں نے بائبل کے حوالوں سے بڑی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں، اور ان کا خیال ہے کہ دنوں کے متعلق دنیا کی تمام قوموں میں جو یہ حساب پایا جاتا ہے کہ بجائے کسی اور عدد کے پہلا مجموعہ دنوں کا ہفتہ مان لیا گیا ہے۔ پس بقول ان کے:

''ہفتے کے سات روز اور سات روز کی تعداد زمان آدم سے چلی آتی ہے''

اسی لیے ساری نسل انسانی میں ایام کی یہ تقسیم عمومی طور پر پھیلی ہوئی ہے، ان کا خیال ہے کہ اس کی وجہ یہی ہے:

''ساتویں ہزار میں حضور ﷺ رونق افروز اس جہاں کے ہوئے'' (۷۸)

اپنے اسی نظریہ کو بنیاد بنا کر اور اسی کے ساتھ یہود کی قومی تاریخ میں چند جوہری انقلابات جو آئے، یعنی بابل و نینوا کے فاتحوں میں جن میں بخت نصر کا نام زیادہ مشہور ہے، انہوں نے اس قوم کو تتر بتر کیا، پھر میدیا کے سلاطین نے دوبارہ فلسطین میں آباد ہونے کی آسانیاں یہود کے لیے فراہم کیں۔ اس کے بعد آدمیوں کے ہاتھوں یہود دوبارہ برباد اور تباہ ہوئے۔ یروشلم اور سلیمان کے ہیکل پر بت پرستوں کی طرف سے زیادتیاں ہوئیں۔ آخر میں رومیوں کے ہاتھوں سے ارضِ مقدس کو نکال کر مسلمانوں نے پھر اس کے احترام و تقدس کو زندہ کیا۔ ان تاریخی واقعات کی روشنی میں بائبل کے قدیم و جدید صحیفوں کے معموں کو سلجھانے کی

Marfat.com

کوشش کی ہے جس سے ضمناً النبی الامی کے زمانے کی پیشینگوئیاں بھی مستنبط ہوئی ہیں۔ ان کی تفسیر کے مقدمہ کا یہ حصہ مستحق توجہ ہے، خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو بائبل کے ساتھ ساتھ یہود کی تاریخ سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں، جہاں تک میرا خیال ہے ''مظلوم مولوی کی یابس باتوں کے ساتھ ساتھ ان کو بعض رطب اور مفید چیزیں بھی ہاتھ آئیں گی۔

کچھ بھی ہو، بائبل میں آنحضرت ﷺ کی پیشینگوئیوں کا مسئلہ بذاتِ خود ان کی کتاب کا کوئی خصوصی مسئلہ نہیں ہے، پہلوں نے بھی اس پر بہت کچھ لکھا ہے، اور پچھلوں نے بھی اس پر کام کیا ہے، لیکن انہی پیشینگوئیوں کے سلسلہ میں جو خاص چیز ان کی کتاب میں پائی جاتی ہے، گو کبھی کبھی بطور گرمی بزم لوگ اس کا بھی چرچا کرتے رہتے ہیں، جہاں تک میرا خیال ہے عوام تک اس قصے کے پہنچانے میں دوسروں کے ساتھ زیادہ دخل ہمارے مظلوم ہی کی کتاب کو ہے۔ لیکن افسوس ہے، مسئلہ جس توجہ اور اہمیت کا مستحق تھا اس سے وہ پہلے بھی محروم رہا، اور آج تک اس کی محرومی کا حال یہی ہے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ یوں تو بطور رخانہ پری کے مظلوم مولوی نے یہی دعویٰ کردیا ہے کہ دنیا کی تمام قوموں کی مذہبی کتابوں اور نوشتوں میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر اس وقت تک پایا جاتا ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے مصر، یونان، روما، ایران وغیرہ قدیم ممالک کی قوموں کا بھی نام لیا ہے، لیکن انصاف کی بات ہے کہ بجز دوراز کار اشاروں کے کوئی خاص چیز ان کو نہیں مل سکی ہے۔

ایرانیوں کے متعلق بھی ساسانیوں کی طرف منسوبہ بعض تحریروں کا تذکرہ انہوں نے کیا ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ان تحریروں کی تاریخی وثاقت بہت زیادہ مشتبہ ہے۔ بلکہ ساسان کی طرف ان کا انتساب بھی اس کو مشکوک و مشتبہ کر

Marfat.com

دینے کے لیے کافی ہے۔

البتہ اسی سلسلہ میں ہندوستان کے قدیم نوشتوں کا حوالہ دیتے ہوئے ہمارے مظلوم مولوی نے ایک سے زیادہ شہادتوں کو اس ملک کی علمی و مذہبی زبان سنسکرت ہی کے الفاظ میں جو درج کیا ہے اور ان ہی کے ساتھ جن باتوں کا تذکرہ ہمیں ان کی کتاب میں ملتا ہے، کچھ تو اس لیے کہ ان کا تعلق ہمارے خاص وطن سے ہے اور اس لیے بھی کہ ان کی تحقیق وتفتیش کے ساز و سامان کی کمی نہیں ہے، ان ہی خصوصیتوں نے ان کو کافی دلچسپ بنا دیا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، سب کا نقل کرنا اور دہرانا تو دشوار ہے۔ تفصیل کے لیے تو مناسب ہوگا کہ ان کی اصل کتاب کا مطالعہ کیا جائے لیکن ان کے لیے جو سنسکرت زبان اور ان کی کتابوں سے تعلق رکھتے ہیں، میں ان کے کلام کا خلاصہ درج کرتا ہوں۔

غرض یہ ہے کہ جاننے والے بتائیں کہ آخر جن چیزوں کا تذکرہ ہمارے مظلوم مولوی نے کیا ہے ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟ خود فقیر نہ سنسکرت ہی سے واقف ہے اور نہ میری رائے اس باب میں نفیاً یا اثباتاً قابل قبول ہوسکتی ہے۔ حیثیت میری صرف ناقل کی ہے، چاہتا ہوں کہ یہ بحث علمی وتحقیقی دائرے میں لائی جائے ، فالعھدۃ علی الراوی کہتے ہوئے اس داستان کو اہل علم کے حلقہ میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

ہند کے قدیم نوشتوں میں رسول اللہ ﷺ کی پیشینگوئیاں

اس سلسلہ میں مولوی صاحب نے تین کتابوں کا نام لیا ہے جن میں پہلی کتاب تو وید ہی کا ایک حصہ ہے۔ ان کا بیان ہے کہ وید کی چوتھی کتاب جو اتھرون وید کے نام سے مشہور ہے اور اب تک اتھرون وید کا کامل نسخہ طبع ہوکر شائع نہیں ہوا ہے۔ لیکن اس کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں ملتے ہیں۔ وہی لکھتے ہیں کہ

Marfat.com

اتھروَن وید کے اسی غیر مطبوعہ حصہ میں ایک عبارت پائی جاتی ہے۔ پھر انہوں نے سنسکرت کے لغت کی دو مشہور کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ نام اتھرون وید کے اس حصہ کا ''اللہ سکتہ'' ہے ان کے اپنے الفاظ میں:

''واچپتی لغت سنسکرت کو ''ال'' کے لفظ کے ذیل میں اللہ سکتہ کو اتھرون وید کے سکتہ مشہور کر کے لکھا ہے اور لغت سنسکرت مسمی کلپ ورم مصنفہ راجہ رادھا کانت دیو بہادر میں بھی اللہ سکتہ لکھی ہے'' (۹۷)

مطلب یہی ہوا کہ اتھرون وید کی یہ عبارت یا فقروں کا مجموعہ جو اللہ سکتہ کے نام سے موسوم و مشہور ہے اس کا ذکر سنسکرت کی لغت کی دو مطبوعہ کتابوں میں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ ایسا ہے جس کی تحقیق و تنقیح میں چاہیے تو یہی کہ کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہ آئے، سنسکرت کے عام کتب خانوں میں لغت کی یہ دونوں مطبوعہ کتابیں بآسانی مل سکتی ہیں، جن میں دیکھا جا سکتا ہے اور پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ مظلوم مولوی کی اطلاع کس حد تک واقعہ کے مطابق ہے۔

بہر حال مولوی صاحب نے راجہ رادھا کانت بہادر کی کتاب کلپ ورم کا حوالہ دیتے ہوئے خطِ نسخ (عربی خط) سنسکرت زبان کی اس عبارت کو درج کیا ہے۔ ان کے مقدمہ کے بعض نسخوں میں یہی عبارت سنسکرت حروف میں بھی نقل کی گئی ہے۔ پوری عبارت کا معائنہ تو ان کی کتاب ہی میں کرنا چاہیے یہ دس شعروں کی ایک طویل نظم ہے، اردو ترجمہ بھی ہر شعر کے نیچے درج کرتے چلے گئے ہیں۔ جن میں خالقِ کائنات کی تعریف بڑے بلیغ پیرائے میں کی گئی ہے۔ بظاہر اس نظم کے ہر شعر میں لام کے حروف کی کثرت نظر آتی ہے۔ اسی کے آخری شعر میں حروف کا ایک مجموعہ ہے۔ اصل سنسکرت سے، عرض کر چکا ہوں میں قطعاً ناآشنا ہوں لیکن خط نسخ میں وہی حروف جیسا کہ مولوی صاحب نے نقل کیا ہے، ان کی صورت یہ ہے۔

Marfat.com

''رُسُلَه مُحَمَّد رَه کَنرَشِنیً''

اعراب یعنی ان حروف پر زیر زبر پیش وغیرہ بھی مولوی صاحب کے لگائے ہوئے ہیں اسی کے نیچے انہوں نے اردو ترجمہ یہ درج کیا ہے:

''رسول اللہ محمد زور آور کا نام ہے جن کے برابر کا کون ہے''۔

مولوی صاحب نے راجہ رادھا کانت بہادر کی کتاب سے اسی کو نقل کرتے ہوئے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ اس کتاب میں اس کی تصریح بھی کی گئی ہے کہ:

''یہ سکتہ اتھرون وید ہے''

اور یہ بھی لکھا ہے کہ کلپ ورم کے مصنف نے اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے جس سے معلوم ہو کہ ان کے نزدیک یہ جعلی اور بنائی ہوئی عبارت ہے۔ اگرچہ اعتراض نہ کرنے کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ کلپ ورم کے مصنف کو اس عبارت کے غیر جعلی ہونے کا یقین تھا۔ لیکن عام حالات کے لحاظ سے چاہیے تھا کہ علمائے سنسکرت کے نزدیک اگر یہ عبارت جعلی اور مصنوعی سمجھی جاتی تھی، تو اس کی تصریح کر دیتے۔

خیر یہ تو پہلی کتاب اتھرون وید کی عبارت کی داستان تھی۔ دوسری کتاب جس کا ذکر اسی سلسلہ میں مولوی صاحب نے کیا ہے وہ ''اپنشد'' کے سلسلہ کی ایک کتاب ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، وید سے کلامی اور صوفیانہ عقائد و خیالات جو پیدا کیے گئے ہیں ان ہی کی تعبیر ''اپنشد'' سے کی جاتی ہے۔ مولوی صاحب نے یہی لکھا ہے کہ عموماً اپنشد کی تعداد باون (۵۲) بتائی جاتی ہے اور بعض ایک سو آٹھ (۱۰۸) بھی کہتے ہیں۔ پھر یہ لکھ کر کہ داراشکوہ نے فارسی زبان میں پچاس اپنشدوں کا ترجمہ کرایا تھا، ان اپنشدوں میں تو ان کی یہ عبارت نہیں ملی اور نہ اس اپنشد ہی کا نام ملا، جس میں لوگوں نے آنحضرت ﷺ کے اسمِ مبارک کی نشاندہی کی ہے۔ ان کا بیان

Marfat.com

ہے کہ ''الوپ اپنشد'' کے نام سے یہ اپنشد موسوم ہے اور اس کا اقرار کرتے ہوئے پروفیسر میکس مولر نے اپنشدوں کی جو فہرست شائع کی ہے اس میں بھی ''الوپ اپنشد'' کا نام شریک نہیں ہے لیکن اسی کے ساتھ وہی لکھتے ہیں:

''بخلاف فرانس کی فہرست کے کہ اس میں لکھا ہے''(۸۰)

یعنی اپنشدوں کے ناموں کی جو فہرست فرانسیسی زبان میں شائع ہوئی ہے، اس میں ''الوپ اپنشد'' کا نام بھی پایا جاتا ہے، ان تفصیلات کا اقتضاء ہے کہ اپنی حد تک مولوی صاحب نے تحقیق وتفتیش میں پوری کوشش کی ہے۔ داراشکوہ کے ترجمہ کرائے ہوئے اپنشدوں کا بھی انہوں نے مطالعہ کیا۔ میکس مولر نے سنسکرت زبان کی کتابوں کی جو فہرست تیار کی تھی اس میں ڈھونڈھا اور علمائے فرانس کی شائع کردہ فہرست کا بھی معائنہ کیا تھا۔ اپنی ان کوششوں کے بعد اسی ''اپنشد'' سے جس کا نام وہ الوپ اپنشد بتاتے ہیں، اسی سے سنسکرت زبان کی ایک طویل عبارت خطِ نسخ میں مولوی صاحب نے نقل کی ہے جس کی آخری سطر میں: ''الـو رسول محمد رہ کنبر شـم لـی'' کے حروف بھی ان کی نقل کردہ عبارت میں پائے جاتے ہیں، انہوں نے اتھرین وید والی عبارت کا تو ترجمہ بھی اردو میں کر دیا ہے اور ہر حرف پر اعراب بھی لگے ہوئے ہیں۔ لیکن جس عبارت کو ''الوپ اپنشد'' کی طرف انہوں نے منسوب کیا ہے نہ اس کا ترجمہ ہی کیا اور نہ ان کے حروف پر زیر وزبر وپیش وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ تاہم آخری سطر میں خط نسخ کی مذکورۂ بالا حروف کی شکل میں وہی الفاظ ہیں جو آپ کے سامنے پیش کر دیے گئے۔ واللہ اعلم بالصواب اُس فقرہ کا صحیح ترجمہ کیا ہو سکتا ہے۔ اتنی بات تو یقینی ہے کہ خط نسخ میں حروف کی جن شکلوں کو ہم یہاں پا رہے ہیں، اصل سنسکرت زبان کے حروف کی شکلیں بھی یہی ہوں یہ قطعاً غیر ضروری ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں سنسکرت زبان میں عربی زبان کے حلقی حروف مثلاً ح ع وغیرہ

Marfat.com

شاید نہیں پائے جاتے۔ ایسی صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ مثلاً محمد کے تلفظ کی شکل سنسکرت زبان میں بھی یہی ہوگی؟ اور اسی قسم کے اشتباہات دوسرے حروف کے متعلق بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

کچھ بھی ہو، اصل واقعہ کیا ہے اس کا جواب تو اہل تحقیق ہی دے سکتے ہیں لیکن اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے مظلوم مولوی نے ان عبارتوں کو صرف سنی سنائی زبانی روایتوں ہی کی بنیاد پر نقل نہیں کر دیا ہے بلکہ اپنی بساط کے مطابق جتنی کاوش و کوشش سے وہ کام لے سکتے تھے، اس میں کوتاہی نہیں کی ہے۔ سنسکرت زبان کی کتابوں کی جو فہرست انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں ان کے زمانے میں شائع ہو چکی تھی اور بھی دوسرے طریقوں سے وہ جو کچھ پتہ چلا سکتے تھے سب ہی سے کام لیا ہے اب یہ آئندہ نسلوں کا کام ہے کہ تلاش و جستجو کے سلسلہ کو جاری رکھیں اور آخری فیصلہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ ان کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا فقروں کے متعلق یہ شبہہ بھی کیا جاتا تھا کہ مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں یہ جعلی فقرے بنا کر ان کتابوں میں شریک کر دیئے گئے ہیں، واللہ اعلم کس ذریعہ سے یہ خبر ان تک پہنچی تھی:

''راجہ ٹوڈرمل نے شیخ جیون قوم برہمن کو اللہ سکتہ پڑھتے سنا تو تعصب مذہبی سے اودے پور کے راجہ کو لکھا کہ ایک شخص ایسی عبارت وید سے پڑھتا ہے جس میں لام بکثرت ہیں، اس کا دفعیہ لازم ہے'' (۸۱)

مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ راجہ ٹوڈرمل کی اسی تحریک کو بنیاد بنا کر یہ خیال پھیلا دیا گیا ہے کہ یہ جعلی عبارتیں اکبر کے وقت بنالی گئی ہیں۔

جواب میں سکھوں کے بابا گرونانک شاہ کا حوالہ دیتے ہوئے مولوی صاحب نے دعویٰ کیا ہے:

Marfat.com

''اللہ سکتہ کی تسلیم نانک کو بھی تھی جو شاہان ترک دہلی کے اوائل میں قبل از زمانہ اکبر جلال الدین سے زمانہ بابر میں ہوا ہے'' (۸۲)

لیکن افسوس ہے کہ گرونانک کے نہ اس کلام ہی کا ذکر مولوی صاحب نے کیا اور نہ اس کا پتہ دیا ہے کہ گرونانک کے اس قول کو انہوں نے کس کتاب میں پایا تھا۔

یہ اور اس کے سوا دوسری بہت سی باتیں ہیں جن کی وجہ سے مظلوم مولوی کا دعویٰ تشنہ ٔ تحقیق ہی نہیں کہا جا سکتا کہ تحقیق سے کیا ثابت ہو، لیکن اتنی بات تو بہر حال سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمانوں پر ہندوؤں کے متعلق یہ الزام جو لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے ان کو ادنیٰ درجے کے وحشی بت پرستوں سے زیادہ اہمیت کبھی نہیں دی، کم از کم اس الزام کے بے بنیاد ہونے کے دوسرے اسباب و وجود کے ساتھ ایک بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کی مذہبی اور دینی کتابوں میں اپنے پیغمبر حق کے ذکر کو وہ تلاش کرتے رہے۔ اسی طرح تلاش کرتے رہے، جیسے اہل کتاب یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں بھی آنحضرت ﷺ کے تذکرہ کو ڈھونڈتے رہے ہیں، جس کا مآل اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہندو دھرم اور برہمنی مت کی بھی ان کی نگاہوں میں تقریباً وہی اہمیت تھی جو اہمیت اہل کتاب کے مذہب و ادیان اور ان کی دینی کتابوں کی ہے اور آسمانی صداقتوں کی تلاش جیسے اہل کتاب کی کتابوں میں وہ کرتے رہے ہیں، ہندوستان پہنچ کر یہی طرز عمل ہندوؤں کی دینی کتابوں کے ساتھ بھی انہوں نے اختیار کیا۔

پس اصل مسئلہ یعنی ہندوؤں کے قدیم نوشتوں میں آنحضرت ﷺ کی پیشینگوئیاں خواہ ملیں یا نہ ملیں، اور جن عبارتوں کی نشان دہی مذکورہ بالا کتابوں میں کی گئی ہے، ان میں وہ عبارتیں موجود ہوں یا موجود نہ ہوں یا موجود ہونے کے بعد یہ ثابت بھی ہو جائے کہ یہ الحاقی عبارتیں ہیں، ان تمام امور سے قطع نظر بھی کر لیا

Marfat.com

جائے، پھر بھی یہی نتیجہ کیا کم قیمتی ہے کہ مسلمانوں کی طرف منسوب کرنے والوں نے ہندو مذہب کے متعلق جن بے جا اور بے بنیاد بدگمانیوں کو منسوب کر دیا ہے، ان کا تو ازالہ ہو جاتا ہے۔ اتنی بات تو بہر حال ثابت ہو جاتی ہے کہ دنیا کے ادیان و مذاہب کے ساتھ توہین وتحقیر کا تعلق مسلمانوں نے کبھی نہیں رکھا، بلکہ جس احترام واکرام کے جو مذاہب مستحق تھے، اپنے طرز عمل سے ہر ایک کے جائز استحقاق کا وہ اعتراف ہی کرتے رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہندو مذہب کی کتابوں میں اپنے پیغمبر کی پیشینگوئیوں کا ان کے دل میں کیا خطرہ بھی گذر سکتا تھا۔

بہرکیف ان دو کتابوں کے سوا جن میں ایک کا تعلق وید سے اور دوسرے کا اپنشد سے ہے، مظلوم مولوی نے اس سلسلہ میں ہندو دھرم کی جس تیسری کتاب کا ذکر کیا ہے اس کا نام ہندوؤں کے ہاں وہی کہتے ہیں کہ ''کلکی پران'' ہے۔

یہ بتاتے ہوئے کہ ''ویدا'' اور ''اپنشدا'' کے بعد ہندوؤں میں خاص قسم کی کتابوں کے لکھنے کا رواج ہوا، جن کی عام تعبیر ''پران'' کے لفظ سے کی جاتی ہے، پھر پرانوں کے سلسلہ کی کتابوں کی تعداد بتاتے ہوئے مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''مخفی نہ رہے کہ ہنود کے کتب میں اٹھارہ پران جو زمانہ مختلف میں لکھے گئے ہیں''

ان ہی اٹھارہ پرانوں میں ان کا بیان ہے کہ ایک پران ہندوؤں میں ''کلکی پران'' کے نام سے موسوم ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''کلکی اوتار'' کا تذکرہ ملتا ہے، افسوس ہے کہ جیسے انہوں نے اتھروَن وید اور الوپ اپنشد سے اصل سنسکرت زبان کی عبارت خطِ نسخ میں نقل کی ہے، کلکی پران کی عبارتوں کے ساتھ اپنے اس طرزِ عمل کو انہوں نے جاری نہیں رکھا بلکہ نمبروار، اس کتاب کے فقرے اردو زبان میں ترجمہ کر کے درج کرتے چلے گئے ہیں۔ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، اس کا خلاصہ

Marfat.com

بھی ناظرین کے سامنے پیش کردیتا ہوں۔ ان کا بیان ہے کہ اسی کتاب ''کلکی پران''
میں لکھا ہے کہ:

''کلکی اوتار کلک و بت پرستی کو دور کریں گے'' (۸۳)

گویا ''کلکی اوتار'' کو کلکی کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ بھی ہے کہ دنیا
سے بت پرستی کو وہ مٹا دیں گے۔ آگے وہی لکھتے ہیں کہ اس کتاب میں ''کلکی اوتار''
کی پیدائش کا زائچہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے:

''بارہویں چاند سدی ماہ بیساکھ میں پچھتر ہرشن بالب نام کرن میں کلکی اوتار
پیدا ہوں گے''۔

مولوی صاحب کا بیان ہے کہ کلکی پران میں سنسکرت زبان کا یہ شعر جو پایا
جاتا ہے۔

دواوشی شام شکل پک شیشی مامن مادھوم ہست وہی ہرشن جوکی کرنی بال باہوے

انہوں نے سنسکرت کے حروف کو خط نستعلیق میں لکھا ہے کہ اسی کی بعینہ نقل
میں نے اتار دی ہے۔ نہیں کہہ سکتا کہ کس حد تک حروف اپنی شکل کے مطابق لکھے
جا سکتے ہیں۔ بہر حال مولوی صاحب کا بیان ہے کہ زائچہ کی اردو عبارت کلکی پران
کے اسی شعر کا ترجمہ اور خلاصہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

ان امور کے ذکر کے بعد مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ:

''حضور ﷺ پیر کے روز بارہویں چاند سدی ماہ بیساکھ میں دو گھڑی دن
چڑھے رونق افروز ہوئے'' (۸۴)

پھر ''کلکی اوتار'' کا اپنے خاص طریقہ سے زائچہ کا جو نقشہ برہمنوں نے کھینچا
ہے اسی کی نقل بایں شکل مولوی صاحب نے درج کی ہے۔

Marfat.com

زہرہ حوت میں | عطارد و مشتری ثور میں
دلو | آفتاب حمل میں | راس جوزاء میں
مریخ جدی میں | : | قمر سرطان میں
ذنب قوس میں | زحل میزان میں | اسد
عقرب | سنبلہ

اور یہ لکھتے ہوئے کہ:

''اور زائچہ کتب ہنود میں جو لکھا ہے ''مطابق زائچہ ابو معشر (فلکی) کے ہے''(۸۵)

جس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے مشہور ماہر فلکیات و نجوم ابو معشر نے رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے وقت جو جو زائچہ بنایا ہے ''کلکی اوتار'' کی ولادت کا زائچہ بھی ہندوستان کے جوتشیوں نے وہی تیار کیا تھا، مولوی صاحب نے آخر میں یہ بھی لکھ دیا ہے:

''کسی صاحب کو اگر تردد واقع ہو، وہ اس وقت حساب کر لیں کہ آفتاب و ماہتاب حساب کے لیے ہیں، ان کا حساب غلط نہیں ہوتا''

ولادت کے وقت اس زائچہ کے سوا مولوی صاحب نے اسی کتاب ''کلکی پران'' کا حوالہ دیتے ہوئے بیان کیا ہے کہ علاوہ وحدت زائچہ کے ''کلکی اوتار'' کے متعلق حسب ذیل خصوصیتیں اس کتاب میں بیان کی گی ہیں مثلاً ''کلکی پران'' میں لکھا ہے:

''کلکی اوتار کے والد کا نام وشنویس ہوگا''

مولوی صاحب نے اس کو درج کر کے لکھا ہے:

''وشنو اللہ کو دیس عبد (بندہ) کو کہتے ہیں اور عبد اللہ حضور ﷺ کے والد کا نام تھا''۔

اسی طرح وہی لکھتے ہیں کی کلکی اوتار کی ''والدہ ماجدہ کا نام سومتی لکھا ہے''۔

Marfat.com

سومتی کے لفظ کا ترجمہ مولوی صاحب نے سنسکرت کے لغت کی کتاب کے حوالہ سے ''امانت دار'' بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ''والدہ ماجدہ حضور ﷺ کا نام آمنہ ہے''۔

آگے وہی راوی ہیں کہ کلکی اوتار کے متعلق کلکی پران میں بیان کیا گیا ہے کہ ''پہلے پہاڑ کے غار میں تپشیا یعنی عبادت کریں گے''۔

پھر خود لکھتے ہیں:

چنانچہ غارِ حرا میں رسول اللہ ﷺ نے عبادت کی۔

اسی کتاب کلکی پران میں ان ہی کے بیان کے مطابق یہ اطلاع بھی دی گئی ہے کہ: ''وہ (کلکی اوتار) شمالی پہاڑوں میں ہجرت کریں گے''

مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ مدینہ منورہ کا کوہستان جو مکہ معظمہ سے بجانب شمال واقع ہے حضور انور ﷺ نے ہجرت بھی فرمائی ان ہی کا بیان ہے کہ اسی کتاب میں یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ کلکی اوتار ''پہاڑ کے کھوہ میں پرشرام سے تعلیم پاویں گے''۔

پرش رام کی تشریح کرتے ہوئے مولوی صاحب نے لکھا ہے:

''پرش بمعنی روح رام بمعنی خدا یعنی روح اللہ جبرئیل'' اس سے مراد ہے۔

یہ بھی اسی کتاب کلکی پران میں ہے کہ:

''سواری کلکی اوتار کی ایسی ہوگی کہ جہاں پر اس کی نظر پڑے وہیں اس کا قدم پڑے''۔

مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ یہی صفت براق کی حدیث کی عام کتابوں میں بیان کی گئی ہے، ایک خصوصیت کلکی اوتار کی کلکی پران میں یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ ''سارے اوتاروں کو اچھا کہیں گے''۔

Marfat.com

آنحضرت ﷺ کی خصوصیت ﴿مصدقا لما معکم﴾ ﴿مصدقالما بین یدیہ﴾ یعنی تمام انبیاء ورسل کی تصدیق واحترام کا اعلان خود فرمایا اور اپنی امت کو بھی سکھایا کہ رسولوں میں فرق نہ کریں اور قرآن پر ایمان لانے کے ساتھ ان ساری کتابوں کو مانیں جو اس سے پہلے نازل ہوئیں، ان ہی باتوں کو پیش کر کے اس کا مصداق بھی آپ ہی کی ذاتِ مبارک کو ٹھہرایا ہے۔

میں اس سے ناواقف ہوں کہ ''کلکی پران'' اس وقت تک چھپ کر شائع بھی ہوئی ہے یا نہیں، لیکن قلمی نسخے جہاں تک میں نے سنا ہے سنسکرت کے بعض پرانے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ جاننے والوں سے چاہتا ہوں کہ جن امور کی نشان دہی ہمارے مظلوم مولوی نے کی ہے، بتائیں کہ واقعی اس کتاب میں وہ ملتے بھی ہیں یا نہیں اور ملتے ہیں تو جن الفاظ کی لغوی تشریح مولوی صاحب نے کی ہے، ان کی یہ تشریح کس حد تک صحیح ہے۔

بہرحال یوں تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی جو تصدیق کی ہے اور اس پر ایمان لانے کی دولت سے جو وہ سرفراز ہیں، اس میں اس قسم کی پیشینگوئیوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ گونہ اس نوعیت کی چیزوں سے ان کی ایمانی طمانیت ومسرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم نہ ماننے والوں کو بھی مجبور نہیں کر سکتے، خصوصاً جنہوں نے طے ہی کر لیا ہے کہ جو سب کا، ساری بنی آدم کا آخری رسول ہے، اس کو مسلمان نامی قوم ہی کے رسول قرار دینے پر اصرار کرتے رہیں گے۔ لیکن علمی حیثیت سے غالباً کوئی حرج نہیں ہے کہ اس قسم کی مبہم مبہم باتیں قوموں میں جو مشہور ہیں، یک سوئی کے ساتھ تحقیقی فیصلہ کر کے عوام کو اس سے آگاہ کر دیا جائے، میرا مقصد مظلوم مولوی کی کتاب کے اس حصہ کے نقل کرنے سے یہی ہے۔ واللہ ولی الامر والتوفیق

Marfat.com

حواشی

الف۔ مثلاً ابوالفضل کی آئین اکبری ہی میں ''می فرمودند'' کے ابتدائی الفاظ سے اکبر کی طرف جو فقرے منسوب کیے گئے ہیں، یا مجدد الف ثانی کے مکاتیب طیبہ میں منتشر طور پر ان کا ذکر پایا جاتا ہے ان سے ملا عبدالقادر کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔

ب۔ ملاحظہ ہو تاریخ فلسفہ، (مترجم)، و یبر، الفرڈ، مترجم، خلیفہ عبدالحکیم، حیدرآباد دکن، جامعہ عثمانیہ، ۱۹۲۸ء

ج۔ نبوت کبریٰ کے ہزار سال بعد دوسرے ہزارے یعنی الف ثانی کے متعلق ارباب کشف والہام کے رمزی اشارے قوموں میں منتقل ہوتے چلے آتے تھے، جن کا ذکر اس مضمون میں انشاءاللہ آئے گا۔ اکبر کے کانوں تک بھی ان کی بھنک پہنچی تھی جن کی وجہ سے بعض غلط فہمیوں کا وہ بھی شکار ہو گیا تھا۔ الفی سکہ الفی تاریخ وغیرہ جیسی چیزوں کا ذکر مورخین اکبر کے حالات میں جو کرتے ہیں، ان کا تعلق انہی غلط فہمیوں سے تھا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تجدید کو الف ثانی کی طرف منسوب کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ خاکسار نے اپنے بعض مقالات میں اس پر بحث کی ہے۔

د۔ خافی خان نے گودہ بندر کے پرتگالی گورنر جنرل کی یہ درخواست اپنی تاریخ میں نقل کی ہے۔ قصہ تو طویل ہے، حاصل یہ ہے کہ بمبئی کے قریب دمن بسی نامی جزیرے بہادر شاہ گجراتی سے فرنگیوں نے مانگ لیا تھا۔ سمندر کے کنارے چالیس پچاس میل طولاً اور میل دو میل عرضاً پہاڑوں کے دامن فرنگیوں کے قبضے میں تھے، جہاں انہوں نے قلعے بھی بنائے تھے اور ناریل اور چھالیا اور اناس کے باغ لگا کر آمدنی حاصل کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے اپنے چند دیہات بھی آباد کر لیے اور مغل علاقہ کے باشندوں کو ستانے لگے۔ یہ عالمگیر کا زمانہ تھا ملک کے فوجدار معتبر خان نائتی کو حکم ہوا کہ ان پہاڑی علاقوں سے فرنگیوں کو نکال دیا جائے۔ معتبر خان نے فرنگی گڑھیوں پر حملہ کر دیا۔ خافی خان نے لکھا ہے کہ مغل فوجدار کے مقابلہ میں فرنگی اس لیے ٹھہر نہ سکے کہ سوائے بندوق و شمشیر کے بصورت داران کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ ان بھگوڑے فرنگیوں نے گودہ کے گورنر کو اپنے حال زار سے مطلع کیا تب وہی درخواست عالمگیر کی خدمت میں

پیش ہوئی۔ بادشاہ نے معتبر خان کو حکم دیا کہ محاصرہ اٹھالیا جائے۔ عجیب بات ہے کہ بمبئی والے انہی فرنگیوں نے شاہی جہاز گنج سوائی نامی پر سمندر میں حملہ کر دیا۔ جب حاجیوں کو لے کر سورت سے وعرب جارہا تھا۔ جس کے بعد طویل قصے پیش آئے۔ خافی خان خود بھی گویا گرفتار ہو کر قلعہ بمبئی میں انگریزوں کے افسر اعلیٰ سے ملا تھا۔ انگریزوں کی شان وشوکت کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے پڑھنے کے قابل ہے۔ لکھا ہے سب سے پہلے تیرہ چودہ سال سبزہ آغاز انگریز سپاہیوں کا پرا تھا۔ جن کے کندھوں پر بندوقیں تھیں اور زرق برق لباس سے آراستہ تھے۔ پھر داڑھی رکھنے والوں کی صفوں سے گذرا آخر میں انگریز افسروں کو دیکھا جو کلاہ پوش تھے ان کی (ہیٹ) پر موتیوں کا گچھا تھا۔ اس علاقے میں وہ اپنا سکہ چلاتے تھے۔ خافی خان نے آخر میں لکھا ہے کہ انگریز بظاہر تاجروں کی شکل میں تھے لیکن اصلی مقصد ان کا زون وتاراج نمودن راہ کعبۃ اللہ است سال میں دو سال میں جب موقع ملتا ہے تو جاسوسوں سے پتہ چلانے کے بعد جس جہاز میں زیادہ مال ملنے کی امید ہوتی ہے یہ حملہ کر کے اس کو لوٹ لیتے ہیں اور یہی ان کا اصلی پیشہ ہے۔

(منتخب اللباب ،۲ ر ۴۲۷ ، خافی خان ، کلکتہ، 1925, Badtistmission Press.

ھ۔ روسی علوم وادب کا ذکر انیسویں صدی میں انگریزی کے مقابلہ میں ممکن ہے، موجب حیرت ہو لیکن مولوی صاحب نے خاص نظریہ کے تحت اس کا تذکرہ کیا ہے۔ آج بیسویں صدی میں وہی نظریہ مشاہد ہو چکا ہے، اس خاص نظریہ کا ذکر آگے آئے گا۔

و۔ اپنی ان اصلاحوں کی تشریح انہوں نے یہ کی ہے کہ دار سولی کو کہتے ہیں، عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ دار پر چڑھ کر مسیح ان کے گناہوں کا کفارہ بن گئے۔ اس لیے میں عیسائیوں کو داریہ کہتا ہوں اور ناریہ سے وہ ساری قومیں مراد ہیں جو آخرت میں نار (آگ) کی مستحق ہوں گی، لکھا ہے کہ آریہ ایک نیا فرقہ ہمارے زمانہ میں پیدا ہوا ہے، جو دیانند جی کے پیرو ہیں۔

ز۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانی فلسفہ میں عناصر اربعہ (آب وآتش خاک وباد) کو بجائے مرکب کے بسیط جو مانا جاتا تھا، وہ اس کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اور عناصر کی ترکیب کا جو جدید نظریہ ہے اسی کے قائل ہو گئے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ شیخ اکبر محی الدین بن عربیؒ نے فتوحات میں ایک موقع پر لکھا ہے کہ ہوا میں پانی کا لطیف حصہ اگر شریک نہ ہو تو ہوا جل اٹھے گی،

Marfat.com

ان کے اپنے عربی الفاظ ہیں کہ ان الھوء ا ان لم یکن فیه مانیة احرق (فتوحات ۳۲،۵ ابن عربی محی الدین ابوبکر مصر مطبع میریہ، س ن) بظاہر اس سے بھی جدید نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

ح۔ حضرت آدم کے اسی الشجرہ کے متعلق قرآن ہی میں دوسری جگہ یہ بات ملتی ہے کہ اس کو الخلد کے لفظ کی طرف شیطان نے منسوب اور مضاف کیا تھا۔ الخلد کے معنی لغت میں دوام اور ہمیشگی کے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن ہی کی سورہ الھمزہ میں فرمایا گیا ہے کہ یحسب ان مالہ اخلدہ (سرمایہ کے متعلق خیال کرتا ہے کہ وہ خلود یعنی دوام و ہمیشگی بخشتا ہے) یوں بھی عام انسانی فطرت میں مال یا سرمایہ کے متعلق خلود بخشی کا خیال معلوم ہوتا ہے کہ راسخ ہے، سمجھا جاتا ہے کہ سرمایہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ سے اپنے اسٹینس یا حیثیت کو آدمی قائم رکھ سکتا ہے مگر دوسری طرف اسی کا نتیجہ ہے کہ بجائے خدا کے سرمایہ دار کے دل کا سارا تعلق سرمایہ ہی میں مرکوز ہو کر رہ جاتا ہے۔ اپنی ہر ضرورت میں بجائے خدا کے سرمایہ ہی کے خیال سے تسلی حاصل کرتا ہے اور آدمی کے بس میں نہیں ہے کہ آج جو کچھ مل جائے، حیوانوں کی طرح اس سے مستفید ہو کر کل کے خیال سے لاپروا ہو جائے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آج آدم کی اولاد کے سامنے جو چیز سرمایہ کی شکل میں پیش ہوئی ہے، دوسرے عالم میں وہی کسی نباتی وجود کی شکل میں پایا جاتا تھا۔ الغرض اجمال کی تفصیل میں بکثرت احتمالات دماغ میں آنے لگتے ہیں۔ پس احتیاط کا تقاضا ان امور میں یہی ہے کہ قرآن نے جن چیزوں کو مجمل حالت میں چھوڑ دیا ہے ہم بھی اس کو مجمل ہی رہنے دیں۔

ط۔ مذہب کی ضرورت کو ختم کر دینا، ختنہ کا قانون جو حضرت مسیح اور حواریوں کا موروثی قانون تھا، اور بہیمی قوت کو نقطہ اعتدال سے قریب رکھنے کی عملی تدبیر تھی۔ اس سے یورپ کی گوشت خور اور شراب نوش قوم کو مستثنیٰ کر دینا۔ یہ سارے جرائم سینٹ پال ہی کے پیدا کیے ہیں، ابن حزم نے اپنی ملل ونحل والی کتاب میں براہ راست بعض یہودی علماء کی زبانی یہ دعویٰ نقل کیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں یہود کے جو اخیار علماء تھے، انہوں نے سینٹ پال کو رشوت دے کر آمادہ کیا کہ مصنوعی طور پر عیسائی بن کر مسیح کے دین کو بگاڑ دے اور مسیح خدا کے بیٹے تھے، ان میں لاہوتی عنصر پیوست ہو گیا تھا۔ ان باتوں کو پھیلائے اخیار یہود نے اس کی ذمہ داری بھی لی تھی کہ جو کچھ گناہ ہوگا اس کا وبال ہم اپنے سروں پر لے لیں گے۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ علماء یہود کی یہ متفقہ روایت ہے اور بغیر کسی شرم وحیا کے

Marfat.com

اپنے بزرگوں کی طرف چالبازی کے اس فعل کو منسوب کرتے ہیں۔ اسلام میں یہودیوں نے رخنہ اندازی اسی راہ سے کی اور عبداللہ بن سبا جو ایک یمنی یہودی تھا، اس مشن کے ساتھ مسلمانوں میں ابن حزم نے لکھا ہے کہ کھڑا کیا گیا تھا، اور اس قسم کے فرقے جو حضرت علیؓ کو خدا مانتے ہیں، یا باطنی عقائد رکھتے ہیں یا صحابہ کا احترام جن کے دلوں میں نہیں ہے سب کے سب اسی یہودی فریب کے نتائج ہیں۔ (الفصل، ۱/۱۶۴، ابن حزم، علی بن احمد، مصر مطبعۃ الادبیۃ، ۱۳۱۷ھ)

ی۔ یہود جو اپنے آپ کو ابناء اللہ (خدا کے بیٹے) واحباء ہ (خدا کے دوست) سمجھتے تھے، ان کی نسلی برتری کے زعم کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا، انہوں نے بنی اسماعیل اپنے چچازاد بھائیوں کا نام ہی ساراقین (یعنی سارہ کے غلام) رکھ چھوڑا تھا۔ ساراقین آج تک مسلمانوں کو اسی بنیاد پر یورپ میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت اسماعیل کی والدہ ہاجرہ کو حضرت ابراہیم کی دوسری بیوی سارہ کی لونڈی قرار دیتے تھے۔ حضرت لوط، حضرت ابراہیم کے بھتیجے تھے۔ جو نسل حضرت لوط سے چھلی اس کو بدنام کرنے کے لیے یہ لطیفہ تراشا گیا اور اسی لطیفہ کو کسی زمانہ میں تورات میں شریک کر دیا گیا۔

ک۔ اہل جستجو و تلاش کے لیے جہاں تک میرا خیال ہے قرآن کی مذکورہ بالا اطلاع یعنی اہل کتاب کی خیانتوں سے تم ہمیشہ آگاہ ہوتے رہو گے، ایک بہترین اور کافی لذیذ موضوع ومشغلہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ خاکسار نے شاید ۱۹۱۴ء سے بائبل کا مطالعہ شروع کیا ہے، اس محدود زمانہ میں بھی میرے بعض شخصی تجربات اس سلسلہ میں آدمی کو مبہوت بنانے کے لیے کافی ہیں۔ تورات کی کتاب استثناء کی مشہور پیشینگوئی جس میں سینا اور دس ہزار فاران کا ذکر ہے اس میں برابر یہی پڑھتا رہا کہ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ۔ فاران یعنی مکہ کی پہاڑیوں میں آنحضرت ﷺ فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار صحابیوں کے ساتھ تشریف فرما ہوئے۔ صحابیوں کی تعداد دس ہزار بخاری شریف کی حدیث میں بیان کی گئی ہے۔ (بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، باب غزوۃ الفتح فی رمضان: ۴۰۲۷، دمشق، دار ابن کثیر، ۱۴۱۰ھ)

مگر اسی استثناء کا ترجمہ جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا ہے اسی مقام کو اٹھا کر دیکھا تو دس ہزار کی جگہ لاکھوں قدوسیوں کے الفاظ ملے۔ رسول اللہ کے جد اعلیٰ حضرت اسماعیل بن ابراہیم کے ذکر میں ہمیشہ کتاب پیدائش میں یہ الفاظ پائے جاتے تھے۔ ''وہ عربی ہوگا''

Marfat.com

لیکن اچانک عربی کی جگہ وہ گورخر کی طرح آزاد مردہوگا ،ترجمہ چھپنے لگا ۔ ۱۹۳۵ء میں بھی یہی آخری الفاظ ہیں ،زبور فصل ۸۴ میں بکہ کے لفظ کے ساتھ مکہ کا ذکر کیا گیا تھا لیکن میں نے اسی بکہ کے لفظ کو زبور ہی کے دوسرے مطبوعہ نسخوں میں ''وادی بقاء'' کبھی ''وادی بکاء'' کی شکلوں میں پایا اور اس کی ایک طویل فہرست میرے پاس ہے ۔ چند سالوں کے اندر جس کتاب میں اتنی اہم تبدیلیاں مسلسل کی گئی ہوں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نزول توراۃ کے عہد میں جس پر تخمیناً ساڑھے تین ہزار سے زیادہ مدت گذر چکی ہے تحریفی بجوبہ طرازیوں کی کتنی طویل داستان اسی کے متعلق تیار ہوسکتی ہے ۔کاش اسی کو مطالعہ کا موضوع خاص بنا کر کام کرنیوالے کام کرتے ۔

حوالہ جات

۱۔ منتخب التواریخ ،۲،۲۱۴/۲ ، بدایونی ،عبدالقادر ، ملا ،کلکتہ ،کالج پریس ،۱۸۶۵ء

۲۔ ایضاً ،۲۹۱/۲
۳۔ منتخب التواریخ ،۲۹۱/۲

۴۔ منتخب التواریخ ،۲۹۹/۲
۵۔ محولہ بالا

۶۔ منتخب التواریخ ،۲۵۶/۲
۷۔ ایضاً ،۲۷۳/۲

۸۔ ایضاً ،۳۴۹/۲
۹۔ ایضاً ،۳۱۶/۲

۱۰۔ تاریخ فلسفہ ،(مترجم) ص۲۴۲ ،وبیر ،الفرڈ ،مترجم ،خلیفہ عبدالحکیم ،حیدرآباد دکن ،جامعہ عثمانیہ ،۱۹۲۸ء

۱۱۔ ایضاً ،ص۲۴۳
۱۲۔ تاریخ فلسفہ ،ص۲۴۳

۱۳۔ محولہ بالا
۱۴۔ محولہ بالا

۱۵۔ منتخب التواریخ ،۳۲/۲

۱۶۔ منتخب اللباب ،۴۶۹/۱ ،خافی خان ،کلکتہ ، Badtistmission, Press, 1925

۱۷۔ ایضاً ،۴۰۳/۲

۱۸۔ رسالہ اسباب بغاوت ہند ،ص۱۲۳ ،سرسید احمد خان ،کراچی ،اردو اکیڈمی سندھ ،۱۹۵۷ء

۱۹۔ ایضاً ،ص۱۲۲
۲۰۔ محولہ بالا

۲۱۔ ایضاً ،ص۱۲۹
۲۲۔ ایضاً ،ص۱۳۰۔۱۲۹

Marfat.com

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۳۰ ۲۴۔ محولہ بالا

۲۵۔ مقدمہ تفسیر، ص ۱۲، محمد حسن امروہی جن کے بارے میں یہ مضمون ترتیب دیا گیا ہے ان کی یہ کتاب دستیاب نہیں ہو سکی۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۴

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۹ ۲۸۔ ایضاً، ص ۷۷

۲۹۔ ایضاً، ص ۳ ۳۰۔ ایضاً، ص ۴۰

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۴ ۳۲۔ ایضاً، ص ۱۹۹

۳۳۔ ایضاً، ص ۴۶ ۳۴۔ ایضاً، ص ۴۶

۳۵۔ ایضاً، ص ۳۷ ۳۶۔ ایضاً، ص ۳

۳۷۔ ایضاً، ص ۴۱ ۳۸۔ مقدمہ، ص ۲۰۱

۳۹۔ محولہ بالا ۴۰۔ محولہ بالا

۴۱۔ ایضاً، ص ۳۷ ۴۲۔ ایضاً، ص ۴۶

۴۳۔ مقدمہ تفسیر، ص ۴۶ ۴۴۔ ایضاً، ص ۴۱

۴۵۔ الفتوحات المکیہ، ۱/۲۴۸، ابن عربی، محی الدین، ابوبکر، مصر، مطبع بولاق، س ن

۴۶۔ محولہ بالا ۴۷۔ محولہ بالا

۴۸۔ محولہ بالا ۴۹۔ ق/۱۸

۵۰۔ مقدمہ، ص ۶۲ ۵۱۔ ایضاً، ص ۱۲

۵۲۔ حم سجدہ/۱۱ ۵۳۔ مقدمہ، ص ۶۲

۵۴۔ مقدمہ، ص ۶۶ ۵۵۔ محولہ بالا

۵۶۔ مقدمہ، ص ۶۲ ۵۷۔ ایضاً، ص ۳۲

۵۸۔ ایضاً، ص ۳۷ ۵۹۔ ایضاً، ص ۷۹

۶۰۔ ایضاً، ص ۹ ۶۱۔ ایضاً، ص ۶۹

۶۱ الف۔ الاعراف/۲۲ ۶۱ ب۔ الاعراف/۲۲

۶۲۔ ایضاً، ص ۴۵ ۶۳۔ مقدمہ، ص ۱۶۳

Marfat.com

۶۴۔ محولہ بالا

۶۵۔ مقدمہ، ص ۱۸۴

۶۶۔ ایضاً، ص ۱۶۹

۶۷۔ الاعراف/۱۵۷

۶۸۔ مقدمہ، ص ۱۸۴

۶۹۔ ایضاً، ص ۴۲

۷۰۔ ایضاً، ص ۸۱

۷۱۔ الاعراف/۱۵۷

۷۲۔ مقدمہ، ص ۱۰۶

۷۳۔ ایضاً، ص ۸۷

۷۴۔ ایضاً، ص ۱۲۵

۷۵۔ المائدہ/۱۳

۷۶۔ مقدمہ، ص ۶۷

۷۷۔ الفتوحات المکیہ، ۱/۱۷۱

۷۸۔ مقدمہ، ص ۱۸۷

۷۹۔ مقدمہ، ص ۱۸۹

۸۰۔ محولہ بالا

۸۱۔ محولہ بالا

۸۲۔ محولہ بالا

۸۳۔ مقدمہ، ص ۱۹۱

۸۴۔ محولہ بالا

۸۵۔ محولہ بالا

Marfat.com

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی علیہ الرحمۃ والغفران

اپنی طالب العلمی کے ابتدائی دنوں میں اس مبارک ومسعود نام کو پہلی دفعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے آرگن اور مجلّہ شہریہ الندوۃ کے سرورق پر دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ مولانا شبلی نعمانی کے اسم گرامی کے محاذی یہی نام بالالتزام لکھا جاتا تھا، واقفیت اس سے زیادہ نہ تھی کہ الندوۃ کی ترتیب وادارت میں مولانا شبلی کے معاون کوئی صاحب ہیں۔ راجپوتانہ کی دورافتادہ ایک سنگستانی آبادی ٹونک میں قدیم علوم کے ایک طالب العلم کے لیے اس سے زیادہ جاننے کی کوئی صورت بھی نہ تھی۔ اگرچہ بہت کم لیکن یاد آتا ہے کہ کبھی کبھی کوئی مضمون بھی مولانا شبلی کے اس ہمدوش وہم قدم مدیر کے قلم سے اس رسالہ میں نکل جاتا تھا۔

مگر کیا معلوم تھا کہ اتنی دور سے جو دیکھا جا رہا ہے، اسی کے ساتھ قرب ونزدیکی کا ایسا مقام زندگی میں میسر آئے گا۔ جسے اب بھی سوچتا ہوں تو ''ظلِ پدر'' یا ''پدری شفقت'' کے سوا تشبیہ کے لیے کوئی دوسری چیز سمجھ میں نہیں آتی، آہ۔

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل

مقادیر کی گردشوں نے ٹونک سے دیوبند اور دیوبند سے حیدرآباد پہنچایا۔ ٹھیک ان ہی دنوں میں پہنچایا جب مرحوم ہی کے محاورے میں ان ہی کی کمان سب سے زیادہ چڑھی ہوئی تھی۔ نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان استاذ السلطانؒ کی وفات کی وجہ سے حکومتِ آصفیہ کی جدید قائم کردہ وزارت (معین المہامی)

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں دسمبر ۱۹۵۰ء کو شائع ہوا۔

Marfat.com

مذہبی کی جگہ خالی ہوگئی۔ ملک کے طول وعرض پر نظریں دوڑائی گئیں اور طے کیا گیا کہ عہدے کے شایانِ شان ہمہ صفت موصوف ہی کی ذات والا صفات ہے جو بھیکم پور ضلع علی گڑھ کی ریاست کے ایک طرف رئیس بھی تھے اور سیدنا استاذ مولانا لطف اللہ علی گڑھی سابق مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد دکن کے ممتاز تلامذہ میں بھی شمار ہوتے تھے۔ قلم بھی ان کے ہاتھ میں تھا اور زبان بھی گل افشانیوں، درباریوں میں اپنی آپ نظیر تھی، پیکر شاہانہ، دل فقیرانہ

الغرض حکومتِ آصفیہ کے وزیر مذہبی کے لیے جن خصوصیتوں کی ضرورت تھی ایسا پایا گیا کہ: جامہ بود کہ بر قامتِ او دوختہ بود

ابا عن جدٍ پشتہا پشت سے جس کے یہاں نوکر رکھنے کا دستور چلا آرہا تھا، اسی کو شاہ دکن نے اپنی نوکری کی دعوت دی، مرحوم اس شاہانہ دعوت کے تاثرات کا ذکر خود فرمایا کرتے تھے۔ تلغرافی پیام حیدرآباد سے ان کے نام وصول ہوا۔ فرماتے تھے کہ بجز اس بات کے کہ کسی قسم کی دینی خدمت چاہی جاتی ہے کہ مجھ سے لی جائے اور اس جگہ کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا، یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ اس عہدہ کا سرکاری نام کیا ہے۔ تار میں غالباً ''ناظم امور مذہبی'' کا لفظ کسی طرح داخل کر دیا گیا تھا۔ نظم کا حیدرآباد کی سرکاری زبان میں کیا ترجمہ ہے، کس قسم کی ذمہ داریاں اس کے سپرد ہوتی ہیں اور اختیارات جو ملے ہیں ان کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ سب سے ناواقف تھے، تار ملا، بیان فرماتے تھے کہ سینہ پر تار رکھا ہوا تھا، خوابگاہ کے پلنگ پر لوٹ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے ''نوکری'' کا تو کبھی خطرہ بھی قلب پر نہ گذرا تھا، خاندانی روایات اس کے قطعاً منافی ہیں، ضرورت بھی بحمد اللہ نہ تھی، پھر خواہ مخواہ کی ذمہ داریوں کو اپنے سر کیوں لوں؟ ہجومِ خیالات کا ایک سلسلہ تھا کہ آتا تھا اور جاتا تھا۔ دوسری طرف خیال گذرتا تھا کہ سرزمینِ ہند کی سب سے بڑی اسلامی ریاست

Marfat.com

کے فرمانروا کا حکم ہے، ان کے حکم سے سرتابی بلا وجہ کیوں کی جائے، اچانک فرماتے تھے کہ اپنے خیال کی آنکھوں کے سامنے پانے لگا کہ حشر کا میدان قائم ہے، لوگ بلائے جارہے ہیں، میری باری بھی آئی ہے، پوچھا جاتا ہے:

''میرے دین کی خدمت کا ایک موقع تیرے سامنے آیا تھا، کیا جواب ہے کہ اس موقع سے تو نے اعراض کیا، صرف اپنی تن آسانی کے لیے اعراض کیا''

اسی کے بعد جو مقدر تھا وہ فیصلہ بن کر سینے میں جلوہ گر ہوا، لبیک کے ساتھ تار کا جواب تار ہی سے غالباً دیا گیا اور حسب وعدہ حیدرآباد پہنچ گئے، لفظ ''ناظم'' کی وجہ سے شروع میں مغالطہ کی کچھ صورت بھی پیش آئی مگر بارگاہِ خسروی سے جب تصریح ہوگئی کہ ''صدر الصدور ممالک محروسہ سرکار عالی'' اس منصب کا سرکاری نام ہوگا، جس کی دعوت دی گئی تھی، تو مغالطے کا جو بادل پھیلایا گیا تھا، پھٹ کر صاف ہوگیا۔ ''ناظم امور مذہبی'' کا عہدہ ان کے تحت کر دیا گیا۔ جب تک صدر الصدوری کے منصب جلیل پر وہ سرفراز رہے، نواب اختر یار جنگ، مولوی لطیف احمد مینائی مرحوم فرزند امیر مینائی مرحوم ان کے محکمہ کے ناظم اور بعد کو معتمد بھی ہو گئے۔

نواب موید الملک سر علی امام مرحوم نے جب ''باب حکومت'' کے نام سے کابینہ کی تنظیم کی، تو بابِ حکومت کے صدر کا نام صدر اعظم اور اراکین کابینہ صدر المہام کے نام سے موسوم ہوئے، صدر الصدور کی حیثیت اس کے بعد کیا ہوئی اسے کیا بتایا جائے اسی سے قصہ شروع ہوا اور اسی پر ختم ہوگیا۔ (الف)

خیر میں کن باتوں میں مشغول ہوگیا، عرض یہ کر رہا تھا کہ تقدیر نے حیدرآباد جب پہنچایا تو اس وقت حیدرآباد کی دینی و علمی سرگرمیوں کا مرکز وحید شروانی صاحب کی ذات والا صفات بنی ہوئی تھی، طالب العلمی کا زمانہ تو

Marfat.com

ختم ہو چکا تھا۔ لیکن طالب العلمی کے بعد والی زندگی صحیح معنوں میں چونکہ شروع نہیں ہوئی تھی اس لیے سن و سال وضع وقطع ہر لحاظ سے عربی مدرسہ کے ایک طالب العلم سے زیادہ میری کوئی حقیقت نہ تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے صرف ایک سرسری ملاقات کا موقع ملا تھا لیکن دراصل نیازمندی کے صحیح تعلقات اس وقت سے شروع ہوئے جب دوسری دفعہ در دولت پر فقیر حاضر ہوا تھا۔ ایک انگریز کی کوٹھی کرایہ پر لی گئی تھی۔ اسی میں مقیم تھے وہ اندر ملاقات کے سجے ہوئے کمرے میں تشریف فرما تھے، سامنے چلمن پڑی ہوئی تھی۔ باہر برآمدے میں کرسیوں پر میری طرح اور بھی مختلف طبقات کے لوگ ملنے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں اونچے نیچے سرکاری، غیر سرکاری ہر طرح ہی کے لوگ تھے۔ ایک کرسی پر فقیر بھی اسی جھمیلے میں بیٹھ گیا، صرف ہلکی سی سرسری ملاقات جس میں صورت کی شناخت بھی دوسروں کے لیے دشوار ہوتی ہے، مگر سنیے ان کی نظر چلمن کی تیلیوں سے برآمدے پر جو بیٹھے ہوئے تھے ان پر پڑتی ہے اور ایک بھاری بھر کم آواز میرے کانوں میں اندر سے آتی ہے:

''مولوی صاحب! آپ کی جگہ وہ نہیں ہے، آپ بے تکلف اندر چلے آیا کیجیے''۔

پہلے تو مجھے حیرت ہوئی کہ خطاب کس سے ہے لیکن خیال آتا ہے کہ پھر شاید نام لے کر اس حیرت کا ازالہ فرمادیا گیا اور آپ کا خاص خادم ''محبوب مرحوم'' باہر آیا، بولا کہ نواب صاحب آپ کو اندر بلا رہے ہیں، حاضر ہوگیا پاس بٹھایا اور مزاج پرسی کے بعد پھر اسی پدرانہ شفقت وعطوفت کے ساتھ فرمانے لگے کہ:

''آپ کے لیے اجازت وغیرہ کے قصوں کی ضرورت نہیں، جب آنا ہو، بے تکلف چلمن اٹھا کر اندر چلے آیا کیجیے''۔

غیر معمولی مہربانی سے تعلق کی ابتدا ہوئی، اسی عرصہ میں حضرۃ الاستاذ

مولانا حمید الدین فراہیؒ کی ہمرکابی میں خاکسار اورنگ آباد اور خلد آباد کی سیر کے لیے روانہ ہوا، شروانی صاحب بھی شاہی فرمان کی بنیاد پر ضلع اورنگ آباد کے کسی بڑے جاگیردار کے مقدمہ کے تصفیہ کے لیے اورنگ آباد ہی میں قیام فرماتھے۔ خلد آباد بھی سیر کے لیے گئے ہوئے تھے، خلد آباد کی مقدس پہاڑی پر سب کا اجتماع تھا، اسی اجتماع میں استاذ مرحوم نے شروانی صاحب کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں وطن (اعظم گڑھ) جارہاہوں، خاکسار کا نام لے کر فرمایا کہ ان کو بطور امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ مسکراتے ہوئے شروانی صاحب نے فرمایا کہ آپ کی یہ امانت میرے پاس محفوظ رہے گی۔ حضرۃ الاستاذ وہیں سے اعظم گڑھ کے ارادہ سے روانہ ہوگئے اور رفاقت کی سعادت پہلی دفعہ نواب صاحب مرحوم کے ساتھ میسر آئی، پہاڑی سے اتر کر اورنگ آباد سب واپس ہوئے۔ اب خاکسار شروانی صاحب کے ساتھ اورنگ آباد کے دارالامارہ میں مقیم تھا حکم دیا گیا کہ شہر میں گھوم گھوم کر قلمی کتابوں کا پتہ چلاؤں، یہ بڑا دلچسپ مشغلہ تھا۔ نواب صاحب کے منشاء کو پاکر اپنے اپنے کتب خانے کی سیر کی اجازت ہر ایک نے دی۔ اس سفر میں بعض نادر مخطوطات کا سرمایہ اکٹھا ہوا، دس پندرہ دن بعد نواب صاحب کی معیت میں حیدر آباد واپسی ہوئی اورنگ آباد ہی میں فقیر بھی ان سے مانوس ہوگیا اور ان کے لطف و کرم کی موسلا دھار بارشوں کا سلسلہ اس کے بعد جو شروع ہوا، وہ زندگی کے آخری دنوں تک برستا ہی رہا۔ امانت کا پورا حق ادا کرنے والے نے ادا کردیا۔

کم وبیش تقریباً بارہ سال کی طویل مدت ان کے زیرِ سایہ حیدر آباد کی زندگی گذری اس عرصہ میں سرکاری غیر سرکاری شعبوں میں ان کے کارناموں کی فہرست اتنی طویل ہے جس کی پوری تفصیل کے لیے ضخیم جلد بھی غالباً کافی نہ ہو، یہاں سرسری طور پر بعض نمایاں خدمات کا جو یاد آتے جاتے ہیں تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

Marfat.com

جس وقت نواب صاحبؒ حیدر آباد تشریف لائے تھے۔ میلادی مجلسوں کا حیدر آباد میں جو رواج تھا، ان میں عموماً یہی دیکھا جاتا تھا کہ حضرمی عرب جن کے ساتھ کچھ مقامی پیشہ ور میلاد خوان لوگ بھی شریک تھے، اپنی مختلف پارٹیاں بنائے ہوئے تھے۔ میلاد پڑھانے والے ان ہی میلادی ٹولیوں میں سے کسی ٹولی کو دعوت دے دیتے، ٹولی میلاد پڑھنے والوں کی اس کے گھر پر کچھ رات گذرے پہنچ جاتی اور چیخ چیخ کر تین تین چار چار آدمی زیادہ تر اردو جس کے ساتھ فارسی اور عربی اشعار بھی ہوتے ایک خاص لہجہ میں پڑھتے رہتے، تا آنکہ صبح ہو جاتی، گھر کے لوگ اطمینان کے ساتھ سو رہتے، اور میلاد خوانوں کی یہ ٹولی جاگ کر رات بسر کرتی، صبح کو معینہ فیس لے کر چلی جاتی تھی، شروع شروع میں حیدر آباد کے مسلمانوں کے گھروں میں میلاد خوانی کی یہ آواز جب میرے کانوں تک پہنچی تو مدت تک سمجھتا رہا کہ بھجن گایا جا رہا ہے۔ کچھ ایسے لب ولہجہ میں یہ لوگ اردو اشعار کو بھی پڑھتے تھے کہ الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے کہنے والے پیشہ ور میلاد خوانوں کی ان ٹولیوں کے متعلق طرح طرح کی باتیں منسوب کرتے ہیں، واللہ اعلم بالصواب

لیکن سنی سنائی باتوں سے قطع نظر کر لینے کے بعد وہاں کی میلاد خوانی کی عام حالت وہی تھی جو بیان کی گئی۔

لیکن نواب صاحب مرحوم نے میلادی مجلسوں کا ایک نیا نظام قائم کیا، قائم کیا کیا، اندرونی طور پر دلوں میں تقاضا تو اصلاح کا پہلے ہی سے تھا۔ لیکن اصلاحی اقدامات میں عملی شرکت کے لیے کوئی آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ نواب صاحب نے اس کا خیال کیے بغیر کہ ان کے منصب جلیل کا اقتضا کیا ہے ہر اس شخص کے گھر پہنچنے پر راضی ہو گئے جو ان سے میلاد پڑھوانا چاہتا ہو۔ سیرتِ طیبہ کے متعلق ان کا مطالعہ کافی وسیع اور عمیق تھا، بیان وخطاب کا طریقہ بھی حد سے زیادہ متین وسنجیدہ معلومات ان کے

نکھرے ہوئے تحقیق ہوتے تھے۔ جس نے بھی بلایا اپنی موٹر پر اس کے گھر پہنچ گئے، اور گھنٹہ دو گھنٹے ''سیرت طیبہ'' کے مختلف پہلوؤں پر مسلسل پر مغز، مؤثر تقریر فرماتے، رفتہ رفتہ لوگوں کا مذاق بدلنے لگا، اور بجائے انفرادی مجلسوں کے اجتماعی مجلسوں کے انعقاد کا ذوق پھیلنے لگا، اس کے بعد کیا ہوا، یہ آٹھ دس سال حیدرآباد کے واقعہ یہ ہے کہ بھلائے نہیں جا سکتے۔

جلسہ میں شریک ہونے والوں کی تعداد ہزار ہا ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر میلاد کی بعض اجتماعی مجلسوں کے سامعین کی تعداد کا تخمینہ پچاس ساٹھ ہزار تک کروں، سکندرآباد کی میلاد کی مجلس نے اس سلسلہ میں پہلا نمونہ قائم کیا۔ پھر تو حیدرآباد کے مشہور محلوں اور بستیوں میں شاید ہی کوئی محلہ اور کوئی ایسی بستی باقی رہ گئی جس میں سکندرآبادی مجلس کے معیار تک جلسہ کے نظم و انتظام، فرش و فروش، جھاڑ فانوس وغیرہ کو نہ پہنچا دیا گیا ہو۔ اور نہ نواب صاحب اس عرصہ میں بیان کرنے سے کبھی تھکے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کی تقریروں کے سننے والوں میں مجھے اکتا جانے کی کیفیت ہی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ کہتے جاتے تھے، اور لوگ سنتے جاتے تھے، حالانکہ ان کی تقریریں موضوع جعلی حدیثوں، جھوٹے تراشیدہ افسانوں، بلکہ شعر و نغمہ کی دل چسپیوں سے قطعی طور پر پاک ہوتی تھیں۔ بیان کا طرز بھی سادہ سیدھا، رواں ہوتا تھا مگر قرآنی آیتوں سے نکالے ہوئے صحیح نتائج معتبر حدیثوں اور سیرت کے تاریخی مستند واقعات ہی میں اتنی غیر معمولی دل آویزی پیدا ہو جاتی تھی کہ مشکل ہی سے حیدرآباد کی پبلک دوسروں کی تقریر یا وعظ سننے کے لیے آمادہ ہوتی تھی۔ رئیس آدمی تھے، راحت و آرام کی زندگی کے قدرۃً عادی تھے۔ لیکن میلادی مجلسوں کے لیے نہ وقت کا سوال ان کے لیے باقی رہتا تھا اور نہ موقع اور محل کا، رات کے بارہ بارہ بجے تک کبھی واپسی ہوتی، لیکن میں نے کبھی

ان کی زبان پر کسی قسم کی گرانی کی شکایت نہیں پائی۔(ب)

غلط عقائد، بے نبیاد اوہام، جاہلی رسوم و رواج، ہر ایک چیز کی اصلاح بھی ان کی عالمانہ تقریروں سے ہوتی چلی جاتی تھی۔لیکن مجھے یاد نہیں ہے کہ کسی کو کسی زمانہ میں ان کی تقریر کے کسی فقرے سے کبھی شکایت پیدا ہوئی ہو، اور فتنہ وفساد کا برپا ہونا تو دور کی بات تھی، وہ سب کچھ کہتے تھے، سب کچھ سناتے تھے جو کچھ کہتے اور جو کچھ سناتے تھے، سچ ہوتا تھا، لیکن تلخی ان کے بیان سے کبھی پیدا نہیں ہوئی۔فہمائش کا طریقہ قطعاً غیر معمولی تھا، جس کی نظیر اپنے تجربہ میں تو نہیں ملی۔ دیو بندیت، بریلویت، ندویت، نیچریت، وہابیت وغیرہ وغیرہ عصری اختلافات کے سلسلہ میں حالانکہ ہر مسئلہ کے متعلق فیصلہ کن رائے رکھتے تھے اور اپنے فیصلوں پر ان کو کافی اصرار تھا، تقریروں میں وہ اپنے فیصلوں کے حدود سے سرمو متجاوز نہ ہوتے تھے۔مگر یہ طرز بیان کی خوبی تھی کہ مخالف خیال رکھنے والوں میں بھی ان کی باتوں سے کسی قسم کی گرانی پیدا نہ ہوتی تھی اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان مختلف جتھوں کے افراد کے قلوب میں غیر معمولی اعتماد اور بھروسہ ان کے متعلق پایا جاتا تھا۔اس راہ میں تو یہ واقعہ ہے کہ غیر اسلامی دائروں میں بھی ان کی ہردلعزیزی کا کافی وزن تھا۔''امور مذہبی'' کا شعبہ حکومت آصفیہ کا ایسا شعبہ ہے جس کے احاطے میں مسلمانوں کے مساجد و مقابر اور دوسرے مآثر کے ساتھ ہندوؤں، عیسائیوں، پارسیوں کے مذہبی و دینی مقامات کی نگرانی بھی داخل ہے۔اسی وجہ سے ہر ملت و مذہب کے نمائندے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، اپنے درددکھ کے قصے سناتے، ہر ایک کی بات سنتے اور حسن سلوک کا ایسا نمونہ پیش فرماتے کہ ہر ایک آپ کا مداح ہو کر واپس ہوتا، کم از کم اس بارہ سال میں میں نے تو کسی دین وملت کے ہیرو کو آپ سے شاکی نہ پایا۔حالانکہ اپنی اسلامی و دینی زندگی میں ان کا اصرار تصلب کے

Marfat.com

درجہ تک پہنچا ہوا تھا۔ مگر ان کی زندگی کے مختلف شعبے اپنے اپنے حدود میں اس خوبی کے ساتھ محدود تھے، کہ خلط مبحث کی صورت ہی کبھی پیش نہ آتی تھی۔ شروانی صاحب اس باب میں غیر معمولی کردار کے حامل تھے، ان کی زندگی کا یہ پہلو بڑی تفصیل کا طالب ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف سیدنا مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہٗ اور ان کے خلفاء جانشینوں کے ساتھ ایسے تعلقات قائم تھے کہ گویا ان ہی صاحب دل درویشوں میں ایک بڑے درویش وہ بھی ہیں، دوسری طرف مولانا شبلی نعمانی ومولانا ابوالکلام آزاد جیسے آزاد خیال بزرگوں سے ان کی راہ ورسم لوگوں کے لیے باعثِ حیرت بھی بن جاتی ہے۔ مگر ان مختلف الجہات بلکہ متضاد تعلقات کے نباہنے اور حسن وخوبی کے ساتھ نباہنے کا غیر معمولی سلیقہ قدرت کی طرف سے ان کو عطا ہوا تھا ہر ایک میں فضل وکمال کا جو حصہ پایا جاتا تھا، حد سے زیادہ فراخ چشمی کے ساتھ ان کا اعتراف ان کی عجیب وغریب خصوصیت تھی۔ ایک ہی مجلس میں ان سے آپ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم مہتمم دیوبند کی تعریف بھی سن سکتے تھے، اور اسی کے ساتھ مولوی احمد رضا خاں بریلوی میں جو علمی اور عملی خوبیاں ان کے علم میں پائی جاتی تھیں ان کا بھی ذکر فرماتے۔ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی امہات الامۃ کی مجلس تحریق کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک رکن وہ بھی تھے اور اس آتشیں مجلس کی بھپتی اڑانے والے مولوی عبدالحق صاحب بابائے اردو سے بھی ان کی دوستی تھی۔

حیدرآباد جس زمانہ میں فقیر پہنچایا گیا تھا، عثمانیہ یونیورسٹی اس وقت تک قائم نہیں ہوئی تھی، چرچا البتہ اس کے قیام کا پھیلا ہوا تھا، سب سے بڑی رکاوٹ جیسا کہ خاکسار نے سنا ہے نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان مرحوم کی طرف سے پیش آرہی تھی۔ کہتے ہیں کہ ''جامعہ'' کا جو نقشہ پیش کیا گیا تھا اس کو دیکھ کر

Marfat.com

مولانا مرحوم نے فرمایا تھا کہ ملک کی آمدنی میں اس یونیورسٹی کے تعلیم یافتوں سے کوئی مدد نہیں ملے گی بلکہ مصارف بڑھا دیئے جائیں گے اور الحاد و بے دینی کے جراثیم جن سے حیدرآباد ایک حد تک محفوظ ہے، عوام میں پھیل جائیں گے۔ حضرت آصف جاہ سابع پر مولانا انوار اللہ خان مرحوم کا غیر معمولی اثر تھا، نتیجہ یہ ہوا مولوی صاحب کی مخالفت راہ کا روڑا یونیورسٹی کے حق میں بن گئی تھی۔ نیچے سے اوپر اتنی طاقت کسی میں نہ تھی جو اس روڑے کو ہٹائے، ان کی وفات کے بعد جب شروانی صاحب ان کی جگہ مامور ہوئے تو اعلیٰ حضرت نے فرمان صادر کیا کہ یونیورسٹی کے متعلق جتنے کاغذات بھی ہوں وہ صدر الصدور کے توسط اور معائنہ کے بعد پیش ہوں۔

شروانی صاحب نے اس سلسلہ میں بلیغ کوشش کی اور مولانا انوار اللہؒ کی رائے کا اثر سرکار والا تبار کے قلب پر جو تھا، اس کے ازالہ میں کامیاب ہوئے۔ یونیورسٹی کا چارٹر مل گیا اور پہلے وائس چانسلر اس یونیورسٹی کے شروانی صاحب فرمان مبارک کی رو سے مقرر ہوئے۔

ابتداء میں تو ان لوگوں کو جو جدید یونیورسٹی کا خواب دیکھ رہے تھے، بڑی خوشی ہوئی، وہ کلیتہً مشرق میں مغرب کا کھیل کھیلنا چاہتے تھے، سمجھتے تھے کہ شروانی صاحب روشن خیال آدمی ہیں۔ اس کھیل کی صرف اجازت ہی نہ دیں گے بلکہ ایکٹ میں حصہ بھی لیں گے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

چارٹر تو منظور ہوگیا، چارٹر ہی میں شروانی صاحب نے یہ بھی منظور کرالیا کہ مغربی علوم وفنون کے ساتھ مشرقی روایات اور اسلامی اخلاق و جذبات کی نشوونما کا کام بھی اس جامعہ سے لیا جائے گا، سمجھا گیا تھا کہ یہ رسمی الفاظ ہیں، عمل کے وقت ان الفاظ کو بے اثر کر کے رکھ دیا جائے گا۔

Marfat.com

یونیورسٹی کے اوقات مختلف شعبے اور ہر شعبہ کا درجہ واری نصاب جب بننے لگا تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب شروانی صاحب نے علاوہ شعبہ دینیات کے (جو مرحوم دار العلوم کالج) کا جانشین اور اسلامی علوم وفنون کی تعلیم کا مستقل ادارہ تھا، اس کے سوا بھی ان کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا کہ ہر مسلمان طالب العلم کو ابتدائی تعلیم سے بی اے تک ایک مستقل مضمون دینیات کا بھی لزوماً لینا پڑے گا۔ ان کو مغالطہ دیا جاتا تھا کہ ''مضمون'' کی حیثیت سے نصاب میں دینیات کا نام بھی لکھ دیا جائے گا۔ مطالبہ کے لیے کچھ کتابوں کی سفارش بھی کر دی جائے گی۔ لیکن یونیورسٹی کے کلاسوں میں اس کی تعلیم نہیں دی جاسکتی۔ خدا خدا کر کے تعلیم دلانے پر لوگ جب راضی ہوئے تو کہا گیا کہ اس مضمون میں طلبہ کا امتحان نہ ہوگا۔ مگر شروانی صاحب ڈٹے رہے۔ کہ تعلیم بھی اور امتحان بھی ہوگا۔ وقت ہی ایسا تھا کہ آخر سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک جبری عنصر جو پہلی دفعہ ایک جدید طرز کی یونیورسٹی کے نصاب میں باہر سے بزور داخل کرا دیا گیا تھا، اسی لیے دباؤ کے ہٹنے کے ساتھ ہی وہ باہر نکل پڑا۔ جو نہیں جانتے ہیں وہ اس کو حکومت کے سیکولر نظریہ کا کوئی جدید نتیجہ سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدیم نظریہ کا یہ قدیم نتیجہ تھا، جس کا ظہور اب ہوا ہے۔

دوسرا اہم معرکہ اسی جامعہ کے قصوں میں جو پیش آیا وہ شعبہ دینیات کے اساتذہ کی تنخواہ کا مسئلہ تھا، کہا جاتا تھا کہ بازار میں جن علوم کے پڑھانے والوں کی جو قیمت ہے اس سے زیادہ قیمت یونیورسٹی بھی ان کی کیوں ادا کرے، لیکن نواب مرحوم کے اصرار نے اس مسئلہ کو بھی طے کرا چھوڑا، وہ اس کو گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ جامعہ کے حدود میں داخل کر کے اسلامی علوم کی اہانت کی جائے۔

اس کامل ایک جگ یا قرن میں اور اور کیا کیا قصے پیش آئے، انہیں کہاں

Marfat.com

تک بیان کروں، قدم قدم پر روڑے تھے، ٹھوکریں تھیں، مگر غایت بے جگری اور دلیری کے ساتھ وہ آخر وقت تک زمانہ کی اس آندھی کا مقابلہ کرتے رہے جو ہر موقع پر ان کے قدم کا رخ بدل دینا چاہتی تھی۔

بعض دفعہ دلچسپ لطائف بھی اس سلسلہ میں پیش آتے۔ ایک دفعہ صاحب رزیڈنٹ بہادر کے یہاں ڈنر پر دوسرے حکام کے ساتھ مدعو ہوئے، انگریزی ڈنر میں جیسا کہ دستور ہے منجملہ دوسرے التزاموں کے ضروری ہے کہ نشست دوجنسی ہو، یعنی مرد کی ایک کرسی کے ساتھ دوسری کرسی جنس لطیف کے کسی فرد کی رکھی جاتی ہے، شاید نشست گاہ کی اس خصوصیت سے پہلے وہ واقف نہ تھے، ورنہ شرکت ہی سے عذر کر دیتے مگر شریک ہو جانے کے بعد کیا کرتے، بقول امام ابوحنیفہ ''ابتلیت بہ فصبرت'' انہوں نے بھی صبر سے کام لیا، فرماتے تھے کوئی میم صاحبہ دوسری کرسی پر ان کے ساتھ بیٹھی تھیں، پوچھنے لگیں کہ آپ کی بیگم صاحبہ بھی کیا اس ڈنر میں شریک ہیں ''نہیں'' کا جواب سن کر میم صاحبہ نے پر لطف فقرہ یہ فرمایا:

''اپنی بیویوں کو آپ لوگ اپنی ذات کے لیے مختص سمجھتے ہیں''

انگریزی زبان کا فقرہ تھا شاید اس کا ترجمہ یہی ہو سکتا ہے ہنس کر چپ ہو رہے، بعد کو بار بار اس فقرے کو دہراتے اور مسکراتے کہ میم صاحب نے عجیب بات پوچھی۔

کبھی کبھی جامعہ کے بعض علمی مقالات خصوصاً اسلامیات سے جن کا تعلق ہوتا، ان کے ملاحظہ کے لیے بھی بھیج دیئے جاتے تھے۔ ایک دفعہ حجاج بن یوسف مشہور ظالم امت کی مداحی میں ایک مقالہ ایک خاص نقطہ نظر کے پروفیسر کی نگرانی میں کسی طالب العلم نے پیش کیا، پروفیسر کی طلبی ہوئی اور مذہبی نہیں بلکہ علمی حیثیت سے جو مواخذے ان کی طرف سے پیش ہوئے وہ بڑے دلچسپ تھے۔

خود فرمایا کرتے تھے کہ انگریزی حلقوں کے متعلق اس قسم کی خبریں مجھ تک

Marfat.com

بسا اوقات پہنچائی جاتی ہیں کہ ''نیرو مائنڈ'' کا عیب اس شخص میں پایا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ اپنے بچے کھچے ایمان کی سند میں تو اسی کو سمجھتا ہوں۔

مگر ایک پہلو ان کی زندگی کا اگر یہ تھا تو دوسری طرف ایک دفعہ نہیں بیسیوں مواقع پر تجربہ ہوا کہ قدیم خیال کے پرانے مولویوں کا کسی مسئلہ پر شدید اصرار ہے۔ لیکن ان کے اصرار سے قطعاً متاثر نہ ہوتے اور اپنے نزدیک جو بات دین کی روح کے مطابق ہوتی اسی پر عمل کرتے۔ جامعہ عثمانیہ ہی کے شعبہ دینیات کی انگریزی کا مسئلہ چھڑا۔ قصہ یہ تھا کہ گو اس شعبہ میں بھی انگریزی ادب کی تعلیم طلبہ کے لیے ضروری تھی، مگر آرٹس اور سائنس کے طلبہ کے مقابلہ میں معیار ان کے نصاب کا پست تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ انگریزی پڑھنے میں شعبہ دینیات کے طلبہ کا وقت بھی صرف ہوتا تھا لیکن انگریزی آپ لوگوں کو نہیں آتی۔ اس شعبہ کے طیلسانی (گریجویٹ) واپس کر دیئے جاتے تھے۔ خاکسار کی طرف سے تحریک شروع ہوئی کہ شعبہ دینیات کی انگریزی فنون و سائنس کے مساوی کر دیجائے۔ بلکہ انگریزی ادب کی تعلیم وامتحان تینوں شعبوں کی چاہیے کہ مشترک ہو۔ قدیم طرز کے علماء جن کی تعداد اس وقت شعبہ کے اسٹاف میں غالب تھی اس ترمیم سے چراغ پا تھے، ناقص معیار کی انگریزی ہی سے وہ نالاں تھے، مساوی معیار کی تجویز جس حد تک ان کو برہم کرسکتی تھی، ظاہر ہے کہ نواب صاحب مرحوم نے اول سے آخر تک اسی پر زور دیا کہ شعبہ دینیات کی انگریزی دوسرے شعبوں کے مساوی کر دی جائے۔ بالآخر اسی کو طے کر کے رہے، اس ترمیم کے نتائج غیر معمولی نکلے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

قدامت وجدت کا امتزاج ان کے اندر کچھ عجیب وغریب طریقہ سے ہوا تھا۔ ایک طرف کوٹھی کے پائیں باغ میں ورد وظائف وتلاوت میں بھی مشغول پائے جاتے اور صبح کے اوراد سے فارغ ہونے کے بعد چائے کی میز پر بالالتزام کسی

Marfat.com

انگریزی روزنامہ کے مطالعہ میں مشغولیت بھی ان کی عام عادت تھی، مسرف تو وہ نہیں تھے لیکن کریم النفس، فیاض امیر باذل ہونے میں بھی شک نہ تھا۔ حیدرآباد میں ان کو دو ہزار ماہوار کے ساتھ الاؤنس کی بھی کافی رقم ملتی تھی۔ لیکن جہاں تک فقیر جانتا ہے گھر سے بھی حیدرآباد کے مصارف کی تکمیل کے لیے بسا اوقات منگوانے کی ضرورت پیش آجاتی تھی ان کا ہاتھ کھلا ہوا تھا، مشکل ہی سے کوئی ضرورت مند ان کے آستانے سے محروم واپس ہوتا تھا، ہر سال شب دیگ کی دعوتوں کا سلسلہ موسم سرما میں مہینوں جاری رہتا، ہر شب میں ایک ایک ٹولی ہم مذاقوں کی مدعو ہوتی۔ آج بھی ان کی شب دیگی دعوتوں کا ذکر کام و دہن میں یاروں کے ہلچل پیدا کردیتا ہے۔

میں اس سلسلہ میں دوسروں کا ذکر کیا کروں، ملازمت کے ابتدائی سالوں میں مجھ پر ایک سخت مرض کا حملہ ہوا، وطن ہی میں تھا، میں تو بیہوش پڑا ہوا تھا، میرے منجھلے بھائی برادرم مکارم احسن گیلانی سلمہ نے شروانی صاحب کو صرف میرے بیمار پڑ جانے اور مرض کی جو کیفیت تھی اس سے مطلع کیا۔ جواب میں صرف استمزاج کا خط ہی نہیں آیا بلکہ منی آرڈر کے ذریعہ شاید ڈھائی تین سو کی رقم بھی ارسال فرمائی گئی۔ خط میں میرے بھائی کو انہوں نے لکھا تھا کہ مولوی صاحب کے علاج میں مصارف کا خیال نہ کرنا جتنے روپے کی ضرورت ہو مجھ سے منگواتے رہنا، اگرچہ زیادہ منگوانے کی ضرورت بحمد للہ نہ ہوئی لیکن ان کے شریفانہ برتاؤ کی یاد دل میں جب کبھی آجاتی ہے، چشم پرآب ہو جاتا ہوں۔ اب ایسے بے غرض حسن سلوک کرنے والے بزرگوں کو دنیا کے اس پردے پر ہم کہاں پائیں گے۔

سچ تو یہ ہے کہ علاوہ ان عام مادی منافع کے ان کی صحبت و رفاقت میں خدا ہی جانتا ہے کہ شعوری و غیر شعوری طور پر کتنے علمی و اخلاقی جواہر پارے میرے دل و دماغ میں رچ گئے۔ انہوں نے انسانی زندگی کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا، عام ہنگاموں

Marfat.com

سے آزاد ہو کر سوچنے کے عادی تھے۔ یاد آتا ہے کہ ایک دفعہ دینی و اسلامی علوم کے جاننے والوں کی بے قدریوں کا عام دکھڑا ان کے سامنے جیسا کہ اس زمانہ میں دستور ہے ہو رہا تھا۔ سنتے رہے پھر فرمایا کہ مولوی صاحب! آپ کے دینی و اسلامی علوم کے ماہرین کا کیا آج ہی یہ حال ہے آپ کے امام ابو حنیفہ جیل میں کب گئے تھے اور امام احمد بن حنبل پر تازیانے کیا کسی غیر اسلامی حکومت کی طرف سے لگائے گئے تھے، امام بخاری کو جلا وطنی کی سزا کیا ان ہی دنوں میں بھگتنی نہیں پڑی تھی جب دنیا پر مسلمانوں ہی کا سیاسی اقتدار قائم تھا۔ سمجھاتے کہ آپ کے بزرگوں نے کام کرنے کی شرط کبھی یہ نہیں رکھی تھی کہ پہلے حکومت قائم ہو لے۔ مولویوں کے لیے بڑے بڑے عہدوں اور مناصب کے دروازے کھل جائیں، تب کام کریں گے۔ اس دن کچھ ایسے انداز میں تقریر فرمائی کہ اپنے اندر بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں میں نے ایک کلی انقلاب محسوس کیا۔ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے زوال کو دین وعلم کی بے قدری کا سبب قرار دینے کا جو دل عادی تھا اس کا نقطہ نظر ہی بدل گیا۔

حیدر آباد کی مسجد چوک میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی یاد میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا۔ شروانی صاحب نے اس جلسہ میں تقریر کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس تقریر سے پہلے حضرت مجدد کی خدمات کی صحیح قیمت کا مجھے قطعاً اندازہ نہ تھا۔ مجدد سے پہلے مغلوں کے تخت پر اکبر و جہانگیر اور مجدد کے بعد شاہ جہاں و عالمگیر ان کی تقریر کا اساسی عنوان تھا، پھر میں کیا بتاؤں کہ اس سلسلہ میں انہوں نے معلومات کے کن خزینوں کو وقف عام فرمایا۔ بعد کو حضرت مجدد الف ثانی پر فقیر نے جو مقالہ لکھا اور کافی مقبول ہوا مجھے اس کا اعتراف ہے کہ صحیح نقطہ نظر اگر نواب مرحوم سے نہ ملتا تو اس مقالے کے لکھنے میں کبھی کامیاب نہ ہوتا۔

ان کی خانگی مجلسیں بھی علم و ادب کی مجلسیں تھیں۔ معلومات کا غیر معمولی

Marfat.com

ذخیرہ ان کے سینے میں محفوظ تھا۔ مطالعہ ان کا غیر معمولی طور پر وسیع تھا، گویا میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ سبقاً سبقاً کسی کتاب کے پڑھنے کا موقع تو ان سے مجھے نہیں ملا لیکن کسی شاگرد کو اپنے استاذ سے جو فوائد پہنچتے ہیں مجھے اس پر فخر ہے، ان سے یہ منافع مجھے حاصل ہوئے، اور بہت زیادہ حاصل ہوئے، تفصیل کے لیے مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

وہ بڑے صاف ستھرے اجلی زندگی کے عادی تھے، جامہ زیبی میں مشکل ہی سے حیدر آباد میں کوئی دوسرا آدمی ان کا مدمقابل بن سکتا تھا ان کی موٹر بھی سب سے اچھی اور قیمتی موٹر ہوتی تھی۔ کوٹھی بھی ان کی سول لائن سواجی گوڑہ کی کوٹھیوں میں ممتاز تھی، زندگی کے اکثر شعبوں میں ان کا یہی حال تھا، بعضوں میں ان کے اس طرز عمل سے گرانی بھی پائی جاتی تھی مگر یہ جو کچھ تھا صرف ظاہر میں تھا باطن میں ان کے کچھ نہ تھا۔ خیال آتا ہے کہ سفر حج کا عزم جب فرمالیا گیا تو فقیر کو علی گڑھ طلب کیا گیا، پہنچا، حکم ہوا کہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے بعض زندہ بزرگوں سے بھی ملنا چاہتا ہوں اور اپنے پیرومرشد مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے مزار فائض الانوار پر بھی حاضری کا قصد ہے، جی چاہتا ہے کہ کم ازکم اس سفر میں تو تم میرے ساتھ رہو۔ بسروچشم قبول کیا گیا۔ منجملہ دوسرے مقامات کے فیض آباد بھی پہنچے یہاں حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ مولانا شاہ نیاز احمدؒ تشریف فرما تھے، ان کا قیام کویلو کے چھپر کے نیچے تھا جس کے سامنے مٹی کا ایک چبوترہ میدان میں تھا، جس پر بوریا بھی پڑا نہ تھا، گرد سے بھرا ہوا تھا، بیٹھنے کی جگہ اس کے سوا تھی بھی نہیں، اور شاہ صاحب نے حیدرآباد کے وزیر مذہب کو اسی چبوترے پر بیٹھ جانے کا اشارہ بھی فرمایا، بے تکلف میں نے محسوس کیا کہ بغیر کسی جھجک کے بخندہ پیشانی وہ اس چبوترے پر اپنی قیمتی شروانی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ پھر شاہ صاحب مرحوم سے دعا کی درخواست کی، اس عجیب وغریب دعا کے الفاظ آج بھی حافظہ کے نہاں خانہ میں

گونج رہے ہیں، شاہ صاحب نے ہاتھ اٹھایا ان کے ساتھ ہم لوگوں کے ہاتھ بھی اٹھ گئے، پھر فرمانے لگے۔

''بارالہا! یہ حبیب الرحمٰن شروانی تیرا ایک ناچیز بندہ ہے،

بارالہا! جب اس پر ناگزیر وقت آ جائے، سانس اکھڑ رہی ہو، تو اس کی امداد فرمائی جائے،

بارالہا! جب کفن پہنا کر اس کے تابوت کو لے چلیں تو اپنی رحمت کا سایہ اس پر ڈال اور جب گور کے خلوت خانہ میں حبیب الرحمٰن خاں کو لوگ رکھ کر واپس آ جائیں اور غریب وہاں تنہا رہ جائے تو اپنی رحمت اپنے کرم سے روشنی پیدا فرما، قوت بخش کہ نکیرین کے سوال و جواب میں یہ بے چارہ ثابت قدم رہے۔

بارالہا! جب حشر کا میدان قائم ہو اور بڑے چھوٹے پتنگوں کی طرح ادھر ادھر مارے پھرتے ہوں تو اس بے چارے حبیب الرحمٰن بھیکم پور والے کی دستگیری فرما، اس کے گناہوں کو بخش دے اور بجائے جہنم کے اس کو تیرے فرشتے جنت کی طرف لے جائیں''۔

بیس سال سے زیادہ مدت کی بات ہے، یہ دعویٰ تو مشکل ہے کہ یہی بجنسہ ان کے الفاظ تھے لیکن بہت سے الفاظ ان کی زبان سے نکلے ہوئے اس میں محفوظ ہیں، شاہ صاحب نے اور بھی کیا کیا فرمایا، اب یاد نہیں، نواب علیہ الرحمۃ والغفران کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی، سارا مجمع مجسم گریہ و بکا بنا ہوا تھا آخر میں فرمایا کہ

''اے اللہ اس غریب پر اس کے حج و زیارت کے سفر کو آسان فرما''

کیا معلوم تھا کہ بیس سال پہلے جن ضرورتوں کی تصویر مرد عاقبت بین کے سامنے تھی وہ ہم سب کے سامنے بھی آ جائے گی ان پر ان کا ناگزیر وقت آ گیا اب وہ تنہا اس عالم میں ہیں، جہاں ان کے اعزہ ہیں نہ اقرباء، نہ احباب ہیں اور نہ

Marfat.com

دوست ، نئی دنیا ہے ، نئے رفقاء ہوں گے ، نئے حالات ہوں گے ، آدمی خواب میں بھی پاتا ہے کہ ایک دوسری دنیا میں پہنچ گیا اور بیداری کی دنیا کے واقعات سے بے تعلق ہوکر رہ جاتا ہے ، کون کہہ سکتا ہے ، اپنے حقیقی مرقد (خواب گاہ) میں کچھ یہی صورت ان لوگوں کے سامنے پیش آتی ہے جو اس دنیا والوں سے تو الگ ہو جاتے ہیں لیکن نئی دنیا میں نئی ولادت ان کی ہوتی ہے ۔

فاللھم اغفرله و ارحمه کن اللھم انیسه و اجعل له من الملائکة و الا نبیاء و الا ولیاء رفیقا.

قلم ہاتھ میں آ گیا ہے قصداً اس کو اگر نہیں روکتا ہوں تو یہ بہکتا ہی چلا جائے گا ، بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ کہہ نہ سکا امرؤ القیس کے قصیدے کا ابتدائی شعر :

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل   بسقط اللوی بین الدخول فحومل

بار بار زبان پر آ جاتا ہے ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی کے لیے کل یہ شعر عرب جاہلی کے اس شاعر سے کہلوایا گیا تھا ، آخر میں ان ہی کے فرمودہ چند اشعار پر اپنے اس بیان کو ختم کرتا ہوں ۔

"مجلس مذاکرات علمیہ" ان ہی کی سرپرستی میں ایک علمی مجلس قائم تھی ، جس میں شہر کے ممتاز اہل علم و ادب جن کا علوم کے مختلف شعبوں سے تعلق تھا ، اس مجلس کے ارکان تھے ، اسی مجلس میں اپنی زبان مبارک سے اردو کی یہ غزل سنائی تھی ۔ اس کا کیف و اثر دل پر اس وقت تک باقی ہے ، "تیری" کی خطابی ضمیر سے کسی کو مخاطب بنا کر یہ غزل انہوں نے لکھی تھی ، دل اس خطاب کے رخ کو آج کل خود غزل کہنے والے کی طرف کر کے بسا اوقات گنگناتا ہے ، فرمایا تھا :

خوشا وہ باغ مہکتی ہو جس میں بو تیری
خوشا وہ دشت کہ ہو جس میں جستجو تیری

Marfat.com

رہینِ صحنِ گلستان نہیں دل افزائی

شمیم لطف دل افزا ہے کوبکو تیری

اس کوبکو سے ذہن اس مقام کی طرف بھی منتقل ہو جاتا ہے جہاں آج کل یہ فقیر کچھ دنوں سے مقیم ہے۔ انہوں نے بہار کے اس دورافتادہ کوردہ گیلانی کو بھی ایک دفعہ اپنی تشریف فرمائی سے سرفراز فرمایا تھا، اسی کا خیال آجاتا ہے اور پھر زبان پر اسی غزل کا یہ شعر جاری ہو جاتا ہے:

ہنوز دشتِ ختن نافہ زار عالم ہے

کبھی کھلی تھی ادھر زلفِ مشکبو تیری

آخر کے دو شعر یہ تھے:

فرشتہ اجل آئے پری کے قالب میں

بوقت مرگ جو صورت (ج) ہو روبرو تیری

امید تو یہی ہے کہ انشاء اللہ ان کی یہ آخری آرزو پوری ہوئی ہوگی، دوسرا شعر جو مقطع بھی تھا

خیالِ لطف سے حسرت ہے باغ رضوان میں

سنا ہے جب سے کہ لطف و کرم ہے خو تیری

اب ان کا ''شنیدہ'' انشاء اللہ الملک الکریم الجواد ''دیدہ'' بن چکا ہوگا، فتغمدہ اللہ بغفرانہ و طاب ثراہ۔

Marfat.com

حواشی

الف۔ قیام باب حکومت کے بعد زیادہ منظم شکل میں اور اس سے پہلے بھی حکومت آصفیہ کے ہر محکمہ کا ایک ناظم (ڈائریکٹر) اور ناظم کا معتمد (سیکرٹری) ہوتا تھا جس کی معتمدی کسی وزیر کے تحت کام کرتی تھی، جب تک باب حکومت قائم نہ ہوا تھا، وزیراعظم کا نام مدارالمہام اور اس کے رفقائے کار وزراء کو معین المہام کہتے تھے۔ باب حکومت جب قائم ہوا، تو کابینہ کے ہر رکن کا نام صدرالمہام رکھا گیا، سوال پیدا ہوا کہ محکمہ امور مذہبی میں صدرالصدور کی حیثیت کیا ہوگی۔ سرعلی امام مرحوم نے ذاتی طور پر باور کرایا تھا کہ صدرالصدور کی حیثیت شیخ الاسلام کی رہے گی جس کا رتبہ صدراعظم اور وزرائے کابینہ سے بھی بلند تر ہے۔ اسی لیے شروانی صاحب کو باب حکومت کا رکن نہیں بنایا گیا اور محکمہ مذہبی کی نمائندگی کے لیے باب حکومت کے کسی وزیر کے دوسرے صیغوں کے ساتھ اس صیغہ کی نمائندگی بھی ضم کردی گئی۔ ابتداء میں اس عجیب وغریب پیچیدہ صورت حال کا اثر واقعات پر نہ پڑا۔ لیکن شروانی صاحب کی حیدرآباد سے واپسی سچ پوچھیے تو اسی ابتدائی مغالطہ کا نتیجہ تھی، جس کی تفصیل اب غیر ضروری ہے۔ تلک امة قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم یغفر اللہ و لھم اجمعین

ب۔ خاکسار بھی ان میلادی مجالس میں اپنی بساط کے مطابق تھوڑا بہت حصہ تقریباً لیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ کثرت مجالس سے جو تقریری بار پڑتا تھا اس کا ذکر ذرا گرانی کے ساتھ کرنے لگا، فرمانے لگے، مولوی صاحب کس کی مجلس ہے، آپ کے ٹخنوں سے تو خون جاری نہیں ہوا اور آپ کے دانت نہیں توڑے گئے، ابھی سے گھبرا اٹھے، شرم سے گردن جھک گئی۔

ج۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ مرنے والوں سے پہلی بات یہ پوچھی جاتی ہے کہ ما تقول فی ھذا الرجل (اس آدمی کے متعلق تم کیا کہتے ہو) یہ رسول اللہ ﷺ کی صورت مبارکہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے، سوختہ سامانوں کا سارا سامان اسی بشارت میں پوشیدہ ہے۔

Marfat.com

حضرت حکیم سید مولانا برکات احمد صاحب ٹونکیؒ

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کی خبر جس وقت دکن پہنچی اسی زمانہ میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی کا یہ گرامی نامہ خاکسار کے نام شرف صدور لایا۔

مکرمی مولوی سید مناظر احسن، السلام علیکم، مولانا برکات احمد صاحب مرحوم کے حالات میں ایک اچھا سا مضمون معارف کے لیے لکھ دیجیے۔ حالاتِ زندگی، خاندان، تحصیل علم، ٹونک کا تعلق، خصوصاً تدریس کا شغف اور طرزِ تعلیم زیادہ وضاحت سے تحریر ہو، نیز یہ کہ کس کس علم سے خاص مناسبت تھی۔ اخلاقی و ذاتی اوصاف، ممتاز تلامذہ، وغیر ذلک ما یناسب، پراگندہ خاطر پراگندہ قلم سے صرف فرمان کی تعمیل کی جاتی ہے۔ بھولے بسرے خیالات کو جس طرح ممکن ہوا جمع کر دیا گیا ہے۔ واللہ یقول الحق و ہو یہدی السبیل

آبائی وطن (بہار)

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ مشہور ٹونکی نسبت سے ہیں۔ لیکن آپ کا وطن اور آپ کے والد مرحوم کا مولد و منشاء، شیرازِ ہند (الف) کا وہی علاقہ ہے جس کے ایک فرزند بلند طالع نے عہدِ اسلام کے مشرقی عقلیات کے سمندر مواج کو سلم و مسلم کے کاغذی کوزہ میں نچوڑ کر رکھ دیا تھا اور جس نے بقول علامہ شبلی مرحوم ایک صدی سے زیادہ زمانہ تک اسلامی مدارس کے نصاب کے نصف حصہ کو ہندوستان سے بخارا

☆ یہ مضمون معارف، اعظم گڑھ میں مارچ و اپریل ۱۹۲۹ء کو تین اقساط میں شائع ہوا۔

Marfat.com

تک اپنے پنجے میں دبا لیا تھا۔ مشرقی ممالک کے علمائے اسلام کا کمال اس عہد میں صرف اس سے وابستہ تھا کہ ملا محب اللہ بہاری مرحوم کی اس ایجازی انشاء کی نادرہ کاریوں کی تشریح وتحشیہ کرسکیں۔ دہر کی ان عجوبہ طرازیوں کو کیا کہیے کہ ہندوستان کی قدیم ہندو منطق کی بنیاد علم ومعرفت کے اسی دھار (ب) (بہار) کے علاقہ ترہت میں گوتم رشی (ج) نے ڈالی جو ینائے شاستر کے نام سے اس وقت تک مشہور ہے اور پھر مشرق کی قدیم آزاد تعلیم کے آخری علم بردار حضرت مولانا سید برکات احمدؒ کی خمیر بھی اسی صوبہ کی مٹی سے تیار کی گئی۔ ہندو جس منطق کو اپنے علمی دور میں پڑھاتے تھے، اس کا بانی بھی بہاری تھا اور مسلمان جس منطق وحکمت کا درس ہندوستان میں دیتے تھے دیکھو تو کہ اس کا خاتمہ بھی ایک ایسے فرد پر ہوا جو نزیلاً نہ سہی لیکن وطناً بہاری تھا۔

میرنگر ضلع (پٹنہ)

دریائے گنگا بہار کے جگر کو سیراب کرتی ہوئی بنگال میں پہنچتی ہے اور صوبوں کا حال معلوم نہیں لیکن بہار کے اضلاع پٹنہ ومونگیر کا وہ حصہ جو گنگا کے جنوبی ساحل سے ملا ہوا ہے اپنی زرعی خصوصیات کے لحاظ سے صوبہ کا ارض ریف (د) (تال) سمجھا جاتا ہے۔ اسی تال میں سرمیرا رجس کے ایک شہباز (ہ) نے اکبرآباد کے کشکول قلندری کو اردو ادب کے آسمان کا نیر درخشاں بنا دیا سے متصل زیدی واسطی سادات کی ایک چھوٹی سی بستی میرنگر کے نام سے آباد ہے۔ غالباً اشرافِ عرب کے شرفِ انتساب وسکونت نے اس کو یہ نام دیا کیونکہ اسلام کے مشرقی ممالک میں فاطمی امیروں اور حسنی وحسینی شریفوں کے اسمائے گرامی سے پہلے میر کا لفظ تعظیماً وکراماً عموماً بڑھا دیا جاتا ہے جو غالباً لفظ امیر کا مخفف ہے۔ مشہور علمائے سادات سید شریف جرجانی اور سید زاہد ہروی میر ہی کے نام سے اسلامی ادبیات

میں یاد کیے جاتے ہیں اور اول الذکر کے متعدد حواشی تو صرف لفظ میر سے موسوم ہیں۔ شرح مطالع اور قطبی دونوں کے ساتھ کسی زمانہ میں میر نامی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ بہر حال حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کے آبائی وطن ہونے کی سعادت صوبہ بہار کے اسی گاؤں میر نگر کو حاصل ہے جو ضلع عظیم آباد پٹنہ کے علاقہ میں واقع ہے۔

میر نگر کی امیّت

اگرچہ بہار کے اضلاع پٹنہ، مونگیر، گیا، آرہ اور بھنگر، مظفر پور وغیرہ میں متعدد مقامات پر سیدوں کی علم ریز، جواہر خیز بستیاں ہیں۔ قدیم و جدید ہر دور میں صوبہ کا علمی اور دماغی پرچم شہروں سے زیادہ ان ہی دہقانی خانوادوں کے اولوالعزم افراد کے ہاتھوں میں رہا اور اس وقت تک ہے لیکن عجیب بات ہے کہ امیت کی عربی شان سادات کی بستیوں میں سے جس بستی پر بہت زیادہ نمایاں ہے وہ صوبہ کے دارالخلافت پٹنہ کا یہی قریہ میر نگر ہے۔ شرافت نسبی کی وجہ سے گرد و نواح کے سادات کی برادریوں کا سلسلہ میر نگر والوں سے ہمیشہ سے جاری ہے۔ لیکن اس میل جول کے باوجود کچھ نہیں کہا جا سکتا، کہ کیوں لیکن یہ واقعہ ہے کہ میر نگر والے اپنی قدیم امیت (ناخواندگی) کے نقطہ سے اس وقت تک بہت کم ہٹے ہیں الا ماشاء اللہ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ افسونِ فرنگ سحر مغرب کے طلسم کدہ کی تعمیر میں، فاتح خیبر کے ان بچوں کے کاسہ سر دل و جگر سے بہت کام لیا گیا، بہت مشکل سے چند نفوس اس گاؤں میں ایسے ملیں گے جو کالجوں اور اسکولوں میں نہیں کونسلوں اور اسمبلیوں میں نہیں بلکہ صرف معمولی کچہریوں میں سرکاری احکام کی تعمیل کے لیے مقرر ہوں۔ حالانکہ ان ہی کے برادری والے جو دوسری بستیوں میں آباد ہیں ان میں وہ سب کچھ ہے جس کا نام عہد دجل میں ترقی و عروج ہے۔ بہر حال غریب میر نگر ایک قریہ امیہ ہے، امیوں کی آبادی ہے۔

لیکن کیا کیا جائے کہ معماروں نے جس پتھر کو روکا تھا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگیا۔ پیمانوں کے صغرو کبر کا اگر خیال نہ کیا جائے تو دنیا تاریخ کے ان اعادوں پر ہمیشہ حیرت کرتی ہوئی نظر آئے گی اور کرتی رہے گی۔

یہ شاعری اور مبالغہ نہیں ہے بلکہ ایک امر واقعہ ہے کہ اسی قریہ امیہ کی تاریکیوں میں وہ آفتاب چمکا جس کی درسی اور علمی شعاعیں صرف ہندوستان کے لیے نہیں، مشرق کے لیے نہیں، بلکہ سچ پوچھو تو عالم اسلام کی قدیم عقلیات اور آزاد تعلیم کی واپسیں اور آخری شعاعیں تھیں امام الحرمین، غزالی، رازی، طوسی، قطب شیرازی، قطب رازی، سید سند، دوانی، قطب سہالی، ملا نظام الدین فرنگی محلی، علامہ بحر العلوم، خاندان خیر آبادی نے مسلمانوں کی ذہنی تربیت اور عقلی ارتقاء کے لیے تعلیم کا جو نظام قائم کیا تھا، دیکھو! کہ وہ ۱۳۴۷ء کی یکم ربیع الاول کو غروب ہوگیا، اب کیا پھر مشرق کے افق سے علم کے اس آفتاب کے طلوع ہونے کی کوئی امید کرسکتا ہے۔ کیا دہلی لکھنؤ، کابل، بخارا، سمرقند، قسطنطنیہ، شیراز، قاہرہ، تیونس، کے مرحوم مدارس انگورہ، طہران جدید قاہرہ وغیرہ میں اپنی پچھلی خصوصیتوں کے ساتھ زندگی حاصل کرسکتے ہیں؟ جہاں انہیں ہمیشہ کے لیے دفن کردیا گیا۔ اچھا ہوا، یا برا ہوا، اس سے بحث نہیں۔ لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تعلیم کے جس نظام پر بربادی آئی کیا یہ اس کی آخری بربادی نہیں تھی۔ جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ اس قدیم نظام کے درس کو اپنی ظاہری و معنوی خصوصیتوں کے ساتھ اس آخری دور میں صرف حضرت الاستاذ قدس سرہ نے قائم کررکھا تھا اور اسی لیے ان کو تعلیم کے اس نظام کا آخری علم بردار خیال کرتا ہوں۔ فما ھو بقول شاعر

خاندان

میرنگر کے متعلق عرض کرچکا ہوں کہ وہاں زید سادات کا خاندان آباد ہے۔

حضرت قدس سرہٗ العزیز کا خاندانی تعلق بھی اس خانوادہ سے تھا۔ آپ کے والد ماجد مولانا حکیم حاجی سید شاہ دائم علی نور اللہ مرقدہ (الخاطب بخان ریاست ٹونک) میرنگر ہی میں پیدا ہوئے۔ میرنگر اس وقت تک قریۃ الامین ہے۔ اس سے زیادہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آج سے ایک صدی پہلے اس کا کیا حال ہوگا، جبکہ نہ شہروں میں کالجوں کا اور دیہاتوں میں اسکولوں کا جال اس طرح بچھا ہوا تھا جیسا کہ اس وقت ہے۔ حکیم دائم علی مرحوم اسی ماحول میں پیدا ہوئے، بڑھے، اور عمر کے ایک معقول حصہ تک وہ نوشت وخواند سے قطعاً عاری تھے۔ خدا جانے یہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے۔ لیکن میرنگر کے ایک پیرانہ سال بزرگ مجھ سے ذکر کرتے تھے کہ حکیم صاحب کھیت میں گوبر کی ہنڈیا پٹک کر بھاگے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ کچھ بھی ہو بعض نامعلوم اسباب کی بنیاد پر حکیم دائم علی صاحبؒ کے دل میں طلب علم کا شوق اور داعیہ پیدا ہوا۔ میرنگر سے چندمیل بجانب مغرب ان ہی سیدوں کی ایک بستی گیلانی ہے اس زمانہ میں وہاں کسی سرخ وسفید عمارت میں نہیں، ہزاروں روپے کے فرنیچروں کے درمیان نہیں بلکہ ایک خام مسجد کے کنارے برگد کے درخت کے نیچے کھلے ہوئے تخت پر گذشتہ خاک نشینوں کی ایک یادگار، صرف حاضری کے رجسٹروں کی تکمیل نہیں کررہا تھا۔ بلکہ ایک طرف ھدایہ اور تلویح، دوسری طرف چغمنی اور افق المبین جیسی سنگلاخ کتابوں سے لطیف حقائق، دقیق نکات ومسائل کے جھرنے جاری کررہا تھا۔ وہ کسی وقت اگر منطق ومابعد الطبعیات کے رموز، اور پیچیدہ غوامض پر شستہ تقریر کرتا تھا، تو دوسرے وقت قاضی بیضاوی کے تفسیری اسرار اور تفتازانی کے بیانی وبدیعی نظریات کو مفت بانٹ رہا تھا۔ ان کا نام مولانا محمد احسن گیلانیؒ تھا جو اپنے وقت میں صوبہ کے سرآمد روزگار فضلاء میں شمار کیے جاتے تھے۔ اور جن کی تہذیب وتدوین تحشیہ وتصحیح سے طوسی کے اقلیدس کا پہلا مقالہ عربی مدارس میں اس وقت تک

پڑھایا جاتا ہے۔

حکیم دائم علی صاحب کے طلب علم کی پہلی منزل طبعی طور پر گیلانی کو ہونا چاہیے تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ مولانا محمد احسن مرحوم سے آپ کی رشتہ داری بھی تھی، اور یہی ہوا کہ میر نگر کا وہی لڑکا جو صبح کو کسی کھیت میں تھا شام کو گیلانی کے اس شجرِ معرفت کے نیچے دیکھا گیا، گیلانی میں اس وقت صرف بہار ہی کے طلبہ نہیں پڑھتے تھے، بلکہ بالائی ہند حتی کہ سرحد کی پہاڑیوں سے طلبہ کی ایک جماعت علم کے چشمہ شیریں کے آگے مصروف استفادہ تھی۔ حکیم دائم علی صاحب بھی طلبہ کی اس جماعت میں داخل ہو گئے۔ صحیح طور پر معلوم نہیں لیکن بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کے ابتدائی منازل انہوں نے حسب دستور قدیم کسی اعلیٰ جماعت کے طالب العلم کے ذریعہ سے طے کیے اور بالآخر درس نظامیہ کا ایک بڑا حصہ انہوں نے اسی گاؤں میں ختم کیا۔ اس منزل کے بعد ان کے علمی سفر کے منازل اور کہاں کہاں طے ہوئے مجھے اس کا تفصیلی علم نہیں۔ تاہم گیلانی کے عہدِ طلب میں ان کا جو خطاب تھا اس کی اطلاع مجھے اس وقت ہوئی جب ابتداً پڑھنے کی غرض سے میں ٹونک میں حضرت الاستاذؒ کی خدمت میں اپنے وطن گیلانی، صوبہ بہار سے حاضر ہوا تھا۔

میں ٹونک اپنے عم مغفور و مرحوم مولانا حکیم حاجی حافظ سید محمد ابوالنصر گیلانی نور اللہ ضریحہ ابن مولانا محمد احسن گیلانی کے ساتھ گیا تھا۔ ہمارے ساتھ ایک اچھا مجمع تھا جس میں مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم کے شاگرد مولوی محمد اسماعیل مرحوم سابق مینجر صغریٰ وقف اسٹیٹ (بہار) بھی تھے۔ ہم لوگ بعد مغرب ٹونک پہنچے ہیں اپنی خوش قسمتی پر جس قدر ناز کروں بیجا نہ ہوگا، کہ ان بزرگوں کی معیت کے طفیل میں مجھے یہ سعادت نصیب ہوئی تھی کہ حضرت الاستاذ مولانا برکات احمد صاحبؒ ٹونک سے تقریباً دو میل آگے نکل کر بناس ندی کے کنارے ہمارے استقبال کے لیے

Marfat.com

موجود تھے، مطلوب کی یہ شانِ طالبیت عجیب تھی۔

حضرت الاستاذ نے ان لوگوں سے اپنے والد ماجد کی طرف سے یہ عذر پیش کیا کہ پیرانہ سالی کی وجہ سے وہ یہاں تک نہ آسکے۔ بہر حال مغرب کے بعد ہم لوگ حضرت حکیم صاحب کے در دولت پر پہنچے، حکیم دائم علی صاحب ہمارے انتظار میں تھے۔ مولوی اسماعیل صاحب نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ میرا تعارف حکیم صاحب سے کوئی نہ کرائے۔ دیکھوں کہ اتنی مدت کے بعد وہ مجھے پہچانتے ہیں یا نہیں؟ الغرض حکیم دائم علی صاحب مرحوم جب سامنے آئے اور ایک ایک سے گلے ملنے لگے، جب مولوی اسماعیل صاحب کی باری آئی تو چند سیکنڈ کے غور کے بعد یکا یک یہ عجیب منظر آنکھوں نے دیکھا کہ جوانی کے بچھڑے ہوئے دو سفید ریش بزرگ ایک دوسرے کے سینے سے لپٹے ہوئے تھے، لبوں پر ہنسی تھی اور آنکھوں میں آنسو، رقت کے ساتھ حکیم دائم علی صاحب نے فرمایا کہ کہو یار شیخ الاشراق اچھے ہو۔ مولوی اسماعیل نے اس کے جواب میں فرمایا فرمایئے صوفی صاحب آپ تو بعافیت رہے۔ (او کما قال) بہر حال اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ برگد کے درخت کے نیچے ایک شیخ الاشراق اور دوسرا صوفی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مولوی اسماعیل صاحب کی اشرافیت کا حال تو مجھے معلوم نہیں لیکن حکیم دائم علی صاحبؒ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں نہ حکیم تھے اور نہ عالم، بلکہ صرف صوفی تھے۔ حضرت سیدنا الامام مرشد العلماء حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مرید و خلیفہ ہوئے اور عمر کا پچھلا حصہ انہوں نے صرف صوفیانہ مجاہدات باطنی ریاضات میں بسر کر دیا۔ بہر حال میں موضوع سے کچھ دور ہو گیا۔ ذکر حکیم دائم علی صاحب مرحوم کا تھا۔ گیلانی کی تحصیل کے بعد حضرت حکیم صاحب مختلف درس گاہوں کی سیر کرتے ہوئے لکھنؤ رامپور کو دیکھتے ہوئے علم حدیث کی تکمیل غالباً مولانا عالم علی صاحبؒ مراد آبادی نگینوی سے کی اس کے بعد

Marfat.com

اجمیر شریف پہنچے، اجمیر شریف سے فن طب کی تکمیل کے لیے ٹونک آئے اس زمانہ میں والی ٹونک کے جو طبیب خاص تھے ان سے پڑھنا شروع کیا۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ٹونک میں حضرت حکیم صاحب کی طالب العلمی کا زمانہ نہایت سخت تھا۔ عسرت اپنے انتہائی مدارج کو پہنچ چکی تھی کہ ایک دن خواب میں انہوں نے اجمیر کے خواجہ اور ہندوستان کے سلطان الاولیاءؒ کو دیکھا، فرماتے ہیں کہ میاں سید گھبراؤ نہیں، خدا تمہاری مشکلات کو آسان کر دے گا اور یہ فرما کر کچھ صندل اور غالباً چند پیسے انہوں نے حکیم صاحب کے حوالہ کیے غالباً اس زمانہ میں ایسی باتیں افسانہ سمجھی جائیں۔ لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ بیداری میں صندل وغیرہ تو نہیں مگر ایک پیسہ حکیم صاحب کے ہاتھ میں موجود تھا۔ میں نے اس پیسہ کی خود زیارت نہیں کی لیکن مسند برکاتی کے جانشین مولانا حکیم محمد احمد صاحب جو حضرت الاستاذؒ کے خلف الرشید ہیں، ان سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ یہ عجیب وغریب پیسہ ان کے خاندان میں اس وقت تک موجود ہے؟ وسواسین اس ذریعہ سے اپنے آپ کو مطمئن کر سکتے ہیں۔ اس عجیب وغریب رویا کے بعد، صبح کو یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ حکیم صاحب کے استاذ حسب معمول نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت ریاست کے والی نواب محمد علی خاں مغفور تھے جن کو بعض خاص اسباب کی بنیاد پر برٹش گورنمنٹ نے بنارس میں نظر بند کر دیا تھا، نواب صاحب نے اپنے معالج سے فرمایا کہ حکیم صاحب مجھے اپنے ولی عہد کے لیے ایک ایسے اتالیق کی ضرورت ہے جو شریف ہو، عالم ہو، متقی ہو، اور طبیب بھی ہو، حکیم صاحب نواب صاحب کی اس فرمائش کو سن کر چلے آئے۔ اور دل میں اسی شخصیت کا خیال آتا جو اجمیر کے آستانہ سے برکت حاصل کر چکی تھی۔ آتے ہی حکیم دائم علی صاحب کو بلوا کر ماجرا سنایا اور خواہش ظاہر کی کہ اگر تم آمادہ ہو تو میں تمہارا نام پیش کرتا ہوں، ضرورت موجود تھی، اقرار کر لیا گیا، اور اسی

Marfat.com

کے بعد میر نگر کا غریب سید ٹونک کے ولی عہد کا اتالیق مقرر ہو گیا۔

اتالیقی کے چند ہی دن بعد نواب صاحب مرحوم کی نظر بندی کا واقعہ پیش آ گیا اور ہز ہائینس نواب حافظ ابراہیم علی خاں خلیل خلد اللہ ملکہ، فرمانروائے حال، تخت نشین ہوئے۔ نواب صاحب حکیم دائم علی صاحب سے مانوس ہو چکے تھے، رفتہ رفتہ ان کے اعزاز کو بڑھانا شروع کیا، پہلے وہ طبیب خاص مقرر ہوئے، اور آخر میں غالباً وزارت عظمیٰ کے عہدہ تک پہنچے۔

نواب ابراہیم علی خاں بہادر کے دربار سے حکیم دائم علی صاحب پر جود و کرم کی جو بارش مختلف اوقات میں ہوتی رہی، ٹونک کی پرانی صحبتوں میں اس کی گرمی اس وقت تک موجود ہے۔ اسی زمانہ میں معلوم نہیں کیا اسباب و ذرائع پیش آئے کہ حکیم دائم علی صاحب کی شادی ضلع مظفر نگر کے مشہور قصبہ پھلت کے اس شریف گھرانے میں ہوگئی، جس کا خاندانی تعلق حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ سے تھا، اور ان ہی بیوی صاحبہ کے بطن سے، اللہ نے حکیم دائم علی صاحب کو سب سے پہلی اولاد وہ دی جس کے علم و درس کے فیوض سے ہند و کابل، بلکہ، بخارا، سمرقند، خیوا، اور کاشغر کے طلبہ بھی سیراب ہوئے۔ حضرت الاستاذ مولانا برکات احمد صاحب، حکیم دائم علی صاحب کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے، آپ کی ولادت بمقام ٹونک ۱۲۸۰ھ میں ہوئی۔

ابتدائی تعلیم

حضرت الاستاذؒ کی ابتدائی تعلیم کا حال تفصیلی طور پر مجھے معلوم نہیں تاہم معمولی نوشت و خواند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد، شوق کا اندازہ کرنے کے بعد آپ کے والد بزرگوار نے اپنے ایک قدیم دوست اور صوبہ بہار کے مشہور عالم مولانا لطف علی صاحب دھنچھوہوی مرحوم کو اپنے وطن سے ٹونک محض اپنے بچے کی تعلیم

Marfat.com

کے لیے بلوا لیا، اور حمد اللہ تک معقولات کی کتابیں، آپ نے گھر ہی پر مولوی صاحب موصوف سے پڑھیں۔ خدا جانے اسی زمانہ میں یا کب، لیکن حضرت بیان فرماتے تھے کہ مولانا لطف علی صاحب کے سوا ٹونک کے ایک اور عالم فقیہ مولانا محمد حسن صاحب مرحوم جو محلّہ چھوٹی میں رہتے تھے، ان سے آپ نے ہدایہ بھی پڑھی تھی۔ مولانا لطف علی صاحب مرحوم پوری توجہ اور محنت کے ساتھ آپ کی تعلیم میں مصروف تھے اور یہ ان ہی کی تعلیمی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ شوق و ولولہ کے جذبات میں رفتہ رفتہ ایک ایسی ہلچل پیدا ہوئی کہ ٹونک کا علمی صحرا آپ کی جستجو و تلاش کے لیے تنگ ہو گیا۔ ادھر مولوی صاحب بھی کسی وجہ سے بہار روانہ ہو گئے، شوق بے پروا کے شعلے بھڑک چکے تھے، صبر کا دامن چھوٹ گیا اور بالآخر آپ کی بیتابیوں کو دیکھ کر وہی باپ جو ایک دن کے لیے اپنے سعید و ہونہار بچے کو آنکھوں سے الگ کرنا نہیں چاہتا تھا اور اسی لیے ایک بیش تر تنخواہ پر ایک مستقل عالم کو گھر پر رکھ لیا تھا، اجازت دے دی، کہ تم جہاں چاہو جا سکتے ہو، اور یوں اللہ نے آپ کے لیے علم کی قدیم سنت رحلت کی راہیں درست کیں۔

خود حکیم دائم علی صاحب اور مولانا لطف علی صاحب دونوں پر منقولات و سمعیات سے زیادہ عقلیات کا اثر تھا، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ حضرت الاستاذؒ بھی زیادہ تر علم کے اسی شعبہ کی طرف مائل تھے۔ تلاشِ علم کے لیے ہندوستان کے طول وعرض کی طرف نگاہ اٹھی تو سب سے پہلے اسی حلقہ درس پر نظر انتخاب پڑی، جو اس زمانہ میں عقلی علوم کا اگر مرکز وحید نہیں تو سب سے زیادہ ممتاز و نمایاں مرجع تھا۔ میری مراد مولانا عبدالحق صاحب خیر آبادیؒ کے دائرہ افادہ سے ہے۔ خیر آبادی دراست کے شعبہ عقلیات کی امامت اس عہد میں مولانا ہی کی ذات گرامی پر ختم ہوئی تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ نواب کلب علی خاں مرحوم مغفور کی مشہور عالم قدر شناسیوں

Marfat.com

اور معارف نوازیوں نے رامپور کو محط العلم اور مرجع الکملاء بنا دیا تھا۔ جس فن، جس ہنر، جس علم میں ہندوستان کے کسی گوشہ نے کسی نے سر اٹھایا۔ بالآخر وہ کسی نہ کسی طرح رامپور کے بانسواڑے میں محصور ہو جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں نواب صاحب مرحوم کی نازک تدبیروں کی ایک طویل داستان ہے لیکن ان کی علمی ناز برداریوں کا سب سے زیادہ روشن اور زریں کارنامہ یہ شمار کیا جاتا ہے کہ خیر آباد کی سبک روح بھی محض نواب صاحب کی فطری چابکدستیوں کی بدولت رامپور کے نورتن میں آخر وقت تک شریک رہی۔

بہرحال خیر آباد کا یہ علمی دریا بجائے اودہ کے ان دنوں، روہیل کھنڈ کے اسی شہر رامپور کے کنارے درسًا و انشاءً طوفان برپا کیے ہوئے تھا اور اسی لیے حضرت الاستاذ ٹونک سے روانہ ہو کر سیدھے رامپور پہنچے۔ اور خیر آباد کے آستانے پر کچھ اس طرح گرے کہ چرخ نیلوفری کی گردشوں نے خیر آبادی جلال کا نسلی طور پر خاتمہ کر دیا لیکن خیر آبادیت کو ختم ہونے سے آپ نے بچا لیا۔ خیر آباد صدیوں کا معہد علم و عقل خیر آباد، علمی سطوت کے لحاظ سے گویا مٹ چکا تھا لیکن اسی آہنی ارادہ نے زمانہ کی سخت کوشیوں کے باوجود خیر آبادیت کو آخر دم تک مٹنے نہ دیا۔

حضرتؒ کی طلب علم کی یہ مدت بہت طویل تھی، کہہ چکا ہوں کہ نظامی نصاب کے متوسطات آپ ٹونک ہی میں پڑھ چکے تھے اس سے زیادہ پڑھ چکے تھے، جتنا کہ اس زمانہ کا فارغ التحصیل عالم بھی نہیں پڑھتا۔ لیکن علم پیشہ جہل کے اقرار کو مانگتا ہے جو برتن خالی نہیں کیا جائے گا وہ بھرا بھی نہیں جائے گا، ادنیٰ و اعلیٰ ہر قسم کے علم کی راہ کا پہلا زینہ یہی ہے۔ حضرت کی طلب صادق تھی، تشنگی سچی تھی، جو مانگا گیا، سب دیا اور بے پروائی سے دیا، دل کھول کر دیا، علمی غیرت کی پشت پر یہ کتنا وزنی بوجھ تھا کہ حمد اللہ کا فارغ شدہ طالب العلم ایسا غوجی اور میزان منطق کے درجہ کی

Marfat.com

کتابوں میں نئے سرے سے شریک ہوگیا اور جو کچھ پڑھا ہوا تھا سب کو بے پڑھا ہوا بنا دیا گیا۔

طلب و تلاش کے اس طویل و مبارک عہد میں کیا کیا واقعات پیش آئے۔ وہ ایک مستقل دفتر کا مواد ہے، ان شاء اللہ آپ کی سوانح حیات کے مستقل تذکرہ میں ان کی تفصیل کی جائے گی۔ لیکن ان میں سے دو واقعوں کا ذکر غالبا بے محل نہ ہوگا کہ اس سے استاذ و تلمیذ کے باہمی تعلقات کا ایک عجیب و غریب مرقع سامنے آجاتا ہے۔

پہلا واقعہ

خاکسار جب حضرت الاستاذ سے شرح ہدایۃ الحکمۃ خیر آبادی پڑھتا تھا تو کتاب میں کسی فقرہ کا ایک جز ،تقتضی الطبیعۃ الر دالیہ بھی تھا۔ میں جب عبارت پڑھتا ہوا اس جزء پر پہنچا تو حضرت مسکرانے لگے، میں بھی رک گیا، اس کے بعد ایک خاص انداز سے فرمانے لگے کہ میں جب اس کتاب کو مولانا عبدالحق صاحب خیر آبادی سے پڑھتا تھا تو خدا جانے کس بدخیالی میں مبتلا تھا کہ الردالیہ کے دال کو واؤ مشدد خیال کر کے روالیہ پڑھ دیا۔ فرماتے تھے کہ ادھر منہ سے روالیہ نکلا اور دوسری طرف میری کتاب دور پھینکی ہوئی تھی، مولانا عبدالحق آپے سے باہر ہو گئے، غصہ سے بدحواس ہو رہے تھے، اور جو جی میں آیا، فرمارہے تھے، یہاں تک کہ آخری حکم ہوا کہ میرے درس سے تم ابھی اٹھ جاؤ، میں ایسے کم سوادوں کو قطعاً نہیں پڑھا سکتا۔ انداز طبیعت سے اپنے استاد کے حکیم صاحب واقف تھے، خاموشی کے ساتھ اٹھے اور باہر چلے آئے، چند دن کی روپوشی کے بعد حاضری کی اجازت چاہی گئی لیکن صاف جواب ملا، ہر قسم کی کوشش اور سفارش بہم پہنچائی گئی لیکن جو گرایا گیا تھا اس کا اٹھانے والا کوئی نہ تھا، بالآخر دو تین مہینہ کی جد و جہد کے بعد بصد حسرت و یاس، حضرت الاستاذ ٹونک اپنے وطن چلے آئے۔ حالانکہ ہندوستان کے متعدد شہروں میں

Marfat.com

اس وقت بڑے بڑے اساتذہ کرام موجود تھے لیکن

پرسی کہ کرا خواہی از خیل بتاں جامی: چشمے ست مرا اخر غیر از تو کرا خواہم

کے سوا آپ کے دل و زبان پر کچھ نہ تھا، وقفہ سے چند مہینوں کے بعد پلٹ پلٹ کر رامپور آتے۔ سعی و سفارش کی تمام زنجیروں کو ہلاتے لیکن روٹھے ہوئے کا منانا آسان نہ تھا وہ جو بھولے بسرے، برے بھلے دن گذر گئے کون اندازہ کرسکتا ہے کہ کبھی علم کے کوچہ میں بھی استاد کی بے نیازیوں اور شاگرد کی نیازمندیوں کا سلسلہ مہینہ دو مہینہ نہیں پورے دو سال تک جاری رہا اف اب کہاں سے لائیں وہ دشتِ جنوں پرور جہاں رقص میں لیلی رہی لیلی کے دیوانے رہے شوق یہ ہے کہ طلب کی سچی پیاس اسی کا نام ہے جن قوموں کی پیشانیوں پر بلندی کا ستارہ چمکتا ہے ان کے یہاں اس قسم کی قربانیاں نادر نہیں ہوتیں۔ قصہ تو بہت طویل ہے، خلاصہ یہ ہے، بالآخر مولانا کے خدمتگار نے حضرت الاستاذؒ سے ایک بیش قرار رقم لینے کے بعد، کچھ ایسے موقعہ سے سفارش کی کہ پورے دو سال کے بعد پھر علم کے اس دیوان خانہ میں باریابی کا موقعہ ملا۔ جہاں سے آپ ہمیشہ کے لیے جدا کر دیئے گئے تھے۔

علم کی وہ عزت کہ اس کی ایک غلطی نے ایک ہونہار شاگرد کو دو سال کی عقوبت کا مستحق قرار دیا، اور انسانوں پر وہ شفقت کہ ادنیٰ خادم کی التجا پر اتنی قدیم خفگی زائل ہو جاتی ہے، یہ مولانا عبدالحق خیرآبادی کی شاہانہ اور فقیرانہ طبیعت کے امتزاجی آثار کا عجیب و غریب نتیجہ تھا، مولانا عبدالحق کی زندگی اس قسم کے متضاد آثار و نتائج سے بالکل معمور تھی۔ حضرت الاستاذ کثرت سے ان واقعات کا ذکر فرماتے تھے کہ حضرت کی ذہنی بیداری کا یہ حال تھا کہ نواب کلب علی خاں کا دربار ہی کیوں نہ ہو، کسی قسم کے لوگ کیوں نہ ہوں، لیکن لطیف سے لطیف نکتہ آپ کے دماغ کی گرفت سے باہر نہیں ہوسکتا۔ اور دلیری یہ تھی کہ دماغ میں جو خیال آتا کچھ ہی ہو

Marfat.com

جائے، زبان پر اس کا آنا ضرور تھا، واقعات تو بہت ہیں، لیکن ایک خاص واقعہ اس سلسلہ میں یاد آیا، فرماتے تھے نواب مولانا سے اشارۃً کبھی کبھی مذاق بھی کرلیا کرتے تھے، خصوصاً مولانا کی ذہانت اور حاضر جوابی سے لذت گیر ہونے کے لیے کوئی اس قسم کا واقعہ قصداً کرادیتے تھے کہ مولانا کی زبان سے ایسی باتیں بے اختیار نکلنے لگیں، ایک دن مولانا نواب کے دستر خوان پر تھے، نواب صاحب نے خادم کو اشارہ کیا کہ ہڈیوں کو کسی رکابی میں جمع کر کے مولانا کے سامنے رکھ دو، رکابی مولانا کے سامنے آئی اور زبان پر یہ جملہ جاری تھا، خدمت گار سے فرمارہے ہیں "تم غالباً مستحق کو نہیں پہنچانتے ہو، اس رکابی کو ان ہی کے آگے رکھو"۔ نواب کے نام کا پہلا جز کلب تھا (کتا) اس کی طرف اشارہ تھا، نواب اس قسم کے لطائف کے منتظر رہتے تھے، ندامت میں ڈوبی ہوئی تحسین کرتے رہے۔

بہر حال نواب کے دربار میں جرأت و دلیری، حاضر طبعی، ذہنی بیداری کا یہ حال تھا لیکن غریبوں بے کسوں کے ساتھ آپ کی مسامحت اور سہل انگاری کی یہ حد تھی کہ حضرت الاستاذ فرماتے تھے کہ میں ایک زمانہ میں مولانا کے باورچی خانہ کا حساب لکھا کرتا تھا۔ نوکر نے پہلے دن حساب لکھاتے ہوئے ایک جگہ کہا کہ لکھیے، پان ایک آنہ کے، پھر اور چند چیزوں کے بعد بولا کہ پنواڑی ایک آنہ، میں نے کہا کہ پنواڑی سے آخر پان ہی لینے گئے ہوں گے۔ پھر یہ ایک آنے کیسے، بولا یہاں کا حساب تو یوں ہی لکھا جاتا ہے، میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، اور شکایت کی، نہایت سنجیدگی سے فرمانے لگے کہ تم بڑے نادان ہو، حکمت کی بنیاد صرف حیثیات اور عبارات پر قائم ہے، بحیثیت پان کے اس نے ایک آنہ لیا، اور بحیثیت پنواڑی کے کیا دوسرا آنہ نہ لیتا، لولا الاعتبارات لبطلت الحکمۃ، فلسفہ کا عام اصول ہے، اسی نوکر نے مولانا عبدالحق خیر آبادی کو یہ باور کرادیا تھا کہ بگلے بٹیروں کو نگل گئے

اور مولا نا ہر آنے والے سے اس کے بعد اس واقعہ کا ذکر فرماتے اور کہتے کہ فلاسفہ تداخل کو محال سمجھتے ہیں لیکن میرے نوکر کا یہ مشاہدہ ہے کہ بٹیرے بگلوں میں کچھ اس طرح سے در آئیں کہ بگلوں کا نہ حجم بڑھا، نہ اس کے حیز میں کوئی تبدیلی ہوئی، باخبری کے ساتھ بے خبری کے یہ عجیب نظائر ہیں، بہار کے مخدوم حضرت شاہ شرف الدین یحیٰ منیریؒ اپنے مکتوبات میں کسی ''گم گشتہ'' جماعت کا حال ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

''گفتند و نہ گفتند، شنوند و نہ شنوند، رفتند و نہ رفتند، نشستند و نہ نشستند، در بود ایشاں بود نہ بود، در گفت ایشاں گفت نہ بود، گویندگانِ گنگ بودند، در شنود ایشاں شنود نہ بود، شنوندگان کر بودند''۔

اور کسی زمانے میں ایسے محیر العقول نفوس کی مسلمانوں میں کمی نہیں تھی، خیر ان واقعات کا کہاں تک ذکر کیا جائے، میں تو حضرت الاستاذ کے عہد طلب کے واقعات بیان کررہا تھا جن میں سے ایک گذر گیا، دوسرا واقعہ اسی کے بالمقابل یہ ہے کہ رامپور میں کسی طالب العلم نے جرم قتل کا ارتکاب کیا، پولیس نے شبہ میں جن جن لوگوں کو پکڑنا چاہا، اس میں بدقسمتی سے کچھ ایسے اسباب پیدا ہوگئے کہ حضرت الاستاذ کا نام بھی درج ہوگیا، آپ کو جب اپنے متعلق پولیس کے اس اشتباہ کی خبر ہوئی تو سخت پریشان ہوئے کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی، سیدھے مولانا عبد الحق کی خدمتِ میں پہنچ گئے مولانا نے آپ کو سراسیمہ پاکر دریافت کیا، واقعات بیان کیے، سننے کے بعد خیرآباد کے عالم جری کی زبان پر یہ الفاظ کڑک رہے تھے:

''کس کی مجال ہے کہ تم پر کوئی ہاتھ ڈالے اطمینان کے ساتھ یہاں بیٹھو، دیکھوں کوتوال تمہیں کس طرح گرفتار کرتا ہے''۔

ابھی مولانا یہ فرمارہے تھے کہ کوتوال شہر مولانا برکات احمد صاحب کی جستجو

Marfat.com

میں حضرت کے مکان کا ارادہ کر کے اپنی دوڑ کے ساتھ جھروکے کے سامنے نمودار ہوا، چہرہ پر نگاہ پڑی اور اس کے بعد بدترین گالیوں، اور توہینی الفاظ کا ایک سمندر تھا، جو ابل پڑا۔ نہ صرف کوتوال ڈانٹا جارہا تھا بلکہ کوتوال سے زیادہ نواب کلب علی خاں کے نام سے صلواتیں ہورہی تھیں، فرماتے جاتے کہ تو خود کیوں آیا ہے اپنے نواب کو کیوں ساتھ نہیں لایا۔ کوتوال حیرت سے کھڑا، حضرت کا منہ تاک رہا تھا اور الٹے پاؤں غصہ میں کانپتا ہوا سیدھے نواب صاحب کی ڈیوڑھی پہنچا، اور ساری داستان من وعن نواب صاحب کو سنائی، سب کچھ سننے کے بعد نواب مرحوم نے اس کے بعد جو جملہ فرمایا وہ علم و دولت کے باہمی توازن کا ایک عجیب وغریب اعترافی فیصلہ تھا، فرمانے لگے۔

''بھائی! غلطی تو تمہاری تھی کہ تم نے ایک ایسے شخص کے مکان پر حملہ کردیا جو کلب علی کو بھی گالیاں دے سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے اگر میری کوئی فضیحت ہوئی بھی ہے تو اس کے بانی تم ہو، نہ مولانا، تم نہ وہاں جاتے، نہ یہ باتیں سنائی جاتیں''۔

خونی تیمور کے متعلق تاریخوں میں پڑھا تھا کہ تفتازانی کے قلم کے آگے اس نے اپنی بے پناہ تلوار کو بھی یہ کہہ کر نیام میں رکھ لیا تھا کہ ''افسوس کہ جن جن ممالک کو میری تلوار نے فتح کیا ہے تفتازانی کا قلم مجھ سے پہلے ان کو فتح کر چکا تھا''۔

لیکن کیا نواب کلب علی خاں کا علمی شکوہ کے آگے، اپنی حکومت کی پیشانی کا ٹیک دینا تیمور کے واقعہ سے کسی طرح کم ہے۔ گذر گیا اور وہ زمانہ ابھی گذرا کہ عالم اسلامی کا خلیفہ اکبر، یورپ وایشیا کا مطلق العنان حاکم ایک ہندی(و)، کے آگے جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ علم جب جسم کے لیے نہیں، بلکہ علم کے لیے تھا، اس وقت اگر جسم علم سے دبا ہوا تھا تو یہی ہونا بھی چاہیے تھا۔

بہرحال حضرت الاستاذؒ کے عہد طلب وتعلم کے واقعات جنہیں اکثر میں

نے ان کی زبانِ مبارک سے سنا، اس قدر کثرت سے ہیں کہ ان کے لیے حضرت کے مستقل تذکرہ کا انتظار کرنا چاہیے۔ اس وقت ان دو واقعات کے پیش کرنے سے بھی میرا مقصد فقط اس قدر تھا کہ علم کے اس تجارتی عہد میں لوگوں کو اندازہ ہو سکے کہ کسی وقت بدقسمت ہندوستان میں بھی قلم کا پھریرا عزت کی کتنی بلند چوٹیوں پر لہرا رہا تھا۔

استاذ کے ان لامحدود حقوق مسلمہ کا کوئی اندازہ کر سکتا کہ کسی سبق سے غیر حاضری نہیں، کسی درس سے غفلت نہیں، بلکہ عمر بھر ایک لفظ کی غیر متوقع جہالت طالب العلم کو دو سال کی سزا کی مستوجب بنا دیتی ہے اور سعادت مند شاگرد اپنی کشادہ پیشانی کے ساتھ استاذ کی سزا کو جھیل لیتا ہے۔ جس دور میں طلبہ کے لیے استاذ کی سو باتوں میں سے صرف تینتیس (۳۳) باتوں کا سننا ضروری قرار دیا گیا ہو اپنے کو بازار میں بیچنے کے لیے، کسی عالم کے درس کی صرف پچھتر فی صدی حاضری اور وہ بھی فرضی حاضری ان علمی ساہوکاروں کو

رفتم کہ خار از پاکشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دور شد

کی دقیق ذمہ داریوں سے کون واقف بنا سکتا ہے۔ طالب العلمانہ نزاکتوں کا ایک نظارہ تو یہ تھا۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ اس کے ساتھ ساتھ استاذانہ شفقت اور فرائض کی کوئی انتہا ہے کہ ایک معمولی طالب العلم کی عزت کا معلم کو اتنا پاس ہے کہ وہ حکومت سے ٹکراتا ہے، دولت سے ٹکراتا ہے، اپنے رزق سے ٹکراتا ہے، الغرض طالب العلم کو بچانے کے لیے ہر چیز کے بچانے سے استاذ دست بردار ہو جاتا ہے، یہی وہ تعلقات تھے کہ رفتہ رفتہ استاد باپ اور شاگرد بیٹے کے درجے تک پہنچ جاتے تھے۔ لیکن طالب العلم نہیں، بلکہ طالب سند، شاگردوں سے تمغے دینے والے نہیں، بلکہ صرف تنخواہ کے لینے والے اساتذہ کیا توقع رکھتے ہیں۔

Marfat.com

الغرض شوق ومحنت، ولولہ وعزم کے متلاطم جذبات میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے حضرت الاستاذ نے تقریباً دس گیارہ سال کا زمانہ خیرآبادی چوکھٹ جبیں سائی میں گذار دیا۔ علمی حرص و بے قناعتی کا یہ حال تھا کہ ایک ایک کتاب مولانا عبدالحق کی خدمت میں حضرت نے متعدد بار پڑھی۔ حمد اللہ کے متعلق مجھ سے فرماتے تھے کہ تین دفعہ اس کو سمعاً وقرأۃ پڑھا اور سنا۔ اس زمانہ میں عام طلبہ درس نظامیہ کی کتابوں کا ختم کر لینا، فراغت کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن حضرت الاستاذ کے بلند حوصلہ کے سامنے، درس نظامیہ قطعاً ناکافی تھا۔ اصرار کر کے آپ نے مولانا عبدالحق سے خارج از نصاب کتابیں پڑھیں۔ جن میں بعض تو خود مولانا عبدالحق کی تالیف سے تھیں۔ مثلاً جواہر غالیہ، شرح ہدایت الحکمۃ، وغیرہ اور زیادہ ایران اور خراسان کے ان فلاسفہ اور مناطقہ کی کتابیں تھیں، جو مدت ہوئی تھی کہ ہندوستانی نصاب سے خارج ہو چکی تھیں، ان کتابوں میں شفاء ابن سینا، شرح اشارات طوسی، افق المبین، حواشی دوانی، حواشی مرزا جان، وخوانساری، مؤلفات قوشجی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں کا ایک تیسرا حصہ اس وقت تک مخطوط اور غیر مطبوع ہے اور یوں تقریباً ایک قرن کا زمانہ عقلیات کی تحصیل میں بسر کر کے

شکر کہ جمازہ بہ منزل رسید

حدیثِ نبوی کی جستجو

رامپور کا دور جس وقت ختم ہوا، تو اس وقت حضرت کو تنبیہ ہوئی، کہ دماغی محاصل کا تو ذخیرہ فراہم ہو گیا، لیکن لاہوتی معارف کا کوئی حصہ ہاتھ نہیں آیا، اب نبوت کی روشنی میں جو علم پیدا ہوا تھا، اس کی تلاش پیدا ہوئی۔ آپ کے ساتھ مولانا ماجد علی سابق صدر مدرس عالیہ کلکتہ بھی عقلیات کے درس سے فارغ ہوئے تھے۔ دونوں کی بے چینی ایک تھی، یہ دونوں حدیث پڑھنا چاہتے تھے لیکن یہاں ایک سخت

Marfat.com

پیچیدہ سوال تھا۔

عموماً اس زمانہ میں ہندوستان کے علم حدیث کے درس وافادہ کی ریاست یا تو شمس العلماء میاں نذیر حسین صاحب دہلوی مرحوم پر ختم ہوتی تھی اور چونکہ میاں صاحبؒ بھی وطناً بہاری تھے اس لیے طبعاً حضرت کا رجحان اسی طرف ہونا چاہیے تھا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ میاں صاحب اہل الحدیث والالفاظ تھے اور یہاں الفاظ حدیث کے ساتھ ساتھ معانی وحقائق کا بھی مطالبہ تھا۔ جس کی توقع دہلوی کے درس میں بہت کم تھی، یا کم از کم حضرت الاستاذ کا یہی خیال تھا۔

میاں صاحب مرحوم کے سوا حنفی علماء میں اس فن کے اس زمانہ میں مرجع الکل رحلۃ الطلبہ کل دو حضرات تھے۔ ایک مولانا احمد علی صاحب سہارنپوریؒ ناشر ومحشی بخاری اور دوسرے مولانا رشید احمد صاحب چشتی گنگوہیؒ تھے۔

الفاظ نہیں، بلکہ معانی آثار وحدیث کے طلبہ یا یوں کہیے کہ حلقہ بگوشانِ امام الائمہ ابوحنیفہؒ زیادہ تر ان ہی دو محدثوں میں سے کسی ایک کے پاس اس فن کی تکمیل وتحصیل کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ان دونوں حضرات کا تعلق بھی جماعت علمائے دیوبند سے تھا، جس سے خیرآبادی درس کے علم کی معاصرانہ چشمک مولانا فضل حق خیرآبادی اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کے زمانہ سے جاری تھی، یہ دونوں حضرات احیاء اسلام میں تھے۔ دین کے دونوں فدائی سبیل اللہ کے مجاہد تھے اور اسی ملی اور دینی جوش کا وہ خونیں نظارہ تھا کہ دلی کا علامہ تحریر پنجاب کے میدانوں میں سکھوں کی تلواروں کے نیچے خاک وخون میں تڑپ رہا تھا لیکن اگر دلی کا شہید، مرکر اس طرح زندہ ہو رہتا ہے تو کیا یہ غلط ہے کہ خیرآباد کا یلیمی بھی اسلام کے عشق کا مجرم قرار پا کر، قید فرنگ کی زنجیروں کو پٹکتا ہوا، انڈمان کے ساحل سے نور کی دنیا کی طرف روانہ نہ ہوا۔ ان پاک طینت عاشقوں میں لوگوں کو رقابتِ نظر

Marfat.com

آتی ہے، ہوسکتا ہے مجھ سے کہو کہ ان بزرگوں کو یاد کروں اور یہ پڑھتا رہوں

بناء کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

بایھم اقتدیتم اھتدیتم اور اب تو دونوں کی اقتداء گمراہی قرار دی گئی۔

علمائے سوء، رسم کی پابندیوں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ لیکن کیا کوئی پوچھ سکتا ہے کہ پابندی صرف مناظرہ ومجادلہ کے لیے ضروری ہے۔ ''خاک وخوں'' کی غلطیدن کی رسم کا زندہ کرنے والا بھی تم میں سے کوئی ہے؟

بہرحال دہلوی سلسلہ علم اور خیر آبادی خاندان والوں میں ایک علمی منافرت ضرور تھی جس کی بڑی وجہ وہی ''معاصرت'' ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے۔ لوگ مذہب کو بدنام کرتے ہیں، حالانکہ جو مذہب نہیں رکھتے ہیں کیا ان میں معاصرانہ منافرتوں کی کمی ہے۔ علم سیاست، آخر کس میدان میں اس کے گردوغبار نہیں اڑ رہے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ لڑتا تو انسان ہے اور بدنام ہوتا ہے مذہب۔ یہ دنیا کی اگر بڑی بڑی لڑائیوں کو نہیں سوچتے، عظیم محاربوں پر غور نہیں کرتے، تو کیا ان کے سامنے امیر وداغ کی منافرت، انیس ودبیر کی باہمی رقابت شبلی کے مداحوں اور حالی کے بادخوانوں کی منافستہ بھی نہیں ہے؟ کیا ان میں بھی غریب مذہب کی دراندازی ہوئی ہے۔ جن جذبات پر ان منافرتوں کی بنیاد ہے، اس کے اشتعال پذیر ہونے کے لیے صرف انسان ہونا شرط ہے، انسان کو زندگی کے ہر شعبہ میں اس تصادم سے دوچار ہونا پڑتا ہے جس میں ایک مذہب بھی ہے، مذہبی جماعت ہو یا غیر مذہبی، پارٹیوں سے کیا کوئی خالی ہے؟ اور واقعہ یہ ہے کہ دہلوی وخیر آبادی منافرت جو بعد کو دیوبند اور خیر آبادی منافرت سے بدل گئی، اس کا تعلق بجائے مذہب کے زیادہ تر علم سے، یا بجائے دل کے دماغ سے ہے۔ مذہب کے غیر ضروری

Marfat.com

دراز و دور جزئیات بعیدہ کو لے کر صرف ذہنی کرتبوں کے کمالات دکھائے گئے ہیں۔

بہر حال ظاہر ہے کہ حضرت الاستاذ کی علمی تعمیر میں بالکلیہ خیر آبادی مواد و مصالحہ خرچ ہوا تھا، ایسی صورت میں مشکل تھا کہ آپ دیوبند کے کسی عالم کے آگے زانوے تلمذ تہ کریں، جانتے تھے کہ علم حدیث ان ہی لوگوں کی ملکیت ہے۔ لیکن علمی غیرت اجازت نہیں دیتی تھی اور غیر سے زیادہ مولانا عبدالحق خیر آبادی کی حمیت علمی کے لیے یہ واقعہ ہیجان انگیز ہوتا۔ حضرت کو اس کا بھی خوف تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے رفیق درس مولانا ماجد علی نے تو ننگ و ناموس کو خیر آباد کہہ کر ماثر نبوت کے عشق میں گنگوہ کی راہ لی، لیکن حضرت سے یہ نہ ہو سکا، تاہم

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

کے متراجم کشاکش میں مہینوں بے چین رہے، اور آخر میں ایک غیر معروف لیکن معتبر و مستند محدث، مولانا قاضی ایوب صاحب ﷫ کی خدمت میں مولانا خیر آبادی سے اجازت لے کر حاضر ہو گئے۔ قاضی صاحب کا بھی نسبی اور علمی تعلق دہلوی خاندان سے تھا۔ لیکن دیوبندیوں کی طرح شاہ ولی اللہ کے گھرانے کی علم برداری میں خیر آباد میں وہ بدنام نہ تھے، بھوپال میں عہدہ قضاء سے سرفراز تھے اور ہمارے حضرت الاستاذؒ کے وہ حقیقی خالو بھی تھے۔

اب رامپور کا فلسفی بھوپال میں صرف چشمہ وحی و نبوت سے سیر ہونے میں مشغول ہو گیا۔ بھوپال کے یہ چند دن بھی حضرت کی زندگی میں عجیب تھے، یہ سچ ہے کہ اب بھوپال کے اس وقت تک طالب علم تھے۔ لیکن خیر آباد کے تو ایک سربرآوردہ عالم ہو چکے تھے۔ خود بھی پڑھانے کا شوق ابتداء سے تھا۔ رامپور میں بھی اگر خود بڑی کتابیں پڑھتے تھے، تو چھوٹی کتابیں دوسروں کو پڑھاتے تھے اور

Marfat.com

قدیم نظام تعلیم جسے میں ''آزاد تعلیم'' کہتا ہوں، اس کی بہت سی خصوصیتوں میں ایک اہم اور مفید ترین خصوصیت یہ تھی کہ اعلیٰ جماعت کے طلبہ، ادنیٰ جماعتوں کے مدرس العلم ہوتے تھے، اس طرح پڑھی ہوئی کتابیں، ایامِ تحصیل ہی میں، علماء کو مشق ہو جاتی تھیں، عموماً فراغت کے وقت یہ حال ہوتا تھا کہ بجز اوپر کی چند کتابوں کے اکثر کتابوں کے درس سے بھی فارغ ہو چکے ہوتے تھے۔

حضرت الاستاذ جب بھوپال پہنچے تو ٹونک سے طلبہ کی بھی ایک جماعت آپ کے ساتھ آئی۔ خود بھوپال میں بھی تلامذہ کی ایک جماعت آپ پر جمع ہوگئی۔ درسِ حدیث سے جو وقت بچ جاتا تھا وہ عام درسی کتابوں کے پڑھانے میں صرف ہوتا تھا۔ طالب علمی کے ساتھ تعلیم دینا کوئی نئی بات تو نہیں تھی لیکن بھوپال میں حضرت نے جس قسم کا درس دیا تھا وہ اپنے نتائج کے لحاظ سے یقیناً بہت ممتاز تھا۔ اسی عہدِ طالب العلمی میں آپ نے چند آدمی تیار کیے جن میں ایک مدرسہ خلیلیہ ٹونک کے صدر مدرس مولانا نصیر احمد اور دوسرے محکمہ شرعیہ ٹونک کے مفتی مولانا خلیل الرحمٰن صاحب، تیسرے کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے پروفیسر، شیخ الفقہ مولانا عبدالواسع صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس طرح شاید ایک سال سے زیادہ زمانہ آپ نے بھوپال میں گذارا۔ تحصیل سے فراغت کے بعد آپ کی طالب العلمی کا زمانہ ختم ہوگیا۔ اور اب اشاعتِ علم، نشر معارف، تبلیغ دین کے ولولہ سے معمور ہو کر مراجعت فرمائے ٹونک ہوئے۔

میں صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا کہ کس وقت لیکن عہد تعلم کے ان ہی دنوں میں آپ نے کچھ تو اپنے والد مرحوم سے اور کچھ دہلی کے اس خاندان میں جس کے نمائندہ حکیم رضی الدین مرحوم تھے، آپ نے فن طب کی بھی تکمیل کر لی تھی۔

اسی طرح غالباً طالب العلمی ہی کے زمانہ میں رامپور کے ایک بزرگ

Marfat.com

صاحب دل سے آپ مرید بھی ہو گئے تھے۔ اور ان ہی ایام میں منزلی زندگی کے مرحلہ ازدواج بھی آپ ختم کر چکے تھے۔ تحصیل طب و حصول بیعت کے متعلق مجھے کچھ زیادہ معلوم نہیں لیکن ایک اہم نتیجہ خیز تاریخی حقیقت کو میں قصداً چھوڑ دوں گا، اگر حضرت کے نکاح اول کی بعض خصوصیات کو یہاں بیان نہ کروں۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت الاستاذ کے والد ماجد حکیم دائم علی صاحب مرحوم میر نگر (صوبہ بہار) کے ایک غیر مستطیع امی خاندان کے سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ ٹونک پہنچ کر معز مطلق نے ان کو ریاست کے جلیل عہدوں اور رفیع مناصب تک پہنچایا۔ اب وہ میر نگر کے ایک مسکین سید نہیں، بلکہ ہندوستان کی ایک مشہور ریاست کے امیر کبیر تھے۔ کون خیال کر سکتا ہے کہ ٹونک کے ان قصور وایوانوں میں حکیم دائم علی صاحب کے حافظہ میں میر نگر کے خس پوش وشکستہ جھونپڑیوں کے ارتسامات زندہ ہوں گے۔

لیکن ابراہیم کو اپنے بچے اسحاق کے لیے جب دولہن کی ضرورت ہوئی تو فلسطین کے رئیس نے عراق کے دور دست علاقے سے لڑکی منگوائی پھر دیکھو! کہ ہزارہا سال بعد اسی ابراہیمی نسل کے ایک سردار کو راجپوتانہ کے صحراء میں اپنے لڑکے کے لیے بیوی کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ہزارہا میل دور بہار کے ایک گاؤں میں اپنی بہو کو ڈھونڈھتا ہے، جہاں وہ پیدا ہوا تھا اور جن کے نسب کی صحت پر اسے اعتماد تھا۔ ٹونک سے ریاست کے ایک سربرآوردہ عہدہ دار کے لڑکے کی بارات روانہ ہوئی۔ سنگین محل سراؤں سے روانہ ہوئی۔ اونچے دروازوں سے روانہ ہوئی، اور سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک ایسے جھونپڑے کے سامنے کھڑی ہوئی جس کے متعلق بزرگوں سے میں نے سنا تھا کہ اس کی دیوار بھی کچی تھی، اور اس پر چھپر بھی صرف پھوس کا تھا۔ حکیم دائم علی صاحب نے حضرت الاستاذؒ کا پہلا

Marfat.com

نکاح بڑے ذوق شوق سے اپنے قدیم گاؤں میر نگر کے ایک غریب سید کی لڑکی سے کیا تھا، کیا اس واقعہ میں ان باطنی چشمکوں اور اندرونی بدگمانیوں کے سکون کا کچھ سامان ڈھونڈھا جا سکتا ہے جو ہندوستان کے سادات کے متعلق بعض دلوں میں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں۔ آج انساب کی طہارت، نسل کی سعادت کو دولت کی کالی دیوی پر بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے، کیا قربانیوں کا یہ سلسلہ ہمیشہ سے جاری تھا۔ میر نگر میں ایک ہاشمی قربان کر رہا تھا، کیا دولت پر نسل کو قربان کر رہا تھا، یا دولت، عزت، شہرت بلکہ معاشرتی سہولت، قرب مسافت میں سے ہر ایک چیز کو چن چن کر اس نے ذبح کر دیا۔ تاکہ اس کے نسب کی پاکی اور خاندان کی بزرگی، باقی رہے اور ایک حکیم دائم علی صاحب مرحوم نہیں بلکہ فاطمہؓ کے گھرانے والوں میں اس صدی سے پہلے ''خون'' کی تلافی، زندگی کے کسی شعبہ سے نہیں ہو سکتی تھی، پھر اگر ہندوستان کے طول و عرض میں اور اقوام کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں حسینؑ یا حسنؑ کے خاندان والے پائے جاتے تھے، یا اب بھی پائے جاتے ہیں تو دلوں میں وسوسہ کیوں پیدا ہوتا ہے۔ اور اب تو زمانہ نے جو کروٹ لی ہے، سونے اور چاندی کے دیوتاؤں کی پرستش کا جو زور ہو رہا ہے، افسوس ہے کہ یہ وسوسے واقعات بن رہے ہیں اور شاید وہ تو بن بھی چکے۔ لیکن جہاں آج تاریکی ہے، نہ کہو کہ وہاں ہمیشہ یہی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

ملازمت

الغرض حضرت الاستاذؒ کے کسب کمال کا عہد بھی ختم ہو چکا دین و دنیا کے متعلق جتنے علوم متداولہ سیکھنے تھے، سیکھ چکے، عالم ہوئے، حکیم ہوئے، مرید ہوئے، متاہل ہوئے، سب کچھ ہوئے، اب ایک مرحلہ معاش کا باقی تھا۔ حضرت کے ساتھ خدائے مہربان تھا، اس نے آپ کو ایک شفیق باپ عطا فرمایا تھا، جس وقت آپ فارغ التحصیل ہو کر مراجعت فرمائے ٹونک ہوئے تھے۔ اس وقت حکیم دائم صاحب

کی عمر گو پچاس سے متجاوز ہو چکی تھی لیکن قوی مضبوط تھے۔ نواب صاحب ٹونک ان پر صرف اعتماد ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کے تقویٰ اور پارسائی نے نواب میں ان کی جانب سے حسن اعتقاد بھی پیدا کر دیا تھا۔ وہ ان کو اپنا صرف معالج جسمانی ہی نہیں خیال کرتے تھے، بلکہ ان کی دوا سے زیادہ ان کی دعاء میں اپنی صحت و تندرستی کی ضمانت محسوس کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ نواب کی یہ عقیدت اس درجہ کو پہنچی ہوئی تھی کہ طبیعت خراب ہے، حکیم دائم علی صاحب بلائے گئے ہیں، نذر باغ جہاں نواب صاحب رہتے ہیں، اس کے دروازہ پر حکیم صاحب پہنچے اور وہ اپنی بیماری میں خفت محسوس کرتے تھے۔

اقتدار و جاہ، اختیارات و اعزاز کی خواہش جن دلوں کو مسخ کر دیتی ہے وہ اپنی آخری سانس تک اس سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے۔ حکیم دائم علی صاحب بھی چاہتے تو ان کو ملازمت سے جدا کرنے والا کوئی نہ تھا۔ لیکن باوجود شدید تعلقات کے حکیم دائم علی صاحب مرحوم اپنے عہدِ ملازمت میں دنیا پر خود چھائے رہے۔ اس کو اپنے اوپر کبھی چھانے نہ دیا۔ انہوں نے دیکھا کہ اب میرا لڑکا ہر طرح سے میرے فرائض کی انجام دہی کی صلاحیت پیدا کر چکا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی دن کے وہ منتظر تھے، سب سے پہلا کام انہوں نے یہ کیا، کہ نواب صاحب کے پاس حاضر ہوئے اور ریاست کے تمام تعلقات سے استعفیٰ دے کر صرف اتنا عرض کیا کہ میرے منصب طبابت پر آپ اب میرے بیٹے کو مقرر کر لیجیے۔ اصرار سخت تھا، نواب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا اور یوں بغیر کسی تگ و دو کے حضرت الاستاذ پر اللہ تعالیٰ نے فراخی رزق کے دروازے کھول دیے۔ حکیم دائم علی صاحبؒ کو میں نے دیکھا تھا، آخر عمر میں ان کا شغل ﴿یذکرون الله قیاماً و قعودا و علی جنوبهم﴾ (القرآن: ۳/۱۹۱) رہ گیا تھا۔ فرائض و مکتوبات کے سوا روزانہ ہٹو کی مسجد میں سو رکعتیں نفل ادا کرتے،

Marfat.com

رات بھر ذکر و فکر مراقبہ و مجاہدہ میں گذارتے اور دن اللہ والوں کے خطوط، و ملفوظات، و حالات کے پڑھنے میں بسر کرتے تھے، زیادہ سے زیادہ اگر کبھی شوق تھا تو اپنے سعادت مند جوان بخت فرزند سعید کی درس گاہ پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے گذر جاتے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس دانش مند انسان نے دنیا اور دین کی لذتوں کا کتنا سرمایہ اپنے سینے میں جمع کر لیا تھا اور جو فطرت کی راہ پر چلتا ہے، قدرت اس کی مسرتوں کے اضافہ میں کبھی کوئی کمی نہیں کرتی، وہ

﴿من اعرض عن ذکری فان له معیشة ضنکاً﴾ (القرآن ۲۰/۱۲۴)

''جو میری یاد سے کترایا تو ضرور اس کے لیے گھٹی ہوئی زندگی ہے''

اور ﴿ من عمل صالحا من ذکر اوانثی و هو مومن فلنحیینه حیوة طیبة﴾ (القرآن ۱۶/۹۷)

''مرد عورت میں سے جس کسی نے اچھے کام کیے اور وہ ماننے والوں میں بھی ہے تو ہم اسے جلاتے ہیں، پاکیزہ زندگی کے ساتھ''۔

کے اصول پر قوت کے ساتھ جمے ہوئے تھے اور اس کے برکات سے دنیا میں بھی دنیا کے بعد متمتع ہوتے رہے، ہوتے رہیں گے۔

عام انسانوں کی زندگی کے چند ہی مراحل ہیں۔ خصوصاً شرفاء کے خاندانوں میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ لڑکا پڑھ لکھ لے اس کی شادی ہو جائے، کہیں نوکر ہو جائے، ان مراحل کے بعد زندگی کی جدو جہد کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ پہلے بھی یہی تھا اور اب تو بقول اکبر مرحوم

ے کیا کہوں احباب کیا کارنمایاں کر گئے
بی اے ہوئے، نوکر ہوئے، پنشن ملی پھر مر گئے

سے زیادہ اپنی حیات کے سوانح کو مشکل ہی سے کوئی چھوڑتا ہے، ہزار ہا انسان ہیں،

جن کی زندگی کی تفسیر شعر مذکور کے مصرعہ ثانی سے زیادہ نہیں۔

لیکن کچھ لوگ ہوتے ہیں جنہیں قدرت اپنے لیے بناتی ہے، یا یوں کہو کہ جو کمانے کے لیے نہیں جیتے ہیں، بلکہ جینے کے لیے کماتے ہیں۔ جدو جہد کے جن نقاط پر عوام کی زندگی ختم ہو جاتی ہے، ان نفوس عالیہ کی زندگی ان ہی سے شروع ہوتی ہے۔

دیکھو! کہ حضرت الاستاذؒ تمام شریفانہ فرائض سے فارغ ہونے کے بعد ایک والی ملک کے طبی مشیر کے عہدہ سے سرفراز ہو چکے تھے، تنخواہ معقول تھی، جاگیر تھی، جائداد تھی، عزت تھی، جاہ تھا، ماسوا اس کے چونکہ آپ طبیب تھے تو یہ بھی ممکن تھا کہ علاوہ تنخواہ کے اپنے قیمتی اوقات کو روپیہ بٹورنے میں صرف کر دیتے۔ چاہتے تو ہر شہر کے ہر ہر گھر سے فیس اور دوا فروشی کے بہانے سے درہم و دینار کے سیلاب کو اپنی جیب میں بھر لیتے۔ کچھ ماحول بھی چنداں مناسب نہ تھا۔ آپ ایک رئیس کے لڑکے تھے۔ امیرانہ چاؤ مان سے پالے گئے تھے۔ آپ کے احباب و افسران سب کے سب دنیا پر منہ کے بل گرے ہوئے تھے۔ ریاست کے بڑے بڑے آفیسر آپ کے دوست تھے۔ لیکن باہمہ کے ساتھ بے ہمگی کا جو ثبوت انہوں نے پیش کیا اگر اس کو میں کسی ازلی انتخاب کا نتیجہ نہ خیال کروں تو اور کیا خیال کروں۔ کوئی مانع نہ تھا۔ اگر علاوہ طبی مشغلہ کے وہ ریاست کے کسی انتظامی اور کشوری صیغہ کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔ خدا نے ان میں ہر قسم کی صلاحیت پیدا کی تھی، ریاست اور رئیس پر ان کا ذاتی اور خاندانی اقتدار ہر قسم کے امکانات کے لیے زمین درست کیے ہوئے تھا۔

لیکن نواب صاحب کے معالج خاص ہونے کا عہدہ انہوں نے ابتدائے عمر میں اختیار کیا اور جب دنیا سے روانہ ہوئے تو بجز طبیب خاص ہونے کے ان کے اسم گرامی کے پیچھے اور کوئی منصبی اور دنیاوی اعزاز شریک نہ تھا۔ اللہ نے ان کے سینے کو اس سے زیادہ وسیع پیدا کیا تھا کہ وہ ان چلتی پھرتی چھاؤں کے نیچے دم لیتے۔

قناعت نے دل کو ٹھنڈا کر دیا اور ہمت نے تن آسانی کے گوشہ عافیت میں بیٹھنے نہ دیا۔ وہ اٹھے اور جب تک جیتے رہے علم اور دین کی خدمت میں اپنے کو مٹا دیا۔ حضرت الاستاذؒ کی زندگی کا حقیقی دور یہی دور ہے۔ اس کی تفصیل وبسط کے لیے دفتر درکار ہے۔ میں اختصار کے ساتھ کلی طور پر ان کی زندگی کے اس دور کو تین حصوں میں تقسیم کر کے اپنے مضمون کو اب ختم کروں گا۔

اس زندگی کا پہلا حصہ درس و افادہ تھا، دوسرے حصہ میں آپ پر تالیف و تصنیف کا ذوق غالب ہوا اور آخر عمر میں وہ ہر چیز سے الگ ہو کر صرف اس مشغلہ میں ڈوب گئے جس میں ڈوبنے کے لیے انسان بنایا گیا ہے۔ ان کی عمر کل (۶۷) سڑسٹھ برس کی ہوئی۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ یاس و ناامیدی کے سن میں پہنچ کر، ریاضات دینیہ اور مجاہدات عرفانیہ میں مشغول ہوئے، کتنے غافل دل ہیں جو اس عمر کے بعد بھی نہیں چونکتے اور حضرتؒ تو سچ یہ ہے کہ بیداری کے اس جزء سے بحمد للہ کے اپنے ہر دور میں سرفراز تھے۔ لیکن جو چیز پہلے چنگاری تھی وہی آخر میں شعلہ جوالہ بن کر ان کے خرمنِ حیات پر مسلط ہوگئی۔ شروع میں وہ مدرس تھے، پھر مصنف ہوئے اور آخر میں وہ صرف ایک صوفی صافی درویش نیک اندیش تھے۔ میں ترتیب کیساتھ ان کے ہر دور کے بعض اجمالی خصوصیات کو درج کرتا ہوں۔

درس و افادہ

کہا جا چکا ہے کہ پڑھانے اور درس دینے کا شوق ان پر اس زمانہ میں بھی غالب تھا، جب وہ خود پڑھتے تھے۔ بھوپال میں طلبہ کی ایک خاصی جماعت آپ سے مستفید ہو رہی تھی، ابتداءً ان ہی طالب علموں میں سے کچھ لوگ آپ کے ساتھ ٹونک پہنچے۔ یہاں اب ایک باضابطہ درس کا آغاز شروع ہوا لیکن اس درس کے لیے کیا آپ نے اخباروں میں چندے کی اپیل کی۔ مسلمانوں کے پاس آپ نے سفراء

Marfat.com

بھیجے، کانفرنس بنائی، ریزولیشن پاس کیے، کمیٹیاں قائم کیں، نصاب بنایا، کلنڈر شائع کیے؟ کچھ نہیں، خود تھے، علم تھا، محنت تھی، اور خدا کی توفیق تھی، جو آتا گیا اس کی کتابیں شروع کرادی گئیں اور اس طرح اس مدرسہ یا جامعہ کی ابتداء ہوگئی۔ جس کے فارغین و محصلین، ہندوستان کے بڑے بڑے مدرسوں کے مدرس اور صدر مدرس ہوئے اور صرف ہند نہیں بلکہ جاوا، سرحد کے کوہستانوں میں، کابل کی پہاڑیوں میں، بخارا کے مرغزاروں میں، کوقند خیوہ، تاشقند کی مسجدوں میں، تم کو اس عجیب وغریب مدرسہ کے فارغ شدہ علماء علم ودین کی خدمت میں مصروف نظر آئیں گے۔

مدرسہ خلیلیہ

ابتداءً آپ کے حلقۂ درس میں ٹونک کے مقامی طلبہ اور کچھ بیرونی طلبہ شریک ہوئے۔ لیکن جس جانکاہی، دماغ سوزی، شفقت و مہربانی سے آپ پڑھاتے تھے رفتہ رفتہ آپ کی درسی عظمت کا احاطہ وسیع ہونے لگا اور نہ صرف ہندوستان بلکہ ممالک اسلامیہ کے اقطار سے طلبہ کی جماعت آپ پر ٹوٹنے لگی۔ ان غریب الدیار، طلبہ میں ایسے بھی ہوتے جو عربی کی ابتدائی صرف ونحو سے بھی واقف نہیں ہوتے، ایک ایسا شخص جو اسلامی علوم کے ہر شعبہ کی اعلیٰ کتابیں خود پڑھاتا ہو، مشکل تھی کہ وہ ان بچوں کی تعلیم بھی اپنے ذمہ لے، کچھ دن تو نفس پر جبر بھی کیا اور ایک زمانہ آپ پر ایسا بھی گذرا ہے کہ صبح پانچ بجے سے لے کر رات کے گیارہ بجے تک مسلسل سبق پڑھاتے رہتے تھے لیکن جوں جوں طلبہ کی کثرت ہوتی گئی، کام کی سرانجامی میں دقت ہونے لگی۔ آخر اپنی معاونت کے لیے آپ نے ریاست سے محض معمولی امداد لے کر، چند مدرسین کو قلیل تنخواہوں پر نوکر رکھ لیا اور ریاست ہی نے ایک شکستہ لیکن وسیع مکان آپ کو دے دیا، جن میں یہ مدرسین نیچے درجہ کی جماعتوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ اس مدرسہ کی مالی حیثیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا

Marfat.com

ہے کہ اس کے سب کے بڑے مدرس کی تنخواہ (۳۰) تیس روپے نواب شاہی (ریاست ٹونک کے سکہ) سے زائد نہ تھی۔ اس مدرسہ کا نام خلیلیہ ہے جو والی عصر کے تخلص گرامی خلیل کی طرف منسوب ہے۔ حضرت الاستاذؒ ابتداء میں مدرسین کی ہمت افزائی کے لیے چند اسباق خود مدرسہ میں جا کر پڑھایا کرتے تھے لیکن جب کام چل پڑا تو جس مدرسہ سے سینکڑوں علماء اٹھے، دنیا کو یہ سن کر حیرت ہوگی، اس کی عمارتی وسعت صرف ایک دالان تک محدود تھی، جس پر کویلو کا چھپر پڑا ہوا تھا اور جس میں دری بھی نہیں، صرف جاجم کا فرش پڑا رہتا، اس میں حضرتؒ کے بیٹھنے کے لیے روئی کا چھوٹا سا گدا تھا، سامنے معمولی لکڑی کی ایک تپائی پڑی رہتی تھی، جس پر ایساغوجی سے لے کر شفاء تک اور نورالانوار سے توضیح وتلویح تک، شرح وقایہ سے ہدایہ تک، مشکوۃ سے بخاری تک کا وہ درس ہوتا رہا جس کا بنگال سے لے کر بخارا تک کے علمی حلقوں میں غلغلہ بلند تھا۔ حضرتؒ کا ذاتی مکان بہت وسیع تھا اور امیرانہ تھا لیکن وہ سب دوسروں کے لیے تھا۔ اپنے رہنے کے لیے آپ نے صرف ایک سائبان اور ایک حجرہ کا چھوٹا سا مکان منتخب کیا تھا، جس میں اہل وعیال کے ساتھ آپ بسر کرتے تھے اور پڑھانے کے لیے مٹی کا ایک خام دالان آپ نے باہر سے بنوالیا تھا، مدرسہ خلیلیہ تو صرف ایک اعانتی مدرسہ تھا، ورنہ ٹونک کی جس درسگاہ نے شہرت حاصل کی، اس کی تعمیری حیثیت کل اتنی تھی۔

طلبہ کے قیام وطعام کا انتظام

درسی دور کے وسط میں حضرت کے پاس بیرونی طلبہ کا ایک بڑا گروہ جمع ہوگیا تھا۔ ان میں بہار، صوبجات متحدہ، پنجاب، راجپوتانہ، سرحد، کابل، بخارا، سمرقند، ترمذ، ہرات، قفقاز ہر جگہ کے طالب علم تھے۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اتنے مختلف الطبائع نفوس کے باہمی اجتماع کی شیرازہ بندی اور پھر ان کے کھانے پینے

Marfat.com

کے بندوبست کے لیے کچھ انتظام نہ کیا گیا ہوگا۔

لیکن اسباب کو جو اپنے قابو میں لینا چاہتے ہیں، تجربہ بتاتا ہے کہ اسباب ان کے قابو میں بہت کم آئے ہیں، یا آتے ہیں تو مشکل سے آتے ہیں، یہ میرا چشم دید واقعہ ہے اور برسوں دیکھتا رہا کہ ہر طرح کے طالب علم آتے تھے، لیکن ان کے انتظام کے لیے صرف دو صورتیں تھیں۔

پہلی صورت تو وہ تھی، جسے دیکھ دیکھ کر میں اس وقت بھی حیرت کرتا تھا اور اب تک میرے تعجب کا ازالہ نہیں ہوا ہے، کہ طلبہ کی ایک بڑی جماعت حضرت ہی کی ذاتی مہمان تھی، یہ سچ ہے کہ حضرت کو حکومت سے تقریباً چار سو روپے مہینہ تنخواہ میں ملتے تھے اور آپ کی جاگیر میں ایک گاؤں بھی تھا۔ یقیناً یہ کوئی غیر معمولی آمدنی نہیں تھی لیکن برسوں میں نے دیکھا کہ بیس بیس، پچیس پچیس طالب العلم کا کھانا دونوں وقت حضرت کے گھر سے پک کر الگ خوانچوں میں طالب العلموں کے پاس آتا تھا۔ گھر میں بجز ایک ماما بریرہ کے مشکل سے اور کوئی عورت خادمہ رہتی تھی۔ لیکن میں اسے حضرت کی کرامت کہوں یا آپ کی بیوی صاحبہ کی انتھک توجہ و محنت کہ تازہ گرم گرم چپاتیاں، بکرے کے گوشت کا سالن، صبح آٹھ بجے تک طالب العلموں کو مل جاتا تھا، اسی طرح شام کو مغرب کی نماز پڑھ کر لوگ حضرت کے در دولت پر جمع ہو جاتے تھے اور اسی وقت شام کے کھانے سے فارغ کر دیئے جاتے تھے، ان طلبہ میں سے کچھ لوگ تو حضرت کے احباب کے مکان میں رہتے تھے لیکن ایک خاص مجمع خود آپ کے ایک بڑے وسیع پختہ مکان میں فروکش تھا۔ جسے بغیا کہتے تھے، آج قومی اور ملکی خدمات کرنے والے حضرات چندہ کی بھرمار سے پبلک کو زچ کیے ہوئے ہیں، لاکھوں روپے مختلف ناموں سے لیے جاتے اور بہائے جاتے ہیں۔ میں اس کا مدعی نہیں ہوں کہ یہ لوگ کام نہیں کرتے لیکن اس ایثار، اس قربانی کی کوئی نظیر دنیا

Marfat.com

اب بھی پیش کر سکتی ہے، کہ صبح سے شام تک ایک شخص ہر قسم کے علوم کا درس دے رہا ہے اور کسی سے ایک حبہ نہیں لیتا اور پھر اسی پر بس نہیں کرتا، بلکہ اپنی جیب سے ہر مہینہ میں ایک بڑی رقم طالب العلموں کے کھانے پینے پر صرف کرتا ہے، فرض کرو کہ کوئی یہ بھی کرے، لیکن کھانے کی تیاری اور کھلانے کی ذمہ داری اپنے سر کون لینے لیے تیار ہے۔ آہ کہ قوم، ملک، وطن کے الفاظ سے ہماری پچھلی نسلیں اس طرح آشنا نہیں تھیں جیسی کہ اب ہیں لیکن ان کے حقائق و مصادیق کے ساتھ ان کے علمی کارناموں اور اولوالعزمانہ خدمتوں کو ان یحمدو بما لم یفعلوا (تعریف کی جائے ان کاموں کی جو انہوں نے نہیں کیے ہیں) کے قرن سیاہ میں ڈھونڈھنا بھی فضول ہے۔ تم میں کوئی صرف تھوڑی تنخواہ لیتا ہے یا نہیں لیتا ہے، تو اس کی مدح و ستائش کے گیتوں سے گنبد گردوں میں گونج پیدا کرتے ہو، لیکن انہی قباؤں کے نیچے جو اللہ کے دوست پوشیدہ تھے، افسوس کہ ان کو تم میں سے کسی نے نہیں پہچانا، الحاصل طالب العلموں کے ایک بڑے گروہ کے قیام اور طعام کا ایک انتظام تو یہ تھا، تھوڑے ایسے بھی تھے جو مدرسہ خلیلیہ سے وظیفہ پاتے تھے اور بعض دوسرے شہروں کی طرح مساجد میں بھی رہتے تھے۔

طلبہ کے ساتھ آپ کا برتاؤ

قطع نظر اس عام سلوک کے جو بیان کیا گیا، حضرت کا اپنے طلبہ کے ساتھ عام برتاؤ حاکمانہ یا مستبدانہ قطعاً نہ تھا۔ درس میں تو مشتغلین پر ایک قدرتی رعب چھایا رہتا تھا۔ بڑے بڑے مستعد اور ذکی طالب العلموں کو سوال کی جرات کم ہوتی تھی لیکن عام صحبتوں میں وہ ہر ایک مہربان دوست سے زیادہ نہیں معلوم ہوتے تھے، غیر درسی مجلسوں میں ہر قسم کے ذکر و اذکار، بلکہ کبھی کبھی کسی طالب العلم سے ظرافت بھی فرمالیا کرتے۔ تواضع کا یہ حال تھا کہ اگر کسی وجہ سے کسی طالب العلم پر آپ خفا

Marfat.com

بھی ہوتے تو تھوڑی دیر بعد آپ کو منفعلانہ افسوس ہوتا اور اس کی تلافی کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا فرمالیتے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ایک سرحدی طالب العلم تمام علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد گشت کرتا ہوا شفاء اشارات پڑھنے کے لیے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ قد آور تھا اس لیے اس کا نام ابوالبشر رکھ دیا گیا۔ اور اس قسم کے خطابات ظرافت میں اکثر تقسیم ہوتے تھے۔ پانی پت کے ایک معمر طالب العلم کا خطاب مولوی چچا صاحب تھا۔ بدایون کے ایک ذہین طالب العلم مولوی عبدالواحد مرحوم تھے، چونکہ پست قد تھے اس لیے ان کا نام ملا مختصر رکھ دیا گیا تھا۔ بہار کے ایک طالب العلم ذرا زیادہ بولتے تھے، آستانہ استاد سے ان کو بالسٹر کا خطاب ملا تھا۔

بہر حال مولوی ابوالبشر اپنے نام ہی کی وجہ سے محل طیبت بنے ہوئے تھے ان سے اکثر چٹکیاں لی جاتی تھیں اسی وجہ سے وہ کچھ شوخ بھی ہو گئے تھے۔ ایک دن درس کے وقت کچھ اس طرح الجھے کہ حضرت کا مزاج برہم ہو گیا۔ آپ نے غصہ میں کچھ ان کو بھی برا بھلا کہا، ساتھ ہی فرمایا کہ تم نے کس محصل سے تعلیم پائی ہے جو اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ سرحدی پٹھان کو اپنے استاد کی مہملیت کی وجہ سے کچھ غصہ آ گیا اور درس سے اٹھ کر وہ اپنے حجرے میں چلا آیا اس وقت تو بات یوں ہی ہو گئی۔ مغرب کے بعد میں نے تاریکی میں دیکھا کہ کوئی آدمی اس کے حجرے میں داخل ہوا اور مولوی ابوالبشر سے مراضاۃ بلکہ معافی کے کلمات کہہ رہا ہے۔ غور جو کیا تو وہ حضرت الاستاذؒ تھے، اس تواضع اور انکسار پر دل نے عبرتوں کا ایک سبق حاصل کیا۔ فرحمہ اللہ

طریقہ تعلیم

حضرت کا تعلیمی طریقہ زیادہ تر خیر آبادی درس کا تابع تھا، جس کی بنیاد مطالعہ، تقریر، تکرار یا اعادہ پر قائم تھی۔ مطالعہ کا مطلب یہ تھا کہ ہر طالب العلم پر

Marfat.com

لازم تھا کہ بغیر حواشی و شروح کی امداد کے روزانہ پڑھنے سے پیشتر اپنے سبق کے مطالب پر حاوی ہو کر درس میں آئے اور اس کا کبھی کبھی فجائی امتحان بھی ہوتا رہتا تھا۔ آپ کو اس کی بھنک بھی لگ جاتی تھی کہ فلاں طالب علم حواشی اور شروح کی اعانت سے کتاب کا مطلب حل کرتا ہے تو اس پر آگ بگولہ ہو جاتے، مطالعہ صرف طالب العلم ہی پر فرض نہ تھا بلکہ بغیر مطالعہ کے حضرت شیخ تہذیب و قطبی جیسی آسان ابتدائی کتابیں مشکل ہی سے پڑھاتے، فرماتے کہ بغیر دیکھے ہوئے کسی کتاب کا درس جائز نہیں ہے۔ کسی دن اگر آپ رات کو کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کر سکتے تو نہایت صفائی سے کہہ دیتے کہ آج اس کا سبق نہیں ہوگا۔

تقریر سے غرض ہے کہ درس کے وقت کسی طالب العلم کو کتاب کی عبارت پڑھنے کا حکم ہوتا تھا۔ عبارت کی صحت پر خاص توجہ ہوتی تھی، وہی استاد جو درس سے پیشتر ایک معمولی دوست کی حیثیت سے ملتا تھا، عبارتی اغلاط پر اس کے چہرہ کا تکدر طلبہ کے ناقابل برداشت ہو جاتا تھا، تنبیہاً کبھی کبھی کتب بھی اٹھا کر پھینک دیتے تھے، جب عبارت ہو چکی تو اس مقام کا مطلب نہایت شستہ اردو میں آپ خود فرماتے، مطلب کی بنیاد جن مقدمات پر ہوتی ان کو پہلے بیان کرتے، پھر اصل مطلب کے بعد جس جماعت کا طالب العلم ہوتا، اس کی وسعت کے مطابق مصنف کے کلام پر نہایت سنجیدہ تنقید فرماتے۔

تکرار یا اعادہ قدیم درس کا ایک ضروری جزء تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ رسم عربی مدارس سے اٹھ رہی ہے۔ حضرت اس کا خاص لحاظ فرماتے تھے۔ ہر جماعت کے طلبہ مختلف ٹولیوں میں تقسیم ہوتے تھے، جماعت میں جو زیادہ فہمیدہ، ذکی طالب العلم ہوتا تھا، وہ اپنی ٹولی کا معید ہوتا تھا، اس کا فرض تھا کہ جو کچھ اس نے استاد سے سنا ہے، جہاں تک ممکن ہو ان ہی الفاظ میں پھر اپنی جماعت میں دہرائے، بعض طلبہ تو

اس میں اس قدر غلو کرتے تھے کہ حضرت کی طرح شکل وصورت ہیئت بھی بناتے تھے۔

یہ تو عام دستور تھا لیکن بعض خاص خاص طلبہ کے ذمہ علاوہ ان باتوں کے ایک حکم خاص یہ بھی ہوتا تھا کہ روزانہ اپنے سبق کو اردو میں لکھ لیا کریں۔ اور پھر وہ حضرت الاستاذ کو دکھلائیں۔ ان مراحل کے بعد ایک درس ختم ہوتا تھا، ظاہر ہے کہ اس کے بعد طالب العلم ہر کتاب پر کس قدر حاوی ہو جاتا تھا۔

حضرت کے درس کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مصنفینِ کتاب کے متعلق یہ کبھی یاد نہیں کراتے تھے کہ ان کے بیانات قطعی اور فیصلہ کن ہیں بلکہ جہاں جہاں ان میں غلطیاں ہوتی تھی، آزادی کے ساتھ اسے ظاہر فرماتے، خود فرماتے کہ میں کتاب نہیں پڑھانا چاہتا ہوں، فن سکھانا چاہتا ہوں۔

آپ کو اس سے سخت نفرت تھی کہ صرف طلبہ پر رعب جمانے کے لیے ان کے فہم واستعداد سے زیادہ بے محل اعلیٰ باتیں بیان کی جائیں۔ دوسری درس گاہوں کے آئے ہوئے طالب العلم اس کے عادی ہوتے اور کبھی کبھی اپنی حیثیت سے زیادہ کوئی اونچی بات پوچھتے تو اس کو جھڑک دیتے اور فرماتے کہ گدارنے سے پیشتر تم پکنے کی کیوں کوشش کرتے ہو۔

آپ نے طالب العلموں کو انتخاب علم وکتاب کے مسئلہ میں بالکل آزادی دے رکھی تھی، ہر طالب علم کو اختیار تھا کہ جو چاہے پڑھے، میں نے آپ کے یہاں ایسے طالب العلم بھی دیکھے ہیں جو صرف ایک کتاب میں شریک ہوتے تھے، لیکن ان سے کوئی باز پرس نہیں ہوتی تھی۔ ہر طالب العلم آزاد تھا۔ جتنی عمر تک جتنے دن تک چاہے آپ کے مدرسہ میں رہے۔ عجیب بات یہ تھی کہ آپ کے یہاں نہ کوئی حاضری کا رجسٹر تھا اور نہ اس پر کبھی توجہ کرتے کہ کون طالب العلم آیا ہے کون نہیں آیا ہے۔
لیکن اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا ہے تو اس ہشت سالہ میں میں نے کسی طالب العلم کو

Marfat.com

نہیں دیکھا کہ محض بے شوقی کی وجہ سے وہ درس سے غائب رہا ہو، کسی مجبوری کی وجہ سے اگر آ نہ سکا تو اس کی تکلیف کے لیے میں اپنے پاس الفاظ نہیں پاتا، جو یہ بیچارہ محسوس کرتا تھا، دوسرے طالب العلموں خصوصاً معیدوں سے وہ پھر اس سبق کو سنتا، اور افسوس کرتا کہ میں موجود نہ تھا۔

غیر درسی مجالس میں تحصیلِ علم اور قیمتِ علم کے متعلق ایسے واقعات سناتے رہتے تھے کہ خود بخود طالب العلم علم کی تشنگی سے معمور ہو جاتا تھا، آج دار الاقاموں میں مؤدبین ہیں، طلبہ کی صبح و شام نگرانی کی جاتی ہے۔ لیکن جس علمی ماحول کو میں نے اس کھپریل کے بے ضابطہ مدرسہ میں پایا، پھر کہیں نہیں دیکھا۔ تقریروں، حاشیوں، شرحوں، قلمی کتابوں کی نقل میں تنافس کا ایک عجیب خوشگوار سلسلہ جاری تھا، حتیٰ کہ کبھی کبھی یہی شوق حد سے بڑھ جاتا تھا۔ ایک دفعہ فلسفہ کی ایک کتاب کی نقل کے سلسلے میں دو طالب العلموں میں کشمکش جاری تھی اور اس کشمکش کا آخری انجام اس پر ہوا تھا کہ دونوں کے ہاتھ میں چھری تھی، ہر ایک چاہتا تھا کہ اس کی نقل کا موقعہ مجھے پہلے ملنا چاہیے۔ ورنہ زندگی ختم کر دی جائے گی۔ گویا یہ اپنا ایک عیب ہے اور اب حضرتؒ بھی زندہ نہیں ہیں۔ لیکن ایک بدقسمت طالب العلم آپ ہی کے پاس وہ بھی تھا کہ آپ نے خوانساری کا حاشیہ شفاء اور ملا جلال کا حاشیہ از مولانا فضل امام خیرآبادی جسے آپ کسی کو نہیں دکھاتے تھے، اور یہ بھی علم کی قدر و منزلت کا ایک غالبانہ رنگ تھا، یہ دونوں حاشیے جلد بندھوانے کے لیے طالب العلم پر اعتماد کر کے، آپ نے حکم دیا تھا کہ کسی کو نہ دکھانا اور دو دن میں جلد بندھوا کر مجھے دے دینا۔ لیکن جس پر اعتماد کیا گیا تھا وہ غادر ثابت ہوا اور دو رات دو دن مسلسل جاگ کر سینکڑوں صفحات کے ان حواشی کو نقل کر لیا۔ بڑی قیمت دے کر جلد بند سے چند گھنٹوں میں جلد بندھوا کر حضرت کے حوالہ کر دیا جس کی خبر غالباً حضرت کو اپنی آخری عمر تک نہیں ہوئی، وہ

Marfat.com

غالباً یہی خیال فرماتے رہے کہ اس کتاب کا کوئی نسخہ ہمارے یہاں کے سوا اور کہیں نہیں ہے۔ جواز و ناجواز، غدر و خیانت سے بحث نہیں لیکن مجھے اس پر حیرت ہے کہ الٰہی وہ کیا طرزِ تعلیم اور اصول تربیت تھا کہ طلبہ میں ذوقِ علم کی ایسی آگ لگی ہوئی تھی، آج کتابیں بازاروں میں ملتی ہیں، لاکھوں روپے ہر کالج اور مدرسوں میں کتاب خانوں پر صرف کیے جاتے ہیں۔ لیکن کتب خانوں میں لین دین کے کھاتوں کو دیکھو! افسانوں اور ناولوں کے سوا کم کتابیں ایسی نظر آئیں گی، جن کو طلبہ مطالعہ کے لیے لے گئے ہوں۔

علومِ درسیہ

حضرت الاستاذ خیر آبادی اسکول کے چشم و چراغ تھے، اس لیے قدرۃً آپ پر، منطق، اور فلسفہ کی شاخ مابعد الطبعیات کا ذوق غالب تھا، درس میں زیادہ زور ان ہی دو علموں پر دیا جاتا تھا لیکن اسی کے ساتھ ریاضیات کے سوا، تقریباً ان تمام علوم متداولہ کی کتابیں پڑھاتے تھے، جو عربی مدارس کے نصاب میں شریک ہیں۔ میں نے حضرت کو ادب عربی کی کتب اربعہ (حریری متنبّی وغیرہ) بھی پڑھاتے ہوئے دیکھا ہے، ان کے سوا حدیث میں صحاح ستہ کا درس تو آپ باضابطہ دیتے تھے فقہ میں ہدایہ اخیرین کو بڑی تدقیق اور شوق سے پڑھاتے تھے۔ بیضاوی کے ڈھائی پارہ میں اپنی تفسیری قوت کا بھی اظہار فرماتے تھے، عرصہ کے بعد بطور مشغلہ کے آپ دیوان حافظ، مثنوی مولانا روم، مکتوبات مجدد الف ثانیؒ کا بھی درس دیتے تھے اور کبھی کبھی طلبہ کے اصرار سے آپ طب بھی پڑھاتے تھے، لیکن بعض طلبہ کے لیے خصوصیت کے ساتھ حکم تھا کہ وہ طب کے درس میں شریک ہوں۔ ان ہی بدبختوں میں ایک وہ بھی تھا جو طب کے درس سے کئی بار اٹھایا گیا، اور یہ کہہ کر اٹھایا گیا کہ ''تجھے پر قینچ کر کے رکھا جائے گا'' اور یہ واقعہ ہے کہ وہ اس وقت تک ہر قسم کے

Marfat.com

معاشی علوم سے نا آشنا ہے لیکن افسوس کہ جو حضرت کی تمنا تھی، وہ بھی پوری نہ کر سکا،
و لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

مغرب کے بعد آپ کتابی مطب بھی بعض طلبہ کو کراتے تھے۔ بعض مختلف امراض کے مریض فرض کر کے نسخے بتاتے۔

اُردو میں فلسفہ کی تعلیم

حضرت کی تعلیمی زبان اردو تھی جیسا کہ ہندوستان کے تمام مدارس میں رواج ہے۔ لیکن ایک خاص خصوصیت آپ کے درس کی یہ تھی کہ جب کسی طالب علم کو آپ ابتداء سے فلسفہ پڑھانا چاہتے تھے تو اپنے استاد مولانا عبدالحق خیرآبادی کی ایک ابتدائی کتاب جس کا نام زبدۃ الحکمت ہے ضرور پڑھاتے تھے اور غالبًا اردو زبان میں کسی فن کی تعلیم کی یہ ابتدا تھی اور یوں ہی فلسفہ کی عربی کتابوں میں آپ بعض اصطلاحات کا ترجمہ مزے لے لے کر کیا کرتے تھے۔ مثلاً تداخل کا ترجمہ آپ ''درانا'' حلول کا ''پیوست ہونا'' فرماتے، آپ کے ایسے خاص ترجموں کی فہرست بہت طویل ہے۔

امتحان

آپ کا درس جس طرح رجسٹروں کے گورکھ دھندوں سے آزاد تھا، اسی طرح امتحان کی جھنجھٹوں سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ یوں پوچھو، تو ہر طالب العلم آپ کے یہاں ہر وقت زیر امتحان ہوتا تھا۔ عبارت خوانی سوال و جواب سب میں اس پر کافی گرفت اور تنقید ہوتی رہتی تھی لیکن سند فروشی کے لیے آپ نے امتحان کا کوئی باضابطہ باب اپنے درس میں نہیں کر رکھا تھا۔ زمانہ چونکہ امتحان پر زور دیتا تھا، تو کبھی کبھی سال میں ایک ایک دفعہ زیادہ تر تقریری اور کبھی کبھی تحریری امتحان لے لیا کرتے تھے۔ لیکن اس کی اہمیت ان کی نگاہ میں صرف اس قدر تھی کہ طالب العلموں

Marfat.com

کو ہفتوں پہلے خود ہی سوالات بتا دیتے تھے کہ باتیں تم سے پوچھی جائیں گی جب امتحان لے لیتے اور طالب العلم کتاب کا لکھا ہوا جواب دے چکتا تو فرماتے کہ یہ تو کتاب کی بات ہے، یا تم نے مجھ سے سنی ہیں، میں حافظہ کا امتحان لینا نہیں چاہتا، بلکہ تمہاری استعداد وفہم کا امتحان لوں گا۔ اب اس جواب کے متعلق کوئی پیچیدہ سوال خود پیدا کر کے پوچھتے کہ اس کا کیا جواب ہے؟ جو طالب العلم اس جدید سوال کا جواب دیتا تھا وہی پاس سمجھا جاتا، ورنہ ناکام۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر طالب العلم کی حیثیت، استعداد پر گہری نظر رکھتے، اس کی جو کمزوریاں ہوتیں، دفع فرماتے، بعض خاص طالب العلموں کے اولیاء کو آپ ہر سال ان کے بچے کی تعلیمی حالت کی رپورٹ صیغہ راز میں لکھ کر بھیج دیتے۔ میرے پاس ایسے خطوط کا ایک مجموعہ ہے۔ ان شاء اللہ حضرت کے مکاتیب کے ساتھ وہ شائع ہوں گے۔

تعطیل

سب سے نمایاں چیز آپ کی تعلیم کی تعطیل تھی۔ آپ اس کے قطعاً مخالف تھے کہ مسلسل سال کے گیارہ مہینے طلبہ کو پڑھایا جائے، شعبان، رمضان، شوال میں عموماً تعلیم بند ہو جاتی تھی۔ اسی طرح ہفتہ میں دو دن منگل اور جمعہ میں درس موقوف رہتا اور یوں بھی علی سبیل البدلیہ ہفتہ میں ایک دن ضرور ناغہ ہوتا تھا۔ عجلت پسند طلبہ کے لیے تعطیلوں کا یہ سلسلہ صبر آزما ہو جاتا تھا لیکن جہاں تک تجربہ سے کہا جا سکتا ہے، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پڑھانے سے زیادہ طلبہ کو پڑھنے کا موقعہ دینا چاہیے، جس کی آسان صورت یہی ہے کہ درس سے زیادہ تعطیل کے ایام کر دیئے جائیں، ورنہ کم از کم مساوی تو ضرور ہونا چاہیے۔ جن مدارس میں تعطیلوں کا سلسلہ کم ہوتا ہے۔ عموماً وہاں کے طالب العلم کم سواد، ضعیف الدماغ، بطی الفہم ہو جاتے ہیں۔ موعظت ہو یا دراست، نحول اور ناغہ دونوں میں ضرورت ہے۔

Marfat.com

طلبہ کی استعداد وتربیت کی عام نگرانی

بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت طلبہ کی عام نگرانی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ کی متجاہلانہ عرفانی نگاہوں سے کوئی بچا ہوا نہ تھا۔ خصوصا اس کا خیال سختی کے ساتھ رکھتے تھے کہ طالب العلم ایسی کتابیں یا مضامین نہ پڑھنے پائیں جن سے ان میں سہولت پسندی، یا سطاحت پیدا ہو جائے، اور اسی لیے آپ اخبا ور سائل جن میں زیادہ تر بازاری گپ، یا افسانے، تاریخی واقعات ہوتے ہوں، ان کے پڑھنے سے روکتے تھے، ناول اور قصوں کی کتابوں کے پڑھنے سے بھی منع فرماتے تھے۔ کوئی طالب العلم اگر کسی ایسے استاد کے پاس پڑھنے جاتا تھا، جس کے علمی نظر وفکر پر آپ کو اعتماد نہ تھا، تو اس کو شدت کے ساتھ زجر فرماتے، بعض لوگ اس کو علمی عصبیت پر محمول کرتے تھے، ممکن ہے کہ اس میں اس کا شائبہ بھی ہو۔ لیکن اپنی نیت کی حدود تک وہ اس میں بھی مخلص تھے۔ طلبہ اگر وعظ وتقریر کی مشق کرتے تو فرماتے کہ ''یہ گدرانے سے پیش تر پکنے کی کوشش کر رہا ہے''۔ سیاسیات سے آپ کو خود دلچسپی نہ تھی، تاہم اسلامی معاملات پر عمیق اور گہری رائے رکھتے تھے اور اپنے نزدیک کچھ سوچ کر سرگرم عمل تھے۔ لیکن طلبہ کے لیے سیاسی مشاغل کو بھی پسند نہیں فرماتے اور ساری باتیں اس لیے تھیں کہ آپ کے سامنے ذہنی تربیت اور استعدادی قوت کے مقابلہ میں تمام چیزیں کم قیمت تھیں۔ خیال تھا کہ جب نظر بالغ ہو جائے گی تو یہ باتیں خود بخود اپنے وقت پر سمجھ میں آ جائیں گی۔ میں نے ایک دن میر زاہد کے رسالہ علم کے متعلق پوچھا کہ آخر نتیجہ تو کچھ معلوم نہیں ہوا کہ علم کی حقیقت کیا ہے؟ یہ اس طرح راز میں رہا کہ کتاب کے پڑھنے سے پہلے تھا۔ فرمانے لگے کہ کتابیں صرف کرتب سکھانے کے مشقی دنگل ہیں، مشق کے لیے کوئی بھی چیز لے لو، لکڑی کا مگدر ہو، یا لوہے کا، مقصود بازو کی قوت اور پٹھوں کی مضبوطی ہے۔ کام کا

Marfat.com

وقت تو میدان میں آتا ہے۔ جس کا بدن مشقی دنگلوں کا کھیلا ہوا ہے۔ رن پڑنے پر بازی وہی لے جائے گا، مقصود صرف دین کی تائید ہے اور ان پیچیدہ باتوں سے دماغ کی تمرین وتشحید کی جاتی ہے۔

مقصد درس

حضرت کی خدمت میں مجھے آٹھ سال تک رہنے کا اتفاق ہوا لیکن میں نے کبھی نہیں سنا کہ آپ کی اس درسی کوشش کا مقصد کیا ہے؟ کیا صرف شہرت و نام و نمود؟ لیکن میں جانتا ہوں کہ حضرت میں اس کا جذبہ بہت کم تھا۔ آپ چاہتے تو شہرت کی ایسی زمین آپ کے سامنے کھلی ہوئی تھی کہ ان پر چل کر ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتے جہاں سے صرف دنیا کے مسلمان نہیں بلکہ غیر اقوام بھی آپ کو دیکھتے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم آپ کے بڑے دوست تھے، انہوں نے بار ہا چاہا کہ ان کے ساتھ وہ میدان عمل میں اتریں، طبی مجاہدات میں ساتھ دیں۔ لیکن خاموشی کے سوا آپ کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ حیدر آباد کے معین المہام مذہبی، نواب فضیلت جنگ، مولانا انوار اللہ خاں مرحوم آپ کے مخلص عقیدت مند تھے، انہوں نے بار ہا چاہا کہ دکن کی کسی سطح مرتفع پر آپ بھی اپنا مینارہ قائم کریں۔ لیکن آپ اپنی جگہ سے نہ ہلے، مختلف ریاستوں کے رئیسوں نے بڑی بڑی تنخواہوں پر آپ کو بلایا، لیکن نہ گئے۔ مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے خود مجھے ایک دفعہ لکھنؤ میں پوچھا کیا تمہارے استاد مولانا برکات احمد صاحب ہمارے دارالعلوم کی صدر مدرسی پر آسکتے ہیں۔ حضرت سے جا کر میں نے عرض کیا، تو ہنس کر ٹال دیا۔ اور کچھ جواب نہ دیا، نہیں کہا جا سکتا کہ اندرون قلب میں اس غیر معمولی جدوجہد سے انہوں نے اپنا کیا نصب العین مقرر کیا تھا۔ ثواب آخرت بیشک ان کے نزدیک بڑی چیز تھی، اور جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے مالک کی مرضی اور خوشنودی کے لیے علم دین کی نشر و اشاعت میں

Marfat.com

مصروف تھے، تاہم ٹونک کے ایک بزرگ مرحوم بچے میاں جو حضرت کے دوست تھے ایک دن مجھ سے بولے کہ آج مولوی برکات احمد بہت خوش تھے اور مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں نے اپنا درس چند نشتروں کی تیاری کے لیے قائم کیا تھا، سو الحمد للہ دو نشتر تو مجھے مل گئے ان شاء اللہ ان سے بڑا کام نکلے گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی مراد نشتر سے کیا تھی اور یہ کون دو آدمی تھے، جن کے متعلق حضرت کی پیشین گوئی تھی۔ تاہم اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ حضرت کے سامنے بھی کوئی مقصد تھا، کامیابی و ناکامی کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن ان کی نیت میں کوئی خاص ''سر'' پوشیدہ تھا۔ اِنَّمَا الْاَ عْمَالُ بِالنِّیَّات ۔

دورِ تالیف

تقریباً بیس سال تک مختلف علوم وفنون کی مسلسل تعلیم و درس کے بعد ادھر پچھلے دس پندرہ سال حضرت نے اپنی توجہ درس سے زیادہ تالیف وتصنیف کی طرف پھیر دی تھی۔ ان کی کل کتابیں عربی زبان میں ہیں، جن میں بعض چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں اور مختلف درسی کتابوں کی مشکل مقامات کے حل سے متعلق ہیں۔ ایک ضخیم کتاب آپ نے الحجۃ البازغہ کے نام سے لکھی، جس میں مابعد الطبیعیات کے چند اہم ابواب پر مجتہدانہ انداز سے گفتگو فرمائی گئی ہے۔ مولانا انوار اللہ خان مرحوم نے اس کو حکومت آصفیہ کی جانب سے شائع بھی کرادیا ہے۔ ایک کتاب آپ نے فارسی سے عربی میں ترجمہ کی، یہ مولانا بحرالعلوم کی شرح منار فارسی کا عربی ترجمہ ہے، کاش شائع ہوجاتی تو نصاب کے لیے بہترین کتاب ہے۔

آخر عمر میں آپ پر تصوف کا غلبہ ہوگیا اور چند اہم کتابیں اس موضوع پر لکھی ہیں۔ جو سب کی سب غیر مطبوع ہیں۔ آپ نے دیانند سرستی کے فلسفیانہ اصول کی تردید میں بزبان اردو کچھ نوٹ کرائے تھے۔ جس کو باضابطہ مرتب کر کے صدقہ

Marfat.com

جاریہ فی رد آریہ کے نام سے حضرت کے خلف رشید مولانا حکیم محمد احمد صاحب نے شائع بھی کرادیا ہے۔ اردو میں اگر حضرت کی کوئی یادگار ہے تو یہی ہے، بعض نزاعی جزئیات کے متعلق چھوٹے چھوٹے رسائل بھی ہیں۔ ترمذی شریف کی ایک ضخیم شرح کا بھی آپ نے آغاز کیا تھا، معلوم نہیں کہ مکمل ہوئی یا نہیں۔ بہرحال حدیث وتصوف کے سوا آپ کی تمام تالیفی کوششوں کا تعلق ایسے مسائل سے ہے، جس کی مانگ علم کے دورجدید میں مشکل سے ہوگی۔ یہ ممکن ہے کہ اگر کسی زمانہ میں ہندوستان کی علمی اور ذہنی کیفیت نے پھر وہی ارتفاع پیدا کرلیا، جو کسی زمانہ میں تھا۔ تو لوگوں کو ان کتابوں سے دلچسپی ہو، خیال ہے کہ اگر حضرت کی کوئی مفصل سوانح عمری کبھی شائع کی گئی، تو اس میں ان کتابوں کے مسائل سے لوگوں کو روشناس کرانے کی کوشش کی جائے گی۔

مجاہدات وریاضات

جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے، حضرت میں تقویٰ، انابت، اخلاص باللہ، عشق نبوی کے جواہرات ابتداء سے منور تھے، لیکن ان میں آب وتاب اس وقت آیا جب علم وعقل سے آپ بالکل تھک کر بیٹھ گئے۔ یہ تو آپ کا ہمیشہ سے معمول تھا کہ رات کے تین (۳) بجے، ساڑھے تین بجے اٹھ جاتے، تہجد کی نماز پڑھتے، پھر جہر کے ساتھ صبح تک ذکر کرتے رہتے، صبح کی نماز ہٹو کی مسجد میں باجماعت ادا کرکے ایک خاص منظر قابل دید اس کے بعد یہ ہوتا تھا کہ نماز کے بعد طلوع آفتاب تک مسلسل زور زور سے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر ادعیہ، ماثورہ کا ایک سلسلہ نہایت لجاجت سے شروع فرماتے تھے، مسجد سے اٹھ کر گھر آتے، تانگہ تیار رہتا تھا، علی الصباح نذرباغ نواب صاحب کو دیکھنے جاتے اور راستہ میں قرآن مجید اور دلائل الخیرات کے اوراد ختم کرتے۔ حضرت کی خدمت میں ۱۳۲۵ھ میں حاضر ہوا، اس

وقت تک آپ کی مذہبی ریاضت کا یہی حال تھا۔ میں ٹونک ہی میں تھا کہ آپ پر حج و زیارت کا شوق مسلط ہوا۔ اور حجاز کے سوا، شام و فلسطین، مصر ہوتے ہوئے آپ ہندوستان واپس ہوئے، اس کے بعد آپ کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ فقراء و دراویش کے یوں تو ہمیشہ سے معتقد تھے، لیکن اس کے بعد اس جماعت کی دامن آویزی کا جذبہ بہت تیز ہوگیا۔ اس عرصے میں آپ حیدر آباد ایک ضرورت سے تشریف لائے، یہاں تلاش فقر میں آپ کی نگاہ ایک ایسے فقیر پر پڑی جو اپنی ظاہر شکل وصورت میں ایک معمولی سے آدمی ہیں اور رسمی علوم میں بھی ان کا پایہ کچھ بلند نہیں ہے لیکن فلسفہ و منطق کے سمندر کا یہ نہنگ جب اس فقیر کے آستانہ پر حاضر ہوا تو پچاس سال کے سارے سرمایہ کو ان کے قدموں پر نثار کر دیا۔ ان کا نام حضرت لحمال اللہ شاہ صاحب عرف مچھلی شاہ صاحب مدظلہ العالی ہے۔ میں بھی ساتھ تھا، حضرت سے بعض لاہوتی مسائل پر گفتگو ہوئی، اس کے بعد حضرت آبدیدہ تھے، اپنی گذشتہ محنت پر پچھتاتے تھے، اور غالباً اس کے بعد ایک مہینہ تک حیدر آباد میں رہے، لیکن وقت کا اکثر حصہ انہیں بزرگ کی چٹائی پر متحیرانہ بسر کرتے تھے، وہ کچھ کہتے جاتے تھے اور حضرت الاستاذ سنتے جاتے تھے۔

یہ بزرگ مدراس کی جماعت صوفیہ کے بڑے اصلاحی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے سلسلہ کے بزرگوں نے عربی فارسی میں ایک خاص قسم کا ذخیرہ تصوف کے متعلق مختلف کتابوں کی شکل میں مہیا کیا ہے۔ حضرت نے ڈھونڈ کر یہ کتابیں مطبوعہ وقلمی مہیا کیں۔ اور شاہ صاحب سے ارشاد لے کر مراجعت فرمائے ٹونک ہوئے۔ آخر زندگی میں ان کا مشغلہ ان ہی کتابوں کا مطالعہ اور ان سے مطالب استنباط کر کے کئی کتابوں کی تدوین رہ گیا تھا۔

افسوس ہے کہ اس کے بعد خدمت گرامی میں مجھے حاضری کی نوبت نہ آئی۔

Marfat.com

لیکن لوگوں سے معلوم ہوتا رہا کہ حضرت کا یہ آخری رنگ بہت گہرا اور سخت انقلاب انگیز تھا، مزاج میں حد درجہ کی نرمی اور وارفتگی پیدا ہوگئی تھی۔ خود حضرت مچھلی شاہ صاحب نے مجھ سے بار بار فرمایا کہ تمہارے استاد کو میں عالمِ مثال میں دیکھتا ہوں کہ ان کے سر پر ایک تاجِ زرنگار ہے اور وہ کسی منصب عالی پر سرفراز کیے گئے۔ یہ واقعہ حضرت مچھلی شاہ صاحب ان کی زندگی میں فرماتے تھے۔

اس زمانہ کے اندرونی ریاضات و مجاہدات کا مجھے تفصیلی علم نہیں ہے، جن خوش نصیبوں کو اس ''عہد نور'' میں آپ کی رفاقت نصیب ہوئی کاش وہ اس کی تکمیل فرما دیتے۔

یہ تو حضرت کے علمی اور دینی شعبہ کا ذکر تھا، مناسب ہوگا کہ آخر میں آپ کی زندگی کے بعض جزئیات کو بھی یہاں درج کر دیا جائے۔

سخاوت

حضرت کا سینہ نہایت وسیع اور چشم کشادہ تھی، طالب علموں کے ساتھ جو برتاؤ تھا معلوم ہو چکا، اس کے سوا غریبوں، بیواؤں، دوستوں کے ساتھ مخفی طور پر آپ بہت سلوک فرماتے تھے۔ خصوصاً اقربا کے ساتھ آپ کا سلوک بالکل غیر معمولی تھا۔ تنخواہ کا ایک بڑا حصہ ہر مہینہ ان عزیزوں کو مشاہروں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اخیر عمر میں عربوں کی مہمان نوازی کا جذبہ آپ پر بہت غالب ہوگیا تھا۔ محبت رسول کی آگ جوں جوں تیز ہوتی تھی، دیارِ محبوب کا ہر آنے والا آپ کو بے چین کر دیتا تھا، یہاں تک کہ اسی شوق کے زیر اثر آپ نے چند سال پہلے عربوں کے لیے ایک مستقل سرائے اپنے مصارف سے تیار کرائی تھی اور اس کا نام ''رباط'' رکھا تھا، جس میں ہر قسم کے آرام کا سامان آپ کی جانب سے تھا۔ ٹونک میں جو عرب آتا، خصوصاً اگر مدینہ کا ہوتا تو اس کے سامنے معمولی خادم کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرتے،

خود دیتے، امراء سے دلاتے، اور نواب صاحب ٹونک سے کچھ نہ کچھ وصول کر کے عربوں کو دلوانا اپنے اوپر لازم کرلیا تھا۔ خاکسار کے نام آخری خط اپنے وصال کے پندرہ دن پیشتر ایک عرب ہی کی سفارش میں بھجوایا تھا۔ بہر حال آپ کی عام اخلاقی صفات میں جود کی صفت آپ پر بہت نمایاں تھی۔

سادگی اور وارفتگی واستغراق

لباس، سواری وغیرہ میں آپ بالکل سادہ تھے، معمولی چار آنے پانچ آنے گز کا کرتہ اور پاجامہ عام طور پر پہنتے تھے، اور یہ بھی بہت بڑی حالت میں آپ کے جسم پر نظر آتا تھا، مزاج میں وارفتگی حد سے گذری ہوئی تھی۔ درس گاہ میں کبھی کبھی الٹا پائجامہ پہن کر آتے، مونڈھے پر کرتہ کا ایک حصہ پان کی پیک سے تر رہتا تھا، پان کھانے کی عادت بہت زیادہ تھی۔ درس کے وقت عموماً منہ سے چھالیا اڑ اڑ کر طالب علموں کی کھلی کتابوں پر گرتی، خصوصاً قاری کی کتاب تو بالکل سرخ ہو جاتی تھی، کیونکہ طرہ یہ ہوتا تھا کہ خود اپنے دستِ مبارک سے اس کو پونچھ بھی دیتے تھے۔ آپ کی وارفتگی کے قصے بہت مشہور ہیں، کہا جاتا ہے کہ ایک دن حمام سے بغیر کسی کپڑے کے باہر نکل آئے۔ لوگ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ نواب صاحب ٹونک کے سامنے ایک دن بجائے عمامہ سر پر پائجامہ باندھ کر چلے گئے، نواب صاحب کے ٹوکنے پر متنبہ ہوئے۔ یہ بھی بسا اوقات ہوا کہ کسی نے آپ کو فیس دی، رومال جو کندھے پر اکثر ڈالے رہتے تھے، اس کے کونہ میں روپیہ باندھ دیتے لیکن اس طرح کہ رومال میں گرہ پڑ گئی مگر روپیہ باہر ہی رہا۔ جس کا جی چاہتا تھا، لے لیتا تھا، رحم آیا تو دے دیا، علمی انہماک اور فکری استغراق کے بعد "محقرات امور" میں اس قسم کے افعال کا صادر ہونا علم کی تاریخ میں نادر نہیں ہے۔

قناعت

اور یہ بات زیادہ تو اس لیے تھی کہ مزاج میں حرص کا شائبہ بھی نہ تھا، مہاراجہ اندر نے مختلف ذرائع سے آپ پر زور دیا کہ میں بارہ سو روپیہ ماہوار آپ کو تنخواہ دوں گا، اور اس کے سوا اور بھی وعدے تھے لیکن آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کہ مہاراجہ کیا کہتا ہے، ان باتوں کا اثر نواب صاحب ٹونک پر بہت پڑتا تھا۔ خود فرماتے تھے کہ نواب یہ خیال کرتے ہیں کہ میں ان کو چھوڑ دوں گا، حالانکہ ان کا یہ عجیب خیال ہے کہ حیدرآباد آرہے تھے تو نواب صاحب لپٹ کر حکیم صاحب سے کہنے لگے کہ مولوی برکات احمد صاحب جانے کو تو جاتے ہو لیکن مجھے نہ چھوڑ دینا۔ بھائی ٹونک سے تو تم مجھے دفن ہی کر کے جانا، کیا معلوم تھا کہ معاملہ بالعکس ہونے والا ہے، انہوں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ ٹونک ہی میں ایک واقعہ آپ کی مالی آزمائش کا پیش آیا تھا، اس وقت چاہتے تو چھ لاکھ روپے جائز ذریعہ سے آپ کو مل جاتے، لیکن بعض لوگوں کی مروت سے آپ نے اس روپیہ کو بری طرح ٹھکرا دیا۔

مراء وجدال سے نفرت

حضرت کا خاص فن منطق اور فلسفہ تھا، جس کا اکثر حصہ صرف جدالیات و مکابرات پر مبنی ہے۔ اور عموماً منطقی اور فلسفی کے معنی کم از کم قدیم اصطلاح میں جھگڑالو کے تھے۔ اس زمانہ میں جو عالم اپنے کو منطقی کے خطاب سے موصوف کرتا تھا، اس کے لیے ضرور تھا کہ وہ اپنے معاصرین سے ذہنی ولسانی جنگ کرے۔ لیکن حضرت پر جہاں خدا کا اور فضل تھا، اس میں ایک یہ بھی تھا کہ فی عمرہ آپ نے ہندوستان کے کسی عالم سے زبانی مناظرہ نہیں فرمایا، بدقسمتی سے رئیس رامپور کو ایک زمانہ میں مولوی بازی کا شوق ہو گیا، رامپور میں کئی مولویانہ دنگل ہوئے، اسی سلسلہ میں کسی نے نواب کو حضرت کی طرف توجہ دلائی، انہوں نے آپ کو بلوا کر مشہور جدالی

Marfat.com

منطقی مولوی عبدالوہاب بہاری مرحوم سے بھڑا دیا۔ حضرت اس میدان کے مرد نہ تھے، آپ نے تو سنجیدہ پیرایہ میں اصول کے ساتھ گفتگو شروع کی، لیکن مرحوم منطقی نے اپنے چالجوجی پینتروں سے آپ پر حملہ شروع کر دیا۔ آخر میں فیصلہ کے متعلق حاضرین میں اختلاف ہوگیا۔ بعض حضرت کی فتح کے نقارچی تھے، اور بعض مولوی عبدالوہاب کے ڈفالی، لیکن واقعہ یہ تھا کہ تقابل کے لیے نسبت شرط ہے، اور مولوی عبدالوہاب مرحوم اور حضرت کی فطرت و نہاد میں کوئی نسبت نہیں تھی، پیٹی جوتہ سے بہتر ہے یا قلم گوشت سے افضل ہے، آخر ان بے جوڑ، انمل باتوں میں مناظرہ کرنا یا کرانا خود اپنی کوتاہ عقلی ہے۔ اخبارات و رسائل میں مولوی عبدالوہاب مرحوم نے اپنے اس مناظرہ کا مشاعیہ کیا تھا، لوگوں نے حضرت کی طرف سے ذب و مدافعت بھی کی لیکن خود آپ بالکل خاموش تھے، بہرحال زبانی مناظرہ عمر بھر میں صرف ایک ہی دفعہ ہوا، البتہ بعض عقلی اور چند مذہبی جزئیات پر آپ میں اور آپ کے معاصرین مولانا فضل حق رامپوری اور شمس العلماء مولانا عبداللہ ٹونکی وغیرہ میں نوک جھوک ہوتی۔ نیز بعض مسائل دیوبندیہ کے متعلق آپ نے کبھی کبھی کچھ لکھا، لیکن سرسٹھ برس کی عمر میں یہ چند شاذ مثالیں ہیں اور یہ بھی کسی خاص فوری جوش یا ہیجان کا نتیجہ تھا، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی چھوٹی باتوں سے اللہ نے آپ کو بہت ارفع و اعلیٰ پیدا کیا تھا۔

حضرت کے تلامذہ

اس عنوان کی حقیقی تفصیل ایک ضخیم رجسٹر کو چاہتی ہے لیکن جیسا کہ میں بارہا کہتا رہا ہوں، اجمالاً یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ وسط ایشیا، ترکستان کے شہروں خصوصاً بخارا، تاشقند وغیرہ سے شروع کر کے تم بنگال کے آخری حدود تک چلے جاؤ، تقریباً ہر بڑے شہر میں آپ کا کوئی شاگرد ضرور نظر آئے گا، اور اچھی حالت میں نظر آئے گا بیرون ہند سے آپ کے پاس طلبہ خاص کر اس لیے زیادہ آتے تھے کہ علاوہ درس

Marfat.com

نظامیہ کے آپ خصوصیت کے ساتھ ابن سینا، طوسی، قوشجی، دوانی، خوالنساری، میر باقر داماد کی کتابیں پڑھاتے تھے، جو اس زمانہ میں صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ شاید دنیائے اسلام میں بھی نہیں پڑھائی جاتی تھیں۔ اور ماوراء النہر کے طلبہ میں ان مصنفین کی کتابوں کے پڑھنے کا خاص ذوق تھا۔

علمائے ہند میں مولانا معین الدین اجمیری، مولانا خلیل الرحمٰن ٹونکی، مولانا نصیر احمد پھلتی، مولانا عبد الرحمٰن چشتی حیدر آبادی، مولانا اشرف ملتانی، مولانا عبد السبحان بہاری، مولانا مقبول احمد دربھنگوی، مولانا محمود سندھی، مولانا عبید اللہ الامام البہاری، مولانا عبد الحمید ترہتی، مولانا شریف مبارک پوری، مولانا عبد القدیر بدایونی، مولانا فضل کریم بہاری، مولانا احمد کریم بہاری، مولانا عبد الواسع وغیرہم حضرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں اکثر ہندوستان کے مرکزی مدارس کے صدر مدرس یا مدرس ہیں۔ اور اسلامی علوم کے حلقہ علمی میں وقعت وعزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

اہل وعیال

حضرت کی پہلی شادی جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ میر نگر میں ہوئی تھی، لیکن چند ہی دنوں کے بعد ان کا انتقال ہوگیا، ان سے آپ کی کوئی اولاد نہیں ہے، ان کے بعد بہاری کے ایک بزرگ مولانا عبد الرحمٰن صاحب ساکن پترہٹہ ضلع مونگیر کی صاحبزادی سے آپ کا دوسرا نکاح ہوا، حضرت کی یہ بیوی صاحبہ حقیقت یہ ہے کہ ان گرامی قدر خواتینِ اسلام میں سے ہیں جنہوں نے اپنے کو علم ودین کی خدمت میں اپنے شوہر کا دستِ راست ثابت کیا۔ بیوی صاحبہ حضرت کے تمام علمی مہمانوں کی خاطر مدارات نہ صرف ان کے قیام وطعام کا تمیں پینتیس برس تک انتظام کیا بلکہ سچ یہ ہے کہ انہوں نے ان بچوں کو مہربان ماں کی طرح پالا، یہ مبالغہ نہیں ہے کہ بعض

Marfat.com

دفعہ انہیں غریب الدیار طلبہ کے مصارف کے سلسلہ میں بیوی صاحبہ کو اپنے زیور خفیہ طور پر فروخت کرنے پڑے تھے، فجزاها عنا وعن المسلمين خير الجزاء اگر وہ نہ ہوتیں تو برکاتی سلسلہ کے علمبرداروں کو علمی آبادیوں میں شاید ہم نہیں پا سکتے تھے۔ آپ ہی حضرت کے خلف رشید مولانا حکیم محمد احمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کی والدہ ماجدہ ہیں اور محمد میاں صاحب کے سوا حضرت کی کوئی دوسری نسلی نشانی موجود نہیں ہے۔ لیکن جس کی علمی ذریت زمین کے کناروں تک پھیلی ہوئی ہو، کیا ہوا کہ ایک اکلوتے بچے کے سوا اس نے اور کوئی اولاد نہیں چھوڑی

ازصدائے سخن عشق ندیدم خوشتر

یادگارے کہ درین گنبد دوار بماند

مولانا حکیم محمد احمد صاحب علماً ومنصباً، دنیاً وعملاً اپنے والد مرحوم کے سچے جانشین ہیں، اب والی ٹونک خلد اللہ ملکہ کے معالج خاص وہی مقرر ہوئے ہیں۔ اور حضرت کی جگہ درس وتدریس کی عنان آپ نے اپنے ہاتھ میں لی ہے۔ اللہ ان کی عمر میں برکت دے اور توفیق عطا فرمائے کہ اپنے والد کی تمام خصوصیات کی روح تک ان کی رسائی ہو۔

درمجلس وصالت خمہا کشند مستان

چو دورِ خسر آمدی درسبو نماندہ

و نعوذ بالله من الفتن ماظهر منها و بطن

وفات

سرسٹھ برس کی عمر کے بعد یکایک آپ ہستی کی اس منزل پر پہنچ گئے جہاں انسان دنیا میں غروب ہو کر آخرت میں طلوع ہوتا ہے، حضرت کی وفات کے حالات کے متعلق مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں آپ کے نجل سعید، خلف ارشد، مولانا محمد احمد

صاحب کے اس مطبوعہ خط کو نقل کر دوں جسے انہوں نے اقطارِ ہند کے عام تعزیت ناموں کے جواب میں شائع فرمایا تھا، ارقام فرماتے ہیں:

جناب .... السلام علیکم وعلی جمیع من اتبع الھدیٰ، آنجناب کا تار ومکتوب گرامی بسلسلہ تعزیت و بہ طلب حالات مفصل علالت ووفات والدی سراج الملتہ حضرت مولانا برکات احمد صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ موجب مومنیت وتسکین خاطر حزین فقیر حقیر ہوا، جواباً التماس ہے کہ حضرت علیہ الرحمۃ کو دو سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوتا ہے کہ ضعفِ معدہ کی شکایت تھی۔ سال گذشتہ اسی حالت میں بے تابانہ و پروانہ وار زیارت سلطان دوعالم ﷺ وحج ثانی کے لیے روانہ ہو گئے، چونکہ موسم نہایت تیز وتند تھا، اور طبیعت پہلے ہی مضمحل تھی، اس لیے اسہال معدی میں زیادتی پیدا ہوگئی۔ سفر مبارک سے معاودت فرمانے کے بعد برابر سلسلہ اسہال جاری رہا، غذا بجائے دو وقت کے ایک وقت ہوگئی، ریاضت کی کثرت، درس وتدریس میں پوری محویت، تصنیف وتالیف میں کامل انہماک کا نتیجہ یہ ہوا کہ ضعف یوماً فیوماً بڑھتا گیا اور مرض الموت کی ابتدا یوم عید الفطر ۱۳۴۶ھ اس طرح شروع ہوئی کہ شدت سے دفعتہً بخار ہوگیا اور کامل تیئس روز تک مفارق نہ ہوا، اور پھر ورم جگر، سوء القنیہ ہو کر نوبت باستسقاء رسید، امراض کا اس طرح ہجوم تھا مگر وہاں صحت جسمانی کی طرف تغافل اور بے توجہی کا وہی عالم تھا، جو ہمیشہ رہا اور جس نے صحت کو بالآخر اس اخیر درجہ کو پہنچا دیا، تکالیف کے اخفاء کی اس طرح کوشش جاری تھی۔ جس دم، پاس انفاس کا سلسلہ برابر جاری تھا، اسی وجہ سے دو مرتبہ قی الدم بھی ہوئی۔ ماہ صفر کے اخیر عشرہ میں مرض کی انتہائی شدت ڈبل نمونیہ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ جس کی کمزور جسمانیت تاب نہ لاسکی اور آفتاب فضل وکمال غرہ ربیع الاول ۱۳۴۷ ہجری شب کے ۳ بجے غروب ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

Marfat.com

و ما کان قیس ھلکہ ھلک واحد ولکنہ بنیان قوم تھدما

وفات شریف سے ایک شب پہلے وصیت فرمائی کہ میرے مدرسہ اور رباط کا پوری طرح خیال رکھنا، درس و تدریس کا سلسلہ پوری قوت کے ساتھ قائم رکھنا، میرے والد ماجد (حضرت مولانا حکیم دائم علی صاحب بہاری) رحمۃ اللہ علیہ کا عرس ضروری جاری رکھنا، میرے فاتحہ کا بہت خیال رکھنا، دورِ علالت کامل پانچ ماہ قائم رہا، مگر ایک روز بھی مشغلہ علمی ترک نہ ہوا، جمعہ کے روز حضرت کی زندگی کا اخیر دن اور یوم الرحیل تھا۔ میں جمعہ کی نماز سے واپس ہوا تو التعرف فی حقیقۃ التصوف کے مطالعہ میں مستغرق تھے، انہیں ایام علالت میں تین عمیق علمی تصانیف فرمائیں، جن کا اختتام زندگی کے لحات کے اختتام کے ساتھ ہوا ہے اور جن کو حضرت رحمۃ اللہ کے معلومات کا نچوڑ سمجھنا چاہے۔

اس کے بعد کتاب کے نام اور مسائل کا ذکر ہے، آگے ارقام فرماتے ہیں:

یوم الرحیل میں برابر عصر سے مغرب تک عیادت کے واسطے جوق در جوق لوگ آتے رہے، نہات متبسم چہرہ اور خندہ پیشانی سے بات چیت اور تلقین وارشاد میں مصروف رہے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد عشاء تک ورود وظائف کا سلسلہ جاری رہا، اور عشاء کے بعد خلاف معمول مدت دراز کے بعد تناول طعام فرمایا، تقریبا ڈیڑھ گھنٹہ دس بجے تک آرام فرمایا، پھر پوری قوت کے ساتھ بیدار ہو کر ۲ بجے تک اولاً تلاوت قرآن شریف اور پھر ذکر بالجہر میں مصروف رہے۔ دو بجے سے جہر کی شدت میں فرق آنا شروع ہوا، اور یٰس شریف جو ایک مدت سے رات کو پڑھی جارہی تھی ختم کرائی پھر ذکر میں مصروف ہوئے تا آنکہ ٹھیک ۳ بجے اسی حالت میں جاں بحق تسلیم ہوئے۔ اور وہ زبان ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی جس کی تذکیر و تلقین سے عالم گونج اٹھا۔ خدا جانے یہ کیا اسرار الٰہی میں سے تھا کہ تین روز سے آنکھوں

Marfat.com

میں ایسی غیر معمولی چمک دمک اور دلآویزی اور جاذبیت پیدا ہوگئی تھی کہ عام عیادت کنندگان نے اس کا احساس کرلیا تھا اور ایک دوسرے سے متعجبانہ تذکرہ کرتے تھے۔ آہ وہ آنکھیں ۳ بجے شب کو ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں۔ لیکن قلب برابر ۸ بجے تک جاری رہا، عوام اس واقعہ کو بنظر استعجاب دیکھتے تھے، اور حقیقت شناس حضرات کہتے تھے: للہ الحمد ٹھکانے لگی محنت ان کی

حکامان ریاست نے تمام دفاتر سرکاری میں جنازہ ونماز جنازہ میں شرکت کے واسطے عام اجازت دیدی، اور دارالعلوم خلیلیہ میں نماز اولیٰ ادا ہوئی، چوک دفاتر کے قریب صحرا میں نماز ثانی ادا ہوئی۔

دوسرے روز حسب فرمان خسروی ریاست میں تعطیل ماتمی ۱۹ اگست ۱۹۲۸ء کو دی گئی۔

آگے مولانا نے کچھ اپنے حالات لکھے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی تعزیت میں نواب صاحب ٹونک بہ نفس نفیس آپ کے مکان تشریف لائے اور جن فرائض کا تعلق حضرت مرحوم سے تھا وہ آپ کے اکلوتے اور رشید صاحبزادے کے سپرد کیے گئے۔ اس وقت مولانا حکیم محمد احمد صاحب کی تنخواہ چارسو روپیہ ماہوار ہے اور جاگیر میں وہی قدیم گاؤں ٹھکریہ ہے،

فاللهم زدفي عمره و بارك و متعنا و المسلمين بطول بقائه

اب حضرت استاد رحمۃ اللہ علیہ کے نفس ذکی، روح صافی کی طرف فاتحہ کے ساتھ متوجہ ہوکر بجز اس کے اور کیا عرض کرسکتا ہوں کہ

سابكيك ما فاضت دموعي فان تغض

فحسبك مني ماتجن الجوانح

Marfat.com

حواشی

الف۔ بہار کا اصلی نام دہارا ہے جس کے معنی دارالعلوم یا خانقاہ کے ہیں، اس صوبہ میں بودہ مذہب کے علماء کے مدارس اور خانقاہوں کی کثرت تھی اور اسی صوبہ میں بودھا کا شجرِ معرفت بھی گیا میں تھا، کہا جاتا ہے اسی دہارا کا تلفظ بعد کو بہار ہو گیا۔

ب۔ یہ گوتم بودھا نہیں ہے بلکہ ترہت کے ایک دوسرے پنڈت کا نام ہے جو نیائے شاستر کا مصنف ہے، اس علاقہ کا مرکزی شہراب دربھنگہ ہے۔

ج۔ ریف دریائے نیل کے اس ساحلی علاقہ کو کہتے ہیں جس پر نیل کی طغیانی سے ہر سال نئی مٹی چڑھ جاتی ہے اور کاشت کے لیے اکسیر کا کام دیتی ہے۔ بہار کے اس علاقہ کا بھی یہی حال ہے کہ گنگا اور اس کی معاون ندیاں ہر سال نئی کیچڑ اس پر چھوڑتی ہیں۔ جس کی وجہ سے پیداوار غیر معمولی ہو جاتی ہے۔

د۔ پروفیسر مولوی عبدالغفور شہباز، سابق صدر کلیہ اورنگ آباد کی طرف اشارہ ہے، جنہوں نے میاں نظیر اکبرآبادی کے بہی کھاتہ کو بےنظیر دواوین وکلیات کی صف میں جگہ دی۔

ھ۔ صاحب دعوت الحق مولانا رحمت اللہ ہندی مہاجر مکی کے متعلق حضرت مولانا محمد علی صاحب قدس سرہ العزیز بانی ندوۃ العلما فرماتے تھے کہ جب پادری فنڈر ہندوستان سے شکست کھا کر قسطنطنیہ پہنچا اور علمائے اسلام کو مناظرہ کی دعوت دی، تو سلطان عبدالحمید خاں مرحوم نے مکہ معظمہ سے مولانا رحمۃ اللہ کو خاص جہاز پر قسطنطنیہ بلوایا، فنڈر ان سے ہندوستان میں ہزیمت کھا چکا تھا، صورت دیکھتے ہی بھاگ گیا۔ سلطان کو ان کے علمی رعب کا یہ حال معلوم ہوا تو جب کبھی وہ دربار شاہی میں جاتے، رخصت کرتے وقت سلطان ان کی جوتیاں خود ہی اپنے ہاتھ سے سیدھی فرما دیتے تھے۔ فغفر الله له ولمن تبعه

Marfat.com

مصادر و مراجع

۱۔ القرآن الکریم

۲۔ آرنلڈ، ڈی، ڈبلیو، اشاعت اسلام، (دعوتِ اسلام) مترجم عنایت اللہ شیخ، لاہور، محکمہ اوقاف پنجاب، ۱۹۷۲ء

۳۔ ابن ابی اصیبعہ، احمد بن القاسم، طبقات الاطباء، مصر، مطبع الوھبیۃ، ۱۲۹۹ھ

۴۔ ابن اثیر، مبارک بن محمد، اسد الغابۃ، بیروت، دار احیاء التراث العربی، س ن

۵۔ ابن اثیر، مبارک بن محمد، الکامل، مصر، مطبع احمد الحلبی، ۱۳۰۳ھ

۶۔ ابن اثیر، مبارک بن محمد، الکامل، بیروت، دار الکتاب العربی، ۱۴۲۰ھ

۷۔ ابن جوزی، ابو الفرج، عبد الرحمٰن بن علی، سیرۃ عمر بن عبد العزیز، Dragulin، Leipzig، ۱۸۹۹ء

۸۔ ابن حجر، احمد بن علی، الاصابہ، مصر، مطبع السعادۃ، ۱۳۲۸ھ

۹۔ ابن حزم، علی بن احمد، الفصل فی الملل والاھواء والنحل، مصر، مطبعۃ الادبیہ، ۱۳۱۷ھ

۱۰۔ ابن حنبل، احمد بن حنبل، مسند الامام احمد بن حنبل، مکۃ المکرمہ، مکتبہ عباس احمد الباز ۱۴۱۴ھ

۱۱۔ ابن حوقل، محمد بن حوقل، المسالک والممالک، مصر، مطبع السعادۃ، ۱۳۲۴ھ

۱۲۔ ابن خلکان، شمس الدین، احمد بن محمد، وفیات الاعیان، ایران، منشورات، الرضی، ۱۹۷۱ء

۱۳۔ ابن خلدون، عبد الرحمٰن، تاریخ ابن خلدون، مصر، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۹۳۶ء

۱۴۔ ابن خلدون، عبد الرحمٰن، مقدمہ ابن خلدون، بیروت، موسسۃ الاعلمی، س ن

۱۵۔ ابن سعد، محمد بن سعد، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۹۹۷ء، ۱۴۱۷ھ

۱۶۔ ابن عبد ربہ، احمد بن محمد العقد الفرید، مصر، مطبع الجمالیہ، ۱۳۳۱ھ

Marfat.com

۱۷۔ ابن العربی، محی الدین ابوبکر، الفتوحات المکیہ، مصر، مطبع میریہ، س ن

۱۸۔ ابن العربی، محی الدین ابوبکر، الفتوحات المکیہ، مصر، مطبع بولاق، س ن

۱۹۔ ابن العربی، محی الدین ابوبکر، فصوص الحکم، بیروت دار احیاء التراث الکتب العربیہ، ۱۳۵۶ھ

۲۰۔ ابن العربی، محمد بن عبداللہ، احکام القرآن، بیروت، دار الفکر ۱۴۰۸ھ

۲۱۔ ابن عساکر، علی بن حسین، تاریخ دمشق، مطبع روضۃ الشام، ۱۳۳۲ھ

۲۲۔ ابن العماد الحنبلی، عبدالحی بن العماد، شذرات الذھب، بیروت دار المسیرۃ، ۱۳۹۹ھ

۲۳۔ ابن فرحون، ابراھیم ابن علی بن محمد، الدیباج، المذھب، مصر، مطبعۃ السعادۃ، ۱۳۲۹ھ

۲۴۔ ابن کثیر، ابوالفداء اسماعیل بن کثیر، السیرۃ النبویۃ، بیروت، دار احیاء التراث العربی، س ن

۲۵۔ ابن نجیم، زین الدین، البحر الرائق، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ، س ن

۲۶۔ ابن ندیم، محمد بن اسحاق، الفہرست، مصر، المطبعۃ الرحمانیہ، ۱۳۴۸ھ

۲۷۔ ابن ھشام، عبدالملک بن ھشام، السیرۃ النبویۃ، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۵ھ

۲۸۔ ابن ھمام، محمد بن عبدالواحد، فتح القدیر، مصر، المطبعۃ الکبریٰ الامیریۃ، ۱۳۱۶ھ

۲۹۔ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، کتاب السنن، بیروت، مکتبہ دار الجیل، ۱۹۹۲ء

۳۰۔ ابوالسعود، محمد بن محمد، تفسیر ابی السعود (ارشاد العقل السلیم)، مکۃ المکرمۃ، مکتبہ عباس احمد الباز، ۱۴۱۹ھ

۳۱۔ ابوعبید، القاسم بن سلام، کتاب الاموال، بیروت، دار الفکر، ۱۴۰۸ھ

۳۲۔ ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، کتاب الخراج، مصر، مطبع میریہ، ۱۳۱۲ھ

۳۳۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، دمشق، دار ابن کثیر، ۱۴۱۰ھ

Marfat.com

۳۴۔ بخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کراچی، قدیمی کتب خانہ، س ن

۳۵۔ بدایونی، عبدالقادر، منتخب التواریخ، کلکتہ، کالج پریس، ۱۸۶۵ء

۳۶۔ برنی، ضیاء الدین، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۶۲ء

۳۷۔ بلاذری، احمد بن یحیٰ، فتوح البلدان، بریل، لیدن، ۱۸۶۶ء

۳۸۔ بلگرامی، آزاد علی، ماثر الکرام، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۹۱۰ء

۳۹۔ بیرونی، ابوریحان، احمد بن علی، الآثار الباقیہ، جرمنی، لیدن، ۱۸۹۷ء

۴۰۔ بیہقی، ابوبکر احمد بن الحسین، دلائل النبوۃ، بیروت، دارالکتب العلمیہ، ۱۴۰۵ھ

۴۱۔ بھولا داس، انھینو ڈل اتھاس، انھینو گرنتھا گار، س ن

۴۲۔ پرکاش دیو، اشوک، لاہور، جارج اسٹیم پریس، ۱۹۱۷ء

۴۳۔ ترمذی، ابوعیسیٰ، محمد بن عیسیٰ، الجامع الصحیح، مصر، مکتبہ مصطفیٰ البابی، ۱۳۹۸ھ

۴۴۔ جصاص، احمد بن علی، احکام القرآن، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۱۴۱۲ھ

۴۵۔ چڑیاکوٹی، محمد عنایت رسول، بشریٰ، علی گڑھ، شروانی پرنٹنگ پریس، ۱۹۳۶ء

۴۶۔ چلپی سعدی، سعد اللہ بن عیسیٰ، حاشیہ بر فتح القدیر، مصر، المطبعۃ الکبریٰ الامیریہ، ۱۳۱۶ھ

۴۷۔ حاکم، ابوعبداللہ، محمد بن عبداللہ، معرفۃ علوم الحدیث، المدینۃ المنورۃ، المکتبہ العلمیہ، ۱۳۹۷ھ

۴۸۔ خافی خان، منتخب اللباب، کلکتہ، Badtistmission Press، ۱۹۲۵ء

۴۹۔ خطیب بغدادی، احمد بن علی، تاریخ بغداد، مصر، مطبع السعادۃ، ۱۹۳۱ء

۵۰۔ دارقطنی، علی بن عمر، سنن الدارقطنی، بیروت، دارالمعرفۃ، ۱۴۲۲ھ

۵۱۔ دیاربکری، حسین بن محمد، تاریخ الخمیس، بیروت، دارصادر، س ن

۵۲۔ الدمیری، کمال الدین، حیات الحیوان، (مترجم، مولانا محمد عباس فتح پوری) لاہور، ادارہ اسلامیات، ۱۴۱۲ھ

۵۳۔ ذھبی، شمس الدین، محمد بن حسین، تذکرۃ الحفاظ، بیروت، داراحیاء التراث العربی،

Marfat.com

۱۳۷۶ھ

۵۴۔ رازی، محمد بن ضیاء الدین عمر، التفسیر الکبیر، مکہ مکرمہ، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۴۱۴ھ

۵۵۔ رفاعی، احمد الفرید، الدکتور، عصر المامون، قاہرہ، دار الکتب المصریۃ، ۱۹۲۷ء

۵۶۔ زبیدی، سید محمد مرتضی، تاج العروس، مصر، مطبع الخیریۃ، ۱۳۰۶ھ

۵۷۔ زیلعی، محمد عبداللہ بن یوسف، نصب الرایہ، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۶ھ

۵۸۔ السرخسی، محمد بن احمد، المبسوط، بیروت، دار المعرفہ، ۱۴۰۹ھ

۵۹۔ سر سید احمد خان، اسباب بغاوتِ ہند، کراچی، اردو اکیڈمی، ۱۹۵۷ء

۶۰۔ سندر لال، پنڈت، قرآن اور گیتا، حیدر آباد، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، س ن

۶۱۔ سیوطی، جلال الدین، عبد الرحمٰن بن ابی بکر، الدر المنثور، بیروت، دار الکتب العلمیہ
۱۴۱۱ھ

۶۲۔ شربینی، محمد الخطیب، مغنی المحتاج، مصر، مطبع مصطفیٰ البابی، ۱۹۵۸ء

۶۳۔ شکیب ارسلان، تعلیقات بر مقدمہ ابن خلدون، مصر، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۹۳۶ء

۶۴۔ شوکانی، محمد بن علی، تفسیر فتح القدیر، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۴۱۸ھ

۶۵۔ شہرستانی، عبد الکریم، الملل والنحل، مصر، مطبع مصطفیٰ البابی، ۱۲۱۵ھ

۶۶۔ شیبانی، محمد بن الحسن، السیر الکبیر مع الشرح (شارح، سرخسی، محمد بن احمد) حیدر آباد
دائرۃ المعارف، ۱۳۳۵ھ

۶۷۔ شیبانی، محمد بن الحسن، السیر الکبیر مع الشرح (شارح، سرخسی، محمد بن احمد) بیروت،
دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۷ھ

۶۸۔ شیبانی، محمد بن الحسن، کتاب الآثار، کراچی، قدیمی کتب خانہ، س ن

۶۹۔ طحاوی، احمد بن سلامہ ازدی، مشکل الآثار، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۵ھ

۷۰۔ عبد الحکیم، ڈاکٹر، النبی والاسلام، انبالہ، بلدلی اسٹیم پریس، ۱۹۱۵ء

۷۱۔ علی المتقی، علاء الدین بن حسام الدین، کنز العمال، حیدر آباد، دائرۃ المعارف، ۱۳۱۲ھ

۷۲۔ عینی، محمود بن احمد، البنایۃ شرح الھدایۃ، المکۃ المکرمۃ، المکتبۃ التجاریۃ، ۱۴۱۱ھ

Marfat.com

۷۳۔ غزالی، ابو حامد محمد، احیاء العلوم، بیروت، دار الخیر، ۱۴۱۷ھ

۷۴۔ غلام علی، مجددی دہلوی، مقامات مظہری، (مترجم محمد اقبال مجددی)، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۳ء

۷۵۔ فرشتہ، محمد بن قاسم، تاریخ فرشتہ، لکھنؤ، نولکشور، س ن

۷۶۔ قشیری، مسلم بن الحجاج، الجامع الصحیح، مشمولہ موسوعۃ الکتب الستۃ، ریاض، دار السلام، ۱۴۲۱ھ

۷۷۔ قفطی، جمال الدین یوسف، اخبار الحکماء، مصر، مطبع السعادۃ، ۱۳۲۶ھ

۷۸۔ قنوجی، صدیق حسن، نواب، ابجد العلوم، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۲۰ھ

۷۹۔ کاسانی، ابوبکر بن مسعود، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت، دار الفکر، ۱۴۱۷ھ

۸۰۔ کتانی، عبدالحی، التراتیب الاداریۃ، بیروت، ناشر حسن جعنا، س ن

۸۱۔ الکتبی، محمد بن شاکر، فوات الوفیات، بیروت، دار صادر، ۱۹۷۳ء

۸۲۔ لتھروپ سٹوڈرڈ، حاضر العالم الاسلامی (مترجم عربی عجاج نویھض) تعلیقات وحواشی امیر شکیب ارسلان، قاہرہ، المطبعۃ السلفیۃ، ۱۳۴۳ھ

۸۳۔ ماتھر دہلوی، منشی شری رام (مترجم) مہابھارت، دہلی، نولکشور، ۱۹۱۴ء

۸۴۔ مالک بن انسؒ، الموطا مع شرح المنتقی، المکۃ المکرمۃ، مکتبہ عباس احمد البازج، ۱۴۲۰ھ

۸۵۔ ماوردی، محمد بن حبیب، الاحکام السلطانیہ، مصر، مطبعۃ الاتحاد المصری، ۱۳۲۸ھ

۸۶۔ المتقی، علاء الدین، علی بن حسام الدین، کنز العمال، حیدرآباد، مطبع معارف، ۱۳۱۲ھ

۸۷۔ محمد حفیظ، اشوک اعظم، دہلی، انجمن ترقی اردو، س ن

۸۸۔ مراکشی، ابو محمد، عبدالواحد بن علی، المعجب فی تلخیص اخبار المغرب، مصر، مطبع السعادۃ، س ن

۸۹۔ مرغینانی، علی بن ابی بکر، الھدایہ مع نصب الرایہ، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۱۶ھ

۹۰۔ مسعودی، علی بن حسین، مروج الذہب، مصر، مطبع احمد الحلبی، ۱۳۰۳ھ

Marfat.com

۹۱۔ ولی اللہ، شاہ احمد بن عبد الرحیم، ازالۃ الخفاء، (مترجم مولانا محمد اشتیاق) کراچی قدیمی کتب خانہ، س ن

۹۲۔ ویبر، الفرڈ، تاریخ فلسفہ (مترجم خلیفہ عبدالحکیم) حیدر آباد، جامعہ عثمانیہ، دکن، ۱۹۲۸ء

۹۳۔ ھمدانی، ابن الفقیہ، احمد بن محمد، لیدن، مطبع بریل، ۱۳۰۲ھ

۹۴۔ ہیرا چند، گوری شنکر، قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب، الہ آباد، ہندوستان اکیڈمی، ۱۹۳۱ء

۹۵۔ Vincent A. Smith, Early History of India, England, Oxford Press, 1924

Marfat.com

مقالات

شیخ زاید اسلامک سنٹر
جامعہ پنجاب ۔ لاہور

Marfat.com